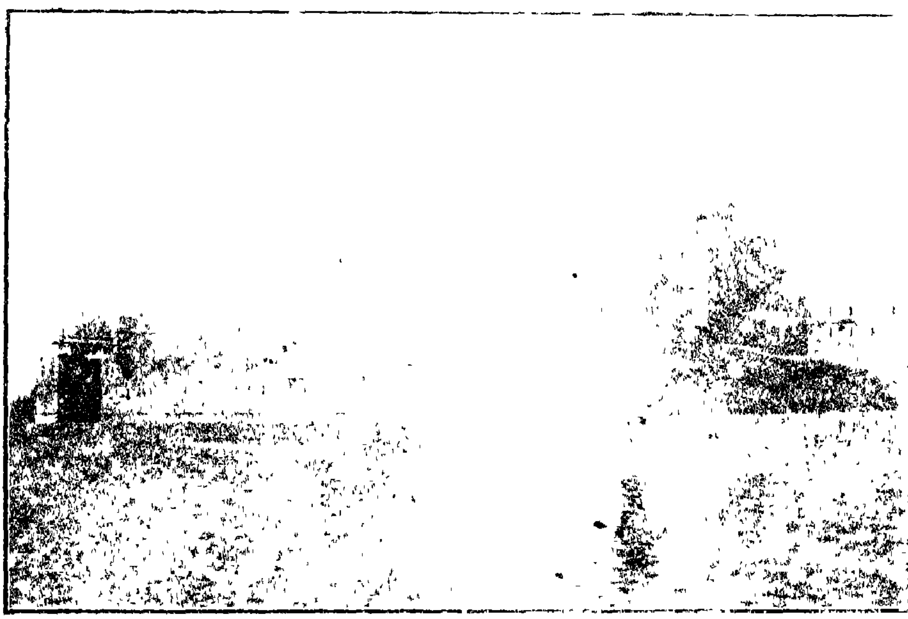
جلد دوم

بابت جنوری ۱۹۲۲ء

H.L. 212

حصۂ پنجم

اُردو



انجمن ترقی اُردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ

جزوِ اوّل تاریخی

از

جناب مولوی سید غلام یزدانی صاحب ایم اے - ایم آر اے ایس ناظم آثارِ قدیمہ حیدرآباد دکن

سلطان محمد قطب شاہ

بانیِ شہر حیدرآباد

نسب | تیرھویں صدی عیسوی میں جب ہلاکو کی ترک تاز نے بغداد کی سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا - تو تاتاری قبیلے ٹڈی دل کی طرح ایشیاء کوچک تک پھیل گئے - ان میں سے ایک قبیلے نے جلائر خاندان کی امداد سے آرمینیا اور آزر بائی جان میں خود مختار حکومت قایم کی - اور رفتہ رفتہ ایسا زور پکڑا کہ پندرھویں صدی کے آغاز میں بغداد پر تسلط حاصل کرلیا - یہ قبیلہ تاریخ میں آق قونیلو کے نام سے مشہور رہا - ترکی میں قونیلو مینڈھے کو کہتے ہیں - اور آق سیاہ رنگ کے واسطے استعمال ہوتا ہے چوں کہ اس خاندان کے فوجی جھنڈے پر سیاہ مینڈھے کی تصویر تھی اس لیئے یہ لقب مشہور ہو گیا - دکن کی قطب شاہی سلطنت کا بانی اِسی خاندان سے تھا -

---

٥ کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ پر جو اُردو کا نہایت قدیم مرتب کلام ہے میں تبصرہ لکھنا چاہتا تھا - لیکن کلام پر تبصرہ لکھنے سے قبل یہ ضرور تھا کہ شاعر اور اس کے زمانہ کے حالات سے ناظرین کو متعارف کیا جائے - میں اپنے مؤرخ دوست اور شفیق مولوی سید غلام یزدانی صاحب ایم اے ایم آر اے ایس ناظم سررشتہ آثارِ قدیمہ ریاست حیدرآباد دکن) کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے یہ حصہ لکھ کر مجھے بہت بڑی فکر و زحمت سے بچا دیا - سید صاحب موصوف کی نظر تاریخ میں بہت وسیع ہے اور خصوصاً خاندان قطب شاہیہ کے تو وہ جید مؤرخ ہیں - میں چاہتا تھا کہ اُن کی تحریر کو اپنے مضمون کا مقدمہ بنا(ؤں)

بانیِ خاندان کے دکن میں آنے کے وجوہ

آق قوینلو خاندان کا ستارہ کچھ زیادہ عرصہ عروج پر نہ رہا چنانچہ بغداد میں حکمرانی کرتے ابھی نصف صدی ہی گزرنے پائی تھی کہ تاتاری نسل کے ایک اور خاندان نے جن کے پرچم پر سفید مینڈھے کی تصویر تھی 'سیاہ مینڈھے' والوں کو سلطنت سے بے دخل کر دیا۔ اور اُن کے رئیس کو ایسا تنگ کیا کہ اُس کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور بھاگ کر جا بجا پناہ گزیں ہونا پڑا۔

دکن میں اس وقت بہمنیہ سلاطین بادشاہی کر رہے تھے۔ ان کی داد و دہش قدردانی کمال اور دربار کی شان و شکوہ کا شہرہ بلادِ اسلامیہ میں پہنچ چکا تھا۔ علم و فضل کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ شعرا قصائد پڑھتے تھے اور منہ مانگی مرادیں پاتے تھے۔ اگر فرشتہ کی روایت صحیح ہے، تو حافظ شیرازی کو بھی محمود شاہ بہمنی کی سخاوت اور علم دوستی نے دکن آنے پر مائل کر دیا تھا۔ اور وہ شیراز سے روانہ ہو کر لار کے راستہ ہرمز تک آئے۔ لیکن بادِ مخالف اور سمندر کے تلاطم نے شاعر کے دل کو ایسا دہلایا کہ جہاز سے اُتر کر وطن واپس چلے گئے اور یہ غزل میر فیض اللہ انجو کو جن کی معرفت دربار میں طلب کیے گئے تھے لکھ کر بھیجدی

غزل

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد　　بمے بفروش دلقِ ما کزیں بہتر نمی ارزد

بکوے مے فروشانش بہ جامے بر نمی گیرند　　زہے سجادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمی ارزد

رقیبم سرزنشہا کرد کزیں باب رُخ برتاب　　چہ اُفتاد ایں سرِ ما را کہ خاکِ در نمی ارزد

بس آساں می نمود اول غمِ دریا بہ بوے سود　　غلط گفتم کہ یک موجش بصد گوہر نمی ارزد

شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیمِ جاں درو درج ست　　کلاہِ دل کش ست اما بہ ترکِ سر نمی ارزد

بشو ایں نقشِ دل تنگی کہ در بازارِ یک رنگی　　بہ نعمت ہاے گوناگوں مےِ احمر نمی ارزد

چو حافظ در قناعت کوش و از دنیاے دوں بگذر

کہ یک جو منتِ دوناں بصد من زر نمی ارزد

طوائف الملوکی کی کثرت کی وجہ سے اس زمانہ کے شاہی درباروں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہر بادشا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱) مگر انھوں نے کچھ ایسی خوبی سے لکھا ہے کہ وہ اصل مضمون پر چھا گیا ہے اور اصل مضمون اس کا طفیلی ہو گیا ہے۔ (اڈیٹر)

کی صُحبت میں بگڑے ہوئے رُؤسا اور نوعمر شاہزادوں کا مجمع رہتا تھا۔ سلاطین اعزاز خاندانی کے خیال سے ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور اپنے جلو میں رکھنا باعثِ تزک و شان سمجھتے تھے۔ ذاتی جوہر اور لیاقت کے موافق مناصبِ جلیلہ بھی عطا فرماتے تھے۔ سُلطان قلی بانیِ خاندانِ قطب شاہیہ کے دکن آنے کے متعلق مورخین نے رنگا رنگ کی روایتیں لکھی ہیں۔ کہیں بزرگانِ دین کی پیشین گوئیاں نقل کی ہیں، کہیں خوابوں کی تعبیر بیان کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اوّل تو جان بچانے کا خیال درپیش تھا دوسرے سیاحوں سے دکن کے بادشاہوں کے جاہ وحشم اور وہاں کے اُمراء کی شان و شوکت کے قصے سُنے تھے۔ یہی بیم و اُمید کے اسباب تھے جو سلطان قلی کو اِس مُلک میں کھینچ لائے اور اوائل عمر ہی میں وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ محمود شاہ ثانی نے جو اس وقت تخت پر متمکن تھا، نووارد شہزادے کو ہونہار دیکھ کر اپنے خاص ملازمین کے زمرہ میں شامل کر لیا اور اولاد کی طرح شفقت کرنے لگا۔

بہمنی سلطنت کا زوال

محمود شاہ ایک حلیم الطبع لیکن کمزور اور عیش پسند بادشاہ تھا۔ اُمراء کی آپس کی چشمک اس کے باپ کے وقت سے چلی آتی تھی۔ چنانچہ اس عہد میں ایک دوسرے کے برخلاف دل کا غبار نکالنے کا خوب موقع ملا۔ محمود شاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی نظام الملک بحری امورِ سلطنت پر حاوی ہوگیا۔ اور یہ منصوبہ باندھا کہ یوسف عادل خاں کو زک دے کر ترکی امراء کا زور توڑ دے۔ چنانچہ سازشیں شروع ہوگئیں اور قصرِ شاہی میں کئی مرتبہ کشت وخون ہونے کے علاوہ ایک دفعہ بادشاہ کی جان بھی بال بال بچی۔ جب بدنظمی دن بدن بڑھتی گئی تو طرف داروں نے علاقے دبا لیے۔ لیکن بادشاہ پر مطلق اثر نہ ہُوا اور وہ عیش کا متوالا دن رات رنگ رلیوں میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ تختِ فیروزہ کو جس کی مرصع کاری میں بہمنی بادشاہوں نے کئی پشت تک خزانے خالی کیئے تھے تڑوا کر جام و صراحی بنوا ڈالے۔ فرشتہ نے محمود شاہ کے دربار کی تصویر نہایت پُرلطف کھینچی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ امورِ سلطنت سے بالکل غافل تھا اور حکومت کی باگ اُمراء کے ہاتھ میں تھی دربار میں دہلی اور لاہور کے گویئے اور کتھک اور ایران اور خراسان کے مطرب حاضر رہتے تھے۔ قصہ خواں اور داستان گو رنگین حکایات سے محفل کو گرم رکھتے تھے۔ بادشاہ کی دیکھا دیکھی رعایا نے بھی یہ رنگ اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ کُہن سال شیوخ نے دخترِ رز کے عشق میں خرقے رہن کر دیئے۔ اور سفید ریش مکتب کے اُستاد بطے کو بغل میں دبا کر شراب خانوں میں جا بیٹھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ سوائے تلنگانہ اور بیدر کی نواح کے کُل ملک بادشاہ کے قبضے سے نکل گیا۔ اور آخر

وقت میں تو قاسم برید نے وکیل السلطنت کی حیثیت سے ایسا تنگ کیا کہ حکمرانی تو در کنار بادشاہ بغیر اس کی اجازت کے پانی بھی نہیں پی سکتا تھا۔ قاسم برید کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے امیر برید نے بادشاہ کے اوپر اپنے اثر کو گھٹنے نہ دیا۔ اور کٹ پتلی کی طرح اپنے اشارہ پر چلایا۔

قطب شاہی حکومت کی ابتداء

سلطان قلی کی رگوں میں ابھی تاتاری خون تازہ تھا۔ علاوہ ازیں آباء و اجداد کی چھ پشت کی بادشاہی نے شاہانہ خصائل میراث میں دی تھیں۔ چنانچہ شجاعت اولوالعزمی، دیانت اور آقا پرستی کے ایسے جوہر دکھائے کہ ابتداء عمر ہی میں قطب الملک کے خطاب سے سرفراز ہوا اور تلنگانہ کا وسیع علاقہ صوبہ داری کے لیئے ملا۔ سلطان قلی نے اپنے آقا کے نمک کا ہمیشہ پاس کیا اور گو "بریدیوں" کے بادشاہ پر حاوی ہونے کی وجہ سے اسمٰعیل عادل خاں، ملک احمد نظام الملک اور علاء الدین عماد الملک نے محمود شاہ کی زندگی ہی میں خود مختاری کا اعلان کرکے سکہ اور خطبہ اپنے نام سے جاری کر دیا تھا لیکن سلطان قلی کی حمیت نے یہ دیدہ دلیری گوارا نہ کی اور جب تک محمود شاہ زندہ رہا خطبہ میں اسی کا نام برقرار رکھا۔ گول کنڈہ کی جامع مسجد کے کتبہ میں جو ۹۲۴ھ ہجری کا کندہ ہے محمود شاہ کا نام بادشاہِ وقت کی حیثیت سے نہایت احترام سے درج ہے۔ اور سلطان قلی کا نام بطور بانیِ عمارت کے لکھا ہوا ہے۔

۹۲۴ھ ہجری کے اواخر میں محمود شاہ کی وفات کے بعد سلطان قلی نے قطب شاہ کا لقب اختیار کیا اور گول کنڈہ کو اپنا پایۂ تخت بنا کر چھتیس برس تک بڑے کرّ و فر سے بادشاہی کی۔ اس عرصہ میں اس نے ساٹھ سے زیادہ قلعے اپنی بہادری اور قوتِ بازو سے فتح کیئے اور نل گنڈہ، کھمیٹ اور قرب و جوار کے راجاؤں اور زمینداروں کو جو بہمنی بادشاہوں کے ضعف کی وجہ سے شوخ چشم اور قریب قریب خود مختار ہو گئے تھے اپنا مطیع اور باج گزار بنا لیا۔ سلطان قلی ایک من چلا اور سورما سپاہی ہونے کے علاوہ نہایت ذی تدبیر سپہ سالار تھا۔ اور فنِ حرب سے خوب واقف تھا۔ جنگ کے موقع پر ایک تازہ دم دستہ ہمیشہ تیار رکھتا تھا۔ اور گھمسان کے وقت ان سپاہیوں کو ساتھ لے کر غنیم پر ٹوٹ پڑتا تھا۔ چنانچہ کئی لڑائیاں اس نے اسی طرح جیتیں۔ ایک اور چال جو وہ اکثر چلتا تھا یہ تھی کہ تھوڑی سی سپاہ کو کمین میں تیار رکھتا تھا۔ اور خود غنیم سے مقابل ہو کر پسپا ہو جاتا تھا جس وقت دشمن تعاقب کرتا تھا کمین کا دستہ چکر کاٹ کر پشت پر جم جاتا تھا۔ ادھر وہ فوج جو پسپا ہوتی تھی پلٹ کر سامنے

سے مقابل ہوتی تھی۔ اور دشمن چاروں طرف سے خطرے میں پھنس جاتا تھا۔ تلنگانہ کے زمینداروں کے علاوہ سلطان قلی کو اپنی قلمرو کی حدود کی حفاظت کے لیئے بیجاپور، احمدنگر اور بیدر کے نئے سلاطین سے بھی لڑنا پڑا اور بیجانگر کے راجہ کشن رائے سے بھی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ الغرض نوّے برس کی عمر تک یہ بڈھا ترک ملک گیری میں مصروف رہا۔ اور ایک ایسی سلطنت کی نیوڈال گیا جس کے استحکام نے ڈیڑھ صدی کے تزلزل کے بعد بھی اورنگ زیب جیسے رفیع القدر اور مستقل مزاج بادشاہ کے دانت کھٹے کردیئے۔[1]

سلطان قلی کے عہد کے دو واقعات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایک جنگ میں توپوں کا استعمال جو شمالی ہندوستان میں بھی تقریباً اسی زمانہ میں بابر کی پانی پت کی لڑائی سے شروع ہوا۔ دوسرا شیعہ مذہب کی ترویج جس کو سلطان قلی کی اولاد نے بھی نہایت جوش و خروش سے جاری رکھا۔ اور آج تک حیدرآباد میں بیسیوں عاشور خانے آبدار خانے قطب شاہی خاندان کے مذہبی اعتقادات کی زندہ یادگار موجود ہیں۔

سلطان قلی کے جانشین

سلطان قلی کے بعد اس کے تین بیٹوں نے یکے بعد دیگرے تریسٹھ برس سلطنت کی۔ ان میں سے آخری بادشاہ یعنی ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں مملکت کو بہت وسعت ہوئی۔ اور تلی کوٹ کی فتح کے بعد بیجانگر کے راجاؤں کا زور بہت گھٹ گیا جس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جنوبی علاقہ کے زمیندار جو بیجانگر کے حکام کی شہ سے روزمرّہ بغاوت کرتے رہتے تھے۔ اب درست ہوگئے۔ علاوہ ازیں ملک میں فوج کا بیشتر حصہ ناگواڑی سپاہیوں کا ہونے کی وجہ سے جو بدامنی کا اندیشہ رہتا تھا وہ بھی رفع ہوگیا۔

سلطان محمد قلی کی تخت نشینی

محمد قلی قطب شاہ سلطان ابراہیم قلی کا بیٹا تھا۔ اور باپ کی وفات کے بعد ۹۸۸ھ ہجری (مطابق ۱۵۸۰ء) میں تخت نشیں ہوا۔ ہندوستان میں اس وقت اکبری "شہنشاہی" کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اُدھر ایران میں شاہ عباس صفوی مسند حکومت پر بیٹھنے کو تھا۔ سلیمان اعظم کو بھی بساط دنیا سے رخصت ہوئے ابھی عرصہ نہ گزرا

---

[1] سلطان قلی کی عملداری میں یہ علاقے شامل تھے۔ شرق مچھلی پٹن راجمندری اور اڑیسہ کی حد تک تمام ملک، شمال ملنگور اور یلگندل۔ غرب کو بیدر تک تمام علاقہ، جنوب کو پل کنڈہ اور دریائے کرشنا تک تمام قلاع اور محالات۔ مروجہ جغرافیہ کے موافق اس سلطنت میں یہ اضلاع شامل خیال کیئے جا سکتے ہیں۔ ورنگل، نلگنڈہ، محبوب نگر، میدک، کریم نگر (بعض تعلقہ) علاوہ ازیں مدراس پریسیڈنسی کے گوداوری اور کرشنا کے اضلاع۔

تھا۔ اور یورپ میں اس کی فتوحات کی یاد تازہ تھی[1]۔ اسلام کی تاریخ میں یہ زرّیں زمانہ علم سیاسیات کی اصطلاح "شہنشاہیت" کے لحاظ سے بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔

بیجاپور سے مصالحت

دکن کی اسلامی حکومتوں کے درمیان آپس میں ہمیشہ نزاع رہتی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ابراہیم عادل شاہ والیِ بیجاپور سے اپنی بہن ملکۂ زماں کی شادی کردی۔ جس سے آیندہ کے لیئے ان دو نو خاندانوں کے درمیان مصالحت ہوگئی۔ بادشاہ کو ملک میں امن ہونے کی وجہ سے رفاہِ عام کے کام کرنے کا خوب موقع ملا۔ چنانچہ قانون میں بہت کچھ اصلاح ہوئی۔ اور مال گزاری میں معقول رعایت کی گئی۔ تاریخ قطب شاہی کا مصنف لکھتا ہے کہ تقریباً دو لاکھ ہون (چودہ لاکھ روپیہ) جو گزشتہ سلاطین کے وقت میں "محصول اجناس" کے عنوان سے جمع ہوتے تھے اس عہد میں بالکل معاف کردیئے گئے[2]۔ قلمرو کے مختلف حصص میں مساجد، مدرسے، محتاج خانے اور شفاخانے قائم کیئے گئے۔ اور مسافروں اور راہ گیروں کے آرام کے لیئے سرائے اور باولیاں بنائی گئیں اور لنگرخانے جاری کیئے گئے۔ بادشاہ کے خاص خزانچی میر ابوطالب کا بیان ہے کہ خیرات کی مد میں سالانہ ساٹھ ہزار ہون (چار لاکھ روپیہ) کا خرچ تھا۔ جس میں سے بارہ ہزار ہون (چوراسی ہزار روپیہ) ماہِ محرم ہی میں غربا، کی امداد میں صرف ہوجاتے تھے۔

حیدرآباد کی بنا،

محمد قلی کے عہد کا سب میں بڑا کارنامہ شہر حیدرآباد کی بنا ہے۔ چوں کہ فرشتہ اس وقت زندہ تھا اس لیئے شہر کی ابتدائی حالت کے متعلق اس کی رائے قابل اعتماد ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "گولکنڈہ کی آب و ہوا متعفن اور خراب ہوگئی تھی۔ اس لیئے بادشاہ نے آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک نہایت شاندار شہر بسایا جس کا نام ابتدا میں ایک محبوبہ کے نام پر بھاگ نگر رکھا گیا۔ مگر آخر میں وہ حیدرآباد کے نام سے مشہور ہوا۔ شہر کا دَور دس میل کے قریب

---

[1] سلیمان اعظم نے ۱۵۶۶ء تک سلطنت کی۔ اور اپنی مملکت کی حدود کو بوداپسٹ (کنار دریائے ڈینوب) سے لے کر اسوان (کنار دریائے نیل) تک اور دریائے فرات سے لے کر جبل الطارق تک پھیلا دیا۔

[2] ملک عنبر نے اسی زمانہ میں دکن کے اُس علاقہ میں جو مرہٹواڑی (مہاراشٹرا) کے نام سے مشہور ہے قوانین مال گزاری میں بہت تغیر و تبدل کیا۔ تعجب نہیں کہ محصول اجناس کی تخفیف بھی ملک عنبر کے نئے قوانین کا نتیجہ ہو۔ کیوں کہ اس کے قائم کیئے ہوئے ضوابط کا عمل بہت جلد تمام دکن میں ہونے لگا۔

اور بازار اور راستے ہندوستان کے اور شہروں کے برخلاف کشادہ اور صاف ہیں۔ آب و ہوا لطیف اور پاک ہے اور بہتی ہوئی ندیاں بعض بڑے بڑے بازاروں کے پاس سے گزرتی ہیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب سایہ دار درخت ہیں جو نظر کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ دکانیں پختہ ہیں، بادشاہی محلات ہندوستان کے اور شاہی محلوں سے بہت زیادہ شان دار اور خوشنما بیان کیے جاتے ہیں۔"

فرشتہ آگرہ اور فتح پور سیکری کی رونق کو دیکھ چکا تھا۔ علاوہ ازیں بیجاپور کی شان و عظمت بھی اس کے پیشِ نظر تھی۔ اس لیے حیدرآباد کی نسبت اس کی تعریف و توصیف قطب شاہی بادشاہ کے نفیس مذاق اور عمدہ تعمیر کی اچھی دلیل ہے۔ تاریخ قطب شاہی کے مصنف نے محلات اور باغات کی جو بادشاہ نے نئے شہر میں بنائے تھے ایک طویل فہرست لکھی ہے۔ آب و ہوا کی لطافت اور منظر کی خوش نمائی کے خیال سے یہ عمارات زیادہ تر رود موسی کے کنارے تعمیر کی گئی تھیں جس کی متواتر طغیانیوں نے اُن کو بالکل نیست و نابود کر دیا! اور اب سوائے ان بیانات کے جو کتبِ تاریخ اور سیاحوں کے سفرناموں میں قلم بند ہیں کوئی دوسرا ذریعہ ان کی کیفیت معلوم کرنے کا باقی نہیں۔ تاریخ قطب شاہی میں سے یہاں دو محلوں کی کیفیت نقل کی جاتی ہے۔

خدا داد محل یہ سر بہ فلک قصر موسی ندی کے کنارے داد محل[1] کے قریب تعمیر ہوا تھا۔ آسمان کے سات طبقوں کی طرح رفعت کے لحاظ سے اس کے بھی سات درجے رکھے گئے تھے۔ سب میں بلند درجے کا نام الٰہی محل تھا اس سے اُتر کر محمدی محل تھا۔ محمدی محل کے نیچے حیدری محل تھا جس کی دیواریں تمام زرنگار تھیں اور رنگ برنگ کے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ حیدری محل کے زیریں حصے میں درجہ بدرجہ حسنی حسینی اور جعفری محل تھے۔ قصر کے تیار ہونے کے بعد بادشاہ نے بڑی دھوم سے جشن کیا۔ اعیانِ سلطنت اور فضلا و شعراء کو انعام و

---

[1] نوشیرواں عادل کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ اس نے مظلومین کی دادرسی کے لیے ایک زنجیر بارگاہِ خسروی میں لٹکا دی تھی جس کا ایک سرا بارگاہ سے باہر آویزاں رہتا تھا اور دوسرا سرا بادشاہ کے تخت سے بندھا ہوا تھا۔ جب کوئی فریادی دادرسی کے لیے زنجیر ہلاتا تھا بادشاہ کو خبر ہو جاتی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے بھی جس کو بے کسوں کی امداد کا بڑا خیال تھا ایک عالی شان محل تیار کرایا تھا اُس کے دروازے بازار کے رُخ رکھے تھے۔ حکم تھا کہ جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہو۔ بغیر دربانوں اور چوب داروں کی مزاحمت کے خود بادشاہ کی خدمت میں عرض کرے۔ اس قصر کا نام داد محل رکھا گیا تھا۔

واکرام سے سرفراز فرمایا۔ میر کی معین سبزواری نے جو تاریخ گوئی میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ عمارت کی تعریف میں ایک قصیدہ پڑھا تھا۔ جس کے آخری شعر سے تاریخ نکلتی ہے۔ **شعر**

تاریخ مرتب شد نقش کلکِ قضار

برلوحِ بقا بناء جاں بخش نوشت

فرانسیسی سیاح ٹیورنیر نے اس قصر کو دیکھا تھا اور اُسے بڑا تعجب ہُوا تھا کہ چھتیں باغوں کے بڑے بڑے تناور درختوں کا بوجھ جو مختلف طبقوں میں لگائے گئے تھے کیوں کر سہارے ہوئے تھیں۔

بارگاہِ خسروی

بارگاہِ شاہی کا طول ہزار گز کے قریب تھا۔ چاروں طرف عالی شان ایوان اور محرابیں تعمیر کی گئی تھیں۔ دولت خانہ خاص کا دروازہ شرقی جانب تھا اور ہند وضع کا بنا ہُوا تھا۔ دو رفیع الشان ستونوں پر جن کی بلندی بیس بیس گز تھی بارہ گز لمبی پتھر کی کڑی ڈال کر چوکھٹ قائم کی گئی تھی اور دروازہ کے بالائی حصہ میں نہایت بلند عمارت بنائی گئی تھی۔ دولت خانہ کے دروازہ کے سامنے نقار خانہ تھا۔ حکم تھا ہر روز اُمرا اور عمائد فوج اپنے جلو کے ہاتھیوں اور سپاہ کے ہمراہ مجرے کی غرض سے بارگاہ میں حاضر ہوں۔ اور خدم وحشم کو مناسب مقام پر چھوڑ کر تنہا آداب بجا لائیں۔ بادشاہی شکوہ ووقار کے خیال سے فیل خانۂ خاص کے بہت سے ہاتھی اور شاہی فوج کے ایک ہزار پیادے دو رویہ صفیں باندھے بارگاہ کے صحن میں حاضر رہتے تھے۔ ان کے علاوہ دو حبشی سرداروں کی ماتحتی میں کئی سو مُسلّح جوان پہرہ داروں کی حیثیت سے موجود رہتے تھے۔

بارگاہ کے صحن کے جنوبی جانب شاہی دفتر خانہ تھا۔ غرب میں جام دار خانہ اور شاہی کارخانوں کی عمارات تھیں شمالی جانب دولت سرا کا دوسرا دروازہ تھا۔ جس کے صحن میں عہدہ داران فوج وفیل خانہ اور اہلِ قلم کے لئے علیحدہ علیحدہ ایوان بنے ہوئے تھے۔ دولت سرا کے اندرونی حصہ میں کئی محل تھے۔ ان میں سے لعل محل، چندن محل اور گلگن محل ترک عرب اور دکنی سلحداروں کے لئے مخصوص تھے۔ ایک اور بلند ایوان تھا جس میں پرانے معتبر ملازم اور مقرب سلحدار حاضر رہتے تھے۔ اعیانِ سلطنت اور فضلاء کا مجمع سجن محل میں رہتا تھا۔ اس محل کے شرقی جانب ایک نہایت وسیع ایوان تھا جس کا طول سو گز سے کم نہ ہوگا۔ یہ نعمت خانہ کے نام سے موسوم تھا۔ ہر روز صبح و شام اہلِ مجلس میں سے دس ہزار آدمی بادشاہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔

افسوس ہے کہ دستبردِ زمانہ نے ان محلات کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ لیکن محمد قلی کی بنائی ہوئی عمارات کی شان وشوکت، مضبوطی واستحکام اور موزونی وتناسب کا اندازہ کرنے کے لیئے چارمینار اور چارکمان حیدرآباد میں اب تک موجود ہیں۔ یہ دونوں اپنی وضع کی عمارات میں نظیر نہیں رکھتیں۔ محمد قلی کا مقبرہ بھی جو گولکنڈہ میں واقع ہے نہایت خوشنما عمارت ہے۔ (ملاحظہ ہو تصویر نمبر(۱))۔ اس کے طرزِ تعمیر میں ہندو صنعت کا اثر نمایاں ہے۔

فنونِ لطیفہ کی سرپرستی

محمد قلی کو تعمیر کے شوق کے علاوہ دوسرے فنون کی بھی ترقی کا بہت خیال تھا۔ شعر وسخن کی طرف اس کی طبیعت خاص طور سے مائل تھی۔ چنانچہ خود بھی شعر کہتا تھا۔ ایک مبسوط دیوان جس میں اس کا اردو اور فارسی کلام درج ہے اب تک موجود ہے۔ میرے کرم دوست مولوی عبدالحق صاحب نے اسی مضمون میں علیحدہ محمد قلی کے کلام پر بحث کی ہے۔ شاعری کے علاوہ خوش نویسی کا بھی اس بادشاہ کو بڑا شوق تھا۔ نستعلیق اور نسخ کے استاد ایران اور عراق سے آکر جمع ہوگئے تھے۔ ان کے خطوط کے اصلی نمونے حیدرآباد کی عمارات کے کتبوں میں اب تک موجود ہیں۔ چنانچہ جامع مسجد کے بیرونی دروازہ کا کتبہ خطِ نستعلیق میں بے مثل ہے اور اسی مسجد کی محراب کا کتبہ خط نسخ کا عمدہ نمونہ ہے۔ خوش نویسی کی تاریخ میں یہ میر عماد قزوینی کا زمانہ تھا۔ نستعلیق خط اوجِ کمال پر تھا۔ حروف کی نشست قلم کا زور اور ہاتھ کی صفائی دیکھنے کے قابل ہے[۱]۔

علم وفضل اور مذہبی تحریکات

علم وفضل اور مذہبی تحریکات کے لحاظ سے بھی یہ زمانہ بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔ اکبر کے عہد کے علماء کا حال اور خلوت خانہ کے مذہبی مناظروں کے قصے خلائق میں مشہور ہیں۔ ایران میں شاہ عباس کو مذہبِ اثنا عشری کا بڑا پاس تھا۔ دربار میں میر باقر داماد، شیخ علی نقی کمرہ، بہاء الدین عاملی، ابن حیدر خوانساری، میرزا جلال اسیر، کوثری مولانا شانی کی صحبت رہتی تھی۔ شیعی شریعت کی بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ایک مرتبہ مولانا شانی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں قصیدہ پڑھا۔ بادشاہ اس قدر محظوظ ہوا کہ مولانا کو سونے میں تلوا کر وہ رقم ان کو انعام میں دے دی۔ دکن کے سلاطین ابتدا سے جعفری مذہب کے حامی رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایران سے علماء کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ چنانچہ محمد قلی کے عہد میں شیعہ عقائد کو خوب رواج ہوا۔ حیدرآباد کر اس

۱؎ جامع مسجد حیدرآباد کے کتبے رسالہ ایپی گریفیا انڈیکا بابت ۱۹۱۵-۱۶ء میں شائع ہوچکے ہیں قدیم خطاطی کے دل دادہ ان کو دیکھ کر ضرور محظوظ ہونگے۔

زمانہ کے علما میں میر محمد مومن استرآبادی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ میر صاحب صفوی دربار میں کئی برس تک شاہزادہ حیدر میرزا کے اتالیق رہ چکے تھے۔ علم و فضل کے علاوہ، بڑے زاہد اور متقی تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور وکیل السلطنت کے جلیل القدر عہدہ پر مقرر کیا۔

لباس اور حلیہ

متحف برطانیہ (برٹش میوزیم) میں سلطان محمد قلی کی ایک قلمی تصویر موجود ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو بادشاہ کے لباس اور خد و خال کے متعلق رائے پیش کرنے کی گنجائش ہے (تصویر نمبر۲)۔

چار پشت کی دکن کی بود و باش اور موسم کے اختلاف نے تاتاری لباس کو بالکل اُتروا دیا ہے۔ سر پر سمور کی کلاہ کی بجائے دکھنی وضع کی پیچ دار پگڑی ہے۔ بڑے کی پوستین اور باناتی قبا کے عوض ململ کا جامہ اور شبنم کا نیمہ زیبِ بدن ہے۔ ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے ہیں۔ داڑھی صاف ہے۔ اور چہرے مہرے سے تعیش کے آثار نمایاں ہیں۔

اعیان سلطنت میر جملہ

شخصی حکومت میں بھی کامیابی کا انحصار بہت کچھ اعیانِ سلطنت کی قابلیت پر ہے۔ لیکن ایشیائی ممالک میں جہاں دربار میں خوشامدیوں کا مجمع رہتا تھا اور روزمرہ سازشیں ہوتی رہتی تھیں لائق وزرا، اور جاں نثار عمائد کا انتخاب سہل کام نہ تھا۔ اکبر کے بعض مورخ اس کے نورتن کی تعریف میں جادۂ اعتدال سے گزر گئے ہیں اور اس حقیقت کو بالکل بھول گئے کہ بغیر اکبر کی دانشمندی اور ملکۂ مردم شناسی کے نورتن جمع نہ ہوتے اور جو نمایاں کام اُنھوں نے کیے وہ ایک بھی بن نہ پڑتا۔ سلطان محمد قلی بھی بڑا مردم شناس بادشاہ تھا۔ اِس کے عہد کے ایک وزیر میر محمد مومن استرآبادی کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ ایک اور رکن سلطنت جس کا حال بیان کرنے کے قابل ہے۔ میرزا محمد امین جو تاریخ میں میر جملہ[۱] کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کاردان وزیر نے اول مالیات کے ضوابط کو جو دکنی پنڈتوں کے داؤ گھات کی وجہ سے دامِ عنکبوت سے بھی زیادہ پیچیدہ ہو گئے تھے صاف کیا اور گو سوریا راؤ[۲] معتمد مالیہ نے بہت سی گلچھٹیاں ڈالیں لیکن میر جملہ کے مقابل میں اس کی کوئی ترکیب پیش نہ گئی۔ سلطنت کے اندرونی معاملات کی اصلاح کے بعد میر جملہ نے سرحد کے علاقے کے نظم و نسق کی طرف توجہ کی۔ اور کئی مہموں میں سپہ سالار کی حیثیت سے خود بھی شریک ہُوا۔ قلمرو کے

۱؎ میر جملہ یا امیر جملگی وکیل السلطنت کی شان وزارت کا خطاب تھا۔

۲؎ سوریا راؤ غیر معمولی طور سے ذہین تھا اور علم سیاق میں ماہر ہونے کے علاوہ بے بدل نشی تھا۔

تصویر ۲



شبیه سلطان محمد قلی قطب شاه پنجمین فرمانروای سلسلهٔ قطب شاهیه

جنوبی حصّہ میں کڑپہ اور کرنول تک جو ملک فتح ہوگیا تھا۔ وہ میر جملہ کے حسنِ انتظام سے مستقل طور سے قبضہ میں آگیا۔ سلطان محمد قلی کے عہد کے آخر میں میر جملہ نے بستر کے راجہ کی سرزنش کے لیئے لشکر کشی کی اور منگورا ور مندلیر میں مستحکم قلعے بنانے کے بعد مہینہ بھر تک راجہ کے ملک کو پائمال کرتا ہُوا آخر دارالخلافہ میں پہنچ گیا۔ اس مہم میں گو قطب شاہی فوجوں کو آخر میں پس پا ہونا پڑا۔ اور راستہ میں بڑے بڑے دریا عبور کرنے پڑے۔ لیکن میر جملہ کے استقلال اور تدابیر کی بدولت لشکر کو زیادہ گزند نہ پہنچا۔

بیرونی تعلقات شاہان سلسلۂ صفویہ کو اوّل تو آل عبا ہونے کا فخر حاصل تھا۔ دوسرے ان کے اسلاف میں کئی پشت تک بڑے بڑے پایہ کے بزرگ گزرے تھے۔ چنانچہ ان میں شیخ صفی الدین اردبیلی کا نام خاص طور سے مشہور رہے۔ قطب شاہی خاندان کے بادشاہ سلاطین صفویہ کا ہم عصر فرماں رواؤں کی حیثیت سے احترام کرنے کے علاوہ مذہبی نقطہ نظر سے بھی بڑا ادب کرتے تھے۔ سلطان قلی بانیِ خاندان قطب شاہیہ نے خطبہ میں شاہ اسمٰعیل صفوی کا نام اپنے نام سے قبل ارادت مندی کے اظہار کے لیئے داخل کر دیا تھا۔ اس عقیدت کی وجہ سے رسل و رسائل کا سلسلہ دونوں خاندانوں میں ابتدا سے جاری تھا۔ سلطان محمد قلی کے عہد میں شاہ عباس صفوی نے اپنے خاندان کے ایک معزز شاہزادے اغزلو سلطان کو ایلچی کی حیثیت سے قطب شاہی دربار میں بھیجا۔ مؤرخین نے ان تحائف کی جو ایلچی اپنے ساتھ لایا تھا مفصل کیفیت بیان کی ہے۔ بیش قیمت اشیا میں موتیوں کا ایک نہایت خوب صورت تاج تھا۔ جس کی چمک دمک کے سامنے آنکھ نہ ٹھیرتی تھی۔ ایک مرصع خنجر تھا جس کا دستہ اور نیام قیمتی جواہرات سے مزین تھا۔ چالیس عربی نژاد گھوڑے تھے جن پر زربفتی زین پوش پڑے ہوئے تھے اور زین اور لگامیں تمام زریں تھیں۔ سلطان محمد قلی نے بھی ایلچی اور اُس کے رفقا کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ سب کو خلعتِ فاخرہ عنایت کیئے اور طرح طرح کے انعام و اکرام سے مہمانوں کے دل کو موہ لیا۔ کہتے ہیں کہ شاہ عباس نے ایلچی کی زبانی محمد قلی کی بیٹی کا پیغام بھی بھیجا تھا۔ کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ صفوی خاندان کے کسی شہزادے کے ساتھ اس لڑکی کا عقد ہو کر دونوں سلطنتوں میں دوستی اور یگانگت زیادہ استوار ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت محمد قلی کو شاہ عباس کی تائید کا ضرور خیال تھا۔ اکبر کے جد اعلیٰ تیمور کی یورشوں سے قطب شاہیوں کے اسلاف آذربائیجان میں کئی مرتبہ جلا وطنی کی تکالیف بھگت چکے تھے اِس زمانہ میں بھی مغلیہ سلطنت کا دکن کے الحاق کا

منصوبہ محمد قلی کے لیئے دل خوش کن نہ تھا۔ برار اور احمد نگر فتح ہو چکے تھے۔ اور ست پوڑہ کی چوٹیوں پر شاہی فوجیں منڈلا رہی تھیں جن کی عقاب آسا نگاہیں اس تاک میں تھیں کہ شکار کو غافل پائیں تو کندے جوڑ کر ٹوٹ پڑیں۔

شاہ عباس کے ایک خط سے جو سلطان محمد قلی کے بھتیجے محمد قطب شاہ کے نام ہے، یہ بات صاف مترشح ہے۔ کہ محمد قلی اپنی سیاسی مشکلات کی اطلاع صفوی بادشاہ کو دیتا رہتا تھا۔ چنانچہ خط میں لکھا ہے کہ :-

"سلطان محمد قلی نے جو واقعات محمد قنبر علی کی زبانی کہلا کر بھیجے تھے ہم کو معلوم ہوئے۔ مکران اور کچھ (کچھ) کا علاقہ فتح ہو گیا ہے۔ اب خشکی کے راستے سے آمد و رفت میں سہولت رہیگی اور رسل اور رسائل کے پہنچنے میں زیادہ تاخیر نہ ہوگی"

وفات | اکتیس برس تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد سلطان محمد قلی نے ۱۰۲۰ھ ہجری (مطابق ۱۶۱۱ء) میں وفات پائی اور اپنے واقعاتِ زندگی سے متقدمین کے لیئے زندہ دلی اور فیاضی انصاف اور رعایا پروری[1]، علم دوستی اور مردم شناسی کی عمدہ مثال چھوڑ گیا۔

حیدر آباد
۷ ستمبر ۱۹۲۱ء

غلام یزدانی

---

[1] مورخین کا بیان ہے۔ اس بادشاہ نے خود کبھی قتل کا حکم نہ دیا۔ ایسے مقدمات ہمیشہ دار القضاء کے سپرد کر دیتا تھا۔ صلۂ رحمی کا بھی اسے بہت خیال رہا۔ چنانچہ اپنے بھائیوں پر کسی قسم کا ظلم تشدد روا نہ رکھا۔ اور مناصب جلیلہ عطا کیئے۔ ہندو عہدہ داروں پر اعتبار کرتا تھا۔ چنانچہ بہت سی سرحدی مہمات ان کے سپرد کیں۔

جُزوِدُوُم۔ اَدَبْ

کلامِ سلطان محمد قلی قطب شاہ

از

جنابِ مولوی عبدالحق صاحب بی اے آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو

اُردو نے اگرچہ شمالی ہند یعنی گنگا جمنا کے دوآبے میں جنم لیا۔ لیکن وہ بات چیت، کام کاج، سودا سلف تک محدود رہی۔ اہلِ علم نے اُسے کبھی مُنہ نہ لگایا اور اس لیئے اُس نے تقریر سے نکل کر تحریر کی کھکھیڑ نہ اُٹھائی۔ سب سے اوّل ادبی صُورت اس نے دکن میں حاصل کی اور دکنی کہلائی۔ اور گردہِ عوام سے نکل کر مجالس خواص میں آئی۔ شعرائے دکن جن کی تخیل کی جولانگاہ فارسی زبان تھی، اب اس نئی زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ جب تک اُردو زبان زندہ ہے دکن کو اس کا فخر حاصل رہیگا اور اُردو زبان کی کوئی تاریخ اس تذکرہ سے خالی نہوگی۔

اس امر کو ہمارے ہاں کے اساتذہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

قائم کہتے ہیں ؎

قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　　اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

اِس میں دکنی زبان کی اس قدر تنقیص مقصود نہیں جس قدر اپنی تعلّی منظور ہے۔

ایک جگہ میر صاحب نے دکن میں اپنے شعر کی شہرت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

سرسبزِ ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ — ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکھن کے بیچ

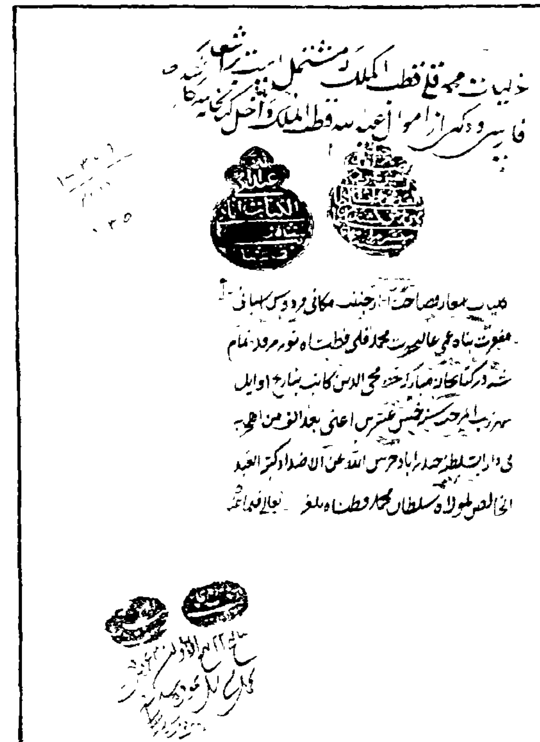
ایک زمانہ تک یہ خیال رہا کہ ولی اُردو کا پہلا شاعر ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ثابت ہُوا۔ مگر تعجب ہے کہ باوجود غلطی تسلیم کرنے کے اب بھی بعض تذکرہ نویس ولی کو اُردو شاعری کا آدم کہتے ہیں۔ معلوم نہیں آدم سے اُن کا کیا مطلب ہے۔ اگر آدم سے مطلب وہ پہلا انسان ہے جو تمام بنیِ نوعِ انسان کا مورثِ اعلیٰ ہے تو یہ خیال صریحاً غلط ہے کیوں کہ ولی سے بھی پہلے دکن میں اُردو کے شاعر ہوئے ہیں۔ اور اگر آدم سے وہ پہلا انسان مراد لیا جائے جس کا علم ہمیں پہونچا ہے (گو ممکن ہے کہ اس سے قبل بھی انسان ہوئے ہوں مگر ہمیں اُن کا علم نہیں) تو بھی یہ خیال صحیح نہیں، کیوں کہ ولی سے پہلے جو شاعر ہوئے ہیں ہمیں اُن کا علم ہے اور اُن کا کلام بھی موجود ہے۔ غرض اس خیال کی نوبت عقیدہ تک پہنچ گئی ہے کہ جاننے اور سمجھنے کے بعد بھی قلم اور زبان سے نکل جاتا ہے۔

اِس کے بعد ایک دوسرا خیال قائم ہُوا۔ جو اب تک صحیح سمجھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگرچہ ولی اُردو کا پہلا شاعر نہیں ہے تاہم وہ پہلا شخص ہے جس نے غزل کو فارسی رنگ میں لکھا ہے اور جس نے اپنا دیوان فارسی دیوانوں کے طرز پر ردیف وار مرتب کیا ہے۔ تحقیق نے جو غلطی کی گھات میں لگی رہتی ہے، پھر اس خیال کو نہ چلنے دیا۔ معلوم ہُوا کہ ولی سے پہلے بھی شعرائے دکن نے اسی رنگ میں غزلیں لکھی ہیں اور مروّجہ طرز پر ردیف وار اپنے دیوان مرتب کیے ہیں۔

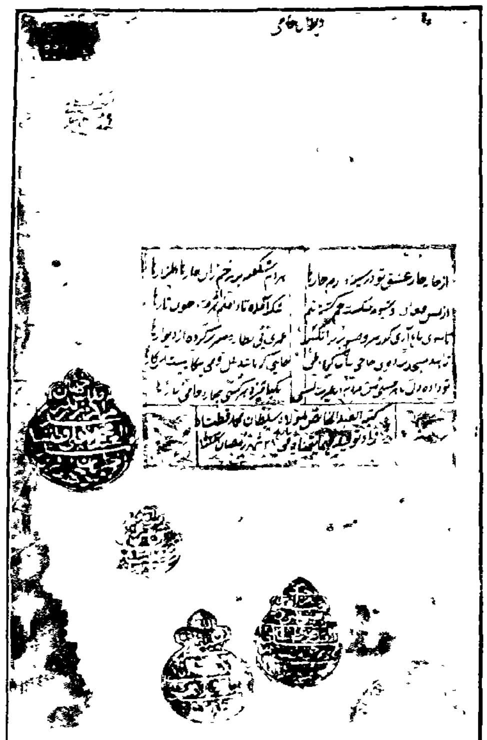
اس کا بیّن ثبوت سلطان محمد قلی قطب شاہ کی کُلیات ہے۔ جسے آج ہم ناظرینِ اُردو سے روشناس کرنا چاہتے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ دسویں صدی ہجری کا شاعر اور اکبر کا ہم عصر ہے۔ جہاں تک تحقیق نے رسائی کی ہے یہ کلام اُردو میں سب سے قدیم ہے۔ بعض مذہبی مثنویاں اِس سے پہلے کی بھی پائی جاتی ہیں، لیکن تغزل کے کوچے میں کسی دوسرے مسافر کا پتہ اب تک نہیں لگا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی کلام اُردو کا نہیں ہے۔ اِس حد تک پہونچنے کے لیے ضرور ہے کہ اس سے پہلے بہت سے عاشق مزاجوں اور موزوں طبع لوگوں نے مصرِ شعر کی کوچہ گردی کی ہو۔ اور اپنی مشاقی اور طبع آزمائی سے غزل، مثنوی، قصیدے اور دیگر اصنافِ سخن کو اس درجہ تک پہونچایا ہو جو ہم محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں دیکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اُن قابلِ قدر بزرگوں اور اُردو کے سچے محسنوں میں سے کسی کا کلام اب تک دستیاب نہیں ہُوا۔ ممکن ہے کہ آیندہ جستجو اُنھیں ڈھونڈھ نکالے

(الف) تحریر سلطان محمد قطب شاه بر سرورق دیوان عم بزرگوارش سلطان محمد قلی قطب شاه



(ب) تحریر سلطان محمد قطب شاه بر سرورق قلمی نسخهٔ دیوان جامی علیه الرحمه



اور ہمارے علم و تحقیق میں اضافہ کرے۔

وہ وقت بھی کیسا عجیب اور پُر اسرار ہوگا جب کہ زبان پہلی بار تقریر سے نکل کر تحریر میں سماتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ کوئی لڑکپن سے نکل کر بلوغت کی سرحد میں اول قدم رکھتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وقت کب آیا۔ خود اُسے بھی نہیں معلوم ہوتا جس پر یہ گزرتی ہے۔ وہ عجیب آن ہے جو نہ دیکھنے میں آسکتی ہے نہ بیان میں سما سکتی ہے۔ بعینہ یہی حال زبان کا ہے وہ آوازیں جو پہلی بار حروف میں منتقل ہوئیں ہمیشہ سے نظر سے پوشیدہ رہنگی لیکن زبان کا مؤرخ اس سے مایوس نہیں ہوتا۔ اگر نقشِ اوّل نہیں تو نقشِ ثانی تو کہیں ضرور مل رہیگا۔ ایک زمانہ وہ بھی ہوتا ہے کہ یہ دل کش انسانی آوازیں سینوں میں محفوظ رہتی ہیں اور ارثاً ایک نسل سے دوسری نسل کو پہونچتی ہیں۔ لیکن اُردو کو وہ بھی نصیب نہیں ہُوا۔ کیونکہ گیتوں کی زبان اُردو نہیں۔ اس لیئے ابتدائی اُردو سینوں میں نہیں سفینوں میں تلاش کرنی پڑے گی۔ چنانچہ دسویں صدی ہجری کی زبان کا پتہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام سے لگتا ہے۔

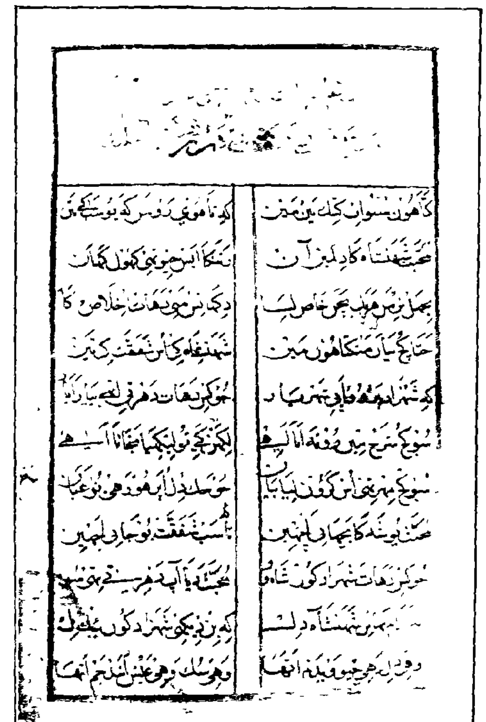
یہ کلیات ایک نہایت قابل قدر اور نادر نسخہ ہے بڑی تقطیع اور اعلیٰ درجہ کے قدیم کاغذ پر بخط نسخ بہت خوش خط لکھا ہُوا ہے۔ کتاب بہت ضخیم ہے تقریباً اٹھارہ سو صفحہ ہونگے۔ اسے محمد قلی قطب شاہ کے جانشین اور بھتیجے محمد قطب شاہ نے بڑے اہتمام اور خلوص سے ترتیب دیا ہے۔ یہ نسخہ شاہی کتب خانہ کا ہے اور سرورق پر خود محمد قطب شاہ کے قلم کی لکھی ہوئی تحریر ہے (ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۳)۔ دونوں چچا بھتیجے صاحب علم، صاحبِ ذوق اور صاحبِ دیوان ہوئے ہیں۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ محمد قطب شاہ کی عادت تھی کہ کتاب پڑھنے کے بعد اُس پر ضرور کچھ نہ کچھ اپنے قلم سے لکھ دیتا تھا۔ چنانچہ اسی تصویر میں کلیات جامی پر اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشعار کا فوٹو دیا گیا ہے۔ دونوں تحریروں کا ایک خط اور ایک قلم ہے۔ اس تحریر کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ فوٹو میں درج ہے اور اگرچہ عکس اصل سے چھوٹا ہے تاہم عبارت صاف پڑھی جاتی ہے۔ اس تحریر کے اوپر ورق کے سرے پر جو عبارت لکھی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خاص کتب خانہ شاہی کا ہے۔ ان دو عبارتوں کے درمیان محمد قطب شاہ کی مُہر ہے۔ مہر کی تحریر پڑھنا ذرا مشکل ہے اس لیئے وہ نقل کی جاتی ہے:-

مُہرِ سلیمان زحق گشتہ میّسر مرا   گشت ز نقشِ نگیں حیدرِ صفدر مرا

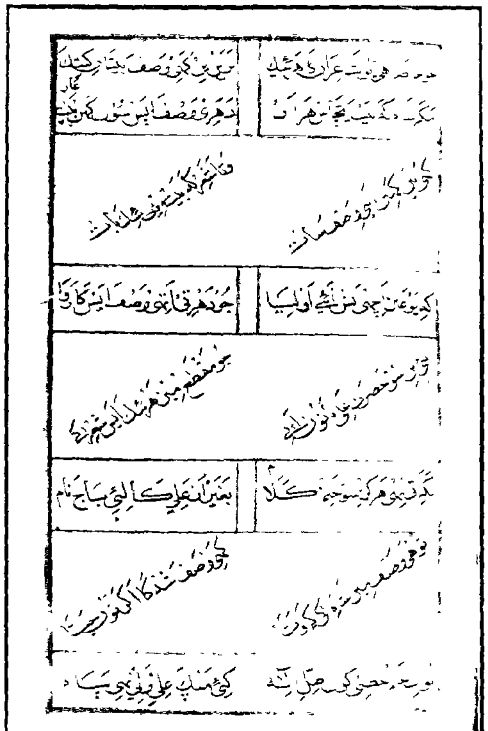
اور ان دونوں مصرعوں کے بیچ میں "العبد سلطان محمد قطب شاہ" لکھا ہے۔ صفحہ کے آخر میں بائیں طرف کتب خانہ میں داخلہ کی تاریخ ہے اور اسی کے نیچے "تحویل نبی لعل نمودہ شد" تحریر ہے۔ اور اس کے نیچے خفی قلم سے "باقی الحال تحویل شمس الدین نمودہ شد" لکھا ہے۔ صفحہ کے اوپر کے حصے میں مہروں کی بائیں جانب کتب کی تعداد بھی درج ہے جس سے کتب خانہ کی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ کتب خانوں کی رونق صرف کتابت کے فنِ شریف پر منحصر تھی۔ کتابت کا سنہ خود قطب شاہ نے اپنی تحریر میں ۱۰۲۵ھ ہجری بتایا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اورنگ زیب نے حیدرآباد فتح کیا تو شاہی کتب خانے سے بعض کتابیں بھی دوسرے مال غنیمت کے ساتھ دلی چلی گئیں۔ اور وہاں کے شاہی کتب خانہ میں داخل ہوئیں۔ اور جب دلی پر آفت آئی اور وہاں کا کتب خانہ برباد اور غارت ہوا تو یہ کتاب پھرتے پھراتے کلکتہ پہونچی اور کلکتہ سے آخر پھر اپنے اصل مقام یعنی حیدرآباد پہنچ گئی۔ صفحہ کے شروع میں جو یہ عبارت لکھی ہے "غزلیات محمد قلی قطب الملک کہ مشتمل است بر اشعار فارسی و دکنی از اموال عبداللہ قطب الملک در حیدرآباد داخل کتب خانہ سرکار شد"۔ اس کی شان تحریر سے صاف ٹپکتا ہے کہ یہ فدویانِ شہنشاہِ دہلی کی تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اور سرکار سے مراد سرکار شاہانِ مغلیہ ہے۔ حیدرآباد کی سرکار میں کوئی شخص محمد قلی قطب الملک اور عبداللہ قطب الملک کے نام بغیر آداب و القاب کے اِس طرح بے تکلفی سے نہیں لکھ سکتا تھا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ باوجود ان حوادث و انقلابات کے یہ کتاب صحیح سالم بچ گئی اور پھر وہیں آگئی جہاں سے گئی تھی۔

کتاب کے بے بہا، نادر اور مستند ہونے میں مطلق کلام نہیں ہو سکتا۔ صحت کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک کتابت میں صحت کا امکان ہو سکتا ہے اس کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ خط بے نظیر ہے مگر نسخ ہے۔ کاتب نے بے شک۔ لکھنے میں اپنا کمال دکھایا ہے لیکن یہ بزرگ عربی خط لکھتے لکھتے یہ بھول گئے کہ یہ ہندی کتاب ہے اور ہندی میں بعض حروف ایسے ہیں جو عربی میں نہیں اور جن کے ظاہر کرنے کے لیئے خاص علامتیں ہیں۔ چنانچہ وہ بعض وقات ڈ اور د، ڑ اور ر، چ اور ج، گ اور ک اور پ اور ب میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ ہندی کتاب کو نسخ میں پڑھنا ویسے بھی مشکل ہے اور جب رسم الخط کی دشواری بھی ہو تو مشکل اور بڑھ جاتی ہے۔ پھر جگہ جگہ دو لفظوں کو ملا کر اس طرح لکھ دیتا ہے کہ بغیر غور و فکر کے اس قسم کے لفظ صحیح نہیں پڑھے جاتے۔ اوّل تو زبان قدیم اور اس پر خط اور طرز تحریر

(الف) آغاز دیباچۂ منظوم محمد قطب شاہ بہ دیوان دم محترمش سلطان محمد قلی قطب شاہ



ب) اختتام دیباچہ



کی وقت، اِس لیئے جب تک پہلے سے کوئی زبان سے واقف نہ ہو اس کا صحیح پڑھنا آسان کام نہیں۔

ہندوستان ہمیشہ سے پائمال السنہ رہا ہے، سنسکرت سے لے کر انگریزی تک کوئی نہ کوئی غیر زبان اس پر مسلط رہی۔ محمد قلی قطب شاہ کی حکومت گول کنڈہ میں تھی جہاں کی سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی اور رعایا کی زبان تلنگی۔ یہی حال عادل شاہیوں کا بیجاپور میں تھا کہ ملک کے آس پاس کی زبان کنڑی تھی۔ یہ دونوں زبانیں دراوڑی ہیں اور انہیں آریائی زبانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیئے ظاہر ہے کہ اس ملک میں جب اُردو نے ادبی صورت اختیار کی تو اُس کے خط و خال کیا ہونگے۔ تلنگی اور کنڑی دونوں اجنبی اور غیر مانوس، ان سے کسی قسم کا میل ہو ہی نہیں سکتا۔ لامحالہ فارسی کا رنگ اس پر چڑھ گیا۔ اوّل تو فارسی آریائی، دوسرے صدہا سال کی یکجائی، دونوں ایسی گھل مل گئیں جیسے شیر و شکر۔ تمام اصناف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، رباعی، غزل اُردو میں بھی بلاتکلف آ گئے۔ الفاظ، تشبیہات، استعارات بنے بنائے تیار مل گئے۔ الفاظ کے ساتھ خیالات بھی داخل ہو گئے اور قصیدے، مثنوی، رباعی اور غزل میں وہی شان آ گئی جو فارسی میں پائی جاتی ہے۔ لیکن سب سے بڑا انقلاب جس نے اُردو ہندی میں امتیاز پیدا کر دیا۔ وہ یہ تھا کہ عروض میں بھی فارسی ہی کی تقلید کی گئی ہے اور بغیر کسی تغیر و تبدل کے اُسے اُردو میں لے لیا۔ فارسی نے اسے عربی سے لیا تھا، اُردو کو فارسی سے ملا۔ اگر اُردو (ریختہ) کو ادبی نشو و نما دکن میں حاصل نہ ہوئی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ بجائے فارسی عروض کے ہندی عروض (پنگل) ہوتا۔ کیوں کہ دوآبہ گنگ و جمن میں آس پاس ہر طرف ہندی تھی اور ملک کی عام زبان تھی۔ برخلاف اس کے دکن میں سوائے فارسی کے کوئی اس کا آشنا نہ تھا۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ فارسی اس پر چھا گئی۔ ورنہ یہ جو تھوڑا سا امتیاز اُردو ہندی میں پایا جاتا ہے وہ بھی نہ رہتا۔ اور غالباً یہ اُردو کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔

میں نے ابھی یہ لکھا ہے کہ اس کلیات کے شروع میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین سلطان محمد قطب شاہ نے ایک منظوم دیباچہ لکھا ہے۔ اس دیباچہ میں اوّل اس نے یہ بتایا ہے کہ ان نظموں کو کس ترتیب سے درج کیا گیا ہے۔ یعنی اوّل مثنویاں پھر قصیدے، اس کے بعد ترجیع بند، ترجیع بند کے بعد فارسی مرثیئے، اُس کے بعد دکھنی مرثیئے۔ دکھنی مرثیوں کے بعد فارسی غزلیں، فارسی غزلوں کے بعد دکھنی غزلیں، اور سب سے آخر میں رباعیات۔ اِس نے بعد وہ کہتا ہے ؎

بجد ہو کے طلّ الٰہی نوشت پرے شعر تا پائیں کر خط سگل

آپس دل میں کر فکر سب ایک رات — کیٔے خطبہ کہہ مستعد کلیات
جو الحق سنے کوئی اگر یو زباں — تو در حال کیں[1] مرحبا بے گماں
سو یکچ شاعری بیچ شہ و ہر کمال — سخن[2] کہہ کہ موتیاں تن[3] صد ڈھال
کہے نیں[4] کہیں شعر میں وصف اپس[5] — جو اچہ شعر کے فن میں اتیا[6] سرس[7]
جو بھی کوئی اچھے شاعر اس ڈھاؤ[8] — تو بن وصف اپس کے نئیں[9] ستاو
اگر کم تو پچاس میں بیت چار — کہے باج اپس وصف سیتی سنگھار
رہیا جائے نا شاعراں منیں — بن آتے[10] کہے صفت شعر کے فن منیر
جو خاصا ہی یو شاعراں کا ہر یک — نرین بن کہے وصف بتیاں کتک
اگر شاہ کہہ بیت پچاس ہزار — دھرے وصف آپس سوں کہن بیت چار
دتا[11] شعر کہہ بیت میں نیک بات — کہی نین کہیں آپنے وصف سات
جو مقطع میں ہر یک اپس شعر کے — لیٔے بن سو حضرت علی ناؤں[12] اپے
نہ کرتے تھے ہرگز سو ختم کلام — بغیر از علی کا لیٔے باج نام
کہے وصف شہ کا اگر تو جتا[13] — تو ہر وصف میں شاہ کے کم وتا
تو اب ختم خطبے کوں ظلّ اللہ — کیٔے منگ[14] علی ولی تے پناہ

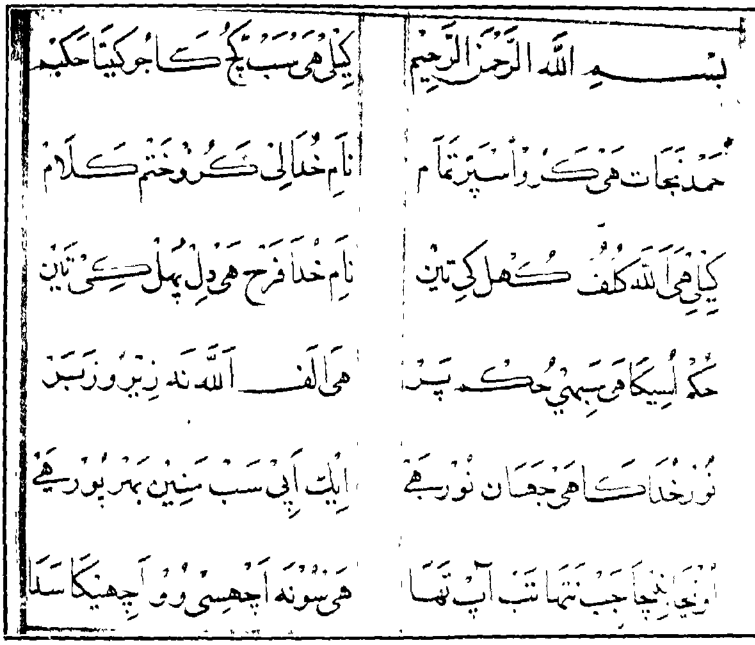
ظلّ اللہ، محمد قطب شاہ کا تخلّص ہی۔ اس مقدمے سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے پچاس ہزار شعر کہے ہیں۔ اور علاوہ فارسی اور دکھنی کے تلنگی میں بھی اُن کا کلام ہی۔ یہ بھی صحیح ہی کہ وہ کہیں شاعرانہ تعلّی نہیں کرتے اور مقطع میں ہمیشہ تبرکاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام لاتے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ تاریخ میں خاص امتیاز رکھتا ہی۔ خاص کر شعر و شاعری کے چرچے ایران

---

[1] کہیں [2] کلام [3] مانند [4] نہیں [5] اپنا [6] اتنا [7] کمال [8] ہویا رہے [9] قسم، طرح [10] نہ رہے [11] کے [12] اتنا [13] نام [14] جتنا [15] مانگ

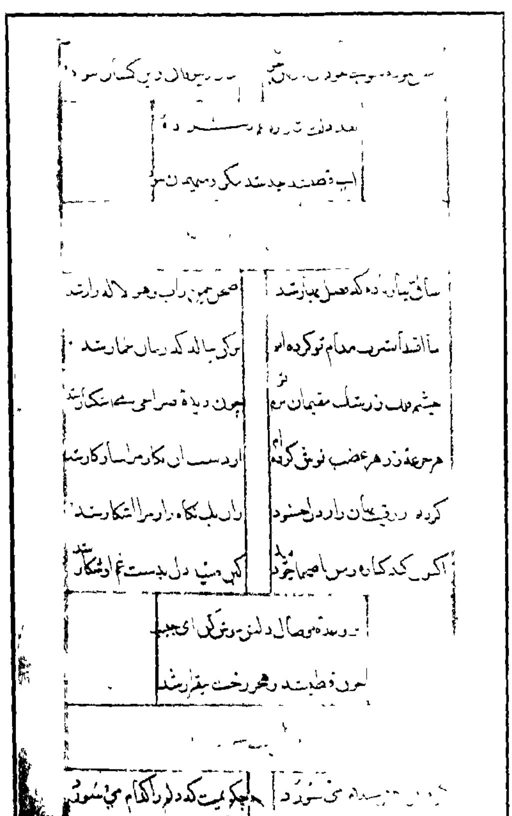
تص

(الف) ابتداء دیوان سلطان محمد قلی قطب شاہ



بسم الله الرحمن الرحیم | کیتی هی سب تج کا جو کیتا حکیم
حمد نجات هی کر واسیتر تمام | انام خدائی کر ختم کلام
کیا هی الله کلف کھل کی تاین | نام خدا فرح هی دل پهل کی تاین
حکم اسیکا هی سبهی حکم پر | هی الف الله نه زیر و زبر
نور خدا کا هی جهان نور بهے | ایک اپی سب تنین بهر پور رهے
اونچی بنچا جب تنها تب آپ تها | هی سونه اچهی وو اچهنکا سدا

(ب) غزلهای فارسی از دیوان سلطان ممدوح



سے لے کر ہندوستان تک یکساں تھے بلکہ ہندوستان کا قدم کچھ آگے ہی تھا۔ شعر و سخن ہماری معاشرت و اخلاق ور ہمارے علم و فضل کا بہت بڑا جز تھے اور ہر شخص جو شرافت کا دعویٰ رکھتا تھا، شعر و سخن کا بھی مدعی تھا۔ شمال میں اکبر کے دربار میں ابوالفضل جیسے اعلیٰ انشا پرداز اور فیضی و عرفی سے زبردست شاعر موجود تھے جن کا کلام ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔ اکبر نے ہندی کی بھی سرپرستی کی اور بیربر، تان سین اور خانخاناں کا ہندی کلام اب تک موجود اور مروج ہے۔ شاہانِ دکن نے فارسی کے ساتھ ساتھ دکنی (قدیم اُردو) کی بھی ویسی ہی قدر دانی کی جو قدیم اُردو کے ابتدائی عروج کی پہلی بنیاد ہے۔ ہمارے بادشاہ صرف شعر و سخن کے قدر دان و سرپرست ہی نہیں تھے بلکہ خود بھی شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے۔ اکبر اگرچہ اُمی تھا مگر اس سے بھی بعض شعر منسوب کئے جاتے ہیں۔ یہی حال دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں کا تھا۔ تاریخوں میں ان بادشاہوں کے نام سے بھی اشعار درج ہیں۔ لیکن ان   میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نمبر سب سے اول تھا۔ اس کے کلام کا مجموعہ اس قدر ضخیم ہے کہ بادشاہ شاعر تو کیا پیشہ ور شاعر بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

جو لوگ فارسی شاعری کے دلدادہ ہیں اور جن کے ذوق کی بنیاد ایرانی شاعری اور بعد کے اُردو کلام پر ہے، انہیں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں خیالات کی جدت، استعارات و تشبیہات کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی، بندش کی چستی نظر نہیں آئیگی۔ نہ انہیں الفاظ کی نشست اور ان کی باہمی ترکیبوں میں کوئی خوبی معلوم ہوگی۔ اور نہ طرزِ ادا میں (جس پر کلام کی خوبی کا بہت کچھ انحصار ہے) کچھ زیادہ لطف آئیگا۔ اس میں سرتاسر شاعری کا قصور نہیں، پڑھنے والے کا بھی ہے۔ اس کے پڑھتے وقت یہ بات نظر انداز نہیں کر دینی چاہیئے کہ یہ اُردو کا قدیم اور ابتدائی کلام ہے جس کے قبل کا کوئی کلام ہمارے پاس نہیں ہے اور اگر ایک آدھ چیز ہے بھی تو وہ بھی کم و بیش ایسی ہی ہے۔ دوسرے اس کی زبان اُس وقت کی ہے جب کہ اُردو نے میدانِ ادب میں پہلا قدم رکھا ہے۔ اس لئے نہ صرف زبان کی صورت شکل میں ہی فرق ہے بلکہ طرزِ ادا میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ دکن میں ہندی نے جب ادبی صورت اختیار کی تو فارسی کے سانچے میں ڈھل گئی، لیکن بہت سے ہندی الفاظ اور ہندی ترکیبیں اور بعض ہندی خصوصیتیں ویسی ہی باقی رہیں۔ اُس وقت کے ادیب اور شاعر نے دو دریاؤں کو جو مختلف سمت میں بہ رہے تھے ایک نہر کھود کر لا ملایا اور یہی وجہ ہے کہ اُس وقت کی زبان میں گنگا جمنی ترکیبوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور ایرانی عشق کے

پہلو بہ پہلو ہندی پریم کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ صورت ایک ہی مگر جلوے دو ہیں؛ بات ایک ہے مگر مزے دو ہیں۔ بعد میں جو ادیب اور شاعر آئے جو مئے شیراز کے متوالے تھے، انہیں جو چیزیں اجنبی اور غیر مانوس اور اپنے ذوق کے خلاف نظر آئیں، وہ اُنھوں نے چُن چُن کر پھینک دیں اور بجائے ہندی کے فارسی عنصر غالب آگیا اس میں وؔلی اور اس کے ہم عصر بھی ایک حد تک قابل الزام ہیں۔ اس زمانہ میں مولوی حاؔلی ایک ایسے شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے اُردو میں ہندی کی چاشنی دے کر کلام میں شیرینی پیدا کردی مگر ہم عصر شعرا میں اس کی کچھ قدر نہ ہوئی۔ غرض سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے وقت ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے کیوں کہ قدامتِ زبان اور طرزِ ادا نے اُس کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور جب تک اُس زبان سے پوری واقفیت نہ ہو، اُس کا لطف حاصل نہیں ہوسکتا۔ شاعر کا یہ کچھ کم کمال نہیں ہے کہ اس نے ایک ایسی زبان میں جس کے منھ سے اُس وقت تک دودھ کی بو نہیں گئی تھی، اُن خیالات کا اظہار کیا ہے جس کی صلاحیت فارسی میں صدہا سال کے منجھنے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اگر زبان کی قدامت کا پردہ حائل نہ ہو تو سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہمارے ہاں کے اوسط درجہ کے شعرا سے کسی طرح کم نہیں۔ میں یہاں چند شعر نقل کرتا ہوں جن میں زبان کی دقت کم ہے، اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ شاعر نے اپنے مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

کفر ریت کیا ہور اسلام ریت
(اور)
ہر یک ریت میں عشق کا راز ہے

عشق کا رتبہ کس قدر بڑھا دیا ہے اور اس بلند مضمون کو کس سلاست اور صفائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ شعر اُردو کے اچھے اور منتخب اشعار کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

چند اشعار اور لکھے جاتے ہیں۔

بنتی کہو پیا کوں ہم سیج کی نہ آوے
اُس باج منج گئے نا منج باج کیوں گماوے

(بنتی = منت سماجت۔ گمنا = وقت کاٹنا، بسر کرنا۔ کی = کیوں)

مطلب یہ ہے کہ پیا سے منت سماجت سے کہو کہ میری سیج پر کیوں نہیں آتا۔ مجھ سے تو ایک دم بغیر اُس کے بسر نہیں ہوتی

وہ میرے بغیر کیونکر بسر کرتا ہے۔

زہد ریا تھے بہو دن بدنام ہو رہیا ہوں
پیالے پلا پرم کے کرنیک نام ساقی

(تھے = سے - بہو = بہت - پرم = پریم - محبت -)

تج بن رہیا نہ جاوے ان نیر کچھ نہ بھاوے
برہا کتا ستاوے مَن سیتی مَن ملاوے

(ان = غذا؛ نیر = پانی؛ برہا = فراق- کتا = کتنا)

رقیب کاہے کو کرتا ہے ہم سوں کچھ بخاں
قبول ظلم و جفا ہے جو آوے جاناں تھے

(تھے بمعنی سے)

جیکوی ہے عشق میں ثابت سدا ہی جیونا اُس کا
سو اُس کے ناؤں سے میخانہ سب معمور کریا تی

(ناؤں = نام - جیکوی = جو کوئی)

رقیباں منے جا بُلانے منجے، کہو اِس بُلانے کو کیا ناؤں ہے
رہے پانوں دِل سوں چلوں تیری پنتھ کہ اس پنتھ چلنے کو دل پانوں ہے

(پنتھ = رستہ، طریقہ - منے = تئیں، پاس)

بنوجی قدر پیو کا وصل کی دِیس سزا اُس برہ کی راتاں میں پائی

(دیس = دن - برہ = ہجر)

تمھارا میا ہونا منج چوک اوپر کہ میں بالی ہوں ہور ناداں بچاری
اونیندی ہے منج نین تج یاد سیتی کہو تم نین میں ہے کاں کی خماری

(اونیندی = بے نیند کے- میا = محبت- کاں = کہاں)

بات ایک ہی مگر مزے دو ہیں۔
پہلو بہ پہلو ہندی پریم کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ صورت ایک ہی مگر جلوے دو ہیں،
بعد میں جو ادیب اور شاعر آئے جو مئے شیراز کے متوالے تھے، انہیں جو چیزیں اجنبی اور غیر مانوس اور اپنے
ذوق کے خلاف نظر آئیں، وہ انھوں نے چن چن کر پھینک دیں اور بجائے ہندی کے فارسی عنصر غالب آگیا
اس میں ولی اور اس کے ہم عصر بھی ایک حد تک قابل الزام ہیں۔ اس زمانہ میں مولوی حالی ایک ایسے
شاعر ہوئے ہیں جنہوں نے اردو میں ہندی کی چاشنی دے کر کلام میں شیرینی پیدا کر دی مگر ہم عصر شعرا میں
اس کی کچھ قدر نہ ہوئی۔ غرض سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے وقت ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے
کیوں کہ قدامتِ زبان اور طرزِ ادا نے اس کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور جب تک اس زبان سے پوری واقفیت
نہ ہو، اس کا لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔ شاعر کا یہ کچھ کم کمال نہیں ہے کہ اس نے ایک ایسی زبان میں جس کے منہ سے
اس وقت تک اردو کی بو نہیں گئی تھی، ان خیالات کا اظہار کیا ہے جس کی صلاحیت فارسی میں صدہا سال کے منجھنے
کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اگر زبان کی قدامت کا پردہ حائل نہ ہو تو سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہمارے ہاں کے
اوسط درجہ کے شعرا سے کسی طرح کم نہیں۔ میں یہاں چند شعر نقل کرتا ہوں جن میں زبان کی دقت کم ہے، ان کے دیکھنے
سے معلوم ہوگا کہ شاعر نے اپنے مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

کفر ریت کیا ہور (اور) اسلام ریت
ہر یک ریت میں عشق کا راز ہے

عشق کا رتبہ کس قدر بڑھا دیا ہے اور اس بلند مضمون کو کس سلاست اور صفائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ شعر اردو کے اچھے اور منتخب اشعار کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

چند اشعار اور لکھے جاتے ہیں۔

بنتی کہو پیا کوں ہم سیج کی نہ آوے
اس باج منج گمے نا منج باج کیوں گماوے

(بنتی = منت سماجت۔ گمنا = وقت کاٹنا، بسر کرنا۔ کی = کیوں)

مطلب یہ ہے کہ پیا سے منت سماجت سے کہو کہ میری سیج پر کیوں نہیں آتا۔ مجھ سے تو ایک دم بغیر اس کے بسر نہیں ہوتی

وہ میرے بغیر کیونکر بسر کرتا ہے۔

زہر ریا تھے بھو دن بدنام ہو رہیا ہوں
پیالے پلا پرم کے کر نیک نام ساقی

(تھے = سے - بھو = بہت - پرم = پریم - محبت۔)

تج بن رہیا نہ جاوے ان نیر نج نہ بھاوے
برہا کتا ستاوے مَن سیتی مَن ملا دو

(ان = غذا، نیر = پانی، برہا = فراق۔ کتا = کتنا)

رقیب کا ہے کو کرتا ہے ہم سوں کج بحثاں
قبول ظلم و جفا ہے جو آئے جاناں تھے

(تھے بمعنی سے)

جیکوی ہے عشق میں ثابت سدا ہے جیونا اُس کا
سوا اُس کے نانوں سے میخانہ سب معمور کرساقی

(نانوں = نام - جیکوی = جو کوئی)

رقیباں منے جا بُلانے سبجے کہو اِس بُلانے کو کیا نانوں ہے
رہے پانوں دِل سوں چلوں تیری پنتھ کہ اس پنتھ چلنے کو دل پانوں ہے

(پنتھ = رستہ، طریقہ - منے = تئیں، پاس)

بوجھی قدر پیو کا وصل کی دیس سزا اُس برہ کی راتاں میں پائی

(دیس = دن - برہ = ہجر)

تمہارا میا ہونا منج چوک اوپر کہ میں بالی ہوں ہور ناداں بچاری
اونیدی ہے بج نین تج یاد سیتی کہو تم نین میں ہے کاں کی خماری

(اونیدی = بے نیند کے۔ میا = محبت۔ کاں = کہاں)

(یعنی، میری آنکھوں سے تو تیری یاد کی وجہ سے نیند اُڑ گئی، مگر تیری آنکھوں میں جو خمار بھرا ہُوا ہے یہ کہاں کا ہے)

اِن اشعار سے جو صاف اور سادہ ہیں، قلی قطب شاہ کی شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ قدیم زبان سے واقف ہیں اُنہیں اس کا خاص لطف آئیگا۔ میں نے حتی الامکان ایسے اشعار دیئے ہیں جو زبان کے لحاظ سے بھی صاف ہیں۔ ایسی ہی ایک غزل کے چند اشعار لکھتا ہوں۔ زبان اور مضمون کی سادگی اور اس کے ساتھ شوق، درد اور گھلاوٹ ملاحظہ ہو ؎

پیا باج پیالا پیا جائے نا　　پیا باج یکتل[1] جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں　　کہیا جائے اما کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کور ہے　　کدھیں[2] اُس سے مل بسیا[3] جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند　　دوانے کو کچ پند دیا جائے نا

اگر دو ایک شاعروں کو مستثنیٰ کر دیا جائے جن کا درجہ درحقیقت نہایت بلند ہے، تو ہمارے ہاں کی عشقیہ شاعری میں کوئی بات نئی نہیں نظر آتی۔ چار سو برس پہلے کا کلام اگر آج کل کے شعرا کے عشقیہ کلام کے سامنے رکھ دیا جائے تو سوائے زبان کے تغیر اور شستگی کے کوئی اور فرق معلوم نہ ہوگا۔ وہی باتیں ہیں، وہی مضمون ہیں اور وہی طرز ادا اور وہی بحریں ہیں۔ اس لحاظ سے سلطان قلی قطب شاہ کا کلام اُردو کے کسی دوسرے شاعر سے کم نہیں ہے۔ عشق و مستی اور تصوّف میں اس کا کلام کسی سے پیچھے نہیں۔ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ حافظؒ کے فیض نے شاعر کی طبیعت کو گرما دیا ہے۔ چند شعر بطور مثال کے یہاں نقل کیئے جاتے ہیں ؎

یوں آج دِستا[4] ہے سکیؔ[5] اس وقت کا مصلت[6] منجے　　جا بیٹھوں گا میخانے میں اُس ٹھار[7] ہے عشرت منجے
پیالا پرم کا ہاتھ لیوں دو جاں کے سنگ تھے دور ہوں[8]　　ہے خوب جیکچ[9] جگ منے سو ہے سدا دولت منجے

پلا ساقیا منجکوں مستانہ مے　　کیا ہے بہوت گرم چنگ ہور نے
جکچ[10] عشق کوچے میں ہے سلطنت　　نہیں دیکھیا ہے کدھیں اس کو کے

---

[1] یکتل۔ ایک دم، ایک لحظہ [2] کدھیں۔ کبھی [3] بسینا۔ بیٹھنا [4] دکھائی دیتا ہے [5] سکی [6] مصلحت [7] جگہ، مقام [8] غیر [9] جو کچھ [10] جو کچھ

سدا پھولبن اور بنڈ ہے منجے   نہیں ہے حماری کہیں ہور دے
سینورں[1] ہے تج جوت سوں سب جگت   نہیں خالی ہے نور تے کوئی شے

زہد ریا تھے ہودن بدنام ہور بیاہو   پیالے پلا پرم کے کر نیک نام ساقی
مستی تھے اپ صراحی کرتی تھی سرکشی   کرتی ہے جام کو اب ہر دم سلام ساقی

اب مست اچھے[3] دائم ہمیں مست اچھنے کا ہنگام ہے   ساقی صراحی نقل ہور پیالے سو ہمنا کام ہے
عاشق اول تھے ہیں ہمیں سرمست ازل تمی ہمیں   نا آج کل تے ہیں ہمیں زاہد کو نیں یہ فاہم[4] ہے
روزِ عید[5] کے عید آنے میں ٹک شیر خرماں کھانے میں   صوفی چلے میخانے میں تسبیح ہات اب جام ہے
منگتا ہے مد مستاں کنے مد باج نیں سکتا رہنے   میخانے کے کوچے تے[7] تو متقی بدنام ہے
ساقی پیالا منج پلا پیالا پینے ہوتا[6] دلا   اُس پیو کوں تو لیا کر ملا جس پیو تھے منج آرام ہے

قطبا نبی کے ادھار[8] تھے رحمت ہی نت کرتا رہے
تو تج علی کے پیار تھے تِلتِل[9] نوا انعام ہے

گرجا ہے میگھ سر تے[10] تازہ ہوا ہے بستاں   پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صباتوں نے جا جواں قداں کن[11]   چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مے پرستاں
او نونہال پھولاں ہے جام خوے سو بادہ   نرگس اپس[12] پلک سوں جھاڑو کرے شبستاں
مکھ نور پر دِسے یوں مج خط عنبریں او   جوں سور اُپر ہے بادل ریحانِ سوں گلستاں
بیہوش میرے دل کوں میٹھے ادہر[13] حلاوی   گلزار ہے عجب او دو لعلِ شکرستاں

---

۱ شراب ۲ ماہِ کامل ۳ اچھنا = ہونا یا رہنا ۴ ہم ۵ روزِ عید ۶ میں ۷ چاہتا ہے ۸ مدد، حمایت، ۹ ہردم۔ ہرآں ۱۰ پھر سے، از سرِ نو ۱۱ باس ۱۲ اپنی ۱۳ لب

مج عشق کے گدا کوں اورنگِ شاہی دیتا　　سب عاشقاں منج انگٹھے ہیں طفل جوں دبستاں

روزی ہوا قطب شہ تج عشق کا پیالا

بھرلے ہیں ہر طرف توں جم شوق کے خمستاں

ایک رباعی ہے۔

مستی کے مُلک میں ہے جہانیانی منجے　　خوباں کے دکھن میں ہے مُسلمانی منجے

خمّار کا حشم خانہ اہے ٹھانوں میرا　　ہر مد کا سو بندِ نگیں سلیمانی منجے

ایک دوسری رباعی ہے۔

کب لک اپچے لب پہ زہد دل میں جام　　اس پاپ سوں بھریا سو زہد منج کیا کام

مد کے مدے لیا وجو صفاتیں ہیں تمام　　یک پختہ برابر نہیں ہے سو لک خام

غرض اس قسم کے سینکڑوں شعر ہیں جن میں مستی اور مے نوشی صاف بہتی نظر آتی ہے۔ یہ سب فارسی شاعری کا طفیل ہے جس کا چربہ شاعر نے اپنی زبان میں اتارا ہے۔ یہ رنگ بہت خوب ہے مگر فارسی میں ضرورت سے زیادہ شوخ ہو گیا ہے ذیل میں ایک غزل کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ ان سے شاعر کے زورِ کلام اور قوتِ بیان کا بہت اچھا اندازہ ہو سکتا ہے

لکھ ایک ہی ہر یک کد من لاکھ چمن ہے　　لکھ جوت ہی ہر ٹھار دسے ٹیک رتن ہے

سمند رہے یک بوند یاں ہیں سو ہزاراں　　باتاں سو کرڈراں ہیں دسے ٹیک رشن ہے

کس ٹھار میں دستا نہیں سب ٹھار رہے بھرپور　　دکھین کو سکت کاں اسے ہر یک نین ہے

منج عشق گری آگ کا یک چنگی ہے سورج　　اس آگ کے شعلہ کا دھواں سات گگن ہے

سلہ آگے　سلہ بوند　سلہ تک　سلہ مطلب یہ ہے کہ شراب کے مقابلہ میں جتنی عمدہ صفات ہیں لاؤ تو دیکھو گے کہ جس طرح ایک پختہ خیال کے مقابلہ میں سو لاکھ خام خیال کچھ حقیقت نہیں رکھتے اسی طرح ایک شراب کے سامنے لاکھوں صفات ہیچ ہیں۔ سلہ کدھن۔ طرف، سمت سلہ سمندر

اُس کے سو پرت پنت میں چل سیس سوں قطبا — تجکوں سو مدد گار حسین اور حسن ہے

ما یہ اشعار اپنے خیال اور رتِ بیان میں حال کے کسی شاعر کے کلام سے کم ہیں؟

علاوہ اُن خوبیوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور جو ہمارے شعرا میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ایک بات نئی دیکھی گئی ہے جو اُردو شعرا میں سوائے سوداؔ اور نظیرؔ کے کسی دوسرے کے لام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ ہے کہ اُس نے اپنی شاعری کو صرف عشق و محبت، حمد و نعت، منقبت و مرثیے تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ انسانی معاشرت اور مظاہرِ قدرت پر بھی نظر ڈالی ہے۔ مثلاً متعدد مثنویاں، پھلوں اور میووں پر ہیں جن میں ایران اور خراسان ہی کے میوے نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر قسم کے پھلوں کا بیان کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ بڑکی بڑدلی، بنولی، انباڑا، بنجل، گینگل، سیندڑے کو بھی نہیں چھوڑا۔ ایک مثنوی سبزی ترکاری کے بیان میں ہے جس میں دھنیئے، ادرک، لہسن تک کا ذکر ہے۔ اِسی طرح ایک مثنوی شکاری پرندوں کے بیان میں ہے۔ علاوہ اِن کے بہت سی مثنویاں اور غزلیں ایسی ہیں جو شاعر نے اپنے محلات (الہی محل، باغ محمد شاہی، دادمحل، اعلیٰ محل، حناں محل)، اُس وقت کے رسم و رواج اور تیوہاروں مثلاً شادی کے رسوم، اپنی سالگرہ، شب برات، میلاد نبی، عید خم غدیر، سوگا، برسات، ہولی، بسنت، پان اور اپنے ہاتھی پر لکھی ہیں۔ ایک مکالمہ صراحی و پیالہ پر اور دوسرا کالی گوری پر لکھا ہے۔ یہ بھی دونوں مثنویاں ہیں۔ اگرچہ یہ مثنویاں معمولی ہیں اور شاعری کے لحاظ سے اعلیٰ رتبہ نہیں رکھتیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ گو اُس نے فارسی شاعری کا پورا اتباع کیا ہے مگر اس کی نظر وسیع تھی اور وہ عشق و محبت کے تنگ کوچے سے باہر نکل کر صنعت و قدرت کی خوبیوں کی داد دے سکتا ہے۔ اِس لحاظ سے سلطان محمد قلی قطب شاہ بحیثیت شاعر کے خاص امتیاز اور وقعت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف پہلا شاعر ہے جس نے اُردو میں غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ لکھا بلکہ اس نے حلقۂ تقلید سے باہر نکل کر جس میں اُردو شاعری ابتدا ہی سے مقید ہو گئی تھی، کسی قدر آزادہ روی اور جدت کا مسلک اختیار کیا اور اپنے مشاہدہ کو کام

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۴) ۶ رس = زبان؛ ۷ دستا = دکھائی دیتا؛ ۸ کان = کہاں؛ ۹ چینگی = چنگاری؛ ۱۰ گگن = آسمان

۱۱ پرت پنت = راہِ محبت ۱۲ سیس = سر ۱۳ ایک قسم کا سن ۱۴ تاڑ کا پھل ۱۵ ایک چھوٹے سے پیڑ کی جڑ ہے جسے حیدرآباد میں بیخ میوہ بھی کہتے ہیں۔ ۱۶ سیندی کے درخت کا پھل ۱۷ سرمہ کا وہ خط جو عورتیں آنکھ سے لے کر زلف تک کھینچتی ہیں۔

میں لاکر ایسی چیزوں پر نظمیں لکھیں جس سے اُردو کے بعد کے شعرا بھی قاصر رہے۔
حمد و نعت، منقبت، مناجات نیز دیگر مضامین پر بہت سی مثنویاں لکھی ہیں۔ اُن کے نمونے دینے سے مضمون بہت طویل ہو جائیگا۔ قصائد بھی بہت لکھے ہیں۔ ان کا ایک آدھ نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔
باغ محمد شاہی کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں سے یہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

تمنا نوں تھے[1] بستا محمد کا لگے بن سارا — سو طوباں سوں سُہاتا ہے جنت نمنے چمن سارا
دسے فانوس کے درمیانے تھے جوں جوت دیوے کا — سو تیوں دستا دِوَلاں میں تھے میویاں کا تن[2] سارا
بہے دم عیسوی انم چمن میں گل لگانے تیں — ہرے نہالاں کے جلوے تیں مشاطا[3] ہوا یوں سارا
سڑک سے باغ کوں دیکھت کھلے منج باغ کی غنچے — سو اُس غنچے کے باساں تھے لگیا جگ مگمگن سارا
چمن کے پھول کھلے دیکھ سکیاں کا مکھ یاد آیا — سُہاتا[4] تھا محمد پھل نمن[5] اُن نین سارا
دِسے ناسک[6] کلی چنپا ہوا ان وبات ہیں تس کے — ہنوز تل دیکھ اس جا کا ہوا حیران من سارا
سو خوشے[7] داکھ لاکھاں کے ثریا سنبلا ہے جوں — سُہے اُس داکھ منڈوا سو جیسا سبز گھن سارا
ناراں میں سُہے دانے سو جوں یاقوت تبلیاں میں — ہر ایک پھل اُس ناراں پر سہے سکّے نمن سارا
کھجوراں کے دسیں چھونکے[8] کہ جوں مُرجان کے پنجے — سیاریاں لعل خوشے جوں دسیں دن ہور رین سارا
دسیں ناریل کے پھل یوں زمرد مرتباناں جوں — ہور اُس کے تاج کوں کہتا ہے پیالا کر دکھن سارا
دسیں جاموں کے پھل بن میں سلیم کے من سالم — نظر لاگے تیوں میویاں کوں رکھیا ہے جتن سارا

صفت کرنے کوں سوسن بی[9] کھلیا ہے دس زبان اپنے — دکھن سب سندریاں کی تیں کھلیا نرگس نین سارا
چمن آواز سن بلبل ایس میں آپ لاپیں ہیں — سو تس آواز سوں موراں کریں قصاں اپن سارا

---

[1] اے = یہ [2] برن = جسم [3] کمکانا = جگمگانا [4] زیب دیتا تھا [5] مانند
[6] ناک [7] انگور [8] گچھے
[9] بھی

دکھت رکھ مست ہو دستک بجادیں پات ہاتاں سوں　　سو ڈالیاں ڈلتے ہو متوال ہیں پھول ابرہن ہارا

مگر شبنم کا مے ہی یا اُدھر لعاب[51] کا پیالا　　یو بی خوب ہور ادبی خوب تجھوں مل پون سارا

اُمنگاں آپ اُمنگاں سوں اپس میں آپ مل ناچیں　　تنّا کا تنن ناچیں ہوئے تن تن تنن سارا

قصیدہ منقبت کی تشبیب کے چند شعر ذیل میں نقل کیئے جاتے ہیں۔

آج شہ چیں چلیا شرق نگر تھے شتاب　　ڈھال فلک کی اُچا[52] او شہِ عالی جناب

باند خنجر کرن کی زریں فرنگ ہات لے　　صبح کے وقت آ کیا پیک[53] دو پیالی شراب

چرک[54] فلک فیل مست مستی سوں مکھ لال کر　　گرم ہو چلنے لگیا دن لے کٹک[55] بی حساب

ذرّے ہو فراش سب چلئے شہ چیں آگے　　دیتے سر اپنے شفق لا اسے زریں طناب

قوس و قزح ہات لے جوڑکہ[56] تیر استوا　　سور کشش جو کیا نس کہ اڑانے غراب

سو ہی غلط یوں نہیں ہی قضیا یوں تو سن　　فتح و ظفر چند کا چیخ دیا اُس جواب

شاہِ ختن سن چلیا غرب نگر تھے لے فوج　　تنکے تاں ان ریں رنگ جیسے لہے مشکناب

کش کہ چلیا ہات قوس اسے اسماں کی　　سو رہا تارن کوں تیں جوڑیا ستارے شہاب

جب آپس میں اُن کی (چاند سورج کی) جھڑپ ہو گئی تو

استنے میں دیتا اہے صلح خدا تن منیں　　ہی تمیں نس[57] دن کی شہ نا لڑو تم استنے باب

میں کیا تم دو کوں شاہ یک سرج ہو ٹیکا　　دھرتی تمیں دنو جاہ دونوں سر پر ہی داب

دن کو سرج نس کو چند تد ہی کیا ہے وہاب　　چاند کوں کنیا مجی سور کوں کیتا ذہاب

"چرخیات" (فلکیات)، پر متعدد قصیدے لکھے ہیں۔ ایک اور قصیدہ منقبت میں لکھا ہی اُس کی تشبیب بھی اسی قسم کی ہی اور شروع سے آخر تک طرح طرح کی تشبیہات میں سورج چاند اور ستاروں کا ذکر کیا ہی۔ مثلاً ایک جگہ شام کو

---

[51] لعاب لب　　[52] اُچا = بلند کیا (اُچانا فعل سے)　　[53] پیک = پی کے

[54] چرک = چڑھ کے (عربی خط کی وجہ سے مسخ ہوگیا ہی)　　[55] کٹک = فوج

[56] جوڑکہ = جوڑکر　　[57] نس = رات

سمندر قرار دیا ہی جس میں سونے کی کشتی ڈوبتی ہی اور اُس کے ڈوبنے سے لاکھوں کروڑوں بُلبُلے نمودار ہوتے ہیں اور یہی ستارے ہیں جو آسمان پر چمکتے ہیں۔ شعر یہ ہی ؎

بن کے سمند سیام میں سنے کی روزق ڈبیا ڈبنے میں تِرنے لگے بڑ بڑے کے لکھ ہزار

دوسری جگہ سورج کو یوسفِ فلک سے تشبیہ دی ہی کہ مغرب کے کنویں میں اُس کے ڈوبتے ہی زمانہ میں یعقوب کی آنکھوں کی طرح اندھیرا چھا گیا ؎

غرب کے چہ میں پڑیا یوسفِ انبر کا ہور
جگ سبہیں یعقوب کے نین منن اندکار

دوسری شعر میں کہتا ہی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ بجھ کر گلشن ہو گئی اور یہ اندھیرا جو دُنیا میں نظر آتا ہی وہ اُسی آگ کا دھواں ہی ؎

آگ براہیم کا بجک ہُوا پھول بن
رین سو تِس آگ کا ہی دھنو یکا دھندکار

دوسری جگہ کہتا ہی کہ چاند سکندر کی طرح رات کی ظلمات میں چلا جا رہا ہی اور تارے اُسے رستہ دکھانے کے لیئے شمع کا کام دے رہے ہیں ؎

چند ہو سکندر چلیا رین کے ظلمات میں
شمع دیپک مشعلاں روشن ہے اُپار

ایک جگہ لکھتا ہی کہ سورج نے چرخ کے خم خانے میں گھس کر اس قدر شراب پی لی کہ بدمست ہو کر مغرب کے چشمہ میں جا پڑا ؎

چرخ کے خم خانے میں سورپیا جا نو مد
مست ہو جا کر پڑیا غرب کے چشمے منجھار

ایک دوسرے شعر میں آسمان کو لگن سے چاند کو شمع سے اور تاروں کو پتنگوں سے تشبیہ دے کر کہتا ہی کہ تارے سوزِ عشق سے بے تاب ہو کر چاند کی شمع پر قربان ہو رہے ہیں ؎

کھن ہی لگن، شمع چاند تارے تپنگ کے مَن
اُڑتے ہیں اُس آس پاس عشق تے بے اختیاؔ

آگےؔ چل کر آسمان کو حوض بتایا ہی جس میں رات پانی کی طرح بھری ہی۔ چاند اُس کا فوارہ ہی اور تارے بوندیں ہیؔ

کھن کے سو حوض خانے میں رین بھریا نیر جوں
چاند پھوہارا من تارے بنداں نیر سار

غرض اسی طرح کی بیسیوں تشبیہیں دی ہیں اور جب سب تشبیہیں ختم ہو گئیں اور کوئی اور نہ ملی تو آسمان کو مدرسہ بنایا، چاند اُس میں مدرس بنے اور تارے طالب علم ہوئے جو مدرس سے بحث کر رہے تھے۔

کھن کے مدرسے منے چاند مدرس کنے
بحث کرن تارے آئے طالب علماں کے سالؔ

ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا شاعر ہی جس نے علاوہ غزلوں کے مختلف مضامین عشقیہ اور غیر عشقیہ پر مثنویاں اور قصیدے لکھے۔ اسی طرح وہ پہلا شاعر ہی جس نے واقعۂ کربلا کے متعلق پُر درد مرثیئے اور نوحے تحریر کیئے۔ نمونہ کے طور پر ایک نوحہ لکھا جاتا ہی:-

دو جگ اماماں دکھ تے سب جیو کرتے زاری وائے وائے ۔۔۔ تن دُونؔ کی لکڑیاں جاؔ لکر کرتی ہیں خواری وائے وائے
ساتوؔ گگن آٹھوؔ جنت ساتو دریا ساتو دھرت ۔۔۔ اکیس تے ایک آپس میں آپ دکھ کرتے کاری وائے وائے
کالا کیا کسوت ہکا دیکھو اماماں دوؔک تے ۔۔۔ ظلمات نیؔ کالا ہوا اس دکھ تے بھاری وائے وائے
لوح ہور قلم کرسی عرش قدسیاں ملک غلماں سب ۔۔۔ بجلیاں بدلؔ اڑر دآتےؔ ہیں رات ساری وائے وائے
اسماں جیج جب لا ہوا سورج اگن دا لا ہوا ۔۔۔ چندر سو جل کالا ہوا ہے دکھ اپاری وائے وائے
نکھی سٹے ہیں سب پراں رو رو دبھرا سے سمدراں ۔۔۔ چھوٹے ہیں سب اپنے گھراں دیکھو تو زاری وائے وائے

۱؎ رداں ۔۔ ۲؎ چل کر ۔۔ ۳؎ ساتوں ۔۔ ۴؎ آٹھوں
۵؎ دُکھ ۔۔ ۶؎ بی ۔۔ ۷؎ بدلے، عوض
۸؎ چلاتے ہیں

کالے ہوئے دکھ تھے منگل سر پر شیں مانی سگل — تو پکڑے اس دکھ تھے جنگل ہے بیقراری والے والے

پھولاں نکلے[1] سب دکھ ستی مکھ موندے بلبل جھکھ ستی — کوئل جینا دکھ ستی بن بن پکاری والے والے

دیکھو تمیں اے مانساں[2] دانے چریں نا پنکھیاں — دھرتی ہے ماتم کی دکھاں دھرتی بچاری والے والے

دو جگ خراباں ہو رہے حیواں کباباں ہو رہے — سمدر سراباں ہو رہے ناہوے جاری والے والے

دکھ آگ سوں جگ بن جلے آکاس تا دھرتی ہلے — کھن پر فرشتے کھلبلی سٹ اختیاری والے والے

حضرت نبی کے گیسواں دو اماماں کے پکاں[3] — جبریل جھلاوے اپ ہتاں[4] آرات ساری والے والے

حضرت علی کے دو تیاں[5] کاندھے نبی کر اُنسیاں — تس پر چڑھے وو شہ جواں اس ہات ساری والے والے

شہزادے کے سب جیسے[6] اونٹاں سمنے پکارے اس زماں — عفعف بنی تن کوں سناں کے دوی باری والے والے

جبرئیل آکر کہے تیہری براں[7] جو عف کئے — اس عفو تھے جگ پاوے سب رستگاری والے والے

دو نور دیدے بی بی کے آخر دیکھو کیوں دکھ دکھے — لھو میں لڑے پیاسے جھکے دیکھو یہ خواری والے والے

یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھینچے خنجر — کافر کئے کیسے قہر یو زخم کاری والے والے

دکھ بات کو تو جیب جلے لکھنے قلم بی نا چلے — دل جیوں ششمے[8] جل تلملے سد کی ہماری والے والے

قطبا کہے دل کے بچن ہر دم مدد پنج تن — راکھے خدا منجکو جتن دشمن کو خواری والے والے

قطبا کو ہے اللہ مدد بستا ہے اس دل میں احد

تو منج مدد حیدر دلدبریاں کوزاری والے والے

اوپر جو نمونے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے پیش کیئے گئے ہیں اُن سے فارسی شاعری کا اثر صاف ظاہر ہے۔ خیالات وہی ہیں، استعارات اور تشبیہات پر بھی وہی رنگ غالب ہے اور بحریں بھی فارسی ہیں، لیکن باوجود ان تمام اثرات کے ایک بات خالص ہندی ہے جو اس کے کلام میں شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے۔ یعنی بخلاف فارسی شاعری کے عورت کی طرف سے عشق و محبت کا اظہار ہوتا ہے وہ مرد کو بے وفائی کے

---

[1] سوکے — [2] لاؤ — [3] بنگیں — [4] ابھوں
[5] بیٹے — [6] مانند — [7] تیسری بار — [8] شمع

طعنے دیتی ہے۔ سوکن (رقیب عورت) کی طرف سے بدگمانی اور رشک ظاہر کرتی ہے۔ برہ کی راتیں بے قراری میں کاٹتی ہے۔ غرض وہ عاشق ہے اور مرد معشوق۔ یہ ہندی شاعری کا رنگ ہے جو شاعر نے اپنی اردو شاعری میں قائم رکھا ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے جہاں گیر کے دربار کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ "ایک موقع پر جہاں گیر کے روبرو قوال امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی ایک غزل گا رہا تھا اور بادشاہ اُس کو سُن کر بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ جب قوال نے یہ یہ شعر گایا ؎

تو شبانہ می نمائی بہ برِ کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

بادشاہ دفعتہً بگڑ گیا اور قوال کو فوراً اٹھوا کر نکلوا دیا اور اس قدر برہم ہوا کہ تمام ندیم اور خواص خوف سے لرزنے لگے اور فوراً ملّا نقشی مہرکن کو جن کا بادشاہ بہت لحاظ کرتا تھا، بُلا کر لائے تاکہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج کو دھیما کریں۔ جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا پایا۔ عرض کیا، حضور خیر باشد بادشاہ نے کہا دیکھو امیر خسرو نے کیسی بے غیرتی کا مضمون باندھا ہے۔ بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی بے غیرتی کی بات کہہ سکتا ہے؟ ملّا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اُسی وقت بادشاہ کا غصہ فرو کر دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندوستان میں نشو و نما پایا تھا اس لیے وہ اکثر ہندوستان کے اُصول کے موافق شعر کہتے تھے۔ یہ شعر بھی اُنھوں نے اُسی طریقہ پر کہا ہے۔ گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تو رات کو کسی غیر عورت کے ہاں رہا ہے کیوں کہ اب تک تیری آنکھوں میں نشہ کا یا نیند کا خمار پایا جاتا ہے۔ یہ سُن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا اور پھر گانا بجانا ہونے لگا۔"

اِس قسم کے ہزاروں شعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

پیا کس سے گمائی رات ساری
تمن انکھیاں میں پائی میں خماری

یہ بالکل امیر خسرو کے شعر کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔
ایک دوسری جگہ اِسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

گما کر رین دوتی سے چھپا تے — میں بوجی ہوں نشانیاں سب رین کے
کھورات کن سات کیتی ہیں باتاں — کہ چوتا ہی تم میں تے رنگِ خماری

غرض اس قسم کے اشعار سے سارا دیوان بھرا پڑا ہی اور اس سے ہندی شاعری کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہی اور بجائے ہمدم و مونس کے سکی (سکھی) سہیلی اور ساجن اور بجائے رقیب کے دوتی، دَرتن اور پریم، نیہ، پرت اور برہ کے الفاظ ہمارے قول کی تصدیق کرتے ہیں ؎

تری نیہ کا منجکو بچھو لڑیا — میرے سبھی تن میں لہر اس کا چڑیا
میں آئی تج پاس اتارا کرن — تمیں کرن ہارا اُتارا پیا
جو دیکھی میں اُس روپ ونتا سجن — نین اُس سلونے تے پھر لب چڑیا

نوازیں آپ میاسیتہیں توں مجکوں — کہ میں باندی ہوں تج سوں حُب سارا

نکو ہو نکو ہو سہیلی کھیلی — تجے شہ کریں گے میا سوں نہالا

تمیں میرے مندر سو آج آؤ لالا — تم اوپر تھے واروں گی جوبن سو بالا

اگر سلطان محمد قلی قطب شاہ جہانگیر کے زمانے میں ہوتے اور وہ ان کا کلام سُن پاتا تو کچھ تعجب نہ تھا کہ طیش میں آکر اُس کے ملک پر چڑھائی کر بیٹھتا۔

بعد کے اُردو شعرا پر فارسی شاعری کا رنگ ایسا غالب آیا کہ یہ خصوصیت اُردو شاعری سے بالکل اُٹھ گئی اور رفتہ رفتہ بہت سے ہندی الفاظ بھی زبان سے خارج ہو گئے۔ اور اُستادی الفاظ کے متروک کرنے میں رہ گئی۔

علاوہ ہندی شاعری کی اس خصوصیت کے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ہندی زبان کی بعض اور خصوصیتیں بھی پائی جاتی ہیں اور الفاظ تو بکثرت ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حمد و نعت و منقبت میں بھی ہندی

کے مذہبی الفاظ استعمال کرتا ہی۔ مثلاً

کروں ابتدا احمد کرتار کا کہ منعم ہے کرتار سنسار کا

کہوں حمد اُس حی سبحان کا دیاونت داتار دیان کا

وہی رب نرنجن ہے لاریب فیہ

کہ تو ہیں اَہے سب جگت کا گُسائیں

دُنیا بسے لگ سدا انند سوں نبی علی کے سو صدقے جگ تیں اہے قطب شہ کہ داس ہے وہ علی ولی شاہ مرتضےٰ کا

ہندی زبان میں ترکیب کی ایک صورت یہ بھی ہی کہ دو اِسم مل کر ایک لفظ بن جاتے ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً بعض وقت دونوں اسموں کے درمیانی حروفِ علت حذف ہو جاتے ہیں۔ جیسے نگمٹ پت جھڑ۔ کبھی پہلے اسم کا آخری یا دوسرے اسم کا پہلا حرفِ صحیح ساقط ہو جاتا ہی جیسے لوچن۔ پھلیل (پھول تیل سے) بعض اوقات دونوں اِسم اپنی اصلی حالت میں رہتے ہیں اور کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی اور یہ ترکیب بغیر کسی حرفِ ربط یا اضافت کے استعمال ہوتی ہی۔ جیسے تِلی گھر، کرن پُھول، اَن داتا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں آخری قسم کی ترکیب بہ کثرت پائی جاتی ہی۔ اس میں اُنھوں نے صرف ہندی الفاظ ہی کی پابندی نہیں کی بلکہ عربی فارسی کا استعمال بھی اسی قاعدہ کے مطابق کیا ہی۔ مثلاً

قطبا کو ہی اللہ مدد، بستا ہی اس دل میں احد

یا

جنت حور ہے یا پری استری

لیکن کمال یہ کیا ہی کہ ہندی کے ساتھ فارسی عربی الفاظ بلا تکلف ملا دیئے ہیں۔ مثلاً

۱۔ جگت لوح تے کفر آند کار کوں
۲۔ فارس اگن ہو ٹھنڈی کفر نگون رہوا
۳۔ کفر ریت کیا ہور اسلام ریت

اسی طرح سموم باد اور وصال بادبھی استعمال کیے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ آزادی یہ برتی ہے کہ فارسی قاعدے کے مطابق ہندی فارسی الفاظ سے ملا کر فاعلی ترکیب قائم کردی ہے۔ مثلاً

نبی مولود آ کیا ہے دو جگ تائیں نور انی   فلک پر سب ملک کرتے ہیں تاریاں سوں پھل افشانی

نکھاں تس سو سدجون پوں بیز تھے   پراں تے جو جبریل کے تیز تھے

ایک جگہ ہندی ترکیب کی رو سے روزِ عید کو روز عید لکھا ہے جس طرح آج کل بقر عید کو بقرید یا بکرید بولتے اور بعض اوقات لکھ بھی دیتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ یہ کمال کیا ہے کہ ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے

پیا آئے ہیں روپ کے رنگ سوں   کہ چوتا ہے اس مکھ تے نیر زلال

(نیر کے معنی پانی)

اس کے علاوہ فارسی واو عطف کا ہندی الفاظ اور جملوں میں بلا تکلف استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

باغ و پھل و جل سہے تو اتا   بن صحبتِ یار خوش ندیسے

تو اپے بوجے میرے سب پن پاپ

تجے حسن جھلکار ہے سور جیسا   زبردست توں ہے و سب تیرا زیرا

تشبیہات و استعارات عموماً سب کے سب فارسی ہیں۔ البتہ دو ایک جگہ ندرت دکھائی ہے اور مشاہدہ سے کام لیا ہے اور یہ تشبیہیں خالص ہندی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ران کی صفائی کو کیلے کے تنے سے تشبیہ دی ہے۔

کیلے گابے تے نازک ہور صاف ران   نہیں اس کی صافی میں کوئی صاف جان

یا کنول کے پتے پر ڈھلتی ہوئی بوند کی تشبیہ

کنول کے پان پر ڈھلتی سو جل بند   کہ یا جھلتی بہو نرنیاں پوں کے

ایک جگہ ہندی مذہبی روایت سے تلمیح کی ہے ؎

نبی صدقے قطب سوں آملی ہے　　　　ستاجوں رآم سوں منج اونگاری

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے عربی الفاظ کو اپنے کلام میں اسی طرح استعمال کیا ہے جس طرح اس کے زمانے میں لوگ عام طور پر بولتے تھے۔ یعنی لکھنے میں صوت کی نقل کی ہے۔ تحریر درحقیقت تقریر کی نقل ہے۔ اور اصل عربی املا کی پرواہ نہیں کی اور اسی کو صحیح سمجھا ہے جو بولنے میں عام طور پر مُروج تھا۔ سید انشاء اللہ خاں نے دو صدی بعد اس نکتہ پر نظر ڈالی جس سے اُن کے ذوقِ زبان اور دقیق نظری کا پتہ لگتا ہے۔ وہ اپنی مشہور اور بے مثل کتاب دریائے لطافت میں لکھتے ہیں کہ "ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہوگیا ہے، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سُریانی، پنجابی ہو یا پوربی، از روئے اصل غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت و غلطی اُردو کے استعمال پر موقوف ہے۔ کیونکہ جو کچھ خلاف اُردو ہے غلط ہے۔ گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو کچھ موافقِ اُردو ہے صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو۔" اس اصول کے قائم کرنے کے بعد وہ بہت سے عربی الفاظ کو جو اُردو میں کچھ کے کچھ ہوگئے ہیں صحیح بتاتے ہیں۔ مثلاً سید انشاء کی رائے میں بَرَقا صحیح اُردو کا لفظ ہے گو وہ خلافِ اصل ہے۔ یا وہ غَدَر کو بفتحِ دال اُردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں اگرچہ اصل میں بسکونِ دال ہے۔ اس قسم کے الفاظ کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ اگرچہ یہ نکتہ اصولِ لسان کی لحاظ سے بہت خوب بیان کیا ہے لیکن اپنے کلام میں کہیں اس پر عمل نہیں کیا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس نکتہ کو دو صدی قبل سید انشا سے بہتر سمجھا اور اپنے کلام میں جا بجا استعمال کرکے دکھایا ہے۔ مثلاً[1]

قفل	کو	کلف	لکھا ہے	تشبیہ	کو	تشبی	لکھا ہے
صراحی	"	صرئی	"	شمع	"	شما (شمے)	"
منع	"	منا	"	وضع	"	وضا	"
ساعت	"	سائت	"	نفع	"	نفا	"
فہم	"	فام	"	انعام	"	انام	"

[1] ملاحظہ ہو دریائے لطافت (مطبوعہ انجمن ترقی اُردو) صفحہ ۲۴۱ و ۲۴۲ و مقدمہ کتاب صفحہ ۵۵

مصلحت کو مصلت لکھا ہی   دعوے کو داوے لکھا ہی

وداع کو ودا لکھا ہی وغیرہ وغیرہ

اسی طرح عَرَش، فَرَش، ظُلَم، وَخَت (وقت)، عِشَق، شَرَق، غَرَب بے تکلف استعمال کئے ہیں اور اصل الفاظ کے اعراب کی پرواہ نہیں کی ہی۔

الفاظ کی تذکیر و تانیث کا بھی بہت کم لحاظ کیا ہی۔ مثلاً

جیت، بنیاد، جوت، یاد، شبرات، بھوک، پیاس، صورت، مصلت (مصلحت)، صحبت، تعریف، روح حمد، دعا، نظر، شکل کو مذکر باندھا ہی۔ ایک جگہ محبت کو بھی مذکر لکھ دیا ہی۔

بعض جگہ جہاں فاعل مؤنث جمع ہی تو وہاں فعل کے پہلے جزکو بھی جمع ہی لکھا ہی۔ اُردو میں پہلے یہی استعمال تھا۔ اور اب بھی دلی اور نواحِ دلی میں بعض اوقات عورتیں اسی طرح بول جاتی ہیں۔ مثلاً

قطب شہ کوں کھلاتیاں ہیں سہیلیاں رنگ بھرا میوا

سکیاں کی دعات ایسی ہی کہ چھند سوں   پیا سوں مل کہ ہوتیاں ہیں کنارے

اسی طرح کیاں ہیں، دیتیاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

قافیہ میں یاے مجہول و معروف کا لحاظ نہیں کیا۔ مثلاً تیرا اور ہیرا یا دید اور بھید کا قافیہ باندھ دیا ہی۔

تمام بحریں (سوائے ایک آدھ کے) فارسی ہیں۔ عروض کا قومی زبان اور خیالات سے خاص لگاؤ ہوتا ہی۔ اُردو نے ابتدا سے، یعنی جب سے اُسے ادبی حیثیت ملی ہی، غیر زبان کا عروض اختیار کیا۔ اگر بجائے فارسی (عربی) عروض کے ہندی عروض ہوتا تو اُردو ہندی نظم اور زبان میں وہ مغائرت جو اس وقت نظر آتی ہی، نہ رہتی یا بہت کچھ کم ہوجاتی۔ یہ مسئلہ تفصیلی بحث کا محتاج ہی اور یہ موقع اس کا نہیں ہی۔ غرض سُلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہی اور خصوصاً اُردو زبان کی تحقیق کے لیے بے بہا ذخیرہ ہی۔ ہمارا ارادہ ہی کہ حواشی و فرہنگ کے ساتھ اسے شائع کریں تاکہ محققین و شائقینِ اُردو زبان کو اس سے مدد ملے۔

تبصرہ

تذکرۂ شعرا مؤلفۂ میر حسن دہلوی

(از جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی صدر الصدور دولت آصفیہ حیدر آباد دکن)

"بدرِ منیر" نے میر حسن دہلوی کے نام کو آسمانِ شہرت پر مہرِ منیر بنا کر روشن کیا۔ روشنیِ طبع نے میر صاحب کو یہ مضمون پہلے ہی سجھا دیا تھا۔ مثنوی مذکور کی نسبت کہتے ہیں ؎

رہیگا جہاں میں مِرا اس سے نام ۔۔۔ کہ ہے یادگارِ جہاں یہ کلام

"مثنوی میر حسن" کو جو قبولِ عام نصیب ہوا شاید ہی اُردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔ جو پڑھ سکتے تھے اُنھوں نے پڑھی۔ جو پڑھ نہیں سکتے تھے اُنھوں نے پڑھوا کر سُنی جاہلوں کا بھی یہ عالم رہا کہ جو دو چار شعر یاد تھے اُن کو پڑھتے تھے اور سر دُھنتے تھے۔ چاندنی رات میں ماہِ کامل کی روشنی بہت سے تاروں کو نگاہ سے اوجھل کر دیتی ہے۔ یہی حال "بدرِ منیر" کی آب و تاب کے سامنے میر حسن کے باقی کلام کا ہوا۔ آبحیات میں آزاد نے لکھا ہے۔ دیوان اب نہیں ملتا۔ "تذکرہ" بھی طاقِ نسیاں کی نذر ہو چکا تھا۔ بالآخر وقت آیا کہ کلامِ حسن کا حُسنِ سادہ رونمائے عالم ہے۔ اہلِ ادب کو مژدہ کہ "انجمن ترقیِ اُردو" کلیات اور تذکرہ دونوں کی اشاعت پر آمادہ ہے۔ اوّل تذکرہ کی یاد ہوئی ہے۔

تذکرہ شعرا

یہ تذکرہ میر حسن نے اُس زمانہ میں لکھا ہے جب کہ دلّی کو خیرباد کہکر فیض آباد میں سکونت پذیر تھے چنانچہ خود اپنے حال میں لکھتے ہیں "شروعِ جوانی از گردشِ روزگار ۔۔۔ ۔۔۔ بطرف لکھنو

وفیض آباد رسیدم"۔ تذکرۂ ہذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اُس میں "مثنوی رموز العارفین" ہے "گلزار ارم" نہیں ہے۔ رموز العارفین کا سال تصنیف ۱۱۸۰ھ ہے اور گلزار ارم کا ۱۱۹۲ھ۔ رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۰ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا اور آج اُس کی تالیف کو ڈیڑھ سو برس کا زمانہ گزر چکا۔ رسم قدیم کے مطابق یہ تذکرہ فارسی زبان میں بہ رعایت حروفِ تہجی لکھا گیا ہے۔ ہر ردیف میں تین دور قایم کئے ہیں۔ متقدین[۱]۔ متوسطین[۲]۔ متاخرین[۳]۔ "دورِ متقدین" فرخ سیر سے پہلے۔ اس دور میں زبانِ ریختہ کا رواج زبان دکن سے ہوا۔ "دورِ متوسطین" آخر عہدِ فرخ سیر سے ابتداءِ عہد محمد شاہ تک "متاخرین" اس کے بعد سے زمانۂ تالیف تذکرہ تک۔ اب سب متقدین ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

یہ تذکرہ شاہد ہے کہ مؤلف کو عبارت آرائی و رنگیں بیانی میں عمدہ دستگاہ حاصل تھی۔ وہ سادہ و پرکار طرز عبارت جو میر تقی میرؔ کے تذکرہ کی ہے اس میں نہیں۔ میرؔ کی یہ ادبی قوت خانِ آرزو کی تربیت کا ثمرہ تھی ایک مثال سن لو۔ میر تقی ایک موقع پر لکھتے ہیں "خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نگنجد"۔ میر حسن اسی موقع پر کہتے ہیں "خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر و تقریر نہ گنجد" ارباب ذوقِ سلیم نے محسوس کیا ہوگا کہ لفظ کے اضافہ نے زورِ کلام کم کر دیا۔

اس تذکرہ کے زمانۂ تصنیف کی ایک خاص خوبی ہے اور وہ یہ کہ وہ ایسے زمانہ میں تصنیف ہوا ہے کہ دورِ سوم ختم اور دَورِ چہارم شروع ہو رہا تھا۔ اس طرح مؤلف نے دونوں دَور کے شعرا کے چشم دید حالات قلمبند کئے ہیں۔ میرؔ۔ سوداؔ۔ خواجہ میر دردؔ اور حضرت میرزا مظہر کو دیکھا اسی کے ساتھ مصحفیؔ۔ انشاؔ اور جراتؔ کو دورِ سوم اور دورِ چہارم کے طرزِ کلام کا ڈانڈا جہاں ملا ہے وہ اس تذکرہ کے انتخابی اشعار سے بخوبی واضح ہے۔ خوبی خاص یہ ہے کہ ایک پاکیزہ مذاق اُستاد کا قلم نکتہ سنجی کے ساتھ انصاف کی داد دے رہا ہے۔ اس لئے اہلِ کمال کے خط و خال اس آئینہ میں ہُوبہو ہویدا ہیں۔

اگرچہ عبارت کا معتد بہ حصّہ رنگ آمیزی کی نذر ہو جاتا ہے تاہم ہمعصرانہ قیمتی معلومات بھی قلم سے نکلتی جاتی ہیں جس سے شاعر کے اندازِ کلام طرزِ زندگی اور صورت شکل پر معنی آفریں روشنی پڑتی جاتی ہے مثلاً میر تقی کے حسب ذیل ضروری حالات زیرِ نظر آجاتے ہیں۔ اُن کا "خانِ آرزو" کا بھتیجا اور شاگرد ہونا۔ وطن اکبر آباد۔ اس تذکرہ کی تحریر کے وقت میر تقی کا سن ساٹھ برس کا تھا اور دلّی میں مقیم تھے۔ جوان محمد شاہی تھے۔ میر تقی کا

"تذکرہ متقدمین و معاصرین" یادگارِ زمانہ تھا۔ رُباعی۔ غزل۔ قصیدہ۔ ہجو۔ مدح۔ سب پر قدرت ہے۔ گرم بازاری کمالِ غزل کی وجہ تھی جس کی شان یہ تھی کہ "بسیار با انداز و طرز از ومی تراود" میر صاحب کا صاحبِ دماغ ہونا "بسیار صاحبِ دماغ ست و دماغ اومی زیبد" عبارت آرائی میں یہ فقرہ بھی ہے "شعرش چوں دُرِ خوشاب و اندازِ سخنش بے حساب" سوداؔ۔ حالات وصفات۔ مولد شاہجہاں آباد۔ تحریر تذکرہ کے وقت سن کا اندازہ ستّر برس کا تھا۔ نوکری پیشہ۔ سرکار نواب شجاع الدولہ میں بسلسلۂ شاعری سرفراز تھے۔ علمِ موسیقی میں مہارت تھی۔ میر حسن اکثر اُن کی خدمت میں جاتے تھے۔ اور وہ بہت کرم فرماتے تھے۔ خوش خلق۔ نیک خو۔ یار باش تھے۔ شاعری کی زندگی اُن کی ذات سے وابستہ تھی۔ طرزِ سخن "میدانِ بیان او وسیع۔ وطرزِ معانی او بدیع۔ ۔ ۔ در قصیدہ و ہجو یدِ بیضا دارد۔ قصائدِ عذب دلاویز۔ وبیانِ ہجو بلند۔ نقلش طرب انگیز"

سوزؔ۔ حالات وصفات۔ سید ضیاء الدین بخاری کے بیٹے۔ قطب عالم گجراتی کے خاندان سے۔ فقیہ درویش منش۔ خوش نویس۔ دانشمند۔ فطرت نہایت بلند۔ علوم تیر اندازی میں ایک رسالہ زور دار لکھا تھا۔ رنگِ زمانہ سے بددل ہو کر گوشہ نشین تھے۔ اشعار اس خوبی سے پڑھتے تھے کہ بیان میں نہیں آسکتے۔ طرزِ سخن "در عہدِ خود از جملہ ادابنداں ممتاز۔ طرزِ ادائیہ ملک اوست"

جرأتؔ۔ حالات وصفات۔ وطنِ اصلی شاہجہاں آباد۔ مقامِ نشو و نما فیض آباد۔ میاں حسرتؔ کے شاگرد جوانِ چیچک رُو۔ خوش خلق۔ نیک "دریں نوجوانی بسیار بحلم و حیا بسر می برد" فنِ موسیقی اور ستار نوازی میں ایک حد تک قدرت۔ طبیعت بہت دردمند اور گداز۔ شوقِ شعر حدِ جنوں تک پہنچا ہوا۔ کہ کسی وقت فکرِ سخن سے خالی نہیں۔ طرزِ سخن "کلام نمکیں۔ بیانِ شیریں۔ گلزارِ معانیش چوں میوۂ آرزو۔ شاخ در شاخ" اس تذکرہ کا نام مؤلف نے نہیں لکھا۔

مؤلف تذکرہ کے حالات

مسلمانوں کے عہدِ حکومت نے جن شہروں کو ناز و نعمت کا مخزن اور علم و کمال کا معدن بنایا تھا اُن میں خراسان کا دارالسلطنت ہرات بھی تھا۔ یہی مردم خیز شہر میر حسنؔ کے خاندان کا بھی وطن تھا۔ میر امامی وہاں سے ہندوستان میں آئے جو میر حسن کے پردادا تھے ہفت قلم تھے اور فاضلِ متبحر۔ بلحاظ علم و فضل دلّی میں آکر ہمسروں میں امتیاز حاصل کیا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ یہ لکھکر

میر حسن کہتے ہیں کہ میری شاعری آبائی ہے نہ آج کی۔ ہر چند کہ میر انیسؔ نے اپنے لئے پانچویں پشت مدّاحی کا دعویٰ کیا ہے ع

پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

مگر میر حسن کی شہادت کی بنیاد پر چھٹی پشت تھی۔ میر نفیسؔ نے کس نفاست سے اس مسالہ کو صاف کر دیا ہے ع

شمشیر فصاحت پہ ہے یہ ساتواں صیقل

سات پشتیں ملاحظہ ہوں۔

۱ - میر امامی
۲ - خواجہ عزیز اللہ
۳ - میر ضاحک
۴ - میر حسن
۵ - میر خلیق
۶ - میر انیس
۷ - میر نفیس

آمدم بر سر مطلب۔ میر حسن کا نام غلام حسن تھا۔ ان کے والد میر غلام حسین ضاحک نے دلّی میں نشو و نما پایا۔ آخر زمانہ میں فیض آباد میں جا کر سکونت اختیار کی۔ تحریرِ تذکرہ کے وقت زندہ تھے اور تیس برس سے ترکِ روزگار کر کے آزادانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ عالم و فاضل تھے۔ ناظم و ناثر۔ ہزل دوست مزاح پسند۔ غزل چالیس پچاس شعر سے کم نہ ہوتی تھی۔ فن موسیقی میں بھی دخل تھا۔ قد میانہ۔ رنگ بھورا۔ داڑھی اوسط۔ ریش بچہ منڈا ہوا۔ سبز عمامہ بطرز عرب باندھتے تھے۔ بڑا سا جبّہ پہنتے تھے۔ فارسی اور ریختہ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ قصائد فارسی کی تعریف تذکرۂ شعرائے ہند کے مؤلف نے کی ہے۔ متین کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

دَرپیش اگر روزِ اجل آہ نہ ہوتا   قصّہ تھا محبت کا یہ کوتاہ نہ ہوتا

اُس آن تھمے آنسو جس آن کہ دل ڈوبا   تب جان سی ہم اُٹھے جب دیدۂ نم بیٹھے

رباعی در منقبت

کشّافِ حقایق و نکاتِ توحید — آں راکبِ دوشِ احمدی شاہ شہید
خود معنیِ آیاتِ کلامِ الٰہی ست — تفسیرِ حسینی ست بقرآنِ مجید

تذکرۂ میر حسن میں یہ رباعی اُن کے نام سے درج ہی۔ حالاں کہ وہ مولانا لطف اللہ شیرازی کی مشہور رباعی ہی اور فارسی تذکروں میں اُن کے نام سے درج ہی۔

رباعی

افسوس دلا کہ غمگساراں رفتند — سیمیں بدناں و گلعذاراں رفتند
چوں بوئے گل آمدند بر باد سوار — در خاک چو قطرہائے باراں رفتند

میر حسن دلّی میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم پائی۔ عربی سے واقف نہ تھے۔ ابتدا سے شعر و سخن کا شوق تھا اس سلسلے میں حضرت خواجہ میر دردؔ کی خدمت میں رہکر پختگی حاصل کی۔ میر ضیاؔ کے شاگرد تھے۔ مگر خود لکھتے ہیں کہ مجھسے اُن کی طرز کا نباہ نہ ہوسکا۔ اس لئے میر دردؔ۔ سوداؔ۔ اور میرؔ کی طرز کی پیروی کی۔ تلمذ کی بابت آبحیات میں لکھا ہی "میرزا رفیع کو بھی غزل دکھائی"۔ میر حسن کے بیان سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ وہ اپنا تلمذ صرف میر ضیاؔ سے ظاہر کرتے ہیں۔ البتہ یہ لکھتے ہیں کہ چوں کہ میں اُن کی طرز نباہ نہ سکا۔ اس لئے میرؔ۔ دردؔ اور سوداؔ کی طرز کی پیروی کی۔ یہاں بھی سوداؔ کی تخصیص نہیں۔ آزادؔ نے جو خط میر حسن کا قدرت اللہ خاں قاسم کے نام نقل کیا ہی اُس میں بھی یہی لکھا ہے "اصلاحِ سخن از میر ضیاؔ گرفتہ ام"۔ سودا کا نام نہیں۔ آغازِ شباب میں دلّی کی تباہی سے پریشان ہوکر اپنے والد کے ساتھ فیض آباد گئے۔ وہاں سے بالآخر لکھنؤ جاکر بود و باش اختیار کرلی۔ اس سفر میں دلّی سے چل کر اوّل چند مہینے ڈیگ میں رہے وہاں سے حضرت شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مکن پور گئے۔ اسی منزل کی کیفیت نے مثنوی گلزارِ ارم کی بہاریں دکھائیں۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں نواب سالار جنگ اور اُن کے بیٹے میرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں رہے۔ معلوم ہوتا ہی کہ گزر یہاں بھی تنگی سے ہوتی رہی۔ خود لکھتے ہیں "چنانچہ تاحال بہرنوع گزراں مینمایم"

حلیہ۔ داڑھی منڈی ہوئی۔ رنگ بھورا۔ قد اچھا بڑا (میر نفیس تک یہ قد و قامت قایم تھا) پُرانی وضع کی پگڑی سر پر (اب سہرے سے پگڑی ہی ندارد ہے۔ پُرانی وضع کون سمجھے گا) اپنے والد کی طرح بڑا سا جُبّہ پہنتے تھے۔ یہ حلیہ "تذکرۂ شعرائے ہند" میں لکھا ہے۔ آبحیات میں اس کے خلاف یوں لکھا ہے "میانہ قد۔ خوش اندام۔ گورا رنگ۔ جملہ قوانین شرافت و آئینِ خاندان میں اپنے والد کے پابند تھے اتنا تھا کہ داڑھی منڈاتے تھے۔ سر پر بانکی ٹوپی تن میں تنزیب کا انگرکھا۔ پھنسی ہوئی آستینیں۔ کمر سے دوپٹہ بندھا"۔ اہلِ نظر فیصلہ کریں کہ کونسا بیان قابل قبول ہے۔ "تذکرۂ شعرائے ہند" کی قدامت اور تحقیقات کے موقع کا زیادہ حاصل ہونا غالباً تذکرۂ شعرائے ہند کو زیادہ مستند قرار دے۔

میر حسن کے اخلاق کی بابت "تذکرۂ شعرائے ہند" میں لکھا ہے: "وہ ظریف اور خوش خلق آدمی تھا۔ مگر بیہودہ اور کلام معیوب کبھی زبان سے نہیں نکالتا تھا۔ سوا ازیں شیریں مزاج خوش خلق اور پسندیدہ تعلیم یافتہ تھا۔ کسی شخص نے اُس کو بُرا نہیں لکھا۔ اور نہ کچھ الزام لگایا ہے"۔

آخر ماہ ذی الحجہ میں علیل ہوئے۔ عشرۂ محرم ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا (یعنی مثنوی "سحر البیان" کے ختم ہونے کے دو سال بعد) مرزا قاسم علی خاں کے باغچہ کی پشت پر مدفون ہوئے۔ مصحفی نے تاریخ وفات کہی۔

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں — رُو۔ ازیں گلزارِ رنگ و بو بتافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی — شاعرِ شیریں زباں۔ تاریخ یافت (۱۲۰۱ھ)

چار بیٹے تھے۔ اُن میں سے تین محسن، خلیق اور خلق شاعر ہوئے۔ شاید ہی اس کی نظیر تاریخ عالم میں ملے کہ شاعری ایک خاندان میں آٹھ پشت تک مسلسل رہی ہو۔ یہ طُرّۂ امتیاز میر حسن کے خاندان کی دستار پر کھلا۔ کبھی علوم سات آٹھ پشت تک شاذ و نادر چلے ہیں۔ چہ جائیکہ شاعری جو وہبی ہے۔ پھر قدرت نے اس فراوانی سے یہ نعمت اس خاندان کو بخشی کہ میر حسن کے تین صاحبزادے شاعر ہوئے۔ اور تین پوتے میر انیس۔ مونس۔ اُنس۔ ایک میر انیس تنہا ایک ملک کے فخر کے لئے کافی ہیں۔

میر حسن کا کلام

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ اب تک فقیر نے قریب سات آٹھ ہزار کے شعر کہے ہیں۔ ایک ترکیب بند کہا ہے اور ایک مثنوی رموز العارفین جو "قبول خاطر" و شہرتِ عام حاصل کر چکی ہے۔

آبحیات میں آزاد لکھتے ہیں "دیوان اب نہیں ملتا"۔ اسی کے ساتھ قدرت اللہ خاں قاسم کا یہ قول دیوان کی نسبت نقل کیا ہے۔ "انواع سخن سے لبریز ہے"۔ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں "آج یہ نوبت ہے کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہ ملیں جو کتاب میں درج کرتا"۔ مثنوی گلزار ارم کی نسبت لکھتے ہیں۔ "میں نے یہ مثنوی دلّی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی اب نہیں ملتی۔ تذکرۂ آبحیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "آزاد" کو مثنوی رموز العارفین کی خبر نہ تھی۔ تذکرہ شعرائے ہند میں منشی کریم الدین نے میر حسن کی تصانیف کی نسبت عجب خلط مبحث کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں "حسن مذکور کی تصنیفات یہ ہیں۔ ایک دیوان اقسام سخن کا جس میں تخمیناً آٹھ ہزار شعر ہیں۔ دوسرا تذکرہ ہندی مصنفوں کا ریختہ میں لکھا ہے۔ تیسری مثنوی بدر منیر۔ اس مثنوی کی برابر کسی سے آج تک اچھی مثنوی نہیں ہوئی چوتھی سحر البیان۔ یہ سب سے بڑی کتاب میر حسن کی ہے۔ اس میں عورتوں کی پوشاک عجیبہ کا حال بیان کیا گیا ہے اور طوایف کا بھی اس میں ذکر ہے اور مسلمانوں کی رسمات شادی کا بھی حال اس میں مندرج ہے"۔ ظاہر ہے کہ "سحر البیان" مثنوی بدر منیر کا نام ہے۔ چنانچہ میر حسن نے مثنوی مذکور کے خاتمہ میں لکھا ہے ع

نئی مثنوی ہے یہ سحر البیاں

منشی صاحب جس مثنوی کو سحر البیان کہتے ہیں وہ گلزار ارم ہے۔ لیکن وہ مثنوی بدر منیر سے بڑی نہیں "تذکرہ" ریختہ میں نہیں لکھا بلکہ فارسی میں لکھا ہے۔ رموز العارفین کا پتہ منشی کریم الدین کو بھی نہیں لگا۔ اور چوں کہ اُن کا تذکرہ ڈی ٹاسی کے تذکرہ سے ماخوذ ہے اس لئے ماننا چاہیئے کہ ڈی ٹاسی بھی اُس سے بیخبر تھا۔ تذکرہ بھی دیکھا نہیں۔ سماعی خبر لکھدی ورنہ اُس کی زبان کی بابت ایسی فاحش غلطی نہ ہوتی۔ یہاں ایک وقت اور ہے۔ آزاد نے آبحیات میں جو خط خود میر حسن کا قدرت اللہ خاں قاسم کے نام کا نقل کیا ہے اُس میں یہ عبارت ہے "تذکرہ در ریختہ ہم نوشتہ"۔ اس عبارت کے معنی خلافِ ظاہر یہ لینے ہونگے "در بیان شعرائے ریختہ نوشتہ" ورنہ یہ تو بعید از قیاس ہے کہ شعرائے ریختہ کے دو تذکرے میر حسن نے لکھے ہوں۔ ایک زبانِ ریختہ میں دوسرا فارسی میں۔ غالباً اسی خط کی عبارت سے منشی کریم الدین کو لغزش ہوئی۔

خدا کا شکر ہے کہ جو نعمت مؤلف آبحیات کے لئے پردۂ ظلمات میں رہی وہ مجھکو مل گئی۔ لکھنؤ سے کلیاتِ میر حسن کا نسخہ ہاتھ آیا۔ جو ۱۲۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ مطلا اور مذہب ہے اور اُس اہتمام سے لکھا گیا ہے جس اہتمام سے فارسی شعرا کے دواوین لکھے جاتے تھے

نعمت بالائے نعمت یہ ہی کہ صحیح ہی۔ قدرت اللہ خاں قاسم کا قول بھی اُس پر صادق ہی۔ انواعِ سخن سے لبریز ہی۔ چار سو صفحوں کا حجم ہے۔ تقریباً سات ہزار شعر ہیں۔ غزل کے اشعار قریباً چار ہزار ہیں چھوٹی بڑی گیارہ مثنویاں ہیں سات قصیدے ہیں مخمس، مسدس، مثلث، رباعی بھی ہیں۔ وہ ترکیب بند بھی (واسوخت کے نام سے) موجود ہی جس کا ذکر تذکرہ میں میر حسن نے کیا ہی۔ مرثئے نہیں ہیں۔ حالاں کہ میر حسن نے مرثیوں کا لکھنا تذکرہ میں لکھا ہی۔ اس مجموعے کی دستیابی سے آزاد کا وہ تاسف آمیز شکوہ رفع ہوجاتا ہے جو ان کو اخلاف میر حسن سے کلیات مرتب نہ کرنے کی بابت تھا۔

جوشِ عقیدت | سب سے اوّل شاہ عالم بادشاہ کا ذکر لکھا ہی۔ اس ادب کے ساتھ" ذکر اوّل بادشاہ جمجاہ سکندر سپاہ ظل اللہ شاہ عالم بادشاہ۔ ۔ خلد اللہ ملکہٗ و افاض اللہ برہ و احسانہٗ" اس ذکر کے بعد تذکرہ شروع ہوتا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چند کہ اُس عہد میں سلاطینِ مغلیہ کے ہاتھ سے سلطنت ظاہری جا چکی تھی مگر دلوں پر حکومت قایم تھی۔

ادبی نکتے | جس طرح میر صاحب نے "نکات الشعرا" کو ضمناً جا بجا ادبی نکتے اور فائدے بیان کرکے زینت دی ہی اسی طرح میر حسن نے اپنے تذکرہ کو آراستہ کیا ہی۔ ریختہ کی تعریف۔ "ریختہ اوّل از زبان دکن رواج یافتہ" اس لحاظ سے یہ گراں بہا جنس شاہجہانی اُردو بازار کی دُکانوں کی ملکیت نہ تھی" میر حسن اور میر تقی میر دونوں نے اپنے اپنے تذکرہ میں اس زبان کا نام یا ہندی لکھا ہی یا ریختہ۔ اُردو جہاں تک میرا خیال ہی کہیں نہیں لکھا۔ منشی کریم الدین نے اُردو کے ساتھ ہندوستانی بھی لکھا ہی) طرزِ متقدمین و متاخرین کا فرق"۔ طرزِ متقدمین بطور ایہام۔ طرزِ متاخرین بزبانِ حال ادائیہ"۔ میر تقی نے خاکسار کے اس شعر میں ؎

خاکسار اُس کی تو آنکھوں ہی گیے مت لگیو مجھکو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

یہ اصلاح دی تھی" بر متتبع ایں فن پوشیدہ نیست کہ بجائے "بیمار کیا"، "گرفتار کیا" می بایست"۔ میر حسن کہتے ہیں:" در عقلِ فقیر چنیں گزرد کہ اگر چشم خود می بود گرفتار مناسب بود۔ چوں اینجا چشم معشوق ست بیماری صحت دارد"۔ دیکھو کیسی باریک بات سمجھائی۔ راقم کا ایک شعر نقل کیا ہی ؎

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں کہنے کو ہی یہ بات کہ مقدور ہی نہیں

لکھتے ہیں کہ اس شعر میں "عین" (عاشقوں کا) تقطیع سے گرتا ہے اور یہ عینِ خطا ہے۔ مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا

میرا تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں

معینؔ بداؤنی کا ایک شعر ہے ؎

خوش ہم عُریانی سے اتنے ہیں برنگ بوئے گل　　نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک سے ہم

میر حسنؔ کہتے ہیں "خوش ہم عُریانی ناموزوں ست چراکہ "میم" با "را" چناں چسپیدہ است کہ "عین" چوں چشمِ غزال از میاں رَم کردہ۔ وایں سخت عیب ست"۔ سجّادؔ کا شعر ہے ؎

تجھے غیر سے صحبت اب آپنی　　اسی دوستی ہم سے ہے دشمنی

میر حسن کہتے ہیں "اسی دوستی" زبانِ قدیم ست یعنی برائے ہمیں" فی البدیہ۔ راجہ رام نراین موزوں تخلص۔ نواب سراج الدولہ کی طرف سے عظیم آباد کے صوبہ دار تھے۔ شیخ علی حزیں کے شاگرد "آشنا پرست" سیاہ دوست۔ فارسی کا ذوق تھا۔ ریختہ کا صرف ایک شعر کہا جو مشہور ہو گیا۔ اس کا واقعہ خود میر حسن کے الفاظ میں سنو "شعر ریختہ کم گفتہ بلکہ نگفتہ۔ مگر وقتیکہ خبر شہید شدن سراج الدولہ در شہر افتاد ہماں وقت فی البدیہ ایں شعر میخواند و از خبر داراں خبرمی پرسید و می گریست ؎

غزالاں۔ تم تو واقف ہو۔ کہو مجنوں کے مرنے کی　　دوانہ مر گیا آخر کو۔ ویرانہ پہ کیا گزری؟

ہمیں شعر از و یادگار ماند"۔ ذرا اس شعر کو مکرر پڑھو اور اس کے درد کا اندازہ کرو۔ اور یہ بھی غور کرو کہ ایک "آشنا پرست" ماتحت کے دل کی واردات کا سچا نقشہ ہے۔ کیا اس کے بعد مجھکو یہ کہنے کی اجازت ملے گی کہ تاریخ کے سیاہ کا، ـ بلیک ہول کے داغدار سراج الدولہ! تیرے دل میں تو محبت وہمدردی کا چراغ روشن نظر آتا ہے! اُن کے اُستاد میر ضیاؔ نے اپنے یہ شعر اُن کو سُنائے تھے ؎

تربت ضیا کی دیکھی کل رات دور سے میں　　آئے نظر مجھے واں شمع و چراغ کتنے

جا کر جو آج دن کو دیکھا میں کر تفحص　　اِک دل جلے ہے اُس میں حسرت کے داغ کتنے

سلام اللہ خاں تسلیمؔ ایک فارسی گو شاعر نے ترجمہ کر کے یہی مضمون اپنے نام سے مشہور کر دیا ؎

دوش رفتم بر مزارِ کشتۂ تسلیم خویش　　می نمود از دُور صد شمع و چراغِ حسرتے

چوں شدم نزدیک دیدم از تفحصا بسے — یک دلے میسوخت باوے چند داغ حسرتے

میرحسن خفا ہیں (اور خفگی بجا ہے) "تسلیم در فارسی ترجمہ کردہ بنام خود شہرت داد۔ این ندانست کہ در نظر صورت شناسان معانی متبنیٰ و فرزند پوشیدہ نمی ماند۔ مثل ہندی مشہور ست" ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں۔ جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں"۔ پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تسلیم کے شعر زبانِ فارسی کی قوت و صفائی کی بدولت ضیا کے اشعار سے زیادہ تا پدار ہیں خصوصاً اس صورت میں کہ ضیا کی زبان بوجہ قدامت ماند پڑ چکی ہے۔ مصرع اوّل میں "کشتۂ تسلیم" نے جان ڈال دی ہے۔

میرحسن صرف ادب اُردو کے نقاد نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شعرا کے کلام کی نقادی پر بھی پوری قوت تھی۔ اور ہر ایک کے طرز کا جدا جدا اندازہ حاصل تھا۔ چنانچہ اساتذۂ اُردو کے کلام کی طرز کو اساتذۂ فارسی کی طرز سے تشبیہ دیتے جاتے ہیں۔ میر ضیا "طرزش ما نا بہ طرزِ مولانا نسبتی"۔ میر تقی "طرزش مانا بطرز شفائی"۔ خواجہ میر درد۔ "دیوانش اگرچہ مختصر ست لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب"۔ میر درد کا ایک شعر سُن لو۔ حافظ کے بہت سے شعر یاد آجائیں گے ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہی چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

قایم چاندپوری "طرزش بہ طرزِ طالب آملی می ماند"۔ زبان کی ٹکسال دلی ہی۔ قایم مذکور کے حال میں "متوطن چاندپور ندینہ۔ چوں از ابتدائے جوانی در شاہجہاں آباد آمدہ بسر بُرد بنا برآں محاورۂ او درست گشت" معین بداؤنی کا ایک مصرع ہے۔ ع

نہ آیا یار، دوپہری بھی اب ڈھلی افسوس

میر صاحب لکھتے ہیں "ایں محاورہ دُرست نیست۔ مردم شاہجہاں آباد دوپہر ڈھلی میگویند۔ دوپہری مگر مردم بیرونجات"۔ ایک شعر میں شاعر موصوف نے "بتِ خانگی" باندھا ہی۔ میر حسن کہتے ہیں "بتِ خانگی نامانوس ست۔ فقیر در ہیچ جا نشنیدہ"۔

سرمایۂ مشترک یہ زمانہ صنعت و حرفت کی ترقی کا ہی۔ گوناگوں مصنوعات سے نہ صرف بازار بلکہ گھروں کے در و دیوار معمور ہیں۔ اسی سلسلے میں بہت سے مصنوعی مسائل کا انبار ہے جو ہماری زندگی پر مؤثر ہیں۔

انھیں مسائلوں میں سے ایک مسائلہ ملکی زبان کا ہی۔ ایک زبان صرف مسلمانوں کی ہے اُس کا نام اُردو ہے۔ دوسری ہندوؤں کی ہی اُس کو ہندی کہتے ہیں۔ ہندوستان کے چاروں گوشوں کو دیکھا۔ شہر۔ دہات۔ پہاڑ اور جنگل دیکھے مگر زبان کی یہ تقسیم کہیں عمل پزیر نہ دیکھی۔ تذکرۂ میر تقی میر اور تذکرۂ میر حسن کے مطالعہ سے صاف واضح ہی کہ ریختہ کہو اُردو کہو ہندی کہو جو نام چاہو رکھو مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی عام رائج زبان ہندو اور مسلمان اہلِ ادب کی محنتِ مشترکہ کا ثمرہ ہی۔ ابتدائے شاعری سے لے کر انتہا تک یہ اشتراکِ محنت عیاں ہے نکات الشعرا میں جہاں متقدمین شعرا میں خانِ آرزو اور قزلباش خان اُمید ہیں وہاں رائے انند رام مخلص اور ٹیک چند بہار بھی ہیں۔ متوسطین میں بندرابن راقم ہیں۔ میر حسن کے تذکرہ میں بھی بہت سے ہندو شعرا کا ذکر ہے۔ جن میں سے بعض جگت اُستاد تھے۔ مثلاً رائے سرب سنگھ دیوآنہ تخلص۔ اُن کی نسبت لکھا ہے "شاعر زبردست فارسی ست۔ شعر بسیار گفتہ است۔ اُستادِ ریختہ گویانِ لکھنؤ چنانچہ میاں حسرت و میر حیدر علی حیرآن واکثر دیگراں شاگرداویند۔ درآنجا مشہور و معروف ست" حسرتِ مذکور اساتذۂ لکھنؤ میں سے ہیں۔ جرأت کے اُستاد۔ شاگردوں کی یہ کثرت تھی کہ پہچان نہیں سکتے تھے۔ ایک اور معتبر شہادت۔ منشی کریم الدین نے تذکرۂ شعرائے ہند میں (جو ڈی ٹاسی کے تذکرہ سے ماخوذ ہے) طبقۂ دوم۔ اُن شعرا کے ذکر میں لکھا ہی جو مصلحِ اُردو اور مروج اس زبان کے تھے۔ اور اُنھوں نے الفاظِ کریہ کا استعمال یک قلم زبانِ ریختہ سے موتوف کر دیا۔ اس طبقے میں سب سے اوّل راجہ جسونت سنگھ متخلص بہ پروآنہ کا ذکر ہے۔ یہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے نائب راجہ بینی بہادر کے بیٹے اور رائے سرب سنگھ دیوآنہ کے شاگرد تھے۔ جرأت کی وفات کی تاریخ کیا خوب کہی ہی۔

"کہو جنت نصیب جرأت ہی"

سنہ ۱۲۲۴ ھ

پروآنہ کے دیوان کی بابتہ یہ رائے ظاہر کی ہی۔ "دیوان اس شاعر کا دیکھنے میں آیا۔ بہت اچھا۔ پاکیزہ اشعار اُس کے ہیں۔۔۔" اسپرنگر بہادر کے پاس وہ دیوان موجود تھا۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں حسب ذیل ہندو شعرا کا ذکر لکھا ہی۔ [1] رائے پریم ناتھ۔ [2] ٹیک چند بہار۔ [3] سنتوکھ رائے بیتوا۔ [4] رسیا ناتھ سنگھ۔ [5] لالہ سرب سنگھ دیوانہ [6] گھاسی رام خوشدل۔ [7] بندرابن راقم۔ [8] لالہ بلاس رائے رنگین۔ [9] لالہ خوشوقت رائے شاداب۔ [10] رائے بھکاری داس عزیز۔ [11] فارغ۔ [12] بدھ سنگھ قلندر۔ [13] لالہ کاشی ناتھ۔ [14] انند رام مخلص۔ [15] راجہ رام نراین موزوں۔ [16] عجائب رام منشی۔

لالہ نولؔ رائے وفاؔ۔ اِن حالات کے ہوتے ہوئے مذکورۂ بالا مصنوعی تفریق کو دیکھ کر چارۂ کار یہی ہی کہ ملک اور اہلِ ملک کے حال پر افسوس کیا جائے۔

اس عہد کی معاشرت

عموماً شعرا کی نسبت یہ خیال ہی کہ وہ ایک بیکار فرقہ ہی جو خیالی دنیا کی سیر میں مصروف ہی۔ کلام کی شوخی و رندی سے قیاس کیا جاتا ہی کہ قائل اپنی حالت کا مرقع کھینچ رہا ہی۔ واقعات اس خیال کا ساتھ نہیں دیتے طبقۂ شعرا میں کثیر حصّہ ایسے کاروباری آدمیوں کا تھا جن کا معیارِ اخلاق بلند تھا۔ اور جو شعرگوئی کو زندہ دلی کا سامان اور ادب کی خدمت تصور کرتے تھے۔ اِسی کے ساتھ اور کمالات انسانی میں قدرت و کمال پیدا کرتے تھے۔ ذیل کے شعرا کے اخلاق و مشاغل پر نظر ڈالیے۔ اُمید ہی کہ آپ بھی میرے ہمنوا ہونگے۔ میر اثرؔ: "خوش اوقات و نیک سیرت درویشے ست مؤقر۔ و صاحب سخنے ست موثر۔ عالم فاضل"۔ قاسمیؔ: "در علمِ تاریخ و شمشیرشناسی و لطیفہ گوئی دستے بہم رسانده"۔ رائے پریم ناتھ: "خطاطِ بے نظیر کمان دارِ دل پذیر۔ غزل فارسی خوب می گوید"۔ آگاہؔ: "بوسیلۂ قصّہ خوانی بسر می بُرد۔ دریں فن شاگردِ میر احمد مرحوم ست کہ بقصہ خوانی مشہور بود"۔ میر اعلیٰ علی: "خلیق و متواضع"۔ میر شیر علی افسوسؔ: "داروغۂ توپ خانۂ عالیجاہ جوانے ست ظاہر و باطن آراستہ۔ بحلم و حیا پیراستہ"۔ بیدارؔ: "بزیورِ حلم و حیا آراستہ"۔ حشمتؔ: "سپاہی پیشہ . . . فہمیدہ و سنجیدہ۔ متواضع و مؤدب"۔ رنگینؔ: "سپاہی پیشہ۔ خوش اوقات و نیک ذات۔ جوانِ محمد شاہی خطِ نستعلیق خوب می نویسد"۔ مہربان خاں رندؔ (اُس عہد کے اُمرا کا ایک نمونہ) نواب غالب جنگ بہادر والیِ فرخ آباد کے وزیر۔ "مجلسے رنگین و بزمے اِرم تزئین داشت"۔ ہر صادر و وارد کی فراخ حوصلگی سے خدمت کرتے تھے اہلِ سخن اور ہر فن کے اہلِ کمال سے ربط تھا۔ موسیقی اور ہندی شاعری میں جو گیتوں سے عبارت ہی، مشاق تھے۔ مرتبۂ امارت اتنا بلند تھا کہ خود اُمرا اون کی صحبت میں تھے۔ میر سوزؔ اور سوداؔ کے شاگرد تھے۔ موسیقی میں بہت سے راگ تصنیف کیئے تھے۔ فن تیر اندازی میں بھی میر سوزؔ کے شاگرد تھے۔ اور اس فن میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ شمشیرشناسی، ادب شناسی اور مردم شناسی بھی میر موصوف کی صحبت میں حاصل کی تھی۔ دیکھو ادب شناسی اور انسان کی قدردانی بھی اس زمانہ میں فن تھے جو اُستادوں سے حاصل کیئے جاتے تھے۔ اِس بیان سے خود میر سوزؔ کے کمالات کی نیرنگی معلوم ہوتی ہی۔ میر مظہر علی: "پاکیزہ سرشت و نیک شعار۔ جوانے ست بعلم و عمل آراستہ و بصلاح

وتقویٰ پیراستہ" سجّاد "موصوف باوصافِ حمیدہ۔ مخلوق باخلاقِ سنجیدہ . . . درلطیفہ گویاں . . . . طاق۔ در ہر امور کہ دخل کردہ بکمال رسانیدہ۔ علم طب ہم حاصل نمودہ . . . . . طلسمات۔ وانشا وخوش نویسی وشعرفہمی بمرتبہ اعلیٰ رسانیدہ" شوق "مردِ سپاہی پیشہ۔ صاحبِ دیوان۔ ازشاگردانِ سراج الدین علی خاں آرزو۔ مدّتے در سرکارِ نواب عمادالملک غازی الدین خاں بوسیلۂ سپہ گری بسر بُردہ" شاعر "جوانے ست بکمال صلاحیت آراستہ وبہ علم وعمل پیراستہ۔ اہلِ دل۔ مُنصف۔ متواضع مؤدب۔ بزرگ وبزرگ زادہ" نواب عمادالملک غازی الدین خاں (ایک اور امیر) "برجمیع علوم قادر ودرفنونِ سخن ماہر ازوزرائے ہندوستان . . . . . بود . . . . . ہفت قلم وہفت زبان" فغاں۔ "خانِ ظریف طبع۔ وخوش اختلاط۔ باہر کس خوش طبعی داشت . . . . لطائف وظرائف اومشہور ست" گریاں۔ "جوانے ست شائستہ . . . . سپاہی پیشہ" وحشت "سیدزادہ خوش اوقات ونیک صفات۔ جوانِ وضع دار ودرفنِ سپہ گری اُستوار" لالہ نول رائے وفا" ازتذکرۂ محمد قائم چناں ظاہر ست کہ جوانے ست نوخاستہ۔ بزیورِ علم وعمل آراستہ . . . صاحبِ حلم وحیا۔ لطافتِ مزاج ازگُل زیادہ . . . . برادرِ خوردش راجہ گلاب رائے دیوان مدارالمہام امیرالدولہ نواب نجیب خاں مرحوم بود۔ لیکن ایں عزیز مصروفِ اکتساب وغریقِ مُطالعۂ کتاب۔ طلبِ ہرکمال دامن گیرِ حال۔ طبع دردمند داشت"

یہ نہ خیال کرنا کہ میر حسن صاحب کے یہاں حُسنِ بیان وحُسنِ ظن کا دفتر کُھلا ہوا ہی اور ہر شخص سندِ تعریف سے سرفراز ہوتا ہی۔ اصل یہ ہی کہ وہی لکھا ہی جو خود دیکھا یا دوستانِ حقیقت داں سے سُنا۔ چنانچہ دیباچہ میں لکھ دیا ہے۔ "پس از دریافتِ حالِ خیر مآلِ صاحبِ سخن شمّۂ کہ از دوستانِ حقیقت داں مسموع نمودہ درذیلِ اشعارِ ہریک نوشتہ" ایسے شعرا بھی ہیں جن کی اخلاقی حالت معلوم نہ ہوئی اُن کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ مثلاً مصحفی۔ اُن کے کلام کی فصاحت اور بلاغت کی تعریف کی ہی۔ مگر اخلاقی حالت چونکہ معلوم نہ تھی اس لیئے صرف اس قدر لکھا ہے " ازتخلص معلوم می شود کہ مردِ صالح ست"

مذکورۂ بالا اقتباس اہلِ انصاف کو اِس امر کا معترف کرنے میں کامیاب ہوگا کہ شعرائے ماضی نکوہیدہ حال نہ تھے۔ بلکہ علم واخلاق سے آراستہ انسان تھے۔ کیا اِس سوال کا موقع ہی کہ آج کل کے مدعیانِ کمال کہاں تک علم وادب کی خدمت کر رہے ہیں؟

بزرگانِ دین کی توجہ ادبِ اردو پر

عام خیال یہ ہے کہ بزرگانِ دین و علمانے اُردو ادب کی جانب توجہ نہیں فرمائی۔ اس خیال کو واقعات سے مطابق کیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو ادب نے شروع سے حضرات اولیاے کرام کی آغوشِ شفقت میں تربیت پائی ہے۔ ریختہ کے اُستادِ اوّل (بقولِ میر حسن) وَلی دکنی ہیں۔ میر تقی میر اور میر حسن دونو کی شہادت ہے کہ دلّی میں آکر حضرت شاہ گلشن قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر رہے۔ اور فیض حاصل کیا۔ ریختہ میں فارسی کے مضامین رنگین استعمال کرنے کا مشورہ حضرت ہی نے دیا۔ میر حسن کی اصل عبارت: "ولی . . . . . از خاکِ گجرات . . . . . در وقت عالمگیر بہ ہندوستان جنت نشان آمدہ در خدمتِ شاہ گلشن قدس اللہ سرہٗ استفادہ حاصل نمودہ۔ از توجہ آں بزرگوار مقبولِ اعلیٰ و ادنیٰ گردید۔"

اُردو شاعری کے تیسرے دور کے ارکانِ چہارگانہ میں سے دو رُکن وہ عالی مرتبہ بزرگ ہیں جن کی تعلیم سے ہزاروں انسان زندگی کے مقصد سے واقف اور شاہدِ مقصود کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ یعنی حضرت خواجہ میر دردؔ اور حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں قدس سرہما۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ یہ شوق حضرات نقشبندی سلسلے میں اس طرح اُردو ادب کا نقشِ اوّل و ثالث حضرات نقشبندیہ کی توجہ کا منت پذیر ہے۔ آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں: "اپنے اُستادوں اور بزرگوں سے یہی سُنا کہ مرزا جانِ جاناں۔ سودا۔ میر۔ خواجہ میر درد۔ یہ چار شخص تھے جنھوں نے زبانِ اُردو کو خراد اُتارا ہے۔" آخر الذکر دو حضرات نے گوناگوں اسلوبوں سے ادبِ اُردو کو ترقی بخشی۔ خود اُستادانہ کلام کہا۔ اپنے فیضِ اثر سے اُس کو مقبول بنایا۔ شاگردوں کی تربیت کی۔ حضرت خواجہ میر دردؔ کو دیکھو۔ خود قادر الکلام اُستاد ہیں۔ چھوٹے بھائی اثرؔ ہیں۔ صاحبزادہ المؔ۔ قائم چاندپوری اور رہکاری داس عزیز زمرۂ تلامذہ میں ہیں۔ میر حسن نے حضرت ہی کی خدمت میں ذوقِ سخن کی پختگی حاصل کی۔ حضرت میرزا صاحب خود اُستادِ فن یقین و حزین زمرۂ تلامذہ میں۔ اِن حضرات کے علاوہ الہ آباد کے دائرے بھی اس ذوق سے پُر صدا تھے۔ حضرت شاہ اجمل سجادہ نشین حضرت شاہ خوب اللہ اور اُن کے برادرِ بزرگوار شاہ غلام قطب الدین مُصیبتؔ بھی شاعرانِ اُردو میں شامل ہیں۔

ایک لطیف بحث

میر تقی میر نے اپنے کلام کا انتخاب نکات الشعرا میں درج کیا ہے۔ میر صاحب کا کلام اُس پر اُن کا انتخاب۔ سونے میں سُہاگہ۔ مگر آفریں میر حسن کے انتخاب کو کہ میرؔ کے کلام کا انتخاب خود میرؔ سے بہتر کیا۔

مشتے نمونہ از خروارے - اشعارِ ذیل میر حسن کے انتخاب میں ہیں - میر صاحب کے انتخاب میں نہیں ؎

کہا میں نے کتنا ہی گُل کا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسّم کیا

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اُٹھے
ہی خیر - میر صاحب - کچھ تم نے خواب دیکھا

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا
کیا جدائی کو منھ دکھاؤنگا

اِن اشعار کی بابت یہ کہا جاتا ہی کہ چونکہ ان اشعار کے ہم طرح اشعار میر کے تذکرہ میں نہیں ہیں اس لئے ممکن ہی کہ ترتیب تذکرہ کے بعد کہے ہوں اِس لئے انتخاب میں نہ آئے ہوں - مگر یہ ہی کہ جن غزلوں کے اشعار منتخب کرکے خود میر صاحب نے لکھے ہیں اُن ہی غزلوں سے بعض ایسے نادر اشعار میر حسن نے انتخاب کرلئے ہیں جو خود میر کے انتخاب سے زیادہ نادر ہیں - اور یہ ایک انسانی کمزوری کا پہلو ہی کہ بعض اوقات خود اپنے کمال پر وہ قلم پھیر دیتا ہی - تذکروں میں لکھا ہی کہ زلالی خوانساری کی معرکۃ الآرا مثنوی محمود ایاز کا مسودہ دیکھا گیا تو اُس میں بعض ایسے نادر اشعار زلالی نے کاٹ دیئے تھے جو فارسی ادب کے لئے مایۂ ناز ہیں - مثلاً - شبِ تاریک کی تشبیہ میں یہ بے نظیر شعر ؎

ستارہ می نمود سے در میانہ
چو چشم گربہ در تاریک خانہ

ایسے متعدد اشعار اہلِ نظر احباب نے مثنویِ مذکور میں بعد کو اضافہ کردیے ہیں -

خلاصۂ کلام - نمونہ کلام مذکور ملاحظہ ہو - ایک غزل ہی - دیدار دیکھنا - گلزار دیکھنا - اس غزل کے یہ اشعار میر نے انتخاب کیئے ہیں ؎

آنکھوں میں جی مرا ہی ادھر یار دیکھنا
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

ہونا نہ چار چشم دل اُس ظلم پیشہ سے
ہشیار - زینہار خبردار دیکھنا

میر حسن اِسی غزل کے یہ شعر انتخاب کرتے ہیں ؎

صیاد دل ہی داغِ جدائی سے رشکِ باغ
تجھ کو بھی ہو نصیب - یہ گلزار دیکھنا

دوسری طرح - روتا رہیگا - سوتا رہیگا - اِس غزل کے یہ شعر انتخاب میر میں ہیں ؎

جو اس شور سے میر روتا رہیگا　　　تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہیگا
تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے　　　ہمیں کچھ کہیگا تو ہوتا رہیگا

میر حسن کے انتخاب میں یہ شعر ہی ؎

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے　　　جسے ابر ہر سال روتا رہیگا

ایک تیسری طرح ہی۔ یار افسوس۔ ہزار افسوس۔ انتخاب میر ؎

مرگیا میں ملا نہ یار افسوس　　　آہ افسوس صد ہزار افسوس
یوں گنوا بیٹھا ہی دل کوئی۔ مجھ کو　　　گے آتا ہے بار بار افسوس

انتخاب میر حسن ؎

رخصت سیر باغ ہمیں نہ ہوئی　　　یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

ایک چوتھی طرح۔ وفائے بلبل۔ جائے بلبل۔ انتخاب میر ؎

گل کی جفا بھی دیکھی۔ دیکھی وفائے بلبل　　　یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

انتخاب میر حسن ؎

کی سیر جذب الفت گلچیں نے کل چمن میں　　　توڑا تھا شاخ گل کو نکلی صدائے بلبل

یہ شعر ایک دیوان پر بھاری ہی۔ میر صاحب کا اس کو منتخب نہ کرنا سراپا حیرت ہی۔

میر حسن کے اس حسن انتخاب نے یقین ہی کہ طبائع کو اُن کے انتخاب کا مشتاق کردیا ہوگا اس لیئے دل چاہتا ہی کہ اور انتخاب بھی ناظرین مقدمہ کی ضیافت طبع کے لیئے یہاں لکھ دوں۔

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں زندہ و مُردہ دونو کو غایت شفقت کے ساتھ دعائے خیر سے یاد کیا ہی۔ اور دیباچہ میں غرض تالیف تذکرہ بھی یہی لکھی ہی کہ اس کو پڑھ کر شاید کوئی مجھ کو دعائے خیر سے یاد کرے۔ لہذا خاتمۂ مقدمہ پر دعا کرتا ہوں۔ ناظرین آمین کہیں۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَتَجَاوَزْ عَنْ سَيِّاٰتِهٖ

انتخابِ اشعار

آبرو — دُور خاموش بیٹھ رہتا ہوں — اِس طرح حالِ دل کا کہتا ہوں
دِل کب آوارگی کو بھولا ہے — خاک گر ہو گیا بگولا ہے
شوق سے جس گھر میں ہو تو جلوہ گر — آئینے ہو جائیں دیواروں میں دل

اثر — بس رفع اب خیالِ مئے و جام ہو گیا — ساقی۔ بیک نگاہ مرا کام ہو گیا
دردِ دل چھوڑ جائیے سو کہاں — اپنے باہر تو یاں گزر ہی نہیں
کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے — اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں
اثر کیجئے کیا کدھر جائیے — مگر آپ ہی سے گزر جائیے
بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر — مجکو میری وفا ہی راس نہیں
یوں خدا کی خدائی برحق ہے — پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں
عاشقی اور عشق کی باتیں — سب جہاں سے اثر کے ساتھ گئیں

اسد — جیوں تیوں اسد کو لائے تم اُس کی گلی تک — خانہ خراب۔ راہ میں پر۔ پھر مچل گیا

آزاد — پوچھتے کیا ہو کہ بیداد کروں یا نہ کروں — یہ تو فرماؤ کہ فریاد کروں یا نہ کروں
وعدۂ وصل تو کرتے ہو مگر سچ کہیو — دل کو اِس وعدہ سے میں شاد کروں یا نہ کروں

عاصی — مثالِ آئینہ ہم نے سبھی نقشِ جہاں دیکھا — جہاں دیکھا ہر صورت تجھے قالب میں جاں دیکھا
قیامت کی عقوبت ساری ہجرِ یار میں گزری — وہاں تھا دیکھنا جو کچھ سو سب ہم نے یہاں دیکھا

اِنشا — ہوئے ہیں خاکِ سرِ راہ اُس کے ہم اِنشا — بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

افسوس — اُس کے اُٹھتے ہی جی پہ آن بنی — دیکھئے آگے آگے کیا ہوگا

بیان — اب ہجر میں کہتا ہے کہ تھا وصل میں آرام — نالاں ہی بیاں میں نے تو دیکھا تجھے جب بھی

پیوے شراب جو انو کہ موسم گل ہی — ہمیں بھی یاد وہ عہد شباب آتا ہی
جاتا ہی یار کچھ تو بیاں منہ سی بول لے — اے بے نصیب مانع گفتار کون ہی
ہووےگا ذوق حسرت دیدار میں خلل — شیریں گزر نہ کیجیو فرہاد کی طرف

رباعی

سو طرح سے یہ عشق لبھاتا ہی مجھے — ہر چیز میں آ جلوہ دکھاتا ہی مجھے
کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہی یارب — ہر چاہ میں یوسف نظر آتا ہی مجھے

رباعی

دنیا سے بیاں چلا ہوں روتے روتے — گزری شب عمر اپنی سوتے سوتے
ظلمات میں تھا آب بقا پر افسوس — روشن یہ ہوا صبح کے ہوتے ہوتے

بیتاب دل چھین لیا میرا بنارس کے بتوں نے — اس وقت میں تو اے مرے اللہ کہاں ہی
بسمل ان کی مسند کی کیا کروں تقریر — نقش ہے روئے خاک پر تحریر
تاباں عجب احوال ہی تاباں کا تیرے — کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا
سید محمد تقی (عرف میر گھاسی) تو ہو اور باغ ہو اور زمزمہ کرنا بلبل — تری فریاد سے جیتا ہوں نہ مرتا بلبل
جرأت آنے کی خبر ہی اس کی لیکن — آتا نہیں اعتبار دل کو
آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں — ہی عین ہجر ہی میں میسر وصال دوست
بات میں کس کی سنوں آہ کہ اے مرغ چمن — شور میں اپنے ہی نالوں کے سدا رہتا ہوں
اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں — تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں
کچھ تو نکلے آرزو دشنام دے تلوار کھینچ — چشم حسرت سے کہاں تک دم بدم دیکھا کریں
چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا — دن گیا رات ہوئی رات گئی دن آیا
حاتم حاتم بجز کس کا تجھ بن کون ہے — کون ہوگا جو نہ ہوگا تو مرا
حزیں ویراں ہوا ہی باغ خزاں سے یہاں تلک — چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

حسن

تھی ہمیں سیر کوئی دن اُسی میخانے کی — اب خبر ہے نہ صراحی کی نہ پیمانے کی
تیغ ابرو نے تو مارا ہی تھا جو زلف نہو — غیر زنجیر خبر کون لے دیوانے کی
اے حسن آپ کو سمجھیگا تو کیا بس چپ رہ — سرِ حق ہے یہ نہیں بات ترے پانے کی

حیران

دلِ ستم زدہ کا آج پوچھتے ہو حال — غمِ فراق سے کب کا ہُوا ہشت نصیب

حسرت

کہے وہ اپنے منھ سے قتل حسرت کو کیا میں نے — مرے مرنے کی عالم میں خبریوں ہو تو بہتر ہے

قطعہ

تم جو کہتے ہو کہہ دو حسرت کو — آہ و فریادیاں کیا نہ کرے
آپ کا اس میں کیا بگڑتا ہے — دردِ دل کی کوئی دوا نہ کرے

عشق کب تک آگ سینے میں مرے بھڑکائیگا — راکھ تو میں ہو چکا کیا خاک اب سلگائیگا
نو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں — لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائیگا
قیامت مجھپہ شب اُس کا ترحم اور تظلم تھا — کبھی تھیں گالیاں منہ پر کبھی لب پر تبسم تھا
ایسی ہی آہ باتیں اُس بے وفا نے چھیڑیں — رو تے ہی روتے جس میں روزِ وصال گزرا
اُس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا — جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا
چھوڑ دے کوئی کسی کے لیئے جس طرح سے کچھ — ہم نے مِنت میں تری کون و مکاں چھوڑ دیا
کرتے تو مجکو قتل کیا ہی پر اب حسن — کیا کیا نہ اپنے جی سے وہ باتیں بنائیگا
جز اشکِ بلبل اب نہیں گُل شاخسار پر — کیا اوس پڑ گئی ہے چمن میں بہار پر
اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے تو کیا — ہو چکی واں بہار ہی آخر
مردمِ چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں — ایک عالم کو نظربند کیا پہرے میں
ہزار حیف کچھ اپنی ہمیں خبر نہ ہوئی — تمام عمر لگی پر فہم یہ سر نہ ہوئی
شبِ فراق میں رو رو کے مر گئے آخر — یہ رات جیسی تھی ویسی رہی سحر نہ ہوئی
جان و دل ہیں اُداس سے میرے — اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

[illegible] - میر حسن - تخلص بحسن

جب قفس میں تھے تو تھی یادِ چمن ہم کو حسن　　اب چمن میں ہیں تو پھر یادِ قفس آتی ہے
کیا ہنسے اب کوئی اور کیا رو سکے　　دِل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے
کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گزرتی　　پر ایک جان تو ہی جس بن نہیں گزرتی
کچھ ہو نہ ہووے ہو تیرا خیال ہر دم　　اِس بِن نہیں گزرتی اس بن نہیں گزرتی
رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا　　بس اے زندگی ایسی ہستی سے گزرے

رُباعی

دُنیا داری میں اور نہ دیں داری میں　　چاہت میں کسی کی ہیں نہ بیزاری میں
حیرت کدۂ دہر میں تصویر کی طرح　　سویا کرتے ہیں عین بیداری میں
پہنچے نہ حسن منزلِ مقصود کو ہم اور　　آخر ہوئے سب زیست کے ایام سفر میں

کرم اللہ خاں دردؔ　اگر وہ بت کسی صورت سے میرا رام ہو جائے　　تو پوجوں اس عقیدت سے کہ کفر اسلام ہو جائے
تری ترچھی نگاہوں نے کیا ہے نیم بسمل کر　　اگر پھر کر نظر دیکھے تو میرا کام ہو جائے
تحمل آتشِ غم میں دلِ بیتاب کیا جانے　　ٹھہرنا ایک دم بھی آگ پر سیماب کیا جانے
کنارے سے کنارہ کب ملا ہے بحر کا یارو　　پلک لگنے کی لذت دیدۂ پُر آب کیا جانے

حضرت خواجہ میر دردؔ　خوابِ عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے　　آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے
بارے مجھے بتا تو سہی کیا سبب ہوا　　پھر مجھ پہ مہربان ہوا تو غضب ہوا
کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اُس کو بھی　　جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا
مدرسہ یا دیر یا کعبہ تھا یا بت خانہ تھا　　ہم سب ہی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ　　وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
جان سے ہو گئے بدن خالی　　جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری　　آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دُنیا کو دیکھا نہ دیکھا

سینۂ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس دل گھبرا گیا

تُجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جُز جفا
پر وہ کیا کچھ تھا کہ دل کو بھا گیا

کسی سے کیا بیاں کیجے اِس اپنے حال ابتر کا
دِل اُس کے ہاتھ دے بیٹھے جسے جانا نہ پہچانا

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ کچھ طاعت کی خاطر کم نہ تھے کرّوبیاں

ہم کس ہوس کی تجھ سے فلک جُستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک دم میں یہ کثرت نمائیاں
گر آئینہ کے سامنے ہم ایک ہو کریں

تیرے سوا نہیں کوئی دونو جہان میں
موجود ہم جو ہیں بھی تو اپنے گمان میں

کیا فرق داغ و گل میں اگر گُل میں بُو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

اپنے بندوں پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
پر نہ آ جائے کبھی جی میں کہ آزاد کرو

اِس ہستیِ خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشّۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

نہ وہ نالوں کی شورش ہے نہ وہ آہوں کی ہے دھونی
ہُوا کیا دردؔ کو یا رب یہ گلی کیوں آج ہے سونی

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں نے پوچھا تو کہا۔ خیر یہ مذکور نہ تھا

رباعی

کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم
تھے آپ ہی ایک سو۔ گئے ہم

جوں آئینہ جس پہ یاں نظر کی
ساتھ اپنے دوچار ہو گئے ہم

رباعی

اے دردؔ یہ درد جی سے کھونا معلوم
جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم

گلزارِ جہاں ہزار پھولے لیکن
میرے جی کا شگفتہ ہونا معلوم

رباعی

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی — اے وردؔ کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیان کریگا اس کو — کہتے ہیں ہم آپ اب کہانی اپنی

درخشاںؔ۔ تھی دِرائے ناقۂ لیلےٰ کی ہر دم یہ صدا — آہ مجنوں پا شکستہ رہ گیا محمل سے دُور

رسواؔ — رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے — ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے
وصل میں بیخود رہے اور ہجر میں بیتاب ہو — اِس دِوانے دل کو رسواؔ کس طرح سمجھائیے
وہ کون سی زمیں جو اشکوں سے نم نہیں — رسوائی اس زمانہ میں مجنوں سے کم نہیں
دیگرے را در گرفتاری شریکِ ما مکن — مدعا گر شہرتِ حسن ست یک رسواؔ بس ست

رندؔ — سینے سے داغِ عشق مٹایا نہ جائیگا — ہم سے تو یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

راقمؔ — پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب — یا رب عجب طرح کا کچھ آزار ہے مجھے
سنتے ہیں ہم کہ ہوتی ہے جگ میں دوامِ صبح — ہوگی کبھی اے چرخ ہماری بھی شام صبح

قطعہ

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض — ہم کو قسم جو توڑیں ترے برگ و بر کہیں
اتنا ہی چاہتے ہیں کہ ہم اور عندلیب — آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھکر کہیں
کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے — اُڑا دیتے ہیں اُس کی بات ہنس کر

رضاؔ — دُنیا میں کوئی تجھ سا ستمگار نہیں ہے — بے رحم جفا پیشہ و خونخوار نہیں ہے

زارؔ — چھوٹ جاویں غم سے ہر دم کے جو نکلے دم کہیں — خاک ہے یہ زندگی جو تم کہیں اور ہم کہیں
ایک دن آگے ہی دُنیا سے اُٹھانا ہم کو — شبِ فرقت تو الٰہی نہ دکھانا ہم کو
ہمیں تو فرش سے اور تکیۂ مخمل سے بہتر ہے — گلی میں اُس کی پڑ رہنا سرہانے ہاتھ کو دھر کے

سراجؔ — نہیں ہے تاب مجھے تیرے سامنے جانا — کہاں سراجؔ کہاں آفتابِ عالم تاب
اوس بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی — جس رات چاند نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی

شعلہ جو جب سے نظر آتا نہیں | لوٹتا ہے تب سے انگاروں پہ دل

وہ ظالم مجکو جلتا دیکھ کر اتنا نہیں کہتا | کہ کیا ثابت قدم ہے کیوں نہو آخر سراج اپنا

سعادت

واللہ جو سرِ لوح ترا نام نہوتا | ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا

سجاد

جان و دل سب قبول ہے جانا | پر گلی میں تری مجھے آنا

اس فصلِ گل میں جوشِ جنوں کا ہوا ہے قہر | جنگل میں آب ہی نکل کر تمام شہر

اس زمانے میں دوستی کا رنگ | آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

سودا

سودا کا تو نے حال نہ دیکھا کہ کیا ہوا | آئینہ لے کے آپ کو دیکھے ہے تو ہنوز

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں | جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

فکرِ معاش و ذکرِ بتاں یادِ رفتگاں | اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

گر ہو شراب و خلوت و معشوقِ خوبرو | زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

عشرت سے دو جہاں کی یہ دل ہاتھ دھو سکے | تیرے قدم کو چھوڑ سکے یہ نہو سکے

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں | تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

منڈا کر خط تم اپنے حق میں کیوں کانٹوں کو بوتے ہو | یہ عارض گل نہو وینگے عبث سبزہ بھی کھوتے ہو

صورت میں تو کہتا نہیں اب کوئی کب ہے | اک دھج ہے کہ وہ قہر ہے آفت ہے غضب ہے

پوچھے ہے پھول پھل کی خبر اب تو عندلیب | ٹوٹے جھڑے خزاں ہوئی پھولے پھلے گئے

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی | اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

نہ تلطف نہ مروت نہ محبت نہ وفا | سادگی دیکھ کے اس پر بھی لگا جاتا ہوں

محمد میر سوز

یاروں درجا ہے اللہ | کیا زمانے کا انقلاب ہوا

سوز کچھ منہ بنائے آتا ہے | آج مجرے کا پھر جواب ہوا

اہلِ یہاں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا | آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

بغیر از عاشقی کچھ کام مجھ سے ہو نہیں سکتا | تڑپنے کے سوا کچھ کام مجھ سے ہو نہیں سکتا

نل نے ہر استخواں میں درد کی آواز ہے — کچھ نہیں معلوم یارب سوز ہے یا ساز ہے

شاعر
اپنے مطلب کی کہے جائینگے ہم — گرچہ سو بار نہیں کیجیئے گا

ضیا
کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی ای ننگِ خلق — اُس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

مجھ سا بندہ نہیں خدائی میں — ہاتھ سے اے صنم نہ کھو مجکو

آہستہ پانو رکھیو اے بوئے گل چمن پر — سوتے ہیں اس زمیں میں نازک دماغ کتنے

اِک تبسم میں کیا خلق کو ساری تسخیر — مسکرانا ہے ترا یا کہ کوئی افسوں ہے

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا — آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

کبھی جا گل کو دیکھے ہیں کبھی دیکھے ہیں نرگس کو — خدا جانے یہ چشم اپنی پھرے ہے ڈھونڈتی کس کو

ہم نہ ثمر نہ ہم نہال ہوئے — اُگتے ہی ہم تو پائمال ہوئے

دل کے جلنے پر نہ کی رقت کسی نے رحم سے — خود بخود جل بل یہ انگارا دہک کر رہ گیا

کعبہ میں چھپ رہا ہے یا دیر میں نہاں ہے — خانہ خراب جلدی تو بول اُٹھ کہاں ہے

کیا کہا قاصد ضیا سنتے ہی جس کے مرگیا — بات تھی کچھ یاس کی یا ہجر کا پیغام تھا

ظہور
چشمِ گریاں حسن سے معمور ہے — چاندنی برسات کی مشہور ہے

مرزا عسکری
بات اب امتحان پر آئی — قصہ کوتاہ جان پر آئی

عشق
کہنے کو اِدھر اُدھر گئے ہم — تھے تیری طرف جدھر گئے ہم
تھا کعبہ و دیر سے کسے کام — مقصود تھا وہ جدھر گئے ہم

فراق
اسیروں قسم تجکو صبا سے کہہ کہ گلشن میں — کوئی اُن ہمنواؤں سے ہمیں بھی یاد کرتا ہے

فقیر
زندگی موجِ آب ہے گویا — دم کا آنا حباب ہے گویا

فغاں
دل تنگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے — گویا کبھی چمن میں مرا آشیاں نہ تھا
یہ امتحاں نہ کر اے میرے مہربان عزیز — جہان میں کوئی تجھ سے رکھیگا جان عزیز
فغاں کو وصل میں آرام کیا ہو — جدائی کا تصور بندھ رہا ہے

فدوی — فدوی مرا ہی کام ہے ور اُٹھکے جسطرح / رکھتا ہوں تھام تھام دلِ بیقرار کو

فارغ — اشک آنکھوں سے جو نکلا سو وہ گوہر نکلا / بعد مدت کے مری چشم کا جوہر نکلا

افصح — کر یاد تجھے جدھر گئے ہم / ہم تو نہ رہے کدھر گئے ہم

* سرمۂ چشمِ جہاں ہیں ہونا / خاکساری کی کرامت دیکھی

قائم — ان دنوں چرخ پر نہیں یہ مہر / گود میں کانگڑی لیئے ہے سپہر

دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات / کالے کمل میں رات کاٹے رات

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا / آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہر دم آنے سے میں بھی نادم ہوں / کیا کہوں پر رہا نہیں جاتا

یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام کسی کا / پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا

ہم نے ہر طرح ہجر میں دل شاد کیا / ہچکی آئی تو یہ سمجھے کہ ہمیں یاد کیا

کوہ اور دشت میں بھی ہم نہ رہے آسودہ / ماتمِ قیس کیا یا غمِ فرہاد کیا

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر / روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

خوب نکلے ہم اُس کے کوچہ سے / ورنہ آئے تھے اِک عذاب میں رات

آہ اے پیر چرخ قائم نام / یاں جو رہتا تھا اِک جواں ہے یاد

بے شغل نہ زندگی بسر کر / گر اشک نہیں تو آہ سر کر

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی / اِس سے جو کوئی جیا تو مر کر

وہ محو ہوں کہ مثالِ حباب آئینہ / جگر سے اشک نکل تھم رہا ہے آنکھوں میں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں / یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں

میں کہا۔ عہد کیا کیا تھا رات / ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

ناز و ادا کہیں کہیں عجز و نیاز ہے / کس کس طرح سے یار مرا جلوہ ساز ہے

حسرتِ دل کو میری سمجھے وہی جسے / یار نے آکے دمِ باز پسیں دیکھا ہے

گو کہیں یار نے بلایا ہے وہ اب آتا ہے
پر اُسے میں تو سمجھتا ہوں وہ کب آتا ہے

شام ہوتی نہیں اک دل پہ بلا ہوتی ہے
صبح ہوتی نہیں اک جی پہ غضب آتا ہے

مرجائیے کسی سے پر الفت نہ کیجیے
جی دیجیے تو دیجیے پر دل نہ دیجیے

شبِ گریہ سے وابستہ مری دل شکنی تھی
جو بوند تھی آنسو کی سو ہیرے کی کنی تھی

مردنِ دشوار میں یہ جانِ بے تقصیر ہے
حسرتِ دل سو طرف سے اس کے دامن گیر ہے

فلک نے لائے تو ہی ہم کو لیکن ڈر ہے
کہ بُلبُلا سا کہیں آپ ہی بہا نہ پھرے

مجھ سا کوئی جہان میں آشفتہ سر نہیں
ہے یوں تو زلفِ یار بھی پر اس قدر نہیں

قائم میں عندلیبِ خوش آہنگ تھا ولے
زاغ و زغن کے ساتھ کیا ہم قفس مجھے

آج اے گریہ خبر لے مرے دیوانے کی
کچھ رکا جاتا ہے دل گرد سے ویرانے کی

آج کی رات جو اس گُل کا میسر ہو وصال
شمع روشن کروں میں خاک پہ پروانے کی

قدرت

اہلِ عدم کو رمزِ فنا کا تھا کب شعور
سرِ مشقِ زندگاں مرا لوحِ مزار تھا

تڑپوں ہوں خاک و خوں میں پڑا اس کے وار سے
قدرت میں کیا کہوں یہ وہی شہسوار تھا

کس کی نیرنگی یہ شمع پردۂ فانوس ہے
جو شرر دل سے اُٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے

جوں نقشِ قدم ہیں ترے وہ خاک نشیں ہم
تا مٹ نہ چلیں آپ سے چھوڑیں نہ زمیں ہم

سینہ اُس کا ہے دل اُس کا ہے جگر اُس کا ہے
تیرِ بیداد جدھر رُو کرے گھر اُس کا ہے

قربان

یوں بندِ قبا کھل گئے جو آن میں گُل کے
کیا پھونک دیا تو نے صبا کان میں گُل کے

کیا کچھ دلِ بلبل پہ کرے دیکھیے یہ عشق
سو چاک دئیے جس نے گریبان میں گُل کے

رباعی

کافر

کیا بھرتی ہے میکدے میں مٹکی مٹکی
زاہد عابد سے دور چھٹکی پھٹکی
قاضی کا نہ ڈر نہ محتسب کا کافر
یہ دخترِ رز بھی جس سے آ کے اٹکی

کلیم

آتی ہے دل پہ قلقلِ مینا سے [illegible]
وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

گماں

مدت سے ہو رہا تھا مرا داغ داغ دل — اس گل کے دیکھتے ہی ہوا باغ باغ دل

فیضِ گل سے پھر ہوا اب گرم بازارِ چمن — مُشتِ پر لئے کر ہوئی بلبل خریدارِ چمن

مجھے تو زیست بھی دشوار ہو گئی ہے اب — خدا کرے کہ گماں دل مرا سنبھل جائے

قتل کر مجکو مری نعش پہ بولا قاتل — ہائے یارو یہ گماں تھا؟ مجھے معلوم نہ تھا

گریاں

دیکھے تو جسے نگاہ بھر کر — مر جاوے وہیں وہ آہ بھر کر

سبک دوشی یہ پروانے کی جی کو داغ کرتی ہے — کہ دوشِ شمع پر رکھتا نہیں بارِ کفن اپنا

مضمون

ہم نے کیا کیا نہ ترے ہجر میں محبوب کیا — صبرِ ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

میر مداللہ۔ زند۔

اشک آنکھ سے دل ہاتھ سے جی تن سے چلا جائے — اے وائے مصیبت کوئی کس کس کو سنبھالے

منعم

بھولی نہیں ہے مجکو بتوں کی ادا ہنوز — دل کے نگیں پہ نقش ہے نامِ خدا ہنوز

تصویر اُس کی کھینچ کے ناز و ادا کے ساتھ — نازاں ہے اپنے آپ پہ دستِ قضا ہنوز

محمد تقی۔ میر

کیا دن تھے وہ کہ یاں بھی دلِ آرمیدہ تھا — رو آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ تھا

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا — بیچارہ گریہ ناک گریباں دریدہ تھا

ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم — عمر گذری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

جی گیا میر کا اِس لیت و لعل میں لیکن — نہ گیا ظلم ہی تجھ سے نہ بہانا ہی گیا

کہاں آتے میسر تجکو تجھ سے خود نما اتنے — یہ حسنِ اتفاق۔ آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

صیاد دل ہے داغِ جدائی سے رشکِ باغ — تجکو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے — جسے ابر ہر سال روتا رہیگا

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا — جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے — ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا — خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا / کیا جدائی کو مُنہ دکھاؤں گا

کھُلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُسکے میرؔ / سمندِ ناز کو اِک اور تازیانہ ہوا

مانندِ شمعِ آتشِ غم سے پگھل گیا / بزمِ جہاں میں روتے ہی روتے میں گل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر / تیوری چڑھائی تونے کہ یاں جی نکل گیا

یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رُخِ زرد پر مرے / کہتا ہی میرؔ رنگ تو کچھ اب نکھر چلا

رُخصتِ سیرِ باغ ہم کو نہ ہوئی / یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

گُل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل / اِک مشتِ پر پڑے تھے گلشن میں جائے بلبل

کی سیر جذبِ اُلفت گلچیں نے کل چمن میں / توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل

ہم تو اسیرِ کنجِ قفس ہو کے مر چلے / اے اشتیاقِ سیرِ چمن تیری کیا خبر

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میرؔ کی شب کو / مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میرؔ / کیا ربط محبّت سے اُس آرام طلب کو

مرتے ہیں تیری نرگسِ بیمار دیکھ کر / جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر

جاتا ہے آسماں لیئے کوچہ سے یار کے / آتا ہی جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری / نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

آتا ہی جی میں حالِ بد اپنا بھلا کہوں / پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں

نازِ چمن وہی ہی بُلبُل سے گو خزاں ہی / ٹہنی جو زرد بھی ہی سو شاخِ زعفراں ہی

از خویش رفتہ اکثر رہتا ہی میرؔ اُس بن / کہتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہی

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے / اس طرح کے رونے کو کہاں سے جگر آوے

کوئی کانٹا سرِ رہ کا ہماری خاک پر بس ہی / گلِ گلزار کیا درکار ہی گورِ غریباں کو

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ / ہم ہیں فارغ ہوئے شتابی سے

دمِ نزع دشوار دی جان اُس نے / مگر میرؔ کو آرزو تھی کسی کی

مر گیا کوہکن اسی غم سے ۔۔۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے
کتنا خلاف وعدہ ہوا ہوگا وہ کہ یاں ۔۔۔ نومیدی اور امید مساوات ہو گئی
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیئے ۔۔۔ ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بیخود کیا ۔۔۔ ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ ۔۔۔ سو تم ہم سے منھ بھی چھپا کر چلے
بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے ۔۔۔ نیک بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہیں
اس کے کوچہ میں کہ شور قیامت کا ذکر ۔۔۔ ایسے ہنگامے تو یاں روز ہوا کرتے ہیں
اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں ۔۔۔ یاں کبھی سرو و گل کے سائے تھے
ڈوبے اچھلے ہے آفتاب ہنوز ۔۔۔ کبھی دیکھا تھا تجھ کو دریا پر
ان دونوں یاروں کی نظروں سے نہاں رہتے ہو ۔۔۔ خوش رہو میر مری جان جہاں رہتے ہو

رباعی

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے ۔۔۔ خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر ۔۔۔ مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

منت

منت ایسے کو دل دیا تو نے ۔۔۔ اے مری جان کیا کیا تو نے

محب

عارض اس کے تھے عرق سے یوں سحر بھیگے ہوئے ۔۔۔ جس طرح شبنم سے دو گلبرگ تر بھیگے ہوئے
اشک سے مژگاں ہے نم تجھ تک پہنچتی نہیں نگاہ ۔۔۔ مانع پرواز ہیں طائر کے پر بھیگے ہوئے

ممتاز

ڈروں ہیں کس لیئے رنجش میں پیار میں کیا تھا ۔۔۔ میں اب خزاں کو روؤں بہار میں کیا تھا
جفائے یار نے کس طرح کر دیا مایوس ۔۔۔ اور اپنی خاطر امیدوار میں کیا تھا
ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک ۔۔۔ وگرنہ ہستی ناپائدار میں کیا تھا
عشق میں عرض تمنا مانع دیدار رہے ۔۔۔ میرا ہی دست دعا منہ پر مرے دیوار رہے
یاد اس شوخ کی اس دل میں بھری رہتی ہے ۔۔۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس گھر میں پری رہتی ہے

محترم
محترم کیا بیاں کروں تجھ سے — اِس دلِ داغدار کی صورت

مستمند
نزع تک وصل کی ہی یار اُمید — ہی مثل ایک دم ہزار اُمید

مائل
کہتا نہ تھا کہ باز آ ہر دم کی اس ہنسی سے — آخر گیا نہ ظالم اِک بے گناہ جی سے

مصحفی
جہاں کا گل بنے وہ شوخ یارب — مجھے تو اُس چمن کا خار و خس کر

وقفہ
اے پیکِ نگہ دیدۂ تر ہے در پیش — دن ہیں برسات کے اور رہ میں خطر ہی در پیش
دلِ حیراں کی مری دیکھئے صورت کیا ہو — اب تو واں آئینہ ہی آٹھ پہر ہی در پیش
ہی نہاں داغ جگر زخم نمایاں کے تلے — جس طرح لالہ کہیں ہو گلِ خنداں کے تلے
آشیاں بندی کی تکلیف نہ کر ہم کو ہوس — گر رہینگے کسی دیوارِ گلستاں کے تلے

مجذوب
چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش ہم سفیر — صیاد نے سنا یہ ترانا تو ہم رہے
عجب قسمت ہی اپنے دل کی بازارِ محبت میں — جو کوئی صبح اُس کو لے گیا تو شام لے آیا

ناجی
اُس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں — عارضی میری زندگانی ہے

ولی
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا
صنم کے لعل پر وقتِ تکلم — رگِ یاقوت ہی موجِ تبسم
زندگی جامِ عیش ہی لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں
عجب کچھ لطف رکھتا ہی شبِ خلوت میں مہرو سے — سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ
اے جانِ ولی وعدۂ دیدار کو اپنے — ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو
ہی حسن ترا ہمیشہ یکساں — جنت سے بہار کیونکہ جاوے
آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہی اُس کو — کرتی ہی نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

وحشت
لگتا ہی مجکوں آج یہ سارا جہاں خراب — شاید کہ مر گیا ہی کوئی خانماں خراب

وفا
حسنِ عمل پہ اپنے نہ پھول اس قدر کہ شیخ — واں کے معاملے کی کسی کو خبر نہیں

دُکھ نہ دے اس قدر وفا کیش   آخرش وہ بھی جان رکھتا ہے

بس کہ اپنے انقلابِ بخت سے ڈرتے ہیں ہم   بسترِ گل پر بھی لرزاں ہی قدم دھرتے ہیں ہم

کل کا وعدہ کرلیا ہی اُس نے اے محرم تو کیا   یاں تو بیتابی سے دل کی آج ہی مرتے ہیں ہم

نہ کشتی پار رہی بہہ کر گئی اپنی نہ وار آئی   ہوئے ہیں غرقِ دریا اُس گھڑی جب عین دھار آئی

شب و روز وصل کو رویئے کہ عجب وہ لیل و نہار تھا   کبھی ہم سے یار کو لطف تھا کبھی ناز تھا کبھی پیار تھا

یک رنگ

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے   میرا صبر و قرار جاتا ہے

خیالِ چشم و ابرو کر کے تیرا   کوئی مسجد گیا کوئی خرابات

زخمی برنگِ گل ہیں شہیدانِ کربلا   گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا

اندھیر ہی جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ   ہی سربریدہ شمعِ شبستانِ کربلا

یار

جائے سنگِ لوحِ تربت نصب کیجو آئینہ   تا کوئی جانے کہ یہ حسرت کشِ دیدار تھا

آفریں اے دستِ گستاخِ محبت آفریں   یہ گریباں ایک مدت سے گلے کا ہار تھا

۱۶ ر نومبر ۱۹۲۱ء
حیدرآباد دکن

محمد حبیب الرحمن خان شروانی

لارڈ میکالے کی یادداشت مسئلہ تعلیم پر[1]

ترجمہ

(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب۔ رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

مجلس تعلیمات کی جو تحریریں اس وقت (گورنر جنرل کی) کونسل کے سامنے پیش ہیں۔ میں نے اُن کے تیار کرنے میں عمداً کوئی حصہ نہیں لیا۔ کیوں کہ مجلس کے بعض اراکین کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ٹھیک اُن اُصول کے مطابق ہے جنھیں پارلیمنٹ نے ۱۸۱۳ء میں مُعین کر دیا تھا۔ اور اگر یہ صحیح ہو تو ہمیں اپنے موجودہ طرزِ تعلیم میں تبدیلی کرنے کے لئے ایک دوسرا قانون بنانا پڑے گا۔ لیکن میری یہ رائے نہیں ہے اور اسی واسطے میں نے مجلس تعلیمات کی مذکورۂ بالا کارروائی میں (بہ حیثیت صدر نشین مجلس) شرکت نہیں کی تاکہ جب یہ مسئلہ کونسل میں آئے تو میں بہ حیثیت رُکنِ کونسل آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قانونِ پارلیمنٹ کا جو مفہوم لیا جا رہا ہے اس کی تاویل کیا ہو سکتی ہے؟ قانون میں

---

[1] ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں یہ یادداشت نہایت اہم ہے۔ ہمارے ملک کی تاریخ تعلیم یا مسئلہ تعلیم پر کوئی کتاب کوئی رسالہ یا مضمون ایسا نہیں جس میں اس تحریر کا حوالہ نہ ہو۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جنھوں نے اصل یادداشت کو ملاحظہ کیا ہو۔ اکثر اصحاب اس کے دیکھنے کے شایق تھے اور خاص کر ہمارے دوست حافظ ساجد علی صاحب عباسی (وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن) کا شدید اصرار تھا کہ اس کا ترجمہ اُردو میں شائع ہو چوں کہ اس میں ذریعۂ تعلیم اور عربی سنسکرت اور دیسی زبانوں کی بحث آ پڑی ہے اور اسی پر موجودہ تعلیم کی بنیاد رکھی گئی ہے اس لئے ہم نے اس کا شائع کرنا مناسب اور ضروری خیال کیا (اڈیٹر)

کسی خاص زبان یا علم کی تعلیم دیئے جانے کے متعلق کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس میں صرف مصارف کی ایک مد اس غرض کے لئے علیحدہ کر دی گئی ہے کہ اس روپے سے "علم ادب کے احیا اور ترقی دینے کا کام لیا جائے نیز ہندوستانی اہلِ علم کی ہمت افزائی اور سرکار انگریزی کے علاقوں میں علوم کی ترویج و اشاعت کی جائے" اب حجت یہ پیش کی جاتی ہے بلکہ اس بات کو مسلم قرار دے لیا گیا ہے کہ "علم ادب" سے پارلیمنٹ کی مراد صرف سنسکرت اور عربی علم ادب ہو سکتی ہے اور "ہندوستانی اہلِ علم" کے معزز لقب کے وہ لوگ کسی طرح اہل نہیں ہو سکتے جنھیں ملٹن کے کلام لوک (Locke) کے فلسفۂ الٰہیات اور نیوٹن کی طبعیات سے آگہی ہے بلکہ اس لفظ کے مخاطب پارلیمنٹ کی نظر میں صرف وہ حضرات ہیں جنھوں نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں کشا گھاس کے تمام طریق استعمال یا پرمیشور سے مل جانے کے سارے بھید پڑھ لئے ہیں! مگر میرے نزدیک یہ کوئی قابلِ اطمینان توجیہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ پاشائے مصر کچھ روپیہ "احیائے علوم اور اہل علم کی سرپرستی" کے نام سے مخصوص کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زمانے میں ملکِ مصر یورپ کی قوموں سے علمی ترقی میں کہیں آگے تھا مگر اب اُن سے بالکل پیچھے رہ گیا ہے۔ تو کیا اس پاشائے مصر کی سرپرستیٔ علوم کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے علاقے کے لڑکوں کو سالہا سال تک قدیم خطِ تصویر کی تعلیم دلانی چاہتا ہے تاکہ وہ اسائرس دیوی کی کہانی میں جو نکتے پنہاں ہیں ان کا سراغ لگائیں اور بلیوں اور پیازوں کی قدیم پرستش کی ایک ایک رسم کو کمال صحت کے ساتھ تحقیقات کرتے رہیں؟ اس کے برخلاف اگر وہ اپنی رعایا کو خطِ میخی کی عبارتیں پڑھنے کے بجائے انگریزی اور فرانسیسی زبان اور وہ علوم سیکھنے کا حکم دے جو زیادہ تر انھیں زبانوں کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں تو کیا کوئی انصاف پسند آدمی اس پاشا کو یہ الزام دے گا کہ وہ سرپرستی علوم کے مقصد سے انحراف کرتا ہے؟

قدیم علوم کے حامیوں کا جن الفاظ پر انحصار ہے اوّل تو اُن کا وہ مطلب نہیں جو وہ نکالنا چاہتے ہیں دوسرے فقرے کے آخری حصّے سے قطعی طور پر اُن کے خلاف نتیجہ نکلتا ہے کیوں کہ پارلیمنٹ نے یہ ایک لاکھ روپیہ نہ صرف احیاءِ علوم کے واسطے دیا ہے بلکہ ایک غرض یہ بھی ہے کہ اسے "سرکار انگریزی کے علاقوں میں علوم کی ترویج و اشاعت میں" صرف کیا جائے۔ اور یہی الفاظ اُن تمام تبدیلیوں کو جائز ثابت کرنے کے لئے

کافی ہیں جن کے واسطے میں نے یہ بحث اُٹھائی ہے۔ اب اگر کونسل کو مجھ سے اتفاق ہو تو کسی نئے قانون کی ضرورت پیش نہ آئے گی لیکن اگر اراکین کونسل ان معنی میں مجھ سے اختلاف رکھتے ہوں تو میں ایک مختصر سا قانون مرتب کردوں گا کہ ۱۸۱۳ء کے فرمانِ شاہی سے اس فقرے کو حذف کر دیا جائے جس کی وجہ سے یہ دقتیں پیدا ہوئی ہیں۔ لیکن یہ تو محض ایک ضابطہ کی بات ہوئی۔ ہمیں پہلے اُس دوسری دلیل پر غور کرنا چاہیئے جسے مشرقی علوم کے حامی پیش کرتے ہیں اور اگر اسے درست مان لیا جائے تو پھر موجودہ طرزِ تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ ان صاحبوں کے ذہن نشین ہوگیا ہے کہ موجودہ طرزِ تعلیم کے جاری رکھنے پر ہی سرکار کی حسنِ معاملت کا انحصار ہے اور اگر ہم مذکورۂ بالا مد کا روپیہ جو اب تک عربی و سنسکرت کی ترقی میں صرف کرتے رہے ہیں کسی دوسرے کام میں صرف کریں گے تو یہ گویا ایک قسم کی بدعہدی ہوگی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سے طریق استدلال سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں؟ سرکاری طور پر جو روپیہ علوم کی سرپرستی کے لئے دیا جاتا ہے اُس کی نوعیت اُسی قسم کے مصارف کی سی ہے جو سرکار لوگوں کے کسی حقیقی یا خیالی فائدہ کے واسطے ادا کرتی ہے۔ اب اگر ہم ایک صحت گاہ (سینی ٹوریم) ایسے مقام پر تعمیر کرادیں جس کی آب و ہوا کو ہم نے پہلے صحت بخش سمجھا تھا مگر بعد میں اس کے خلاف ثابت ہوا تو کیا ہم اس بات کے پابند ہو جائیں گے کہ کہ وہ صحت گاہ اسی مقام پر رہے؟ یا یہ کہ اگر ہم ایک بند بنوانا شروع کریں اور کچھ عرصے بعد یہ دیکھکر کہ اسے وہاں بنوانے سے کوئی فائدہ نہیں، ہم اُس کی تعمیر روک دیں تو کیا ہم لوگوں کے ساتھ بدعہدی کرنے کے مجرم قرار پائیں گے؟ لوگوں کے مالی حقوق کا بے شبہ پورا لحاظ رکھنا واجب ہے۔ لیکن آج کل جو ان حقوق کا سراسر بے وقت اور بے محل راگ الاپا جانے لگا ہے اس سے تو اندیشہ ہے کہ ان حقوق کو اُلٹا نقصان نہ پہنچ جائے اگر لوگوں کے نام کا روپیہ بُری جگہ صرف کیا جائے اور پھر حجت یہ پیش کی جائے کہ چوں کہ وہ لوگوں کا حق ہے لہٰذا اس کے بُرے مصرف میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم خود اس "حق" کو قابلِ اعتراض ٹھیرانا چاہتے ہیں۔ اگر سرکار نے کسی شخص کے ساتھ حتمی وعدہ کیا ہے۔ وعدہ درکنار اگر کسی کو محض اس بات کا اُمیدوار بھی بنا دیا ہے کہ سنسکرت یا عربی کے پڑھنے یا پڑھانے کے معاوضہ میں سرکار اس کی کفالت کرے گی تو بیشک ہمیں اس شخص کے وسائلِ معاش کا لحاظ کرنا چاہیئے بلکہ اس بارے میں اگر ہم اسراف

سے کام لیں تو بھی میرے نزدیک بہ نسبت اس کے کہ سرکار کی صداقت پر حرف آئے یہ بے موقع فیاضی بہتر ہوگی لیکن یہ تقریر کہ سرکار خاص خاص علوم والسنہ کو پڑھانے کی پابند ہو چکی ہے (خواہ وہ علوم فرسودہ اور وہ زبانیں بیکار ہی کیوں نہ ہو گئی ہوں) میری دانست میں محض لایعنی ہے اوّل تو کسی سرکاری تحریر میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جس سے ثابت ہو کہ سرکار اس معاملے میں کوئی خاص عہد کر رہی ہے یا اس تعلیمی سرمایہ کا ہمیشہ کے واسطے ایک خاص مصرف مقرر کر چکی ہے۔ لیکن اگر ہمارے پیش رو ایسا کر جاتے تو بھی میں کہتا ہوں کہ ان مسائل میں وہ ہمیں اپنی ہدایات کا پابند بنانے کے ہرگز مجاز نہ تھے۔ مثلاً اگر گزشتہ صدی میں کسی حکومت کے اربابِ حل و عقد نے کمال وثوق کے ساتھ یہ قانون نافذ کر دیا ہو کہ اس کی رعایا کے ہر فرد کے ہمیشہ چیچک کا ٹیکا لگایا جایا کرے گا۔ تو کیا ڈاکٹر جینر کے جدید اکتشافات کے بعد بھی اس حکومت کے جانشینوں کو مذکورۂ بالا قانون کی پابندی کرنی فرض ہوگی؟ مجھے زیادہ عالی دماغ لوگ ان باتوں کے کچھ معنی سمجھتے ہوں گے ورنہ میرے خیال میں تو ایسے وعدے جن کے ایفا کا کسی کو مطالبہ نہ ہو اور نہ اُن سے مخلصی کی کوئی صورت باقی ہو اور ایسے حقوقِ لاحقہ جو کسی پر لاحق نہ ہوتے ہوں، نیز ایسا تغلب جس سے کسی کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔ محض لفظ ہی لفظ ہیں کہ جب کسی بیجا بات کے جواز کی اور کوئی دلیل نہیں ملتی تو ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ اسی قسم کے رسمی الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ میں اس ایک لاکھ روپے کے خرچ کو بالکل صاحب گورنر جنرل (معہ کونسل) کی اختیاری شے سمجھتا ہوں کہ وہ اُس طریق پر جو سب سے مناسب معلوم ہو یہ روپیہ ہندوستان میں ترقیِ علوم کے لئے صرف کریں۔ اور اس معاملے میں کہ آیندہ یہ روپیہ عربی و سنسکرت کی اشاعت میں صرف کیا جائے یا نہ کیا جائے، صاحب گورنر جنرل کو میں اسی طرح مختار کار سمجھتا ہوں جس طرح کہ وہ اس قسم کا حکم دینے کے مختار ہیں کہ آیندہ میسور میں شیر مارنے والوں کا انعام کم کر دیا جائے یا کلیسا میں مناجات خوانی کے لئے جو روپیہ سرکار سے دیا جاتا تھا وہ آیندہ موقوف کر دیا جائے۔

اب میں اصل مدعا کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ ہمارے پاس ایک سرمایہ اس غرض سے موجود ہے کہ اسے اہلِ ہند کی دماغی ترقی کے کام میں صرف کیا جائے۔ پس اصلی سوال یہ ہے کہ اسے صرف کرنے کی

سب سے بہتر صورت کیا ہوگی ؟

اس بات پر تو ہر فریق کا اتفاق رائے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیسی زبانیں جو ہندوستان کے ان حصوں[1] میں بولی جاتی ہیں۔ اُن میں نہ تو عام ادبی کتابیں ہیں نہ دیگر علوم طبیعی۔ نیز یہ کہ وہ ایسی مفلس اور گنواری ہیں کہ جب تک دوسری زبان سے مدد نہ لی جائے ان میں کسی اعلیٰ درجہ کی کتاب کا ترجمہ کرنا بھی دشوار ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ گویا مسلّم ہے کہ اُن ہندیوں کی دماغی تربیت کے لئے جنھیں اعلیٰ تعلیم کے دیگر ذرائع میسّر نہیں ہیں اس وقت ناچار دیسی زبان کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعۂ تعلیم اختیار کرنا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی زبان ہو ؟

مجلس تعلیمات کے نصف اراکین کی رائے ہے کہ یہ ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان ہونی چاہیئے لیکن باقی نصف اراکین شد و مد کے ساتھ سنسکرت و عربی کی سفارش کرتے ہیں اور میرے نزدیک اصلی فیصلہ طلب امر یہی ہے کہ ان تین میں کون سی زبان سیکھنی سب سے زیادہ مفید اور مناسب ہوگی۔

خود مجھے عربی یا سنسکرت زبان نہیں آتی۔ لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان زبانوں کی قدر قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کروں۔ میں نے سب سے مشہور عربی اور سنسکرت کتابوں کے ترجمے پڑھے ہیں۔ ان زبانوں کے ممتاز عالموں سے یہاں اور انگلستان میں اکثر میری گفتگو ہوئی ہے۔ یہ مستشرقین علوم مشرقی کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں میں اسے بجنسہٖ تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن ان میں آج تک مجھے کوئی شخص ایسا نہیں ملا جو اس بات کا انکار کر سکا ہو کہ یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی ایک الماری کی کتابیں قدر و قیمت میں ہندوستان و عرب کے سارے علم ادب کے برابر ہیں! خود مجلس تعلیمات کے وہ اراکین جو مشرقی زبانوں کے حامی ہیں۔ مغربی علم ادب کی معنوی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔

اس میں تو شاید کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا کہ علم ادب کی وہ شاخ جسے مشرقی ادیبوں نے سب سے زیادہ کمال کو پہنچایا ہے فنِ شاعری ہے۔ بایں ہمہ مجھے کبھی کسی ایسے مستشرق سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا جس نے دعویٰ کیا ہو کہ سنسکرت یا عربی شاعری کا یورپ کی بڑی بڑی قوموں کی شاعری سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر جب ان خیالی

[1] ان حصوں سے بنگال و بہار یا جنوبی ہند کے بعض علاقے مراد ہیں۔ ہندوستان خاص کے بعض علاقے جن میں فارسی یا اردو زبان کا رواج تھا اُس وقت تک براہِ راست انگریزوں کے قبضے میں نہیں آئے تھے۔ مترجم

تصانیف کو چھوڑ کر ہم اُن کتابوں کو دیکھتے ہیں جن میں حقائق و واقعات اور عام کلیات قلمبند کیے جاتے ہیں تو میدان میں یورپ والے کہیں آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ انگلستان کے ابتدائی مدارس میں جو چھوٹے چھوٹے تاریخی خلاصے بچوں کو پڑھائے جاتے ہیں ان کی علمی قدر و قیمت اس تمام مجموعی معلومات سے جو ساری سنسکرت کتابوں سے حاصل ہوتی ہے زیادہ ہے۔ دونوں ملکوں میں قریب قریب یہی نسبت دیگر علوم و فنون کی کتابوں میں ہے۔

اب ہمیں اس معاملے پر از سرِ نو نظر ڈالنی چاہیئے کہ ہم ایسے لوگوں کو تعلیم دینی چاہتے ہیں جن کو بالفعل ان کی مادری زبان میں تعلیم دینی ممکن نہیں۔ پس کسی غیر زبان کی تعلیم تو ناگزیر ہے۔ اسی کے ساتھ خود ہماری زبان (انگریزی) کو جو وجوہِ ترجیح حاصل ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ کیوں کہ وہ (یعنی انگریزی) خود یورپ کی زبانوں میں نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اُس میں نظم کی ایسی کتابیں کثرت سے موجود ہیں جو قدیم یونان کی بہترین ادبی یادگاروں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ تاریخ پر ایسی ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ اخلاقی اور قومی تربیت دینے کے معاملے میں تو ان کی کہیں نظیر نہیں ملتی اور محض طرزِ بیان کے اعتبار سے بھی شاید ہی کوئی کتاب اُن سے بہتر ہوگی اس میں انسانی فطرت اور زندگی کی صحیح اور مُنہ بولتی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ مابعد الطبیعات اخلاق، سیاسیات، قانون اور تجارت وغیرہ ہر موضوع پر اس میں نہایت عمیق و جامع کتابیں ہیں۔ ایسے تمام علوم تجربی کے متعلق وافر و صحیح ذخیرہ جمع ہے جو حفظانِ صحت یا اسبابِ راحت کو بڑھاتے اور انسان کی عقل و ذہانت کو ترقی دیتے ہیں۔ جو شخص انگریزی جانتا ہے وہ دماغ انسانی کی اُس بے حساب دولت تک رسائی رکھتا ہے جسے نوّے پشت میں کرۂ ارض کی سب سے عاقل قوموں نے پیدا اور جمع کیا ہے اور ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں وہ علوم جو زبان انگریزی میں آج موجود ہیں اس تمام مجموعی ذخیرے سے جو تین صدی پہلے دنیا کی ساری زبانوں میں جمع تھا کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ ہندوستان میں انگریزی حکمران طبقے کی زبان ہے حکومت کے صدر مقامات میں اعلیٰ رُتبے کے دیسی باشندے تک انگریزی بولتے ہیں۔ قرینہ کہتا ہے کہ انگریزی ایشائی سواحل پر بھی ایک سرے سے دوسرے تک تجارتی زبان ہو جائے گی۔ اُن دونوں یورپین قوموں کی بھی زبان انگریزی ہے جو ایک طرف آسٹریلیا اور دوسری طرف جنوبی افریقہ میں نشو و نما پا رہی ہیں اور ہر سال اُن کا

اثر بڑھتا اور ہماری "سلطنتِ ہند" سے اُن کا تعلق قوی ہوتا جاتا ہے۔ الغرض کیا اپنی معنوی خوبیوں کے اعتبار سے اور کیا ہندوستان کے محل وقوع اور خاص حالات کے لحاظ سے انگریزی زبان ہر طرح ہماری دیسی رعایا کے لئے دوسری تمام غیر زبانوں سے زیادہ مفید و کارآمد ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب ہم اس مفید زبان (انگریزی) کی تعلیم دے سکتے ہیں تو کیا پھر بھی ہمیں وہی زبانیں پڑھانی چاہئیں جن میں مسلّمہ طور پر کسی مضمون کی ایسی کتابیں نہیں ہیں جن کا ہماری زبان کی کتابوں سے مقابلہ کیا جا سکے؟ کیا ایسی صورت میں جب کہ ہم یورپی سائنس کی تعلیم دے سکتے ہیں ہم وہی قدیم علوم پڑھائے جائیں جو کہ جدید علوم سے جہاں کہیں اختلاف رکھتے ہیں وہیں اُن میں نقص ہے۔ کیا ایسی صورت میں جب کہ ہم مفید فلسفے کی اور سچی تاریخ کی ترویج کر سکتے ہیں ہم سرکاری خرچ سے (مثالاً) ایسے طبّی اصول کی تعلیم دینی جائز رکھیں جو ایک انگریز نیم حکیم کے لئے بھی موجبِ عار ہیں، ایسی علم نجوم کی تعلیم دیئے جائیں جسے پڑھ کر انگلستان کے زنانہ مدرسے کی لڑکیوں تک کو ہنسی آ جائے۔ یا ایسی تاریخ کی جس میں دس دس گز لمبے بادشاہوں کے اور تیس تیس ہزار کے عہد حکومت کے قصّے بھرے ہوئے ہیں۔ یا ایسے جغرافیے کی جس میں مکھن اور شربت کے سمندر لہریں مار رہے ہیں؟

اس معاملے میں ہماری رہنمائی کے واسطے نظائر بھی موجود ہیں۔ تاریخ میں اسی قسم کی صورتِ حالات کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں اور اُن سب سے ایک ہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔ ہم اگر زیادہ دُور نہ جائیں تو قریب ہی کے زمانہ میں دو یادگار مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ ایسی قوموں کی جن میں پہلے جہالت و وحشت کا دَور دَورہ تھا، تھوڑے ہی عرصے میں بالکل کایا پلٹ ہو گئی۔ ان کا جہل و تعصب مٹ گیا، بیداری پیدا ہوئی ذوق دُرست ہو گیا اور علم و فن کا قدم ملک میں جم گیا۔ ان میں سے پہلی مثال جس کی طرف میرا اشارہ ہے اُن مغربی اقوام کی ہے جن میں پندرھویں صدی عیسوی کے اخیر اور سولھویں کے آغاز میں علم ادب کا احیا ہوا۔ اُس وقت تمام قابلِ مطالعہ چیزیں قدیم اہلِ یونان و روما کی تصانیف میں پائی جاتی تھیں اور اگر ہمارے اجداد بھی مجلس تعلیمات کے مسلک پر عمل کرتے اور ٹیسی ٹس اور سسرو کی زبان کو چھوڑ کر اپنے جزیرہ (برطانیہ) ہی کی پرانی بولیوں پر ساری توجہ مبذول رکھتے اور اپنے اعلیٰ مدارس میں اینگلو سیکسن زبان کے "وقائع" اور

نارمن فرنچ زبان کی داستانوں کے سوا اور کچھ نہ پڑھاتے تو کیا انگلستان کو یہ بات میسر آسکتی تھی کہ آج اس کے علم ادب کا پلہ دَورِ قدیم کی مستند تصانیف (کلاسیکس) سے بھاری ہے؟ اور اُس عہد کے انگریزوں میں جو حیثیت یونانی اور لاطینی زبان کی تھی، وہی موجودہ اہلِ ہند میں ہماری زبان کو حاصل ہی۔ بلکہ مجھے تو اس میں بھی شبہ ہے کہ ہمارے سیکسن اور نارمن اسلاف کے پاس جیسا علمی سرمایہ تھا، سنسکرت میں اس کے برابر ہی بھی یا نہیں؟ بعض شاخوں میں، مثلاً تاریخ میں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سنسکرت ان قدیم برطانوی السنہ سے بہت گری ہوئی ہی۔

احیاءِ علوم کی دوسری مثال گویا بالکل ہمارے سامنے کی بات ہی گزشتہ ایک صدی کے اندر ایک بڑی قوم جو ایسی وحشیانہ حالت میں تھی جیسے صلیبی لڑائیوں سے قبل ہمارے (یعنی انگریزوں کے) اسلاف جہل کے غار سے آہستہ آہستہ نکل آئی اور مہذب اقوام کی صف میں داخل ہوگئی۔ اس سے میری مراد روس کے لوگ ہیں جہاں اب تعلیم یافتہ افراد کا معقول گروہ ہوگیا ہے اور اس میں ایسے ایسے قابل اشخاص موجود ہیں کہ سلطنت کی بڑی سے بڑی خدمات انجام دے سکتے ہیں اور اپنے اُن معاصرین سے جو پیرس و لندن کے بہترین حلقوں کی زیب و زینت ہیں کسی بات میں کم نہیں۔ اور یہ توقع کرنا کسی طرح بیجا نہ ہوگا کہ یہ وسیع سلطنت (روس) جو ہمارے دادا پردادا کے وقت میں غالباً ملکِ پنجاب سے بھی پس ماندہ تھی، ہمارے پوتے پروتوں کے زمانہ میں بہ اعتبار ترقی فرانس و برطانیہ سے لگا کھانے لگے گی۔ لیکن روس کے اس نمایاں تغیر کا سبب یہ نہیں ہی کہ قومی تعصبات کی تائید کی گئی یا روسی لڑکوں کو بڑی بوڑھیوں کی وہ کہانیاں اور سینٹ نکولاس کے وہ جھوٹے کارنامے سنائے گئے جنھیں ان کے جاہل اسلاف مانتے تھے۔ یا ایسے باریک مسائل کی تحقیقات کا انھیں شوق دلایا گیا کہ دُنیا تیرہ ستمبر کے دن پیدا ہوئی تھی یا اور کسی دن اور پھر جو شخص ان علمی رموز سے واقف ہوا اسے "دیسی فاضل" کا لقب دیدیا گیا۔ نہیں بلکہ درحقیقت اہلِ روس میں یہ انقلاب اُن غیر زبانوں کی تعلیم سے پیدا ہوا ہی جن میں معلومات کے بہترین ذخیرے بھرے ہیں اور جب روسیوں نے یہ (مغربی یورپ کی) زبانیں سیکھیں تو اس علمی ذخیرے تک اُن کی دسترس ہوگئی اور وہ شائستہ قوم بن گئے اور مجھے اس میں ذرہ شبہ نہیں کہ ان مغربی السنہ نے جو کام روسی تاتاریوں کے حق میں کیا وہی ہندو (یعنی اہلِ ہند)

کے حق میں کر دکھائیں گی۔

غرض عقل و تجربہ دونوں اسی طرزِ عمل کو پسندیدہ ٹھہراتے ہیں لیکن اختلاف کرنے والوں کا قول ہے کہ ہمیں تعلیمی معاملات میں اپنی دیسی رعایا کو ہم آہنگ بنانا ضروری ہے اور یہ بات صرف عربی اور سنسکرت کی تعلیم دینے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اس کے جواب میں سب سے اوّل تو مجھے یہ تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ جب ایک ترقی یافتہ قوم کسی پس ماندہ اور کم علم قوم کی تعلیم کا انتظام اپنے ذمہ لے تو پھر بھی طریق تعلیم کا انحصار اسی پس ماندہ اور سیکھنے والی قوم کی رائے پر رکھا جائے۔ مگر اس سے قطع نظر سچ پوچھئے تو مذکورۂ بالا دلیل پر کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے کیوں کہ اس امر کی مسکت شہادت موجود ہے کہ موجودہ طریق تعلیم میں دیسی رعایا ہماری ہم آہنگ نہیں ہے۔ یہ بات بجائے خود ناپسندیدہ ہے کہ ہم لوگوں کے ذوق کی خاطر ان کی دماغی صحت کا لحاظ نہ کریں لیکن زیرِ بحث معاملے میں تو ہمیں اُن کے ذوق کی پروا ہے نہ صحت کی۔ اس لئے کہ ہم صریحاً لوگوں کو وہ تعلیم دے رہے ہیں جس سے وہ بیزار ہیں اور اُس تعلیم کے دینے میں بخل کر رہے ہیں جس کی انھیں دلی تمنا ہے۔ ثبوت اس قول کا یہ ہے کہ ہمیں عربی اور سنسکرت پڑھنے والوں کو تو وظیفے دے دے کے پڑھانا پڑتا ہے اور انگریزی پڑھنے والے خود روپیہ دے دے کے ہم سے پڑھنے پر تیار رہیں۔ اور صرف یہی مسلّمہ واقعہ کہ ہمیں اپنے وسیع مقبوضات میں ایک طالب علم بھی ایسا نہیں مل سکتا جو بغیر کچھ روپیہ لئے ہم سے اپنی مقدس زبانیں سیکھنی جائز رکھتا ہو، منصف مزاج آدمی کی نظر میں یہ دکھانے کے لئے کافی ہے کہ سنسکرت و عربی سے لوگوں کی عقیدت اور ذوق شوق کے متعلق جو تقریریں کی جا رہی ہیں وہ کچھ وزن نہیں رکھتیں۔

اس وقت مدرسۂ کلکتہ کے ایک مہینے (دسمبر ۱۸۳۳ء) کے حسابات میرے سامنے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی پڑھنے والوں کی تعداد ستتر تھی۔ ان میں سے ہر ایک کو سرکاری وظیفہ ملتا ہے جس کا کل خرچ پانسو روپیہ مہینے سے کچھ زیادہ ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری طرف درج ہے کہ خرچ کی میزان میں سے نفی اکیسو تین جو انگریزی پڑھنے والے (بیرونی) طلبہ سے گزشتہ مئی، جون اور جولائی میں وصول ہوا۔

بعض صاحبوں نے مجھے جتایا کہ چوں کہ مجھے اس ملک کا تجربہ اور حالات سے واقفیت نہیں، اس لئے

طلبہ کا اس طرح وظائف لے کر پڑھنا دیکھکر میں حیران ہوا۔ حالاں کہ ہندوستان میں یہ دستور ہی نہیں کہ طالب علم اپنے خرچ سے تعلیم حاصل کریں۔ مگر یہ سن کر مجھے اُلٹا اپنی رائے میں زیادہ وثوق ہوگیا کیوں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ دنیا کے کسی حصے میں بھی ایسا کام کرنے کے واسطے جسے لوگ اچھا اور فائدہ مند سمجھتے ہیں، اُن کو روپیہ دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہندوستان اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہی۔ یہاں کے لوگوں کو بھی جب بھوکے ہوتے ہیں تو چاول کھلانے کے لئے یا سردی میں اُونی کپڑا پہنانے کے لئے روپیہ دینا نہیں پڑتا۔ اس سے بھی قریب مثال یہ ہی کہ وہ بچے جو دیہاتی اُستاد سے الف بے تے اور ابتدائی حساب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، کوئی وظیفہ اپنے اُستاد سے نہیں پاتے بلکہ خود اُستاد کو معاوضہ دیتے ہیں تو پھر عربی اور سنسکرت پڑھنے کے لئے لوگوں کو وظیفہ دینا ضروری کیوں ہی؟ صریحاً اس وجہ سے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ان زبانوں کی تحصیل سے کوئی ایسا فائدہ نہیں ہوتا جو اس دردسری کا کافی صلہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے سب معاملات میں اصلی فیصلہ بازاری مانگ دیکھکر ہوتا ہے[1]۔

بایں ہمہ اگر مزید شہادت کی ضرورت ہو تو وہ بھی موجود ہے:-

گزشتہ سال ہی سنسکرت کالج کے چند قدیم طلبہ نے مجلس تعلیمات کو ایک عرضی دی تھی کہ عرضی گزاروں نے دس بارہ سال تک اس کالج میں تعلیم پائی۔ ہندو علوم وفنون سے واقفیت بہم پہنچائی اور فارغ التحصیل ہونے کی سند حاصل کی۔ لیکن اس سب کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ لکھتے ہیں کہ ان تمام اسناد کے باوجود ہمیں اس بات کی بہت کم اُمید ہی کہ مجلس تعلیمات کی دستگیری کے بغیر ہم اپنی فلاح کی کوئی صورت نکال سکیں گے۔ کیوں کہ ہمارے ہم وطن جس بے پروائی سے ہمارے ساتھ پیش آتے ہیں اسے دیکھکر ذرا بھی توقع نہیں رہتی کہ وہ ہماری کوئی ہمت افزائی یا امداد کریں گے۔ لہذا عرضی گزار درخواست کرتے ہیں کہ لاٹھ صاحب کے پاس اُن کی سفارش

---

[1] مکالے کے ان نتائج پر غالباً یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ ممالکِ مشرقی میں اعلیٰ تعلیم ایک مذہبی نوعیت رکھتی تھی اور اس کے اُستاد یا طلبہ مالی فوائد کو پیش نظر نہیں رکھتے تھے۔ اگر بادشاہ یا اُمرا کی طرف سے اس تعلیم کا انتظام ہوتا تھا تو وہ طلبہ کے قیام وطعام کا بندوبست کرنا بھی پسندیدہ اور موجب ثواب جانتے تھے۔ خود اُستاد شاگردوں سے کسی قسم کی فیس یا مالی معاوضہ لینا گوارا نہ کرتے تھے اور طلبہ کے شوقِ علم کی دلیل یہ ہی کہ وہ تعلیم کے واسطے دُور دراز کے سفر اور ہر قسم کی مشقت وعسرت کو خوشی سے برداشت کرلیتے تھے۔ مترجم

کردی جائے کہ کوئی سرکاری ملازمت مرحمت فرمائیں اور کوئی اعلیٰ یا بڑی تنخواہ کی ملازمت نہ ہو بلکہ صرف ایسی کہ اُن کی بسر اوقات کے لئے کافی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم صرف بھلے آدمیوں کی طرح زندگی گزارنے اور تدریجی ترقی کرنے کا وسیلہ ڈھونڈھتے لیکن سرکار کی مدد کے بغیر جس نے ہمیں لڑکپن سے پرورش کیا اور تعلیم دیوا ئی ہے ہمیں کوئی وسیلہ نہیں ملتا۔ اور آخر میں وہ بہت درد انگیز پیرائے میں لکھتے ہیں کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ سرکار کا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا کہ زمانۂ تعلیم میں اس قدر فیاضانہ برتاؤ کرنے کے بعد آخر میں ہمیں ایسی بیکسی کی حالت میں چھوڑ کر خود الگ ہو جائے!

سرکار کے نام عرضیاں تو میں نے بہت دیکھی ہیں جن میں عرضی گزار (بعض اوقات خواہ مخواہ بھی) کسی لیسے ضرر یا نقصان کی تلافی چاہتے ہیں جو اُن کے خیال میں اُنھیں سرکار سے پہنچا ہو۔ لیکن بے شبہ یہ پہلے عرضی گزار ہیں جو مفت میں تعلیم پانے کا معاوضہ طلب کر رہے ہیں۔ یعنی اس بات پر کہ ہم نے انھیں بارہ برس تک وظیفہ دیا اور پڑھا لکھا کے دنیا میں داخل کیا وہ اُلٹا ہمیں سے تاوان مانگتے ہیں! بہ الفاظ دیگر وہ اپنی تعلیم کو ایک ضرر کی صورت میں پیش کرتے ہیں جس کی تلافی چاہنے کا اُن کو حق ہے اور جس کا وہ وظائف کسی طرح کافی معاوضہ نہ تھے جو اس ضرر رسی کے دَوران میں انھیں ملتے رہے! میں کہتا ہوں کہ بے شک اُن کا دعویٰ ٹھیک ہے۔ انھوں نے زندگی کا بہترین زمانہ ایسی تعلیم میں صرف کیا جس سے نہ انھیں روٹی ملتی ہے نہ عزّت۔ ان لوگوں کو نکما بنانے اور مصیبت میں پھنسانے سے تو بہتر تھا کہ ہم اُن پر اتنا روپیہ خرچ نہ کرتے۔ لوگوں کو اپنے ہموطنوں پر ایک بوجھ اور ہمسائوں کی نظر میں حقیر بنانا ایسا کون سا بڑا کام ہے جس کے لئے سرکار کو اتنا روپیہ صرف کرنا ضروری ہو؟ لیکن ہماری حکمت عملی ہی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے۔ حق اور باطل کی کشمکش میں ہم ایک طرف علیحدہ بھی کھڑے نہیں رہتے اور اس پر اکتفا نہیں کرتے کہ اہل ہند اپنے موروثی اوہام و تعصب کے اثرات میں مبتلا رہیں۔ بلکہ ہم اُن قدرتی مشکلات میں جو ایشیا میں سچّے علم کی سدِّراہ ہیں اپنی طرف سے اضافہ کر رہے ہیں اور جھوٹے علوم اور جھوٹے ذوق کے واسطے اس طرح بے دریغ وظائف و انعامات دے رہے ہیں کہ سچّی تعلیم کی اشاعت کے لئے بھی اتنا اسراف نہیں کرنا چاہیئے۔

پھر یہ کہ اس طرز عمل سے ہم اپنے لئے اُسی پریشانی کا سامان کر رہے ہیں جس سے بچنے کے واسطے ہم نے

بزعم خود یہ طرزعمل اختیار کیاہے۔ یعنی ہم اُن لوگوں میں جواب تک مخالف نہیں اپنی مخالفت کے اسباب پیدا کررہے ہیں۔ عربی اور سنسکرت کے مدرسوں پر روپیہ خرچ کرنا فقط حق کو اعانت سے محروم رکھنا ہی نہیں بلکہ باطل اور خطا کے حامی پیدا کرنے کے لئے انعام بانٹنا ہی۔ اس خرچ سے ہم اُن لوگوں کا جتھا تیار کررہے ہیں جو محض نالایق نوکری کے بھکاری اور ساتھ ہی سخت متعصب بھی ہوں گے اور اسی تعصب اور ذاتی اغراض کی بنا پر تعلیم کی ہر مفید تجویز کے خلاف ہنگامہ بپا کردیا کریں گے۔ اس وقت بھی اگر موجودہ طرز تعلیم کو بدلنے کی دیسی لوگوں میں مخالفت ہو تو وہ خود ہمارے طرز عمل کا نتیجہ ہوگی اور اس میں پیش پیش وہی لوگ ہوں گے جو ہم سے وظائف اور ہمارے مدارس میں تعلیم پاتے رہے ہیں۔ اور جس قدر زیادہ عرصہ تک ہم اپنے موجودہ طریق پر کاربند رہیں گے۔ اسی قدر زیادہ یہ مخالفت قوی ہوتی جائے گی۔ سال کے سال مخالفین کی فوج میں نئے سپاہیوں کا جنھیں تنخواہ ہم دے رہے ہیں اضافہ ہوتا رہیگا۔ خلاصہ یہ کہ دیسی باشندوں کو اگر ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو کوئی دشواری پیش آنے کا اندیشہ نہیں۔ جو کچھ چیں بچیں ہوگی وہ اسی گروہ کی طرف سے ہوگی جس کے اغراض مشرقی تعلیم سے وابستہ ہیں اور جسے خود ہم نے مصنوعی تدابیر سے پیدا کیا اور قوت پہنچائی ہی۔

ان سب باتوں کے علاوہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ خود اہل ہند کے وہ خیالات نہیں جو قدیم علوم کے حامی بیان کرتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی کافی ہی کہ مجلس تعلیمات نے تو عربی اور سنسکرت کتابیں چھاپنے کے واسطے ایک لاکھ سے کچھ اوپر روپیہ صرف کرنا ضروری سمجھا تھا لیکن اب ان کتابوں کے خریدار میسّر نہیں آتے۔ شاذ و نادر کوئی نسخہ فروخت ہوتا ہی ورنہ مجلس کی الماریاں، بلکہ کہنا چاہیئے کہ گودام، اُن تیس ہزار کتابوں سے (کہ اکثر بڑی سے بڑی تقطیع پر چھپی ہیں) پٹے پڑے ہیں۔ ہر چند مجلس مختلف تدبیریں نکالتی ہی کہ اس انبار عظیم سے کچھ تو سبک دوشی حاصل ہو لیکن وہ جس تیزی سے کتابیں چھاپ رہی ہے اس تیزی سے تقسیم نہیں کرسکتی اور ہر سال انھیں ردّی کاغذوں کے تازہ انبار جمع کرنے میں بیس ہزار کے قریب روپیہ خرچ ہوتا رہتاہے حالاں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہم پہلے ہی اتنا بڑا ڈھیر جمع کرچکے ہیں کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں۔ مجموعی طور پر گزشتہ تین سال میں تقریباً ساٹھ ہزار روپیہ اس طریق پر صرف ہوا لیکن اس

مدّت میں کتابوں کی فروخت سے آمدنی پوری ایک ہزار کی بھی نہیں ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں اسکول بُک سوسائٹی انگریزی کی سات آٹھ ہزار کتابیں ہر سال فروخت کر لیتی ہے اور اسے نہ صرف مصارفِ طبع وصول ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے سرمایہ پر بیسؔ فیصدی کا منافع بھی حاصل ہو رہا ہے۔

بعض حضرات اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ ہندؤں کے قوانین بیشتر سنسکرت کتابوں سے اور اسلامی قانون کتب عربیہ سے سیکھا جاتا ہے۔ مگر میرے نزدیک اس بات کا مسئلہ زیرِ بحث پر کوئی اثر نہیں۔ پارلیمنٹ ہمیں حکم دے چکی ہے کہ ہندوستان کے قوانین کی تحقیق وتنقیح کی جائے۔ ہماری مدد کے لئے تحقیقات قوانین کی ایک خاص جماعت (کمیشن) بھی مقرر ہوئی ہے۔ پس جب ہمارا نیا مجموعۂ قوانین مُرتب اور نافذ ہو جائیگا تو کسی منصف یا صدر امین کو شاستروں کی یا ہدایہ کی ضرورت نہیں رہیگی۔ اور مجھے توقع اور پُورا بھروسہ ہے کہ وہ لڑکے جو اس وقت عربی یا سنسکرت کالج میں داخل ہو رہے ہیں اپنی تعلیم پوری نہ کرنے پائیں گے کہ مذکورۂ بالا کام کی تکمیل ہو جائے گی۔ نظر بریں کونسل کو اُن حالات کے مطابق تعلیم دینے کا انتظام کرنا، جن کو ہم ان لڑکوں کے جوان ہونے سے پہلے بدل دینا چاہتے ہیں، صریحاً فضول ہے۔

مشرقی علوم کی حمایت میں ایک اور دلیل پیش کی جاتی ہے جو اور بھی کمزور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عربی اور سنسکرت وہ زبانیں ہیں جن میں تقریباً دس کروڑ نفوس کی مقدس (آسمانی) کتابیں لکھی ہوئی ہیں اور اس بنا پر ان زبانوں کی بہ تخصیص قدر ہونی چاہیئے۔ لیکن ہندوستان میں اگر سرکار انگریزی کا فرض ہے کہ تمام مذہبی معاملات میں رواداری سے کام لے تو اسی کے ساتھ اُس کو بالکل غیر جانب دار بھی رہنا چاہیئے۔ پس ایسی زبانوں کی تعلیم کو فروغ دینا جو بذاتِ خود تو کچھ قابلِ قدر نہیں، البتہ اُن میں سب سے اہم مسائل (یعنی مسائل الٰہیات) میں سب سے سنگین غلطیاں پائی جاتی ہیں، کسی عقل واخلاق اور اس غیر جانب داری کے بھی مطابق نہ ہوگا جسے نہایت احتیاط کے ساتھ قایم رکھنے پر ہم سب متفق ہیں۔ ۔ ۔ ۔ [لہ]

لہ اس کے آگے مکالے نے پھر اسی خیال کی وضاحت کی ہے اور اہل ہند کے مذاہب کو صاف صاف لفظوں میں جھوٹا قرار دیا ہے۔ اُس کے اعتراضات کا اصلی ہدف ہندو مذہب معلوم ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ مترجم کو ان خیالات سے کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا اور اسی لئے اس فقرے کی باقی دو، سطریں جن میں مکالے نے اپنے تعصب کو بہت نازیبا طریق پر ظاہر کیا تھا۔ حذف کر دی گئیں۔

مشرقی تعلیم کے حامیوں نے اس بات کو بالکل مُسلّم سمجھ لیا ہے کہ ہندوستان کا کوئی باشندہ انگریزی زبان میں سوائے شُد بُد کے زیادہ مہارت حاصل ہی نہیں کرسکتا۔ مگر اس خیال کا جو اُن کی تحریروں میں جابجا جھلکتا ہے انھوں نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا انگریزی زبان کے حامی جس تعلیم کی سفارش کرتے ہیں اُسے یہ مخالف حضرات محض ابتدائی تعلیم بتاتے ہیں اور اسی لئے انھوں نے فرض کرلیا ہے کہ اس موقع پر ہمیں اعلیٰ سے اعلیٰ مشرقی تعلیم اور محض ابتدائی انگریزی تعلیم کا مقابلہ کرنا ہے۔ مگر اُن کا یہ خیال محض وہم اور وہم بھی سراسر عقل اور تجربہ کے خلاف ہے۔ سب قوموں کے لوگ ہماری زبان سیکھتے ہیں اور اس قدر کافی واقفیت بہم پہنچا لیتے ہیں کہ اس کے دقیق و خاص مضامین تک اُن کی رسائی ہوجاتی ہے اور ہمارے انشا پردازوں کی بامحاورہ سے بامحاورہ تحریر کے لطیف ترین کنایات اور حسنِ بیان کا وہ مزا لینے لگتے ہیں۔ خود اس شہر (کلکتہ) میں ایسے دیسی موجود ہیں جو ہر قسم کے سیاسی اور علمی مضامین پر انگریزی زبان میں نہایت روانی اور صحت کے ساتھ بحث کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر مسئلہ پر ہی میں نے بعض دیسی حضرات کو ایسی گفتگو کرتے سنا کہ مجلس تعلیمات کے فاضل اراکین بھی اگر اتنے وسیع الخیال اور باخبر ہوں تو اُن کے لئے موجب مباہات ہے۔ حتیٰ کہ یورپ کے ادبی حلقوں میں بھی ایسے غیر ملکی شاذ و نادر ہی ملیں گے جو انگریزی زبان میں اتنی صحت و سہولت سے اپنا مطلب ادا کرسکیں جس طرح کہ اکثر ہندوؤں کو ہم نے ادا کرتے دیکھا ہے۔ یہ دعویٰ تو شاید کوئی بھی نہ کرے گا کہ انگریزی زبان ہندوؤں کے لئے اتنی دشوار ہے جتنی کہ انگریزوں کے لئے یونانی۔ تاہم ایک ایک ہوشیار انگریز لڑکا اس مدت سے جو ہمارے بدنصیب ہندی طلبہ کو سنسکرت کالج کا امتحان دینے میں درکار ہوتی ہے۔ کہیں کم وقت میں یونانی سیکھ لیتا ہے اور یونانی کے بہترین مُصنّفین کی انشا پردازی کا نہ صرف لطف اُٹھاتا ہے بلکہ اپنی تحریر میں خاص طرح اُن کی نقل بھی اُڑانے لگتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جتنے عرصہ میں ایک انگریز طالب علم ہیرو دوٹس اور سفاکلیس کی کتابیں پڑھنے کے لائق یونانی سیکھ سکتا ہے اس سے نصف یا اور بھی کم مدّت میں ایک ہندو (یعنی ہندی طالب علم) کو اتنی انگریزی نہ آجائے کہ وہ ہیوم اور ملٹن کا مطالعہ کرسکے۔

جو کچھ میں نے عرض کیا اس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو ہم (یعنی سرکارِ انگریزی) قانون پارلیمنٹ مجریہ ۱۸۱۳ء کی رو سے مجبور ہیں اور نہ کسی علانیہ یا مضمر عہد کی بنا پر پابند ہیں کہ موجودہ تعلیم کو ہمیشہ جاری رکھیں۔

برخلاف اس کے ہمیں پُورا اختیار ہے کہ اپنے تعلیمی سرمایہ کو جس طرح چاہیں خرچ کریں پس ہمیں یہ روپیہ اُن علوم کی تعلیم پر خرچ کرنا چاہیئے جو سب سے زیادہ مفید و کارآمد ہیں اور یہ ثابت ہے کہ سنسکرت اور عربی کی نسبت انگریزی کا جاننا زیادہ مفید اور مناسب ہی۔ خود دیسی باشندے انگریزی سیکھنے کے خواہاں ہیں اور سنسکرت یا عربی پڑھنی نہیں چاہتے اور قانونی یا مذہبی زبانیں ہونے کے اعتبار سے بھی عربی یا سنسکرت کسی خاص توجہ کی مستحق نہیں ہیں۔ نیز یہ بالکل ممکن ہی کہ ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان میں بہت اچھی مہارت حاصل ہو جائے اور یہی ہماری کوششوں کا مقصود و مدّعا ہونا چاہیئے۔

طرز تعلیم کے متعلق جن صاحبوں کے عام خیالات سے میں نے اختلاف کیا۔ ایک بات میں اُن سے میں بالکل متفق ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارا موجودہ سرمایہ اس قدر کافی نہیں ہے کہ ہم جمہور اہلِ ہند کی تعلیم کا اہتمام کرسکیں پس ہمیں سرِدست صرف یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ایک گروہ ایسے تعلیم یافتہ ہندیوں کا تیار کردیں جو ہمارے اور ہماری کثیر التعداد رعایا کے درمیان ترجمان کا کام انجام دے سکے۔ یہ نئے تعلیم یافتہ رنگ و خون کے اعتبار سے ہندی لیکن اپنے ذوق اور افکار و اخلاق کے لحاظ سے انگریز ہوں۔ ملک کی دیسی زبانوں کی تہذیب و ترقی کا کام بھی اسی گروہ کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیئے کہ مغربی لغات سے علمی اصطلاحات لے لیکر اپنی دیسی زبانوں کو مالا مال کریں اور بتدریج اس قابل بنادیں کہ انھیں کے ذریعے عوام تک علوم کو پہنچایا جاسکے۔

قدیم طریقِ تعلیم سے جن لوگوں کی مالی اغراض وابستہ ہیں میں اُن کے حقوق کا پوری طرح لحاظ رکھنا چاہتا ہوں اور ان سب کے ساتھ بھی فیاضانہ سلوک کرنے کا خواہاں ہوں جو معقول وجوہ کی بنا پر سرکار سے اپنی کفالت کی توقع رکھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی میں اُس ناقص نظام کی بالکل بیخ کنی کردینی چاہتا ہوں جسے اب تک ہم نے قایم اور سرسبز رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بلا تاخیر عربی اور سنسکرت کتب کا چھاپنا موقوف اور کلکتہ کا مدرسہ اور سنسکرت کالج بند کردیئے جائیں۔ برہمنی تعلیم کا بڑا مرکز بنارس اور علوم عربیہ کا صدر مقام دہلی ہی۔ لہٰذا اگر ہم بنارس کے سنسکرت کالج اور دہلی کے اسلامی کالج کو بحالِ خود قایم رکھیں تو میرے نزدیک یہ مشرقی السنہ کی کافی بلکہ کافی سے زیادہ رعایت ہی اور ان دونوں کالجوں کو جاری رکھنے کی

صورت میں بھی میری تجویز یہ ہے کہ ان کے طلبہ کو سرکاری وظیفہ دینا بند کردیا جائے اور لوگوں کو ایسی تعلیم کے لئے جس کے وہ خواہاں نہیں، سرکار کی طرف سے کوئی رشوت نہ دی جائے اب یہ اُن کی مرضی کہ قدیم یا جدید علوم کی تعلیم میں سے جس کو چاہیں اختیار کرلیں۔ اس طرح جو سرمایہ ہمارے پاس بچیگا وہ کلکتہ کے ہندو کالج (انگریزی) کو پہلے سے زیادہ امداد دینے میں اور صوبہ بنگالہ و آگرہ کے تمام بڑے بڑے مقامات پر ایسے مدارس قایم کرنے میں کام آئے گا جن میں انگریزی زبان کی عمدہ طریق پر تعلیم دی جائے۔

اب اگر گورنر جنرل باجلاس کونسل اس معاملہ میں وہی فیصلہ کریں جس کی مجھے اُمید ہے تو میں مجلس تعلیمات کی صدارت کے فرایض نہایت خوشی اور مستعدی کے ساتھ انجام دینے میں مشغول ہوجاؤں گا۔ لیکن اگر سرکار کی رائے یہ قرار پائے کہ موجودہ طریق تعلیم بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہے تو میری درخواست ہے کہ مجھے مجلس تعلیمات کی صدارت سے مستعفی ہونے کی اجازت مرحمت کی جائے۔ کیوں کہ اس صورت میں میرا اس عہدے پر رہنا بالکل بے سود ہوگا بلکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں ایک ایسے کام میں معاون رہوں جو میرا پختہ یقین ہے کہ محض دھوکا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ موجودہ طریق تعلیم حق وصداقت کی اشاعت میں کوئی تقویت نہیں پہنچاتا بلکہ اُلٹا اُن اوہام باطلہ کو جو اپنی قدرتی موت مر رہے ہیں مرنے سے روکتا ہے۔ بحالتِ موجودہ میں خیال کرتا ہوں کہ ہمیں "مجلس تعلیماتِ عامّہ" کا معزز لقب اختیار کرنے کا بھی استحقاق نہیں۔ ہماری مجلس تو محض لوگوں کا روپیہ ضایع کرتے اور ایسی کتابیں چھاپنے کے لئے ہے جو اتنی قیمت بھی نہیں رکھتیں جتنی کہ چھپنے سے پہلے اُن کا (سادہ) کاغذ رکھتا تھا۔ وہ (یعنی مجلس) مہمل تاریخ، مہمل طبیعات اور مہمل مابعد الطبیعات کی زبردستی ترویج میں کوشاں ہے اور ایسے فاضلوں کی اُمت تیار کر رہی ہے جن کے حق میں یہ تعلیم ایک مصیبت اور فضیحت ہے۔ جو طالب علمی کے زمانہ میں تو سرکاری خرچ سے پلتے ہیں اور پھر اُن کی تعلیم اس قدر نکمّی ہوتی ہے کہ اس کی تحصیل کے بعد یا تو سرکار ہی ساری عمر اُن کی پرورش کرے اور یا وہ بھُوکے رہ جائیں۔

جب کہ میرے خیالات یہ ہیں تو پھر قدرتی بات ہے کہ میں ایسی جماعت میں شریک ہونا پسند نہیں کرسکتا جو اپنے سارے طرزعمل کو بدلے بغیر میرے نزدیک نہ صرف بیکار بلکہ یقیناً نقصان رساں ہے۔

تلمیحات

از

جناب مولوی سیّد وحید الدین صاحب سلیم
پروفیسر اُردو۔ عثمانیہ کالج حیدرآباد دکن

(جولائی نمبر سے آگے)

ادبی تلمیحاتِ قسمِ اوّل میں جو تلمیحات درج کی گئی ہیں، وہ بطور مثال کے ہیں۔ تمام تلمیحات کا استیعاب نہیں کیا گیا۔ یہ کام اُس مصنف کا ہے، جو تلمیحات کی فرہنگ مرتب کرے۔ اب ہم اُن تلمیحات پر توجہ کی نظر ڈالتے ہیں، جو قسمِ دوم میں داخل ہیں اور یہ وہ تلمیحات ہیں، جن میں ایرانی اثر پایا جاتا ہے۔

اُردو ادبی تلمیحات (قسمِ دوم)

جمشید ایران کا ایک مشہور پادشاہ تھا، جو عیش و عشرت اور شان و شوکت کے لحاظ سے بار بار مذکور ہوا ہے۔ اُس کو جم بھی کہتے ہیں۔ مگر جم کے لفظ سے شعرا کبھی حضرت سلیمان مراد لیتے ہیں، کبھی سکندر اور کبھی ایران کے اس نامور بادشاہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ خاتمِ جم۔ نگینِ جم۔ انگشترِ جم۔ تختِ جم کی تلمیحوں میں اس لفظ سے حضرت سلیمان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آئینۂ جم میں سکندر مراد ہے۔ بزمِ جم۔ جامِ جم۔ جشنِ جم۔ ساغرِ جم میں ایران کے بادشاہ جمشید کی طرف اشارہ ہے۔ ان تلمیحات میں جم کی جگہ جمشید کا لفظ بھی لایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس بادشاہ کے پاس شراب کا ایک پیالہ تھا۔ اس کے گرد سات خط کھنچے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے خط یعنی بالائی خط تک شراب بھری جاتی، تو جمشید کے سوا

کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس پیالہ کو پی سکے۔ پہلے خط یعنی کنارے کے خط کا نام خطِ جور ہے۔ باقی چھ خطوط کے نام ترتیب وار حسب ذیل ہیں۔ خطِ بغداد۔ خطِ بصرہ۔ خطِ ازرق جس کو خطِ سیاہ۔ خطِ شب اور خطِ سبز بھی کہتے ہیں۔ خطِ شکر یا خطِ اشک۔ خطِ کاسہ گر۔ خطِ فرودینہ۔ تختِ جمشید جو ایران کے آثار قدیمہ میں سے ایک عالی شان عمارت ہے اسی بادشاہ کی یادگار ہے۔

ایک اور بادشاہ جس نے ایران پر حکومت کی، ضحاک تھا۔ یہ اپنے ظلم وستم اور خوں ریزی کے سبب بدنام ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے دونوں شانوں پر دو سانپ پیدا ہو گئے تھے۔ اُن کی غذا کے لئے انسان کا گوشت درکار تھا۔ ضحاک ہر روز انسانوں کو ہلاک کرتا اور ان سانپوں کے لئے خوراک بہم پہنچاتا تھا۔ مارِ ضحاک سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ بادشاہ فریدوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

فریدوں اپنی عظمت وصولت کے سبب مشہور ہے۔ جب شاعر کسی بادشاہ کی تعریف کرتے ہیں، تو اُس کو فریدوں فر کہا کرتے ہیں۔ ضحاک کے عہد حکومت میں ایک لُہار تھا، جس کا نام کاوہ تھا۔ یہ لُہار اصفہان کا باشندہ تھا اس کے چار بچے ضحاک نے مروا ڈالے تھے۔ خلقت ضحاک کے جور وستم سے عاجز آگئی تھی۔ کاوہ کے دل میں ان واقعات کو دیکھ کر جوش پیدا ہوا۔ اُس نے دُکان بند کر دی۔ جس چمڑے کو وہ اہرن کے نیچے بچھایا کرتا تھا، اُس کو ایک لکڑی پر آویزاں کر کے پھریرا بنایا اور ڈھول بجاتا ضحاک کے ظلم کے راگ گاتا نکل کھڑا ہوا۔ اس جھنڈے کو درفش کاویانی کہتے ہیں۔ علم کاویانی۔ پرچم کاویانی۔ اختر کاویانی کے الفاظ سے بھی یہی جھنڈا مراد ہے۔ ایران کے باشندے جو ضحاک کے ظلم وستم سے تنگ آگئے تھے، اس جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ کاوہ اس لشکر کو اپنے ساتھ لے کر بڑھا۔ ضحاک کی فوجوں سے اُس کی ٹکّر ہوئی۔ ان فوجوں نے شکست کھائی۔ یہاں تک کہ تمام ایران کو کاوہ نے فتح کر لیا۔ اُس نے بذاتِ خود سلطنت کرنے سے انکار کیا۔ فریدوں جو جمشید کا بیٹا تھا اور جس کا باپ ضحاک کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا تختِ ایران پر بٹھایا گیا۔ تمام لڑائیوں میں درفش کاویانی فوج کے آگے رہتا تھا۔ پے درپے فتوحات نے یہ بات ذہن نشین کر دی کہ یہ جھنڈا بہت مبارک ہے۔ کاوہ کے مرنے کے بعد فریدوں نے اور فریدوں کے بعد ایران کے دیگر بادشاہوں نے اس جھنڈے کو جواہرات سے مرصع کیا۔ یزدجرد کے زمانے تک یہ جھنڈا ہر لڑائی میں فوج کے آگے آگے چلتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ جھنڈا مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اُس کے جواہرات تقسیم

کردیئے گئے اور جھڑا جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔

کیخسرو ایران کا ایک اولوالعزم فرماں روا تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس نے ایک پیالہ بنایا تھا۔ اُس پر ہندسی خطوط کھچے ہوئے تھے۔ جس طرح اصطرلاب کے خطوط سے ستاروں کا ارتفاع وغیرہ معلوم ہوتا ہے، اسی طرح اس جام کے خطوط سے ستاروں کی گردش نمایاں ہوتی تھی اور زمانے کے آیندہ واقعات اس سے معلوم کیئے جاتے تھے۔ اس جام کی طرف جو اشارے ہمارے شعرا نے کیئے ہیں، اُن کے لیئے حسبِ ذیل الفاظ تراشے گئے ہیں:-

جامِ کیخسرو۔ جامِ جہاں نُما۔ جامِ جہاں بیں۔

کیانیوں کے عہدِ حکومت میں ایران اور توران کے درمیان ہمیشہ معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ ایرانیوں کی حمایت میں سیستان یا زابلستان کے ایک پہلوان نے اپنے شاندار کارناموں سے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس پہلوان کا نام رستم تھا۔ رستم کو پیلتن اور تہمتن بھی کہتے ہیں۔ یہ زال کا بیٹا تھا، اس لیئے پورِ زال کے لفظ سے بھی یہی پہلوان مُراد ہے۔ شاہ نامۂ فردوسی کا ہیرو یہی رستم ہے۔ رستم کے ہاتھ میں گرز رہتا تھا، جو گرزِ رستم کے نام سے مشہور ہے۔ چوں کہ یہ گرز بیل کے سر سے مشابہ تھا، اس لیئے اِسے گرزِ گاؤسر بھی کہتے ہیں۔ اُس کے گھوڑے کا نام رخش ہے۔ سہراب اسی کے بیٹے کا نام تھا۔ اتفاق سے دونوں باہم جنگ آزما ہوئے اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ جب رستم کے ہاتھ سے سہراب زخمی ہو چکا، تو اس راز سے آگاہ ہُوا۔ مگر واقعہ لاعلاج تھا۔ افراسیاب جو توران کا بادشاہ تھا اس کے لشکر سے بار بار رستم کے مقابلے ہوئے۔ کیکاؤس جو ایران کا نہایت مشہور بادشاہ تھا، اُسے ایک دفعہ دیووں نے گرفتار کر کے مازندران کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ رستم اِس بادشاہ کو قید سے چھڑانے کے لیئے گیا۔ رستہ نہایت دشوار گزار تھا۔ ہر منزل میں ایک نئی ہول ناک مُصیبت و تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ سات منزلیں شاہ نامہ کی زبان میں ہفتخواں کے نام سے مشہور ہیں۔ ہفتخواں کو طے کر کے رستم کیکاؤس کو دیووں کی قید سے چھڑا لایا۔ شاہ نامہ میں ہفتخوانِ رستم کے علاوہ ایک اور ہفتخواں بھی ہے، جو ہفتخوانِ اسفندیار کے نام سے موسوم ہے۔ ارجاسپ بادشاہ اسفندیار کی دو بہنوں کو پکڑ کر لے گیا تھا اور اُنھیں روئیں دِز میں جو ایک قلعہ کا نام ہے، قید کر دیا تھا، جب اسفندیار اپنی بہنوں کو چھڑانے کے لیئے اُس قلعہ کی طرف روانہ ہُوا، تو رستے میں اُسے بھی سات مُصیبت خیز اور ہول ناک واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسفندیار کی بھی ساتوں منزلیں،

جن کو طے کرنے کے بعد وہ اپنی بہنوں کو چھڑا کر لایا، ہفتخوانِ اسفندیار کے نام سے مشہور ہیں۔ ابھی بتایا جا چکا ہے کہ رستم کے باپ کا نام زال تھا۔ زال کو دستان بھی کہتے ہیں، اِس لحاظ سے رستم کو رستم دستاں کا لقب بھی دیا گیا ہے۔ زال کی پرورش پہاڑ کے ایک غار میں سیمرغ نے کی تھی۔ جوان ہونے پر سیمرغ نے اپنا ایک پر اُسے دیدیا تھا کہ جب میرے بلانے کی ضرورت ہو، اِس پر کو آگ پر رکھنا میں اُس کی بُو پر آ پہنچوں گا۔ رستم کو جب کبھی کوئی سخت واقعہ پیش آیا، اُسی پر کی مدد سے سیمرغ بلایا گیا اور اُس سے مشورہ کیا گیا۔ سام رستم کے دادا کا نام تھا اور نریمان پردادا کا۔ شغاد رستم کا ایک بھائی تھا، جو اُس کی طرف سے دل میں حسد رکھتا تھا۔ اُس نے سات کنوئیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تیار کرائے اور اُن کو ہتھیاروں سے بھر دیا اور خس پوش کر دیا۔ پھر رستم کو سیر و شکار کے بہانے سے اُس موقع پر لے گیا، جہاں وہ خس پوش کنوئیں تھے۔ رستم جو گھوڑے پر سوار تھا، پہلے کنوئیں میں گر گیا۔ مگر گھوڑے نے جست کی، تو اُس میں سے نکل آیا؛ پھر دوسرے کنوئیں میں جا گرا۔ جب چھ کنوؤں سے جست کر کر نکل چکا اور ساتویں کنوئیں میں گرا، تو رستم اور اُس کا گھوڑا دونوں بہت زخمی ہو گئے تھے۔ آخر رستم نے اِسی کنوئیں میں جان دی۔ شعرا اس واقعہ کی طرف چاہِ رستم کے لفظ سے اشارہ کرتے ہیں۔

چاہِ رستم کی طرح ایک تلمیح چاہِ بیژن بھی ہے۔ بیژن گیو کا بیٹا اور رستم کا بھانجا تھا۔ وہ افراسیاب کی بیٹی منیژہ پر عاشق ہو گیا تھا۔ اِس کی پاداش میں وہ ایک چاہِ تاریک کے اندر قید کر دیا گیا۔ یہی کنواں چاہِ بیژن کہلاتا ہے۔ رستم اُس کو آخرکار قید سے چھڑا لایا۔

سیاوش کیکاؤس کا بیٹا تھا۔ اپنی سوتیلی ماں کے طعنوں سے تنگ آ کر اپنے باپ کے دشمن افراسیاب کے پاس چلا گیا، جو توران کا بادشاہ تھا۔ وہ پہلے تو اُس کے آنے سے بہت خوش ہوا اور اپنی لڑکی سے اُس کی شادی کر دی؛ مگر پھر اپنے ایک اور داماد کے بہکانے سکھانے سے اُسے ناحق قتل کر ڈالا۔ خونِ سیاوش اِسی واقعہ کی تلمیح ہے۔ اِس لفظ سے خونِ ناحق مراد لیتے ہیں۔

بہرام گور بھی ایران کا ایک مشہور بادشاہ تھا، جو شہسواری اور نیزہ بازی میں شہرت رکھتا تھا۔ یہ شکار کا بے حد شائق تھا اور اکثر گورخر کا شکار کرتا تھا۔ اِسی لحاظ سے اُسے بہرام گور کا لقب دیا گیا ہے۔ ہمارے شعرا اس بادشاہ کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔

نوشیرواں ایران کا عادل بادشاہ مشہور ہی۔ اُس کا محل ایوانِ کسریٰ کے نام سے موسوم ہی، جو نہایت عالی شان تھا۔ اِسی کو طاقِ کسریٰ بھی کہتے ہیں۔ اِن تلمیحات میں کسریٰ کو نوشیرواں کا مرادف خیال کیجئے۔ جب یہ محل بننے لگا، تو محل کے ایک پہلو پر ایک بڑھیا کی جھونپڑی تھی۔ چاہا کہ اس جھونپڑی کی جگہ خرید لی جائے، تاکہ محل اس گوشے کی طرف ٹیڑھا نہ رہ جائے، مگر بڑھیا نے جگہ دینے سے انکار کیا۔ عاملانِ شاہی نے بڑھیا پر جبر کرنا چاہا، مگر نوشیرواں نے اُنہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا کہ میں ظلم سے رعایا کی زمین پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا۔ اگر میرا محل ٹیڑھا رہے، تو کچھ پروا نہیں۔ عدلِ نوشیروانی کا ذکر جب ہمارے شعرا کرتے ہیں، تو اس بڑھیا کا ذکر ضرور آتا ہی۔

نوشیرواں کا بیٹا ہرمز تھا۔ ہرمز کا بیٹا پرویز، جس کو خسرو پرویز بھی کہتے ہیں۔ اس بادشاہ ذکر ہمارے شعرا نے بار بار کیا ہی۔ یہ بمقابلہ دیگر شاہانِ ایران کے زیادہ مالدار تھا۔ اِس کے پاس آٹھ خزانے تھے، جن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

گنجِ عروس۔ گنجِ باد آورد یا گنجِ شایگاں۔ گنجِ دیبا خسروی۔ گنجِ افراسیاب۔ گنجِ سوختہ۔ گنجِ خضرا گنجِ شاد آورد۔ گنجِ بار۔

اِس بادشاہ کے گھوڑے کا نام شب دیز تھا، جو ایک اعلیٰ درجے کا مشکی گھوڑا تھا۔ کچھ دنوں تو اس بادشاہ نے عاقلانہ اور مدبرانہ طریقہ سے سلطنت کی، مگر آخر میں وہ عیش پسند ہوگیا۔ اِس نے اپنے محل میں حسین عورتیں کثرت سے جمع کرلیں۔ اِسی زمانۂ عیش میں اُس نے شیریں کے حُسن کا چرچا سُنا۔ یہ آرمن کی ملکہ مہین بانو کی بھتیجی تھی۔ خسرو نے اپنے ایک مُصاحب شاپور نامی سے اس باب میں امداد چاہی۔ شاپور کو مصوّری میں کمال تھا۔ اُس نے خسرو کی کئی تصویریں مختلف لباس اور مختلف وضع کی کھینچیں پھر اُن تصویروں کو بغل میں دبا آرمن پہونچا۔ ایک باغ میں، جس میں شیریں سیر و تفریح کے لیے آیا کرتی تھی۔ اُس نے وہ تصویریں درختوں سے لٹکا دیں۔ شیریں کی نظر اُن پر پڑی، تو وہ فریفتہ ہوگئی۔ اُس نے شاپور کو بھی دیکھا اور اُس سے اِن تصویروں کا حال پوچھا۔ اُس نے خسرو کے حُسن و جمال کا تذکرہ اِس طرح نمک مرچ لگا کر کیا کہ وہ خسرو کے پاس جانے اور اُس سے شادی کرنے پر راضی ہوگئی۔ آخرکار شیریں خسرو کے محل میں داخل ہوئی۔ خسرو محل کی تمام حسین عورتوں سے زیادہ اُسی سے محبت

کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ شیریں کو تازہ دودھ سے بہت رغبت تھی۔ شہر کے کنارے ایک پہاڑ کوہِ بیستون نامی کھڑا تھا
اُس کی پشت پر بکریوں کے گلّے چرتے تھے۔ اُنہیں کا دُودھ شیریں کے محل میں لایا جاتا تھا، مگر اتنی دُور سے لانے
میں دقت تھی۔ ایک نامی سنگ تراش فرہاد سے کہا گیا کہ وہ کوہ مذکور سے ایک نہر کاٹ کر شیریں کے محل تک پہنچا دے
تاکہ چراگاہ سے بکریوں کا دُودھ دُہ کر نہر میں ڈالا جائے اور وہ بہہ کر شیریں کے محل میں پہنچے۔ فرہاد مذکور بھی اتفاق
سے شیریں پر فریفتہ تھا۔ اس کے عشق کے چرچے پھیل چکے تھے۔ خسرو نے اس خیال سے کہ اُس سے پیچھا چھڑائے
یہ خدمت اُس کے سپرد کی اور وعدہ کیا کہ اگر وہ اِس خدمت کو سرانجام دے سکا، تو شیریں اُس کو بخش دی جائیگی۔
خسرو کو یقین تھا کہ فرہاد اِس سنگین خدمت کو انجام تک نہ پہنچا سکیگا؛ مگر عشق اور اُمیدِ وصال محبوب نے فرہاد
میں ہزاروں سنگ تراشوں کی قوّت پیدا کردی۔ وہ کمر باندھ کر اس کام میں مشغول ہوگیا۔ بیستون کے پتھر کاٹنے
کے وقت فرہاد عشق کی دُھن میں جا بجا شیریں کے مورتیں تراشتا جاتا تھا۔ کئی سال کے بعد جب یہ کام اختتام
کے قریب پہنچا اور ایفائے وعدہ کا وقت آیا، تو خسرو نے ایک مکّار بُڑھیا کو فرہاد کے پاس بھیجا، جو سر کے بال
بکھیرے ہوئے روتی پیٹتی اس کے پاس پہنچی اور اُس نے یہ جھوٹی خبر سُنائی کہ شیریں کا انتقال ہوگیا۔ فرہاد
کو جو صدمہ اس خبر سے ہُوا، وہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اُس کے ہاتھ میں تیشہ تھا۔ وہی تیشہ اپنے سر پر دے
مارا اور ہلاک ہوگیا۔ شیریں اور فرہاد کا افسانہ ایران میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔ اس قصے پر مثنویاں لکھی
گئیں۔ شاعروں نے لیلیٰ اور مجنوں کی طرح اِن دو عاشق و معشوق کے تذکرہ کو بھی اپنے اشعار میں عاشقانہ شاعری
کا محور بنا لیا ہے۔ فرہاد کا لقب کوہکن ہے۔ جوئے شیر وہ نہر ہے، جو فرہاد نے بیستون سے کاٹ کر قصرِ شیریں تک
پہنچائی۔ قصرِ شیریں کی جگہ قصرِ خسرو کا لفظ بھی لایا جاتا ہے۔ باربد اس بادشاہ کا خاص درباری بربط نواز تھا، جو
موسیقی کے فن میں کمال رکھتا تھا۔ اِس نے تیس راگنیاں ایجاد کیں، جو سی لحن کے نام سے مشہور ہیں۔ ترانۂ باربد
یا ترانۂ باربدی سے اِسی بربط نواز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ خسرو پرویز کے تخت کا نام طاقدیس تھا۔ یہ تخت
فریدوں سے اُس کے ورثہ میں آیا تھا۔ اِس کا طول (۱۷۰) گز اور عرض (۱۲۰) گز تھا۔ سر سے پاؤں تک جواہرات
نصب کیے گئے تھے۔ اُس کی چھتری میں بارہ برجوں اور سات ستاروں کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا تھا کہ فلکی اور نجومی
حالات اِس سے معلوم ہوتے رہتے تھے۔

مانی اور بہزاد دو نقّاشوں کے نام بار بار شاعری میں لائے جاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا ایک رومی نقّاش تھا۔ اُس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا۔ مانوی فرقہ اُسی کی طرف منسوب ہے۔ اُس نے تصویروں کا جو مجموعہ تیار کیا تھا، اُس کو ارتنگ یا ارژنگ کہتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ارژنگ ایک دوسرے مصوّر کا نام تھا۔ بہزاد شاہ اسمٰعیل صفوی کے زمانے کا نقّاش ہے۔ مرقعِ مانی۔ نقشِ بہزاد کے الفاظ انہیں دونوں نقّاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

آتش پرستوں یعنی زردشتیوں کے مذہب سے جو تلمیحیں لی گئی ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

اہرمن اور یزداں دو قوتوں کا نام ہے، جو دنیا پر حکمرانی کرتی ہیں۔ کبھی یہ قوّت غالب آتی ہے اور کبھی وہ۔ ان میں سے پہلی قوّت بدی کی ہے۔ دوسری قوّت نیکی کی۔ سدہ آگ کو کہتے ہیں۔ جمشید نے اوّل اوّل پتھر سے آگ نکلتی دیکھی، تو اس خوشی میں ایک جشن کی بنیاد ڈالی۔ یہ جشن جشنِ سدہ کے نام سے مشہور ہے۔ زردشتی مذہب والے آگ کی پرستش کرتے ہیں۔ آتش کدوں میں آگ ہر وقت روشن رہتی ہے۔ کبھی بُجھنے نہیں پاتی۔ آتشِ فارسی اِسی آگ کی طرف اشارہ ہے۔ آتش کدہ کی خدمت کے لیے جو خوبصورت نوجوان مقرر ہوتے تھے۔ وہ مُغ کہلاتے تھے اور اُن کا افسر پیرِ مغاں کہلاتا تھا۔ یہی نوجوان مجلسوں میں ساقی گری کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آتش کدوں میں ایک جانور چھپکلی کی شکل کا پیدا ہو جاتا ہے، جس کی زندگی کا مدار آگ کھانے پر ہے۔ اس کو سمندر کہتے ہیں۔ سمندر کا ذکر بھی ہماری شاعری میں بار بار آتا ہے۔ جب آفتاب بُرجِ حمل کے پہلے نقطے پر پہنچتا ہے اور جب کہ ماہ فروردیں کا پہلا دن ہوتا ہے، پارسی خوشیاں مناتے ہیں۔ اس روز کو نوروز کہتے ہیں۔

نخشب ترکستان کا ایک شہر ہے، جو سمرقند سے تین دن کے رستے پر ہے۔ یہاں ایک حکیم ابنِ عطا نامی نے جسے ابن مقنع بھی کہتے ہیں، کسی عجیب طریقے سے ایک مصنوعی چاند بنایا تھا، جو نخشب کے ایک کنوئیں سے ہر روز شام کے وقت برآمد ہوتا تھا اور اتنا بلند ہوتا تھا کہ اُس کی روشنی چاروں طرف بارہ میل تک پہنچتی تھی۔ دو مہینے تک یہ چاند برابر نکلتا رہا۔ اس چاند کو ماہِ نخشب اور ماہِ مقنع کہتے ہیں اور اِس کوئیں کو جس میں سے وہ چاند نکلتا تھا، چاہِ نخشب کہتے ہیں۔ ایک اور تلمیح سنگِ یدہ ہے۔ ترکستان میں ایک مقدس پتھر تھا۔ جب بارش کا امساک ہوتا تھا

ترکستان کے لوگ جنگل میں نکل جاتے اور اُس پتھر کو ہاتھ پر رکھ کر بارش کی دعا مانگتے تھے۔ اُس کی برکت سے بارش ہونے لگتی تھی۔ اِس پتھر کو سنگِ یدہ کہتے ہیں۔ کمانِ رستم جب ہماری شاعری میں آتا ہے، تو اس سے قوسِ قزح مراد لی جاتی ہے۔ لسان الغیب حافظ شیراز کا، بلبلِ آمل طالب آملی کا، بلبلِ شیراز سعدی شیرازی کا، حسانِ عجم اور خلاق المعانی خاقانی شروانی کا اور عندلیب نیشاپور نظیری نیشاپوری کا لقب ہے۔ شاخِ نبات حافظ شیراز کی محبوبہ کا نام ہے۔ ایاز سلطان محمود غزنوی کا ایک عزیز و محبوب غلام تھا۔ حسن و عشق کے ذکر میں یہ دونوں نام بھی لیے جاتے ہیں۔ سکندر نے ایران کو فتح کیا تھا۔ شاعروں نے اُس کی فتوحات کو آب و تاب سے بیان کیا۔ اُس کے عجیب و غریب کارنامے لکھے گئے۔ اُس کی تعریف کے گیت یہاں تک گائے گئے کہ لوگوں نے اُس کو پیغمبر بھی سمجھ لیا۔ آبِ حیات کے چشمے کی طرف اُس کے جانے کا ذکر خضر کی تلمیح میں مذکور ہوا ہے۔ سدِ سکندری کا ذکر ذوالقرنین کی تلمیح میں کیا گیا ہے۔ ایک اور تلمیح سکندر کی نسبت یہ ہے کہ اُس نے حکیم بلیناس کی ہدایت سے اسکندریہ میں ایک عظیم الشان مینار بنوایا تھا، جو تین سو گز بلند تھا۔ اُس پر ایک آئینہ لگایا تھا، جس کا دَور اکیس[۲۱] گز کا اور قطر سات گز کا تھا۔ یہ آئینہ دُوربین کا کام دیتا تھا۔ جب اُس میں سے دیکھتے تھے، تو قسطنطنیہ کا سارا شہر آنکھوں کے سامنے نظر آتا تھا۔ آئینۂ سکندر سے اِسی بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

ادبی تلمیحات کے بعد اب ہم ذیل میں عام تلمیحات پر نظر ڈالتے ہیں:-

عام تلمیحات عام بول چال میں جو تلمیحات مستعمل ہیں، اُن میں سے بعض تاریخ سے لی گئی ہیں، بعض ہندوؤں اور مسلمانوں کے علمِ مذہبی عقائد و اوہام سے ماخوذ ہوئی ہیں۔ بعض ان دونوں قوموں کی خاص خاص رسموں کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اور بعض کی بنیاد اُن فرضی قصوں پر ہے، جو عام طور سے مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض تلمیحیں محاوروں کی شکل میں ہیں اور بعض مثلوں کے پیرایے میں۔ ایسے محاوروں کو ہم تلمیحی محاورے اور ایسی مثالوں کو ہم تلمیحی مثلیں کہتے ہیں۔ ماخذوں کے لحاظ سے یہ تلمیحیں ملی جلی ہیں۔ ہندو مسلمان ان میں باہم کے شریک ہیں۔

مندرجۂ بالا چاروں قسم کے تلمیحات کی مثالیں ہم پیش کرنا چاہتے ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:-

(اوّل) وہ تلمیحیں جو تاریخ سے لی گئی ہیں۔

ڈھائی دن کی بادشاہت یا اڑھائی دن کی پادشاہت سے تھوڑے دنوں کی حکومت یا ناپائدار حکومت مراد ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اس واقعہ سے آگاہ ہیں کہ جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھاکر دریا میں کود پڑا، تو نظام سقّے نے اُس کو ڈوبتے ڈوبتے بچایا تھا اور اُس کے صلے میں اُس نے ہمایوں بادشاہ سے ڈھائی دن کی حکومت مانگی تھی۔ نظام نے اس قلیل دورِ حکومت میں چمڑے کا گول روپیہ سونے کی کیل جڑ کر چلایا تھا۔ اس واقعہ سے ایک دوسری تلمیح پیدا ہوئی ہے۔ چام کے دام چلانا۔ اس محاورہ سے جوتے کے زور سے حکومت کرنا اور جبرًا کام لینا مراد ہے۔ اورنگ زیبی ایک طبّی تلمیح ہے۔ یہ ایک سوداوی مادّہ کا پھوڑا ہے، جو اکثر کئی سال تک ہرا رہتا ہے اور اچھا ہونے میں نہیں آتا۔ جب اورنگ زیب عالم گیر نے گول کنڈہ کا محاصرہ کیا اور محاصرہ نے وہ طول کھینچا، تو آب وہوا کی خرابی سے اکثر اہلِ لشکر کے پھوڑے نکل آئے اور باوجود علاج کے وہ مدت تک ہرے رہے۔ اسی پھوڑے کو اورنگ زیبی کہتے ہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کے زمانے میں بادشاہوں کے جلوس کے ساتھ بائیس اضلاع کی فوج رہتی تھی۔ یہ فوج بائیسی کہلاتی تھی۔ بائیسی ٹوٹنے کا محاورہ اسی سے نکالا گیا ہے، جس سے مراد ہے ساری فوج سے حملہ کرنا، یا تمام زور صرف کر ڈالنا۔ ٹوپی والے وہ قزلباش سپاہی کہلاتے ہیں، جو اول نادر شاہ کے ساتھ، پھر احمد شاہ ابدالی کے ساتھ آئے تھے۔ ترکی زبان میں قزل کے معنی سرخ اور باش کے معنی ہیں سر۔ یہ سپاہی سروں پر لال لال ٹوپیاں رکھتے تھے۔ اسی سبب سے قزلباش کہلاتے تھے۔ دلی والوں نے اِن کا نام ٹوپی والے رکھا۔ ایک زمانے میں دلّی میں افغان پادشاہوں کی حکومت تھی۔ اُس زمانے کی یادگار پٹھانوں کی وہ چھوٹی چھوٹی مسجدیں ہیں، جو پاس پاس بنائی گئی ہیں۔ پٹھان تندمزاجی کے سبب کسی کا احسان اپنے سر لینا اور غیر کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا ایک تلمیحی محاورہ ہے، جو اس واقعہ کو یاد دلاتا ہے۔ رادھا کو یاد کرو ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں جاؤ۔ اپنا کام کرو۔ سری کرشن کی ایک محبوبہ کا نام رادھا اور ایک کا کُبجا تھا۔ کُبجا بے تکلفی اور شوخی سے یہ کلمہ زبان پر لایا کرتی تھی۔ کالے کلوٹے آدمیوں کو محاورہ میں رادن کی سَینا کہتے ہیں۔ یہ رادن جو لنکا کا راجہ تھا اور جو رام چندر جی کے ساتھ نبرد آزما ہوا، اُس کی فوج کے لوگ سیاہ فام تھے، یا اُن کی وردیاں سیاہ رنگ کی تھیں۔ اسی سبب سے رام لیلا میں جو اس واقعہ کی نقل ہے، رادن کی فوج کے سپاہیوں کو

سیاہ لباس پہنایا جاتا ہے۔ رستم محاورہ میں بہادر کے معنوں میں بولا جاتا ہے، جیسے بس ایک تم ہی تو رستم ہو۔ یہاں تمہاری رستمی کیوں نہ چلی۔ رستم کا بچہ، رستم خاں اور رستم کا سالا وغیرہ الفاظ بھی بولے جاتے ہیں۔ چھپا رستم ایک اور محاورہ ہے، جس کے دو معنے لئے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ شریر آدمی جو ظاہر میں غریب نظر آتا ہو۔ دوسرے وہ شخص جو کامل الفن ہو اور وقت پر اُس کا ہنر ظاہر ہو۔ افلاطون جو یونان کا مشہور حکیم ہے کشتی کے فن میں کامل تھا۔ اِس بنا پر جہاں زورآور اور زبردست کے معنوں میں رستم کا لفظ بولا جاتا ہے، وہیں افلاطون اور افلاطون کا بچہ وغیرہ الفاظ بھی رائج ہیں۔ سکھا شاہی کے لفظ سے بے انصافی اور کس مپرسی کا زمانہ مراد لیتے ہیں۔ یہ تلمیح سکھوں کے عہدِ حکومت کو یاد دلاتی ہے۔ اسی طرح نادر شاہی یا نادر گردی سے بدانتظامی اور افراتفری کا زمانہ مُراد لیتے ہیں۔ یہ الفاظ نادر شاہ کے زمانے میں اس ملک کی حالت کا پتہ دیتے ہیں۔ تاناشاہی مزاج کا لفظ اُس نازک مزاجی کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو ابوالحسن تاناشاہ والی گول کنڈہ میں تھی۔ تختِ طاؤس شاہِ جہاں کے تخت کی تلمیح ہے، جس پر چھ کروڑ روپیہ صرف ہُوا تھا اور جو جواہرات سے مُرصّع تھا اور جس کے اوپر ایک مور پنکھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اخفش ایک مشہور صرفی تھا۔ اُس نے ایک بکری پال رکھی تھی۔ عربی افعال کی گردانیں اُس بکری کے سامنے دُہرایا کرتا تھا۔ اگر وہ بکری سرہلا دیتی، تو سمجھتا تھا کہ سبق یاد ہو گیا؛ ورنہ پھر اُس سبق کو رٹنا شروع کر دیتا تھا۔ جس وقت اِس بکری کو ذبح کیا، تو معلوم ہُوا کہ اُس کے سر میں بھیجا ندارد ہے۔ اِس سبب سے ایسے آدمی کو جو بے سمجھے گردن ہلا دے، بُزِ اخفش کہتے ہیں۔ لکھ بخش یا لکھ داتا اُس شخص کو کہتے ہیں، جو انتہا درجے کا فیاض ہو۔ یہ اصل میں قطب الدین ایبک کا لقب ہے، جو شہاب الدین غوری کا غلام تھا اور اُس کے مرنے پر خود بادشاہ ہو گیا تھا۔ اِس کی فیاضی کی داستانیں آج تک زبان زدِ عام ہیں۔ ہندو آج تک اُسے پوجتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر جا بجا تھان بنا کر اُس کی پوجا کراتے ہیں۔ ہلاکو ظالم اور سفاک آدمی کو کہتے ہیں۔ یہ تلمیح ہولاکو خاں کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو چنگیز خاں کا پوتا تھا اور اِسی نے بغداد کو تاخت و تاراج کیا۔ تورہ والی مغرور عورت کو کہتے ہیں۔ تورہ جتانا شیخی کرنا ہے۔ شرع تورہ بھی محاورہ ہے، جس سے دین داری کا اظہار اور بات بات میں مذہبی روک ٹوک مُراد ہے۔ تورہ اصل میں چنگیز خاں کے مجموعۂ قوانین کا نام تھا، جس میں ہر قانون کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔ یہ سب محاورے اِسی لفظ تورہ سے لئے گئے ہیں۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھا دے یہ ایک تلمیحی مثل ہے۔ راون کے بھائی بھبھیشن نے راجہ رام چندر سے

مل کر اُن کو قلعہ لنکا کے بہت سے بھید بتائے تھے اور اُس کے فتح کرنے میں مدد دی تھی۔ اب اس مثل سے مطلب یہ ہے کہ رازداری کی دشمنی بڑا نقصان پہنچاتی ہے۔

(دُوم) وہ تلمیحیں جو عام عقائد وا وہام سے ماخوذ ہوئی ہیں۔

جب کوئی شخص سفر کو سدھارتا ہے، تو مُسافر کے بازو پر روپیہ وغیرہ باندھ دیا جاتا ہے۔ جب وہ خیر و عافیت سے منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے، تو وہ رقم سیدوں کو بانٹ دی جاتی ہے۔ اس کو امام ضامن کا روپیہ کہتے ہیں۔ یہاں امام سے حضرت علی رضا آٹھویں امام مُراد ہیں۔ عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر آپ کے نام کا روپیہ مُسافر کے بازو پر باندھ دیا جائے، تو آپ اُس کی سلامتی کے ضامن ہو جاتے ہیں۔ اندر کا اکھاڑا اُس مقام کو کہتے ہیں، جہاں ناچنے گانے والی حسین عورتیں جمع ہوں۔ ہندو راجہ اندر کو سواگ پتی یعنی بہشت کا مالک مانتے ہیں، جس کے سامنے حُوریں گاتی اور ناچتی رہتی ہیں۔ یہ محاورہ اِسی خیال پر مبنی ہے۔ بجلی کی تلوار اُس تلوار کو کہتے ہیں جو بہت کاٹ کرنے والی ہو۔ عوام کا خیال ہے کہ بعض مقامات میں بجلی اکثر گرا کرتی ہے۔ وہاں کے لہار بہت سالوہا جمع کرکے میدان میں رکھ دیتے ہیں، تاکہ اُس پر بجلی گرے اور وہ آبدار ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ جو تلوار اس لوہے سے بنائی جاتی ہے، اُس کا مقابلہ آبداری اور کاٹ میں کوئی تلوار نہیں کر سکتی۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ جس رستے سے بلّی نکلے اگر کوئی شخص بلّی کے نکل جانے کے بعد اُس رستے سے گزرے، تو اُس کو لڑائی جھگڑا ضرور پیش آتا ہے۔ اِسی سبب سے بلّی آلانگھنا ایک محاورہ ہو گیا ہے، جس کے معنی ہیں لڑنے جھگڑنے کو آنا۔ جو شخص آتے ہی ٹیڑھی ترچھی باتیں کرنے لگے، اُس کی نسبت کہتے ہیں کہ تم بلّی آلانگ کر تو نہیں آئے۔ بھیروں ہندوؤں کے نزدیک شیوجی کا ایک نام ہے اور یہ اُس وقت کے لیئے ہے، جب کہ وہ غضب ناک ہوں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اُن کی خفگی سے تباہی اور بربادی آتی ہے۔ اِسی عقیدہ سے بھیروں ناچنا ایک محاورہ بنایا گیا ہے، جس کے معنی ہیں ویرانی چھا جانا۔ جاہل مسلمان عورتیں بہت سے پیروں، ولیوں اور پریوں کے نام لیتی اور اُن کو مانتی ہیں۔ مثلاً لال پری، سبز پری، زرد پری، سیاہ پری۔ آسمان پری، دریا پری، نور پری، زین خاں، صدر جہاں، ننھے میاں، شاہ دریا، شاہ سکندر، شیخ سدّو، ماموں الہ بخش۔ سید برہنہ، پیر ہٹیلے، شاہ مدار، پیر غیب، چالیس تن یا چہل ابدال جن کے دم قدم سے یہ دنیا قائم ہے۔ عورتیں ان پریوں یا ان بزرگوں کی روحوں میں سے کسی رُوح کو اپنے سر پر بلاتی ہیں۔ جو عورت یہ کام کرتی

ہی، وہ جمعرات کے دن خوشبو زیور اور عمدہ پوشاک سے آراستہ ہو کر بیٹھ جاتی اور گانا سنتی ہی۔ جب کوئی پری یا روح اُس کے سر پر آتی ہی، تو وہ اپنا سر ہلانے لگتی ہی۔ دوسری عورتیں اپنی اپنی حاجتیں اُس کے سامنے پیش کرتی ہیں اور وہ ہر ایک کے سوال کا جواب دیتی جاتی ہی۔ اس طریقہ سے روحوں کے بُلانے کو مٹھک دینا یا حاضرات کرنا کہتے ہیں۔ اِس تلمیح میں عورتوں کے اِس خاص عقیدے کی طرف اشارہ ہی، جس کا ذکر کیا گیا۔ ادنیٰ درجے کے ہندو بھی اِسی طرح کسی دیوی، دیوتا، یا بیر کو اپنے سر پر بُلاتے ہیں۔ اُن میں جو مرد اِس کام کو انجام دیتا ہی، اُس کو بھگت کہتے ہیں اور عورت کو بھگتانی۔ بیر اُس جن یا خبیث روح کو کہتے ہیں، جس کو جادوگر کسی کو ضرر پہنچانے کے لئے اس پر مسلّط کرتے ہیں۔ مسلمان اُس روح کو موکّل کہتے ہیں۔ اِس سے بیر بٹھانا اور بیر دوڑانا دو محاورے پیدا ہوئے ہیں۔ اُڑن کھٹولا اور اُڑن یا ہوا ان یا بمان کے الفاظ ہندوؤں کے اس عقیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دیوتا ایک تختِ رواں پر سوار ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے تھے اِس تخت کو ہوا اُڑا کرلے جایا کرتی تھی۔ پاتال ہندی میں زمین کے سب سے نیچے کے طبقے کو کہتے ہیں۔ ہندوؤں نے پاتال کے سات طبقے قرار دیئے ہیں۔ ہر طبقے میں ایک زندہ مخلوق آباد ہی۔ پاتال تک کی خبر لانا اسی تلمیح سے ایک محاورہ بنایا گیا ہی۔ پارس ایک خیالی پتھر کا نام ہی، جس کی نسبت عام لوگوں میں یہ خیال پھیلا ہُوا ہی کہ اگر یہ پتھر لوہے سے چھُوا جائے، تو اُسے سونا بنا دیتا ہی۔ پچھل پائی کا لفظ جس سے بھتنی یا چڑیل مُراد ہی، عوام کے اِس خیال کو یاد دلاتا ہی کہ چڑیلوں یا بھتنیوں کے پاؤں میں پنجہ پیچھے کی طرف اور ایڑی آگے کی طرف ہوتی ہی۔ پری ایک خیالی حسین مخلوق ہی، جس کا سارا جسم عورتوں جیسا ہوتا ہی، مگر بازو پردار ہوتے ہیں پرستان اُس جگہ کا نام رکھا گیا ہی، جہاں پریاں آباد ہیں۔ پری مادہ اور دیو یا پریزاد نر ہوتے ہیں پرستان یا پریوں کا اکھاڑہ محاورہ میں اُس محفل کو کہتے ہیں، جہاں بہت سے خوب صورت آدمی جمع ہوں۔ بیر کی طرح پون بھی اُن خبیث روحوں کو کہتے ہیں، جنہیں جادوگر کسی شخص کے ضرر پہنچانے کے لئے بھیجتے ہیں۔ پون بٹھانا اور پون دوڑانا یا چلانا وہ محاورے ہیں جو اس لفظ سے بنائے گئے ہیں۔ بھوت وہ روحیں ہیں، جو جسموں سے جُدا ہو کر دنیا میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔ مرد کی روح بھوت اور عورت کی روح بھتنی کہلاتی ہی۔ بھوت لوگوں کے سروں پر آتے ہیں۔ یہ عام خیال ہی۔ بھوت چڑھنا کے ساتھ بھوت اُتارنا بھی محاورہ میں آگیا ہی؛ کیونکہ عام خیال یہ بھی ہی کہ منتر کے زور سے بھوت کسی کے سر سے اُتارا بھی جا سکتا ہی۔ مسلمانوں کے نزدیک سات سمندر سے مراد بحیرۂ شام، بحیرۂ قلزم،

بحرِ عرب، بحیرۂ عمّان، بحیرۂ فارس اور بحرِ اسود ہیں؛ مگر ہندوؤں کے سات سمندروں میں سے ایک سمندر نمک کا ہی، دوسرا دودھ کا، تیسرا گھی کا، چوتھا دہی کا، پانچواں شراب کا، چھٹا گنّے کے رس کا اور ساتواں شہد کا ہی۔ سفلی عمل جادو کی وہ قسم ہی، جو شیاطین و جنّات کی مدد سے عمل میں لائی جاتی ہی۔ برخلاف اس کے علوی عمل وہ ہی، جس میں ستاروں اور فرشتوں سے مدد طلب کی جاتی ہی۔ جادو کی نسبت عام لوگوں کا جو عقیدہ ہی، اُس کو یہ دونوں الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ خدا کے اسما دو قسم کے مانے جاتے ہیں۔ ایک جلالی جن سے غصہ اور جلال کا اظہار ہوتا ہی۔ دوسرے جمالی جن سے رحم و لطف نمایاں ہی۔ جب خدا کا کوئی جلالی اسم ننگی تلوار کی پشت پر پڑھ کر پھونکتے ہیں، تو اس سے مقصد یہ ہوتا ہی کہ دشمن ہلاک ہو۔ اس عمل کو سیفی کہتے ہیں۔ اگر اسم مذکور کے پڑھنے میں بے احتیاطی ہو، تو کہتے ہیں کہ یہ عمل اُلٹا عامل کے لیئے تباہی کا باعث ہوتا ہی۔ اس حالت کو سیفی کا اُلٹ جانا کہتے ہیں۔ سانپ کا من عوام کے اس خیال کو ظاہر کرتا ہی کہ جب سانپ خوش ہوتا ہی، تو وہ ایک روشن جواہر منھ سے باہر نکال کر جنگل میں رکھ دیتا ہی۔ اُس کی روشنی چودھویں رات کے چاند کی مانند ہوتی ہی۔ سانپ اس روشنی میں کوسوں سیر کرتا پھرتا ہی۔ کہتے ہیں کہ جس کسی کے پاس سانپ کا من ہو، وہ تمام آفتوں سے محفوظ رہتا ہی۔ نہ آگ اُسے جلا سکتی ہی، نہ پانی اُسے ڈبو سکتا ہی۔ شب چراغ بھی ایسا ہی لفظ ہی۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک جواہر ہی۔ دریائی گائے رات کے وقت چرنے نکلتی ہی، تو اس جواہر کو منھ سے نکال کر رکھ دیتی ہی اور اُس کی روشنی میں چرتی پھرتی ہی۔ چرنے چکنے کے بعد اُس کو اپنے منھ میں رکھ کر دریا میں غوطے لگا جاتی ہی۔ شبِ برات میں لفظ برات کے معنی روزی کے ہیں۔ اس لفظ سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہی کہ اس رات کو یعنی شعبان کی چودھویں یا پندرھویں رات کو فرشتے انسانوں کی روزی اور عمر کا حساب آیندہ کے لیئے لگاتے اور روزی تقسیم کرتے ہیں۔ ست جگ ہندوؤں کے نزدیک دنیا کا پہلا دور ہی، جس میں سچ اور راستی کے سوا دوسری بات کا نام نہ تھا۔ اس دور کی میعاد سترہ لاکھ اٹھائیس ہزار برس قرار دی گئی ہی۔ اس کے مقابل ایک دور کلجگ کہلاتا ہی۔ یہ دور چار لاکھ بتیس ہزار برس کا ٹھہرایا گیا ہی۔ اس زمانے میں پاپ اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ ترتیا جگ اور دواپر جگ دو اور جگ ہیں؛ مگر عام لوگوں میں مشہور یہی جگ ہیں۔ لچھمی ہندوؤں کے اعتقاد میں دولت کی دیوی ہی۔ لچھمی گھر میں آنا ایک محاورہ ہی، جس کے معنی ہیں حسبِ منشا اقبال ہونا۔ لنکا میں جو چھوٹا سو باون ہی گز کا۔ یا لنکا سے جو نکلا سو باون گز کا۔ یہ ایک تلمیحی مثل ہی۔ اُس موقع پر بولی جاتی

ہے، جہاں چھوٹے بڑے سب شریر اور فتنہ پرداز ہوں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جزیرہ لنکا میں دیو رہتے تھے، جو بہت بڑے بڑے قد کے ہوتے تھے، یہاں تک کہ اُن کے بچے بھی باون گز سے کم قد نہیں رکھتے تھے اور اُن کا مزاج نہایت سرکش اور شریر واقع ہوا تھا۔ میر بھڑی کی کڑھائی۔ ایک تلمیح ہے، جو ہیجڑوں سے لی گئی ہے۔ میر بھڑی جسے میر بھوجی بھی کہتے ہیں، ہیجڑوں کے سلسلے کا بانی تھا۔ ہیجڑے اُس کی نیاز دلواتے ہیں۔ اُن کا یقین ہے کہ اگر کوئی اس نیاز کی کڑھائی کا حلوا کھالے، تو وہ ناچنے تھرکنے اور ہیجڑوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے اور جب تک ہیجڑا نہ بن جائے اُسے کل نہیں پڑتی۔ یوہا یا یوحی عوام کے خیال میں ایک قسم کا سانپ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک ہزار برس گزرنے پر وہ ایک آواز نکالتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر ہزار برس کے بعد ایک دفعہ چلاتا اور چپ ہو جاتا ہے۔ تیسری دفعہ یعنی تین ہزار برس کے بعد یہ قدرت اُسے حاصل ہو جاتی ہے کہ جس شکل اور جس روپ کا چاہے، بن جائے۔ یعنی انسان یا حیوان بننے کی طاقت اُسے حاصل ہو جاتی ہے۔ عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک جن پیدا ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ اُس کو ہمزاد کہتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو خاص عمل کے ذریعے سے اُس کو قابو میں لا سکتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق اُس سے کام لے سکتے ہیں۔ ہندوؤں کے خیال میں ایک فرضی وجود ہے، جو دکھائی نہیں دیتا اور دنیا کے گرد حرکت کرتا رہتا ہے۔ کبھی کسی طرف ہوتا ہے۔ کبھی کسی طرف مثلاً شنبہ کے دن وہ مشرق میں ہوتا ہے۔ پنجشنبہ کے دن جنوب میں، منگل کے دن شمال میں۔ اتوار کے دن مغرب میں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اِس فرضی وجود کا نام ہندوؤں نے دساسول رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس روز وہ جس سمت میں ہو، اُس روز اُس سمت میں سفر کرنا نقصان اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ سفر کرنے والے پر واجب ہے کہ دساسول کو بائیں طرف یا اپنی پشت کی طرف رکھے۔ اُس کا سامنے پڑنا یا دائیں ہاتھ پر ہونا ازحد منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ الوپ انجن ایک قسم کا سرمہ ہے، جس کے لگانے سے آدمی آپ تو سب کو دیکھتا ہے؛ مگر اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اِسے سرمۂ سلیمان بھی کہتے ہیں۔ گٹکا پارہ کی ایک طلسمی گولی ہے، جسے جوگی تیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اِس گولی کو مُنہ میں رکھنے سے قوتِ پرواز آ جاتی ہے اور اِس کی مدد سے جوگی جہاں چاہتے ہیں اُڑ کر چلے جاتے جاتے ہیں۔

(سوم) وہ تلمیحیں جو خاص خاص رسموں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

مُسلمان عورتوں میں دستور ہے کہ نکاح کے بعد دولھا دولھن کو آمنے سامنے سر سے سر ملا کر اور ایک سُرخ دوپٹہ اُڑھا کر بٹھا دیتی ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں ایک آئینہ اور قرآن شریف میں سے سورۂ اخلاص نکال کر رکھ دیتی ہیں۔ اس رسم کو آرسی مصحف کہتے ہیں۔ آرسی سے مُراد آئینہ ہے۔ آئینہ رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ دولھا دولھن ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ لیں۔ سورۂ اخلاص سے غرض یہ ہے کہ میاں بیوی میں ہمیشہ اخلاص بنا رہے۔ دیو اُٹھان ہندوؤں کی ایک رسم ہے، جو کاتک سدی اکادشی کو منائی جاتی ہے۔ وشنو ہندوؤں کے نزدیک چار مہینے سے اس تاریخ تک سوتے رہتے ہیں۔ ہندو اس تاریخ کو ایک معین جگہ لیپ پوت کر گھیریا اور گیرو سے اُس پر نقش و نگار بناتے ہیں اور وہاں پوجا کی چیزیں رکھ کر اُن کو ایک تھالی سے ڈھک دیتے ہیں۔ گھر کی کوئی عورت یا کوئی برہمنی ہاتھوں سے اِس تھالی کو بجاتی جاتی اور یہ کہہ کر "اٹھو دیو اٹھو" وشنو کی تعریف کے فقرے گاتی جاتی ہے۔ سوئمبر ہندوؤں کی ایک قدیم رسم کا نام ہے۔ جب راجاؤں یا عالی خاندان کے لوگوں میں کسی لڑکی کے لیے بر درکار ہوتا تھا، تو تمام راجاؤں اور امیروں کو پہلے سے اطلاع دی جاتی تھی۔ تاریخ معین پر سب جمع ہو جاتے تھے۔ لڑکی بھرے جلسے میں آکر شہزادوں اور امیرزادوں کے کرتب دیکھتی تھی اور اُن میں سے جس کو اپنا شوہر بنانا پسند کرتی تھی، اُس کے گلے میں اپنے ہاتھ سے پھولوں کا ہار ڈال دیتی تھی۔ اد سپوں کا کونڈا مسلمان عورتوں کی ایک رسم کی تلمیح ہے۔ جب کسی لڑکے کی مسیں بھیگتی ہیں، تو اس خوشی میں اُس کی ماں حضرت خاتونِ جنت کی نیاز دلواتی ہے اور اُس میں رشتہ دار جمع کیے جاتے ہیں۔ آمین ایک رسم ہے جو قرآن کے ختم ہونے یا اُس کا کوئی حصّہ ختم ہونے پر ادا کی جاتی ہے۔ لڑکا جب مکتب میں قرآن کی تعلیم پاتا ہے، اُس کے تمام شاگرد اور اُستاد اُس لڑکے کے مکان پر پہنچ کر ایک خاص نظم بہ آواز بلند پڑھتے ہیں۔ ایک لڑکا پڑھتا ہے۔ باقی سب لڑکے ہر شعر پر پکار کر آمین کہتے جاتے ہیں۔ نظم پڑھنے کے بعد دعا مانگی جاتی ہے۔ شیرینی تقسیم ہوتی ہے اور اُستاد کو لڑکے کے ماں باپ حسبِ توفیق نذر دیتے ہیں۔ رت جگا ایک اور رسم ہے، جو بیاہ، سال گرہ، بسم اللہ یا کسی اور تقریب پر منائی جاتی ہے۔ اِس موقع پر عورتیں جمع ہوتی ہیں اور رات بھر جاگتی ہیں۔ رات کو کڑھائی ہو کر دن کو گلگلوں اور رحسم پر اوّل اللہ میاں کی سلامتی پڑھی جاتی۔ پھر زردے یا خشکہ پر حضرت فاطمہؓ کی نیاز دلوائی جاتی ہے۔ مُسلمان عورتوں میں شادی کے وقت کی ایک خاص رسم ہے، جسے زبان میں حیوانا

کہتے ہیں۔ نوبات، نبات سے بگڑا ہے جس کے معنی ہیں مصری کی ڈلیاں دُلھن کے دونوں مونڈھوں، کہنیوں، گھٹنوں، پیٹھ اور ہاتھوں پر رکھی جاتی ہیں۔ دولھا سے کہا جاتا ہے کہ ان ڈلیوں کو ایک ایک کرکے موہنہ سے اُٹھاؤ اور ہاتھ نہ لگاؤ۔ یہ حقیقت میں ایک ٹوٹکا ہے، جس سے غرض یہ ہے کہ دولھا ہمیشہ دُلھن کا فرماں بردار رہے۔ تارے دکھانا ایک اور رسم ہے، جو ایامِ زچگی میں ادا کی جاتی ہے۔ زچّہ کو رات کے وقت چھٹی کے روز دالان سے باہر لا کر تارے دکھاتی ہیں۔ دو عورتوں کے ہاتھ میں تلواریں ہوتی ہیں اور وہ اُس کے ساتھ محافظ بن کر آتی ہیں۔ زچّہ بچے کو گود میں اور قرآن شریف کو سر پر رکھ کر آسمان کی طرف دیکھتی اور سات تارے گنتی ہے عورتوں کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے زچّہ کو جن و پری کا خوف نہیں رہتا۔ بیوی کی صحنک ایک اور رسم ہے۔ اکثر شادی یا کسی مراد کے برآنے پر عورتیں حضرت فاطمہ کے نیاز دلواتی ہیں۔ اِس میں بڑی احتیاط کی جاتی ہے۔ سہاگن اور پارسا عورتیں شامل ہوتی ہیں اگر کوئی عورت دو خاوند کر چکی ہو، تو اُس کو شریک نہیں کرتیں، بلکہ سیدانیوں کو اس نیاز کا کھانا کھلانا اولیٰ سمجھتی ہیں جہانگیر کے زمانے سے یہ رسم جاری ہوئی ہے۔ پھول ہونا ایک اور رسم ہے، جو مرنے سے تیسرے دن ادا کی جاتی ہے۔ ہندؤں میں دستور ہے کہ مرنے سے تیسرے دن مُردے کی ہڈیاں، جنھیں وہ پھول کہتے ہیں، چُنی جاتی اور دریائے گنگا میں بہائی جاتی ہیں۔ مسلمانوں میں بھی تیسرے دن مردے کی فاتحہ ہوتی ہے۔ چنوں کے دانوں پر کلمہ پڑھا جاتا ہے، تاکہ مردے کی روح کو ثواب پہنچایا جائے۔ فاتحہ کے وقت کچھ اگر جا اور کچھ پھول لائے جاتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ پڑھ کر ہر ایک حاضرِ مجلس اپنے کے پیالے میں پھول ڈالتا ہے اور یہ پھول اور خوشبو مردے کی قبر پر بھیجی جاتی ہے۔ اِن کے علاوہ اور بھی رسمیں ہیں مثلاً بسم اللہ، چھٹی، چوتھی، منگنی، ستواسا، مہندی، بری، یا ساچق، چالیسواں وغیرہ۔

(چہارم) وہ تلمیحیں جن کی بنیاد فرضی قصّوں پر ہے۔

عتر بود کرنا ایک محاورہ ہے جسے عام آدمی بولتے ہیں۔ اِس کے معنی ہیں مطلب خبط کرنا۔ اِس کا قصہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک بے وقوف آدمی بوستان پڑھتا تھا۔ جب سعدیؒ کے اِس شعر پر پہنچا ؎

کہ سعدی کہ گوئے بلاغت ربود

در ایامِ بوبکر بن سعد بود

تو اُس نے استاد سے پوچھا: ۔ عنبر بود کے کیا معنی ہیں۔ بلاغت میں سے اُس نے بلا کو جدا کرکے دوسرے لفظ ربود سے ملا دیا اور عنبر بود کو ایک لفظ سمجھا۔ ٹیڑھی کھیر کے معنی ہیں مشکل کام۔ کہتے ہیں کہ ایک اندھے سے کسی شخص نے پوچھا۔ حافظ جی! کھیر کھاؤ گے، اُس نے کہا، کھیر کیسی ہوتی ہے۔ اِس نے کہا سفید، پوچھا سفید کیسی، کہا جیسے بگلا۔ اُس نے پوچھا، بگلا کیسا ہوتا ہے۔ اِس نے ہاتھ ٹیڑھا کرکے دکھایا کہ ایسا۔ اندھے نے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے ٹٹول کر کہا۔ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم سے نہیں کھائی جائیگی۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ یہ ایک تلمیحی مثل ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی زمیندار کے ہاں بھینس کی چوری کی تھی۔ قاضی نے تمام مشتبہ آدمیوں کو، جن میں چور بھی تھا، سامنے کھڑا کر دیا، پھر اپنے ایک پیادے سے کہا۔ میں جس کی طرف اشارہ کروں، تم اُسے گرفتار کرلینا۔ پھر اُس نے کہا۔ دیکھ چور کی ڈاڑھی میں تنکا ہے۔ چور کے دل میں ڈبکا تھا ہی۔ اُس نے فوراً اپنی داڑھی پر ہاتھ ڈالا اور اِس حرکت سے وہ شناخت کرکے پکڑا گیا۔ نیبو نچوڑ: ناخواندہ مہمان کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک سرائے میں ایک مفت خورہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس کا دستور تھا کہ جب کوئی مسافر کھانا کھانے بیٹھتا، تو ایک نیبو لے کر دسترخوان پر پہنچ جاتا۔ مسافر کے آگے سالن دیکھ کر کہتا ہے کہ حضرت نیبو اس کا بناؤ ہے۔ ذرا اس کو نچوڑ کر مزا دیکھئے۔ وہ بیچارہ مروت میں آکر اُس کو بھی کھانے میں شریک کرلیتا۔ طفیلی کا لفظ بھی اِسی طرح پیدا ہوا ہے۔ طفیل کوفہ کا ایک شاعر تھا۔ اس کی عادت تھی کہ جب لوگوں کو کسی دعوت میں جاتے دیکھتا تو یہ بھی اُن کے ساتھ ہو لیتا تھا اور بے تکلف دعوت میں شریک ہوجاتا تھا۔ ناؤ میں خاک اُڑانا ایک محاورہ ہے، جس کے معنی ہیں جھوٹا الزام لگانا۔ کہتے ہیں کہ ایک شیر اور ایک بکری دونوں کشتی میں سوار تھے۔ شیر نے اُس کو کھانے کی نیت سے کہا کہ تو کشتی میں کیوں خاک اُڑاتی ہے۔ اُس نے کہا۔ جناب یہاں خاک کہاں ہے، جسے میں اُڑاؤں۔ شیر نے غصے میں آکر کہا۔ تو ہماری بات کو جھٹلاتی ہے۔ دیکھ تو میں تیری گستاخی کا کیا مزا چکھاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس پر حملہ کیا اور پھاڑ چیر کر اُسے کھا گیا۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال اس کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ بے دریغ نیکی کر۔ اِس بات کی پروانہ کر کہ اس کا انعام بھی کچھ ملیگا، یا نہیں۔ حاتم طائی کے قصے میں لکھا ہے کہ ایک شخص دریا میں ہر روز دو روٹیاں ڈالا کرتا تھا۔ خدا نے اس کی محنت بھی ضائع نہیں کی۔ اِس کا مفصل قصہ حاتم طائی کے قصے میں دیکھنا چاہیئے۔ اود بلاؤ کی ڈھیری اُس جھگڑے کو کہتے ہیں، جو کبھی فیصل نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ جب کئی اود بلاؤ مل کر مچھلیاں مارتے ہیں، تو دریا کے کنارے ڈھیر لگاتے جاتے ہیں۔ پھر ہر ایک

کا حصّہ الگ الگ لگاتے ہیں۔ مگر کوئی نہ کوئی ادو بلاؤ اپنے حصّے کو کم سمجھ کر سارے حصّوں کو گڈمڈ کر دیتا ہے۔ پھر از سرِ نو حصّے لگائے جاتے ہیں اور اس تقسیم کا انجام بھی یہی ہوتا ہے۔ غرض کہ اُن میں برابر جھگڑا ہوتا رہتا ہے اور کسی طرح فیصلہ ہونے میں نہیں آتا۔ نمازی کا ٹکا اُس ناشائستہ بات کو کہتے ہیں، جس کا بدلا کہیں نہ کہیں ضرور مل کر رہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شریر لڑکا نماز پڑھتے میں لوگوں کی ٹانگیں گھسیٹ لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب سجدہ کرتے وقت اُس نے کسی نمازی کی ٹانگ گھسیٹی، تو اُس نے ملامت کرنے کی بجائے سلام پھیر چکنے سے ایک ٹکا اُس کے حوالے کیا۔ تاکہ یہ مزا پڑ جائے، تو وہ کہیں نہ کہیں اِس کی سزا پائے۔ اُسے تو ٹکے کی چاٹ لگ ہی گئی تھی، اتفاق سے ایک جلّاد پٹھان کے ساتھ بھی اُس نے یہی حرکت کی۔ اُس نے سلام پھیرتے ہی تلوار میان سے نکالی اور اُس شریر لڑکے کی گردن اُڑا دی۔ آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ بہت سا کام ہو چکا ہے۔ تھوڑا سا باقی رہ گیا ہے۔ کہتے ہیں۔ ایک سوداگر بچے کی دوستی کسی جادوگرنی سے تھی۔ وہ اُس کی بیوی کے نام سے جلا کرتی تھی۔ ایک روز اُس نے جادو کی ایک پڑیا سوداگر بچے کے گھر میں پھکوائی۔ اتفاق سے وہ پڑیا بجائے اِس کے کہ اُس کی نیکبخت بیوی کو کچھ ضرر پہنچائے، خود سوداگر بچے کے بدن پر جا پڑی۔ اُس کا پڑنا تھا کہ اُس کے سارے تن بدن میں سوئیاں ہی سوئیاں ٹھک گئیں۔ سوداگر بچہ اس تکلیف کے مارے بیہوش ہو گیا۔ بیوی نے صبح کی نماز پڑھ کر میاں کی یہ حالت دیکھی، تو وہ فوراً سوئیاں نکالنے میں مشغول ہو گئی۔ ہاتھ سے سوئیاں نکالنے میں تکلیف ہونے لگی، تو اُس نے ہونٹوں سے نکالنی شروع کیں، تھوڑی سی سوئیاں نکالنی باقی تھیں کہ ظہر کا وقت آ گیا۔ اُس نے باندی سے کہا کہ میں ظہر کی نماز پڑھتی ہوں۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔ اب میری جگہ تو کام کر۔ باندی سوئیاں نکالنے لگی، بیوی ظہر کی نماز سے فارغ نہیں ہوئی تھی کہ سوئیاں سب نکال لی گئیں۔ سوداگر بچہ کو ہوش آ گیا۔ اُس نے آنکھ کھول کر دیکھا، تو بیوی اُس کے پاس نہ تھی۔ باندی اُس کی خدمت کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اُس کو بیوی سے نفرت ہو گئی۔ اُس نے باندی کو بیوی بنا لیا اور بیوی کو باندی کی خدمت پر مامور کر دیا۔ بھیگی بلّی بتانا ایک تلمیحی محاورہ ہے، جس کے معنی ہیں بیجا عذر کرنا۔ حیلے بہانے کرنا۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنے مکان کے دالان میں شب کے وقت پڑے دالے سو رہا تھا۔ اُسی دالان میں اُس کا نوکر بھی ایک طرف پڑا تھا۔ نوکر کو اُس کے آقا نے کئی دفعہ کام کے لیے دالان سے باہر بھیجنا چاہا۔ ہر دفعہ نوکر نیا عذر تراش کر بیان کر دیتا تھا، تاکہ اُسے باہر نہ جانا پڑے۔ آخر میں آقا نے کہا۔ باہر آگن

میں بارش ہو رہی تھی۔ ذرا باہر جاکر تو دیکھ اب بارش تھم گئی ہے، یا ہو رہی ہے۔ نوکر نے جواب دیا کہ ابھی بارش ہو رہی ہے۔ آقا نے پوچھا۔ تو نے کس طرح معلوم کیا۔ اُس نے کہا۔ باہر سے بلی اندر آئی تھی میں نے اُس پر ہاتھ پھیر کر دیکھا، تو وہ بھیگی ہوئی تھی۔ جون پور کا قاضی محاورہ میں احمق آدمی کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شہر کے کسی مکتب میں اُس مکتب کا اُستاد اپنے ایک شاگرد پر خفا ہو رہا تھا۔ اُستاد نے خفگی میں اُس نے کہا۔ نالائق! تو میرا احسان نہیں مانتا کہ میں نے تجھے گدھے سے آدمی بنایا۔ ایک کمہار نے جو اُس مکتب کے قریب گزر رہا تھا، یہ بات سُنی۔ فوراً مکتب میں آیا اور اُس نے اُستاد سے کہا کہ میرے پاس بھی ایک گدھا ہے۔ اگر آپ اُسے آدمی بنا دیں، تو بڑا احسان ہو۔ اُستاد اُس کی حماقت کو تاڑ گیا۔ اُس نے ہنسی کے طور پر کہا۔ اگر تم سَو روپیہ دو اور اپنا گدھا میرے پاس چھوڑ جاؤ، تو سال بھر کے بعد میں اُس کو آدمی بنا دوں گا۔ کمہار اس شرط پر راضی ہو گیا۔ گدھا اُستاد صاحب کے پاس چھوڑ گیا اور سَو روپیہ بھی دے گیا۔ سال بھر کے بعد آیا، تو اُستاد اُس گدھے کو فروخت کر کے دام کھرے کر چکے تھے۔ اُس نے کہا۔ میرا گدھا جسے آپ نے آدمی بنا دیا ہو گا، واپس کیجئے۔ اُستاد صاحب نے کہا۔ میں نے اُس کو آدمی ہی نہیں بنایا، بلکہ لکھا پڑھا کر عالم بھی بنا دیا ہے۔ اب وہ جونپور میں قاضی کے عہدہ پر مامور ہے۔ یہ سُن کر کمہار خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ فوراً چھپنی، پلانا ہمراہ لے جون پور کو روانہ ہُوا۔ قاضی صاحب عدالت کر رہے تھے۔ کوئی مقدمہ اُن کے سامنے پیش ہو رہا تھا۔ کمہار اُن کے سامنے ذرا دُور کھڑا ہو گیا اور قاضی صاحب کو چھپنی پلانا دکھانے لگا تاکہ وہ اپنے مالک کو پہچان لیں اور اُس کے پاس چلے آئیں۔ قاضی نے یہ عجیب حرکت دیکھی، تو آدمی بھیج کر اِس حرکت کا سبب دریافت کیا۔ کمہار نے سارا ماجرا اوّل سے آخر تک کہہ سُنایا۔ جب قاضی صاحب کو یہ حال معلوم ہُوا، تو اِس خیال سے کہ لوگوں میں اُن کی ہنسی نہ اُڑے، اُس کو ایک معقول رقم دے کر ٹالا اور اُس سے خدا خدا کر کے پیچھا چھڑایا۔ شیخ چلی ایسے شخص کو کہتے ہیں، جو دُور دراز کار منصوبے باندھے۔ یہ ایک فرضی شخص لوگوں نے گڑھ لیا ہے اور اِس قسم کی تمام باتیں جو دور دراز کار منصوبوں اور تجویزوں سے تعلق رکھتی ہیں، اُس کے نام کے ساتھ چپکا دی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ شیخ جی کو ایک شخص نے مزدوری پر لگایا۔ ایک ٹوکری میں شیشہ آلات بھر کر اُن کو دیے کہ فلاں جگہ اِس ٹوکرے کو پہنچا دو۔ شیخ جی نے رستے میں ایک جگہ ٹوکرے کو الگ رکھ کر سوچنا شروع کیا کہ آج جو مزدوری مجھے وصول ہو گی، اِس سے ایک مرغا اور ایک مرغی خرید کر دوں گا۔ مرغی کو انڈوں پر

بٹھاؤنگا۔ اُس سے بہت سے بچے حاصل ہونگے۔ جب بہت سی مرغیاں ہوجائینگی، تو اُن کو بیچ کر ایک بکری اور ایک بکرا خرید کرونگا اور اُس کی نسل بڑھاؤنگا۔ بکریوں کا گلہ جب بڑھ جائیگا، تو اُس کو فروخت کرکے گائے لونگا۔ گائے کی نسل اسی طرح ترقی کریگی۔ گایوں کا گلہ بیچ کر بھینسیں لونگا۔ جب بہت سی بھینسیں ہوجائینگی، تو اُن کی تجارت سے میں امیر و کبیر ہوجاؤنگا۔ ایک بڑے گھرانے میں شادی کرونگا۔ بیوی ایسی تلاش کرونگا، جو حسین ہو۔ میں اُس کو ہمیشہ اپنے قابو میں رکھونگا۔ اگر وہ نافرمانی کریگی، تو میں اُس کی کمر پر زور سے ایک لات جڑونگا۔ شیخ جی اس وقت غصّے میں تھے۔ خیالی بیوی کی جگہ آپ کی لات ٹوکرے پر پڑی اور تمام شیشے چور چور ہوگئے

لال بجھکڑ اُس شخص کو کہتے ہیں جو ہر بات کا جواب دینے اور ہر معاملہ میں رائے دینے پر تیار رہتا ہو۔ اصل میں تو احمق ہو، مگر اپنے تئیں سب سے زیادہ عقلمند خیال کرتا ہو۔ شیخ چلّی کی طرح لال بجھکڑ بھی لوگوں نے ایک فرضی شخص تراش لیا ہے اور اس قسم کی تمام رائیں جو حماقت پر مبنی ہوں، اُس کی طرف منسوب کردی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ جس گاؤں میں لال بجھکڑ رہتا تھا، اُس کے رہنے والوں نے ہاتھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک دفعہ ایک ہاتھی اس گاؤں سے گزرا۔ اُس کے پاؤں کے نشان زمین پر پڑے۔ گاؤں والوں نے ہاتھی کو تو نہیں دیکھا۔ اُس کے پاؤں کے نشان صرف دیکھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ نشان زمین پر کیونکر ہوگئے۔ لال بجھکڑ کو وہ نشان لاکر دکھائے اور اُن کی حقیقت دریافت کی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ارے بے وقوفو! میرے سوا کوئی اس معمّے کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہرن چکّی کے پاٹ چاروں پاؤں سے باندھ کر کودا ہے اور اس سے یہ نشان زمین پر بنے ہیں۔ اِسی طرح ایک دفعہ ایک لڑکا گھر کے ایک ستون کو ہاتھوں کے حلقے میں لئے کھڑا تھا۔ اِس اثنا میں اُس کا باپ باہر سے چنے چباتا آیا۔ لڑکے نے اِسی حالت میں اُس سے چنے مانگے۔ باپ نے اُس کی مٹھی میں چنے دیدئیے؛ مگر یہ مشکل پیش آئی کہ ستون سے ہاتھ کیوں کر نکالے۔ اگر ہاتھ جُدا کرے، تو چنے زمین پر گر جاینگے اور یہ اُسے منظور نہ تھا۔ لڑکا رونے لگا۔ باپ کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آئی۔ وہ دوڑا دوڑا لال بجھکڑ کے پاس پہنچا اور اُس کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اُس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ بھلا میرے سوا کون اس تدبیر کو بتا سکتا ہے۔ جاؤ۔ گھر کی چھت کو اُدھیڑ ڈالو۔ جب ستون پر سے چھت ہٹ جائیگی تو لڑکے کو آسانی سے تم چھت پر کھینچ لوگے۔ مٹھی سے چنے بھی گرنے نہ پائینگے اور لڑکا بھی صحیح سلامت ستون سے نکل آئیگا۔

یک نہ شد دو شد۔ ایک تلمیحی مثل ہے۔ یہ اُس موقع پر بولی جاتی

ہے، جب کہ ایک عجیب امر کے بعد دوسرا عجیب امر واقع ہو۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو ایک ایسا منتر معلوم تھا کہ اُس کے ذریعہ سے وہ مُردے کو جگا سکتا اور اُس سے باتیں کرسکتا تھا۔ دوسرا ایک اور منتر بھی معلوم تھا، کہ جس کے ذریعے سے وہ مُردے کو باتیں کرنے کے بعد پھر قبر میں سلا دیتا تھا۔ اگر کسی مردہ کے گھر والوں کو راز کی کچھ باتیں مردہ سے پوچھنی ہوتیں، تو اُس عامل سے جاکر التجا کرتے تھے۔ وہ اپنے عمل سے مردہ کو جگا کر سب کچھ پوچھ دیتا، پھر اُس کو دوبارہ سلا دیتا تھا۔ مرتے وقت اُس نے ایک شاگرد کو وہ دونوں منتر بتا دیے۔ شاگرد نے بطور آزمائش کے ایک قبر پر پہلا منتر پڑھا۔ مردہ جاگ اُٹھا اور اُس سے باتیں کرنے لگا اور اُس نے ہر سوال کا جواب دیا؛ مگر دوسرا منتر اتفاق سے یاد نہیں رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مُردہ اُس کے پیچھے ہو لیا۔ اُس نے گھبرا کر اُستاد کو قبر سے اُٹھایا، تاکہ وہ پہلے منتر کا اُتار دوبارہ بتائے؛ مگر اُس عالم میں وہ بھی کچھ نہ بتا سکا۔ پہلے مردہ کی طرح یہ نیا مُردہ بھی اب اُس کے ساتھ چل پڑا۔ اس موقع پر بے ساختہ اُس کی زبان سے یہ فقرہ نکلا۔ اس مثل کی طرح ایک اور فارسی تلمیحی مثل اُردو میں مستعمل ہے۔ گربہ کشتن روزِ اول۔ اس مثل کا مطلب یہ ہے کہ رعب پہلے ہی دن جمانا چاہیئے۔ کہتے ہیں، دو دوستوں نے ایک ساتھ شادی کی۔ دونوں کی بیویاں بدمزاج نکلیں۔ ایک کی بیوی خاوند پر غالب آئی۔ دوسرے کی نہایت فرماں بردار ثابت ہوئی۔ پہلے دوست نے دوسرے سے دریافت کیا کہ تم نے اپنی بدمزاج بیوی کو کس طرح مطیع کیا۔ اُس نے کہا۔ اوّل ہی روز جب ہم میاں بیوی کھانے پر بیٹھے، تو ایک بلّی بھی دسترخوان پر آ بیٹھی۔ میں نے کہا۔ چل جا، وہ نہ گئی۔ تب میں نے فوراً اُٹھ کر اُسے مار ڈالا۔ اِس واقعے سے میری بیوی پر میرا رُعب چھا گیا۔ وہ ڈرنے لگی کہ جس نے ذرا سی بات نہ ماننے پر بلّی کو مار ڈالا وہ خدا جانے میرا کیا حال کرے گا۔ یہ سُن کر دوست نے بھی اِس پر عمل کیا؛ مگر چونکہ اُس کی بیوی اُس کی عادت سے واقف ہو چکی تھی اور اُس کے مزاج پر غالب آ چکی تھی؛ اس لیئے کچھ پیش نہ گئی۔ اس کا حال معلوم کرکے دوست نے کہا۔ بھائی گربہ کشتن روزِ اول بعد کا رُعب جمانا کام نہیں دیتا۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی۔ یہ بھی ایک تلمیحی مثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امیر غریب کی نسبت نہیں؛ مگر تقدیر کے نزدیک کوئی بات عجیب نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب راجہ بھوج پر مصیبت پڑی اور راج پاٹ چھن گیا، تو وہ مارا مارا پھرتا تھا۔ ایک دفعہ مانگتا کھاتا ایک رانی کے پاس جا نکلا۔ ابھی وہ محل ہی میں تھا کہ ایک کاٹھ کی مورتی رانی کا کھونٹی پر لٹکا ہُوا ہار نگل گئی۔ رانی نے بھوج کو چور سمجھ کر راجہ کے پاس بھیج دیا۔ اُس نے چوری کی سزا میں اُس کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے۔ وہ اِسی بیچارگی کی حالت میں تھا کہ گنگا تیلی اُدھر آ نکلا۔

گھر میں اولاد نہ تھی۔ اس لنڈ منڈ ہی کو غنیمت سمجھ کر اپنے گھر پڑے گیا۔ علاج کیا تو اچھا ہو گیا۔ کولھو چلانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ ایک دن رات کو کولھو چلا رہا تھا اور دیپک راگ گا رہا تھا۔ راجہ کی بیٹی نے اُس وقت محل کا چراغ گُل کرنے کا حکم دیا! مگر چراغ جب بجھائے جاتے، تو راگ کے سروں کے اثر سے جل اُٹھتے تھے۔ معلوم ہُوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ گنگا تیلی کے گھر میں کوئی شخص دیپک راگ گا رہا ہے۔ صبح کو اُس نے راجہ کے سر ہو کر شادی کا پیغام گنگا تیلی کے گھر بھجوایا۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد تقدیر سے ہاتھ پاؤں بھی نکل آئے۔ کاٹ کی مورتی نے بھی ہار اُگل دیا۔ راج پاٹ بھی دوبارہ نصیب ہُوا۔ راج ملنے کے بعد راجہ بھوج نے گنگا تیلی کو ہمیشہ اپنا باپ سمجھا اور اس کو مالا مال کر دیا۔

تلمیحات کا دائرہ وسیع کرنے کی ضرورت

اُردو زبان کی ادبی اور غیر ادبی تلمیحات پر ہم کافی بحث کر چکے ہیں اور ہر قسم کی تلمیحات کی مثالیں بھی ہم نے تحریر کر دی ہیں۔ ہم نے اِس مضمون میں تمام تلمیحات کو گھیر لینے کی کوشش نہیں کی؛ تاہم اگر وہ تمام تلمیحیں جو ہماری زبان کی نظم و نثر میں مستعمل ہیں یا عام بول چال میں رائج ہیں، ایک جگہ جمع کر دی جائیں، تو اُن پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص اس نتیجے پر پہنچ جائیگا کہ اُن کی تعداد بہت کم ہے۔ ہزاروں خیالات ہیں، جن کے ادا کرنے کے لیئے ہمارے پاس موزوں قالب نہیں ہیں۔ یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں میں تلمیحات کی یہ کثرت ہے کہ اُن کے لیئے مستقل فرہنگیں تیار کی جاتی ہیں، جن میں فرہنگ نگار اُن تلمیحوں کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے جمع کرتے ہیں اور ہر تلمیح کی تشریح کرتے ہیں۔ اگرچہ تلمیحات کی کثرت کے سبب باشندگانِ یورپ ہر قسم کے خیالات کو مناسب سانچوں میں ڈھال سکتے ہیں۔ تاہم اُن کی پیاس نہیں بجھی۔ وہ دُنیا کی مختلف قوموں کی دیوتاؤں کے قصّے معلوم کرتے ہیں۔ اُن کے مذہبی عقائد ادر اوہام کا سراغ لگاتے ہیں اُن کی تاریخوں کو اپنی زبانوں میں ترجمہ کرتے ہیں۔ اُن کے مذہبی اور غیر مذہبی افسانوں کو اپنی زبانوں کے سانچے میں ڈھالتے ہیں اُن کے شاعرانہ خیالات پر عبور حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے ناٹکوں کو ترجمہ کا لباس پہناتے ہیں۔ اور اس تمام ذخیرہ سے ادبیات کے لیئے تلمیحیں اخذ کرتے ہیں تاکہ اُن کو ہر قسم کے خیالات و افکار کے ادا کرنے کا سامان پہلے سے زیادہ میسر ہو۔ برخلاف اس کے ہمارے ہم زبان قدامت پرست ہیں۔ اگر غیر زبان کے کسی لفظ میں اہلِ فارس نے تغیر و تبدل کیا ہے، یا عربوں نے کوئی تبدیلی کی ہے، تو اُس کو جائز سمجھتے ہیں۔ اگر ایرانیوں نے غیر زبان کے کسی لفظ کے ساتھ اپنا لاحقہ، یا سابقہ لگا کر کوئی نیا لفظ بنا لیا ہے تو اُس کو بھی رواداری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر عربوں نے غیر زبان کے کسی لفظ سے کوئی نیا مصدر بنا لیا ہے تو اُس پر بھی ناک بھوں نہیں چڑھاتے۔ اگر اہلِ ایران یا اہلِ عرب میں

سے کسی نے کوئی نئی تلمیح کسی تاریخ یا افسانہ کی بنیاد پر وضع کرلی ہے، تو اس پر بھی رضامند رہتے ہیں؛ لیکن اگر ہمارے ملک کا کوئی آدمی غیر زبان کے کسی لفظ میں تصرف کرے، یا عربی فارسی کے کسی لفظ کے ساتھ ہندی زبان کا کوئی سابقہ یا لاحقہ لگائے، یا کسی لفظ پر مصدر کی علامت لگا کر کوئی نیا مصدر بنائے، یا کوئی جدید تلمیح استعمال کرے، تو اُس پر اعتراضات کی بوچھار ہوتی ہے اور قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ یہ حضرات موجودہ زبان میں سے بہت سے الفاظ کو ترک کرتے جاتے ہیں اور اس پر فخر کا اظہار کرتے ہیں؛ مگر ایسی کوئی تدبیر نہیں کرتے، جس سے ہماری زبان وسیع ہو، ہمارے ادبیات کا دامن فراخ ہو۔ ہماری لغات میں الفاظ کی تعداد زیادہ ہو، ہمارے ادائے خیالات کے قوت میں ترقی ہو۔

اِس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ زبان سے غفلت کرنا ایک ایسا گناہ ہے، جو کسی طرح قابل معافی نہیں ہے۔ اخبار نویس رسالوں کے مرتب کرنے والے، شاعر، انشا پرداز اور مصنف، جنھوں نے اب تک زبان کی طرف سے غفلت کا اظہار کیا ہے، اگر چاہیں، تو نئے الفاظ، نئے محاورات، نئے استعارات، نئی اصطلاحات اور نئی تلمیحات سے ہماری زبان کو مالا مال کرسکتے ہیں۔ میں عام زبان کی توسیع پر یہاں اظہار خیالات نہیں کرتا۔ صرف تلمیحات پر بحث کرنی چاہتا ہوں۔ موجودہ تلمیحات کا بیشتر حصّہ عرب و ایران سے لایا گیا ہے۔ ہندوستانی تلمیحات عام بول چال میں کسی قدر ہیں؛ مگر وہ لائق شمار نہیں ہیں۔ ہندوستان کی زبانوں اور اُن کے ادبیات سے نفرت و گریز کرنے کے بعد کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اُردو زبان کو ہندوستان کی مشترک زبان کا خطاب دیں۔ اگر آپ جرمن، فرانسیسی، یا انگریزی زبان کی لغات کھول کر دیکھیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُنھوں نے تمام دنیا کی زبانوں اور ادبیات سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ کوئی مذہب کوئی زبان کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں ملے گی، جس کے عقائد، رسوم، اوہام، تاریخ اور ادب کے متعلق ضروری الفاظ ان ترقی یافتہ زبانوں میں موجود نہ ہوں۔ گویا اُنھوں نے اپنی زبانوں کے ادب کو ایک عالم گیر ادب بنا دیا ہے۔ کیا ہمارے لیے یہ بات شرم کی نہیں ہے کہ ہم نے اپنی زبان کو اب تک ہندوستانی زبان کہلانے کا مستحق بھی ثابت نہیں کیا۔ اگر ہم فراخ دل ہوتے، اگر ہم میں تعصب کی جھلک نہ ہوتی، اگر ہم کو اپنی زبان سے محبت ہوتی، اگر ہم اپنی زبان کے ساتھ اپنے وطن کی عزت بھی کرنا چاہتے، تو پھر ہمارا فرض تھا کہ جتنی قومیں ہندوستان میں آباد ہیں، اُن کے عقائد و اوہام، اُن کے رسم و رواج اور اُن کی تاریخ و ادب کے تمام ضروری الفاظ اپنی

زبان میں داخل کر لیتے اور اس کا دائرہ اس قدر وسیع کرتے کہ ہندوستان کی کوئی موجودہ زبان اُس کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ اگر عام بول چال میں تغیر و تبدل کرنے کا اختیار ہم نہیں رکھتے، تو یہ بات تو ہماری قدرت میں ہے کہ ہم اپنے ادبیات کا دائرہ وسیع کر دیں اور اُس کو ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ باشندوں کے لیئے قابلِ مطالعہ اور لائقِ انس بنا دیں۔ اُردو زبان کے بنانے میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ اُس کے ادب میں صرف اسلامی ادبیات کے آثار موجود ہیں۔ ہندو قوم کے ادبیات کا کوئی نشان نہ ہماری نثر میں ہے، نہ نظم میں۔

شاید ایک معترض اس موقع پر یہ اعتراض اُٹھائے کہ ہندوؤں کے مذہبی عقائد، اُن کے دیوتاؤں کے قصے، اُن کے شگون واوہام، اُن کی تاریخ کی غیر معتبر کہانیاں اس قابل نہیں ہیں کہ مسلمان اُن کو تسلیم کریں۔ حالاں کہ وہ توحید کے ماننے والے ہیں اور معقول پسند ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اب بھی ہمارے ادب میں ایسی سینکڑوں باتیں داخل ہیں جو نہ مذہب کے لحاظ سے قابلِ تسلیم ہیں، نہ عقل کے لحاظ سے۔ اگر ہم مذہب یا عقل کا پاس کرتے ہیں، تو لازم ہے کہ ہم تمام ایسی باتوں کو اپنے ادبیات سے نکال دیں۔ یہ تو ایک الزامی جواب ہے۔ اصلی اور حقیقی جواب یہ ہے کہ شاعری اور انشا پردازی میں ایسی تمام باتیں اس لیئے داخل نہیں کی گئیں کہ وہ مذہبًا یا عقلًا لائقِ تسلیم ہیں؛ بلکہ اس لیئے داخل کی گئی ہیں کہ وہ ادائے خیالات کے سانچے ہیں۔ مثلًا اگر کہا جائے کہ "ہمالیہ پہاڑ دیو کی طرح سینہ تانے کھڑا ہے اور ہندوستان کو اپنی آغوش میں لینے کے لیئے تیار ہے" تو اُس فقرہ سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا کہ اس کا کہنے والا دیو کے وجود کا قائل ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ ہمالیہ کے بلند سلسلہ نے ہندوستان کو ایک طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کہے کہ "روزگار عنقا ہو گیا ہے" تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائیگا کہ روزگار نہیں ملتا۔ نہ یہ کہ اس فقرہ کا بولنے والا عنقا کے معدوم ہونے کا اظہار کر رہا ہے۔ ہر شخص جو کسی ناول یا ناٹک کو پڑھتا ہے، اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایک مصنوعی قصہ پڑھ رہا ہوں، تاہم جب کوئی ہنسی کی بات اُس میں آتی ہے، تو ہنس پڑتا ہے اور اگر کوئی دردانگیز واقعہ پڑھتا ہے، تو اُس کے آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔ فطرتِ انسانی کے اس گُر سے ہر شاعر، ہر انشا پرداز، ہر قصہ نویس اور ہر واعظ اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے؛ اس لیئے وہ حقائق کو اُن فرضی وخیالی باتوں کے پیرائے میں پیش کرتا ہے، جن سے اُس کے مخاطب مانوس ہوں۔ اُس کو مطلق اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ نقادِ جن میں تمثیل کر دہ اپنے خیالات نظر کے سامنے لاتا ہے۔ اصلی ہے، یا نقلی۔ مولانا روم نے اسی نکتہ کو بیان کیا ہے، جہاں فرمایا ہے کہ

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

بس جب ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی زبان میں ادائے خیالات کے سانچوں کی تعداد بڑھا دیں اور اس غرض سے ہندو مذہب، ہندو دیو مالا، ہندو تاریخ اور ہندو ادب کی تلمیحات کا اضافہ کریں تو اس سے ہمارے مذہب اور عقل پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ نہ کوئی چیز ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ان چیزوں کے وجود پر ہم یقین کریں۔ بلکہ اس اضافہ سے ہمیں حسب ذیل فوائد حاصل ہونگے:۔

(۱) مختلف خیالات کے ادا کرنے پر ہم پہلے سے زیادہ قادر ہو جائینگے۔

(۲) یہ الزام ہم پر سے دُور ہوگا کہ ہم محض مذہبی تعصب کی بنا پر ہندو ادبیات سے گریز کرتے رہے۔

(۳) ہندو ہمارے ادبیات سے پیشتر کی نسبت زیادہ مانوس ہو جائینگے۔

(۴) ہماری زبان صحیح معنوں میں ہندوستانی زبان اور ہمارا ادب صحیح معنوں میں ہندوستانی کہلانے کا مستحق ہوگا۔

(۵) ہندو مُسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد مضبوط ہوگی اور حُبِّ وطن کے میدان میں آسانی سے دونوں قومیں ایک ساتھ دوڑینگی۔

اِس نقطے پر پہنچنے کے بعد ہم کو لازم ہے کہ ہندوؤں کے مندرجہ ذیل ذخیرہ پر نظر ڈالیں اور اُن سے جدید تلمیحات حاصل کریں:۔

(۱) رامائن (۲) مہابھارت (۳) ہندو عہد حکومت کی تاریخ

(۴) ہندو افسانے، مثلاً شکنتلا۔ نلدمن۔ وکرم اروسی وغیرہ (۵) ہندو دیو مالا

(۶) ہندو رسوم۔ (۷) ہندو فرقوں کے حالات و خیالات

اِس کے علاوہ اِسلامی ذخیرہ سے پیشتر کی نسبت زیادہ کام لینا چاہیئے اور اِس کے لیئے ذیل کے ذخیرہ پر نظر ڈالنی اور اُس سے تلمیحیں اخذ کرنی چاہئیں:۔

(۱) قرآنِ مجید (۲) احادیث (۳) اسلام کی عام تاریخ

(۴) اسلامی عہدِ حکومتِ ہند کی تاریخ

(۵) مثنوی مولانا رومؒ

(۶) الف لیلہ

(۷) شاہنامہ فردوسی

(۸) اُردو زبان کے مشہور قصّے، مثلاً مولانا نذیر احمد کے تصنیف کردہ قصّے۔ بوستانِ خیال۔ داستانِ امیر حمزہ چار درویش۔ آرائشِ محفل یعنی قصّۂ حاتم طائی۔ فسانۂ عجائب۔ بدرِ منیر وغیرہ

(۹) اسلامی تصوّف کی کتابیں

ہندو اور اسلامی ذخیرہ کے علاوہ ذیل کے مواد سے بھی تلمیحیں مل سکتی ہیں:۔

(۱) عیسائیوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۲) انگریزوں کی عام تاریخ

(۳) انگریزوں کی عہدِ حکومتِ ہند کی تاریخ

(۴) سکھّوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۵) پارسیوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۶) بودھ مت والوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۷) راجپوتوں کی تاریخ

(۸) مرہٹوں کی تاریخ

جدید تلمیحات کی مثالیں

یہاں ہم مثال کے طور پر چند نئی تلمیحات کا ذکر کرتے ہیں، جو عام ذخیرہ سے لی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ذیل کی تلمیحات پر غور کرو:۔

کال کوٹھری یا بلیک ہول۔ (انگریزی عہدِ حکومتِ ہند کی تاریخ سے) پادشاہ گر (اسلامی عہدِ حکومتِ ہند کی تاریخ سے) الہ دین کا چراغ (الف لیلہ سے)، تسمہ پا (الف لیلہ سے) کالی موت (یورپ کی عام تاریخ سے) چالیس ٹھگ (الف لیلہ سے)، کھُل سمسم! بند ہو سمسم! (الف لیلہ سے) حمام باد گرد (قصّۂ حاتم طائی سے)۔

ی (فسانۂ آزاد سے) ظاہر دار بیگ (توبۃ النصوح سے) فطرت (توبۃ النصوح سے) کلیم (توبۃ النصوح سے) ردولامہ (اسلامی تاریخ سے) رستمِ یک دست (شاہ نامۂ فردوسی سے) رشکِ حمار (خدائی فوج دار سے)۔ راجہ سنگ پرست (چہار درویش سے) دیو سفید (شاہ نامۂ فردوسی سے) گلابو (خدائی فوج دار سے) دیوانی رلیمنٹ (انگریزوں کی عام تاریخ سے) پگوڈا (بودھ مت والوں کے مذہب سے) جیمل فتا (راجپوتوں کی تاریخ سے) عشائے ربانی (عیسائیوں کے مذہب سے) نوشابہ (سکندر نامہ سے) جانِ عالم کا طوطا (فسانۂ عجائب سے) ں کا گھوڑا (بدرِ منیر سے) نروان (بودھ مت والوں کے مذہب سے) دخمہ (پارسیوں کے مذہب سے) اکرت۔ سکھوں کے مذہب سے) کرپان (سکھوں کے مذہب سے) زند بار (پارسیوں کے مذہب سے) مہ آباد (پارسیوں کی تاریخ سے) بہنام (پارسیوں کے مذہب سے) خوجی کی قرولی (فسانۂ آزاد سے) رستم و اسفندیار کی سرزمین سے ایران راد ہے۔ طلوعِ آفتاب کی سرزمین سے جاپان مُراد ہے۔ آسمانی سلطنت سے چین کی سلطنت مُراد لو۔ فراعنہ کی سرزمین سے مصر کا ملک مُراد ہے۔ دیوتاؤں کی سرزمین سے ہندوستان سمجھو۔ روحانیت کی سرزمین ایشیا۔ مادیت کا گہوارہ، یورپ۔ کروڑپتیوں کا ملک، امریکہ۔ عہدِ ظلمت (یورپ کی تاریخ سے) عہدِ اصلاح (یورپ کی تاریخ سے) تاریک برِاعظم سے افریقہ مُراد ہے۔

ہندو ادبیات کی تلمیحیں

نئی تلمیحات کی جو مثالیں ہم نے دی ہیں، وہ بہت ہی کم ہیں۔ اگر ہم عام ذخیرہ کو سامنے رکھ کر تلاش کریں، تو بلاشبہ بہت سی نئی تلمیحات ملیں گی؛ لیکن ہم اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ اُن تلمیحات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو ہندو ادبیات سے لی جا سکتی ہیں اور جن سے ہمارے ادب کے قالب میں نئی روح پیدا ہو سکتی ہے اور جن کے اضافہ کے بعد ہم اپنی زبان اور ادب کو دونوں قوموں کا مشترک سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ ذیل کی تلمیحات پر غور کی نظر ڈالو اور دیکھو کہ شاعری اور انشا پردازی میں ان سے کیا کام لیا جا سکتا ہے اور کون سے خیالات ان سانچوں میں ڈھالے جا سکتے ہیں:۔

ساوتری راجہ اشوپتی کی لڑکی تھی۔ وہ اپنے شوہر ستیوان پر دل سے فریفتہ تھی؛ شادی کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ وہ ایک سال سے زیادہ زندہ نہ رہیگا۔ موت کے وقت اُس نے فرشتۂ موت یم سے اس قدر التجائیں کیں اور اس قدر اصرار کیا کہ وہ ستیوان کی روح قبض کرنے سے باز رہا۔

یَم مردوں کی روحوں کا دیوتا ہی۔ اُس کا رنگ سبز ہی۔ پوشاک سُرخ ہی۔ ایک ہاتھ میں بھالا، دوسرے ہاتھ میں پھانسی کی رسّی ہی۔ ایک بھینسے پر سوار رہتا ہی۔ یَم پوری وہ مقام ہی، جہاں وہ رہتا ہی۔ کالی چی اُس کے محل کا نام ہی۔ اُس کے ملازم یَم دوت کہلاتے ہیں۔ جب کوئی مرتا ہی، تو یَم دوت اُس کے روح کو لا حاضر کرتے ہیں۔ اُس کی نیکیوں اور بدیوں کا دفتر کھولا جاتا ہی۔ پھر آخری حکم اُس کی نسبت صادر کیا جاتا ہی کہ وہ پِتھروں میں داخل ہو، یا دوزخ میں جائے، یا دنیا میں کسی اور صورت میں جنم لے۔ دو خوفناک کتّے اُس کی گزرگاہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُن کی چار آنکھیں ہیں نتھنے کشادہ ہیں وہ یَم کی طرف سے موت کا پیغام پہنچاتے ہیں۔

شت روپا سب سے پہلی عورت ہی، جو دنیا میں پیدا ہوئی۔ جیسے مسلمانوں کے نزدیک حوّا۔ کہتے ہیں کہ برہما جی نے اپنے جسم کے دو حصے کئے ایک حصے سے ایک مرد بنایا، جس کا نام وِراج ہی۔ دوسرے حصے سے عورت اور وہی شت روپا ہے۔

شکنتلا راجہ بھرت کی والدہ کا نام ہی۔ یہ وہی بھرت ہی، جس کے نام سے ہندوستان کا نام بھارت ورش ہُوا اور جس کی اولاد جنگ مہابھارت میں معرکہ آرا ہوئی۔ یہ نامور رشی وشوامتر کی لڑکی تھی؛ مگر رشی کنو نے اُس کی پرورش کی اور اب اُسی کی بیٹی کہلاتی ہی۔ جب یہ جوان ہوئی، تو اتفاق سے راجہ دوشینت سیر شکار کی تقریب سے رشی کنو کے آشرم کے قریب جا نکلا اور اُس کو دیکھ کر فریفتہ ہوگیا۔ شکنتلا نے اُس کے ساتھ شادی کرلی؛ مگر اُس کے ساتھ نہیں گئی۔ چلتے وقت راجہ نے اپنی ایک انگشتری بطور محبت کی یادگار کے اُس کو دی۔ راجہ کے جانے کے بعد شکنتلا اُس کی محبت میں از خود رفتہ رہنے لگی۔ ایک دن ایک رشی اُس رشی سے ملنے کے لیئے آیا، جس نے اس کی پرورش کی تھی۔ شکنتلا نے عاشقانہ بے خودی کے عالم میں رشی مذکور کی تعظیم نہیں کی۔ اُس نے بددعا دی کہ تیرا شوہر تجھے بھول جائیگا۔ شکنتلا نے نادم ہوکر معافی مانگی۔ رشی مذکور نے اپنی بددعا میں اس قدر ترمیم کی کہ جب راجہ دوشینت اپنی انگشتری دیکھیگا، تو اُس کے دل میں تیری یاد تازہ ہوجائیگی۔ شکنتلا جب حاملہ ہوئی، تو اپنے خاوند کے پاس جانے لگی۔ رستے میں وہ ایک چشمے میں نہانے کے لیئے اُتری اتفاق سے انگشتری اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور چشمے میں گر پڑی۔ مگر اُس کو خبر نہیں ہوئی۔ جب وہ راجہ کے پاس پہنچی، تو اُس نے نہیں پہچانا۔ مجبوراً اُس کی والدہ اُسے جنگل میں واپس لے آئی۔ یہاں اُس کے بطن سے بھرت پیدا ہُوا۔ کچھ عرصے کے بعد

ایک ماہی گیر اُس چشمے کے کنارے پہنچا، جہاں شکنتلا نے غسل کیا تھا۔ ایک مچھلی اُس کے جال میں آئی۔ جب اُس کا پیٹ چاک کیا، تو اُس میں سے ایک انگشتری نکلی۔ ماہی گیر وہ انگشتری راجہ دوشینت کے پاس لے گیا راجہ نے اپنی انگشتری کو پہچانا۔ فوراً اُس کے دل میں شکنتلا کی یاد تازہ ہوئی۔ اُس نے جنگل سے اُس کو اور اُس کے لڑکے بھرت کو اپنے پاس بُلا لیا۔

ارجن راجہ پانڈو کا لڑکا رانی کنتی کے بطن سے تھا۔ اُس کی بہادری، سپہ گری، اور تیراندازی کی داستانیں مشہور ہیں۔ وہ اپنے تیروں سے بارش اور ہوا کو روک دیتا تھا اور اگر چاہتا، تو اُن سے آگ اور پانی برساتا تھا۔ جنگ کے وقت وہ کبھی بلند قامت نظر آتا تھا، کبھی پست قد، کبھی لاغر دکھائی دیتا تھا اور کبھی فربہ، درَوپدی کے سویمبر میں بہت سے شاہزادے اور بہادر آدمی حاضر تھے؛ مگر درَوپدی کو اُس کے سوا کوئی حاصل نہ کرسکا۔ اگنی دیوتا نے اُس کو اپنی کمان عطا کی تھی۔ شیوجی نے اپنا طاقتور ہتیار پشوپت دیا تھا۔ کوبیر، ورُن اور یَم دیوتاؤں نے بھی اُسے خاص اسلحہ عنایت کیے تھے۔ اندر دیوتا نے ایک سنکھ دیا تھا۔ پھونکنے کے وقت اِس سے بادل کی گرج پیدا ہوتی تھی۔ مہابھارت کی جنگ میں اُس نے کوروؤں کا ناطقہ بند کردیا اور بہادری و دلیری کے بڑے بڑے کارنامے دکھائے۔ ایک عہدشکنی کے سبب اُسے بارہ برس تک جلاوطن رہنا پڑا۔ جب راجہ یدہشٹر نے ایک گھوڑا اِس غرض سے چھوڑا کہ وہ تمام ہندوستان میں ہر راجہ کی عملداری سے گزرے اور تمام راجہ یہ مانکر کہ راجہ یدہشٹر سب سے بڑا راجہ ہے، اِس گھوڑے کو گرفتار نہ کریں، تو ارجن فوج کثیر لے کر اُس گھوڑے کے پیچھے چلا، تاکہ اگر کوئی راجہ یدہشٹر کے دعوے کو رد کرے اور گھوڑے کو گرفتار کرنا چاہے، تو اُس سے جنگ کرے۔ چنانچہ بہت سے راجاؤں سے ارجن لڑا اور گھوڑے کو بہ حفاظت تمام واپس لایا۔ گویا اُس کی بہادری کے سبب راجہ یدہشٹر چکرورتی راجہ مان لیا گیا۔ سری کرشن جی مہابھارت کی جنگ میں ارجن کے رتھ بان تھے۔ اُردو زبان کے قدیم شاعروں نے ارجن کی تیراندازی اور کمان داری کا ذکر تلمیحاً کیا ہے۔

سدیومن کا ذکر پُرانوں میں آتا ہے۔ لکھا ہے کہ منو دئی وسوت کو بڑی آرزو تھی کہ اُس کے ہاں لڑکا پیدا ہو۔ اِس خیال سے اُس نے ورُن اور مِتر دیوتاؤں کے نام پر ایک یگ کیا؛ مگر یگ کے انتظام میں کچھ غلطی واقع ہوئی۔ اِس لیے لڑکے کی جگہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اِس کا نام اِلا رکھا گیا۔ منو دئی وسوت نے جب بہت

التجا کی، تو دیوتاؤں نے رلاؔ کو لڑکے کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ اب اس کا نام سدیومن ہوا۔ جوان ہونے پر سدیومن سیر و شکار کی غرض سے اتفاقاً اُس جنگل میں جا نکلا، جس کو شیوجی نے بدعا دی تھی۔ بد دعا کے اثر سے اس جنگل کا یہ خاصہ ہو گیا تھا کہ اگر کوئی مرد وہاں قدم رکھتا تھا، تو عورت بن جاتا تھا۔ چنانچہ سدیومن اُس جنگل میں پہنچتے ہی عورت ہو گیا۔ اس کے بعد شیوجی کی عنایت سے یہ بات حاصل ہو گئی کہ وہ ایک مہینے مرد رہتا تھا اور ایک مہینے عورت۔ دونوں حالتوں یعنی مردانی اور زنانی حالت میں اس سے اولاد ہوئی۔

اروشی بہشت کی ایک اپسرا یعنی حور تھی۔ ورن اور مترؔ دیوتاؤں نے اُس کی کسی حرکت سے ناراض ہو کر بد دعا دی تھی۔ اس سبب سے وہ زمین پر پھینکی گئی۔ یہاں راجہ پورو رجو و کرم کے نام سے مشہور ہے، اُس پر فریفتہ ہوا۔ اُس نے چند شرائط کے ساتھ راجہ کی بیوی بن کر رہنا منظور کیا۔ اُن میں سے ایک شرط یہ تھی کہ بجز خاص وقت کے میرے سامنے کبھی برہنہ نہ ہونا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ دو مینڈھے جن کو میں عزیز رکھتی ہوں، میرے بستر کے قریب بندھے رہیں اور تمھیں اُن کی حفاظت کرنی پڑیگی۔ کچھ عرصے کے بعد راجہ اندر نے چاہا کہ اروشی بہشت میں واپس بلائی جائے۔ جو جاسوس اُس کام کے لیے مامور ہوئے تھے، اُنھوں نے اندھیری رات میں آکر دونوں مینڈھے چرا لیے۔ اروشی نے غل مچایا، تو راجہ برہنگی ہی کی حالت میں تلوار ہاتھ میں لے کر چوروں کے تعاقب میں نکلا۔ راجہ اندر کے جاسوسوں نے عین اُس وقت بجلی چمکائی، جس کے سبب راجہ کا برہنہ جسم اروشی کو نظر آیا۔ عہد ٹوٹ گیا۔ وہ راجہ کی نظر سے فوراً غائب ہو گئی اور بہشت میں جا پہنچی۔ وکرم اُس کے فراق میں سخت ملول رہتا تھا اور آوارہ پھرنے لگا۔ اتفاقاً اُس نے کرکشیتر کے تالاب میں اروشی کو اپنی چار سہیلیوں کے ساتھ نہاتے دیکھا۔ اُس وقت اُس نے راجہ سے کہا کہ میں حاملہ ہوں۔ ایک سال گزرنے پر تمھارے پاس آؤنگی اور صرف ایک رات ٹھیرونگی۔ چنانچہ مدت مذکور گزرنے پر وہ راجہ کے پاس آئی۔ لڑکا جو اُس کے بطن سے پیدا ہوا تھا، راجہ کے حوالے کیا۔ رات بھر ٹھیر کر واپس چلی گئی۔ آخر میں دیوتاؤں کے مشورہ سے راجہ نے ایک یگ کیا اور اُس کے صلہ میں اروشی کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی۔ اروشی اور وکرم کی محبت کا فسانہ ملک الشعرا کالیداس نے نہایت فصاحت سے اپنے ایک ناٹک میں بیان کیا ہے۔

سوریہ سورج سے مراد ہے۔ یہ بھی ایک دیوتا ہے۔ اس کے بہت سے القاب ہیں مثلاً روشن دن کا مالک

چشم عالم۔ سُنہری کرنوں والا وغیرہ اُس کے رتھ کے آگے سات گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ اُس کا قد کوتاہ، آنکھیں سُرخ اور رنگ تانبے کا سا ہے۔ اس کی بیوی کا نام سنجنا ہے۔ جو وشوکرما کی لڑکی تھی۔ سنجنا اُس کے جلوہ کی تاب نہ لاکر اُس سے جُدا ہو گئی تھی؛ مگر وشوکرما نے سوریہ کو خراد پر چڑھا کر پاؤں کے سوا ہر طرف سے چھیل ڈالا، جس سے اُس کی روشنی کا آٹھواں حصّہ کم ہو گیا۔ پھر سنجنا اُس کے ساتھ رہنے لگی سورج بنسی راجا سوریہ ہی کے نسل سے ہیں۔

سوم چاند کو کہتے ہیں۔ یہ بھی دیوتا ہے۔ نباتات کا پرورش کرنے والا اور عابدوں کا نگہبان کہلاتا ہے۔ اس نے دکش کی ستائیس لڑکیوں سے بیاہ کیا۔ یہی لڑکیاں ہیں جنھیں نچھتر یعنی چاند کی منزلیں کہتے ہیں۔ چندر بنسیوں کا سلسلہ سوم ہی سے چلا ہے۔ جس رتھ پر وہ سوار ہوتا ہے، اُس کے تین پہیے ہیں۔ سفید رنگ کے دس گھوڑے اِس رتھ کو کھینچتے ہیں۔ اِس کے بہت سے صفاتی نام ہیں۔ مثلاً ٹھنڈی کرنوں والا۔ سفید کرنوں والا۔ تاروں کا مالک۔ رات کا روشن کرنے والا وغیرہ۔

کام جسے کام دیو بھی کہتے ہیں، عشق کا دیوتا ہے۔ جب خدا نے چاہا کہ دنیا کو پیدا کرے۔ اُس وقت کام خود بخود اُس کے دل میں پیدا ہو گیا۔ یہ بہشت کی حوروں اور آسمانی پریوں کا مالک ہے۔ تیر کمان اس کے ہتیار ہیں۔ تیروں میں رنگ برنگ کے پھول لگے ہیں۔ وہ ایک حسین نوجوان ہے۔ طوطے پر سوار ہے۔ اِس کے جلو میں حوروں اور پریوں کے جھمگٹ ہیں۔ ہاتھ میں سرخ رنگ کا ایک علم ہے، جس کے پھریرے پر مچھلی کا نشان ہے۔ اِس کے بہت سے صفاتی نام ہیں۔ مثلاً حسین۔ شعلہ زن۔ شاداں۔ شوخ و شنگ۔ سراپا خرّمی۔ مردم فریب۔ شمع بہار۔ چھتا انگارہ۔ عصائے قہر۔ حُسن کا ہتیار۔ صلح شکن۔ عیّاش۔ دنیا کا اتالیق۔ کانِ محبّت۔ پھولوں سے مُسلح۔

لچھمی یا لکشمی دولت کی دیوی ہے۔ دیوتاؤں اور اُسروں نے سمندر کو بلویا تھا، تو اور رتنوں کے ساتھ لچھمی بھی سمندر سے کنول کا پھول ہاتھ میں لیے نکلی تھی۔ جب سری رام چندر جی نے اوتار لیا، تو یہ سیتا جی کی شکل میں نمایاں ہوئی۔ سری کرشن جی کے زمانے میں اس نے رکمنی کا قالب اختیار کیا۔ دولت و حشمت کی دیوی ہونے کے سبب ہر جگہ اِس کے پرستش کی جاتی ہے۔ اس کو ہیرا، اندرا، اور چنچلا بھی کہتے ہیں۔

اگنی قدیم زمانہ کا دیوتا۔ اس کی تین شکلیں ہیں۔ آسمان پر سورج، ہوا پر بجلی۔ زمین پر آگ۔ اس کی سات زبانیں یا
ہیں۔ ہون کے وقت آگ میں جو گھی ڈالا جاتا ہے، یہ ان زبانوں سے اُس گھی کو چاٹتا ہے۔ اس کی پوشاک سیاہ رنگ
کی ہے۔ سر پر دھوئیں کا تاج ہے۔ ایک وشن ہتیار اُس کے ہاتھ میں ہے۔ سات ہوائیں اُس کے رتھ کے پہیے ہیں۔
سُرخ رنگ کی گھوڑی اُس کے رتھ میں جوتی جاتی ہے۔ ایک مینڈھا اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ دیوتا اُس پر سوار
ہوتا ہے۔

اندر آسمان، ہوا، یا دل، بہشت اور حوروں کا مالک ہے۔ اس کا درجہ سب دیوتاؤں سے بڑا ہے۔ اگنی کی طرح
ویدوں کی بہت سی رچائیں اُس کی طرف بھی منسوب ہیں۔ اس کا رنگ لال کندن جیسا ہے۔ بازو لمبے لمبے ہیں وہ اپنی
مرضی سے جو شکل چاہے، اختیار کرلیتا ہے۔ اُس کی سواری کا رتھ چمکیلا ہے۔ دو سُرخ رنگ کے گھوڑے اُس میں جوتے
جاتے ہیں۔ اِس کا خاص ہتیار وجر ہے۔ کمان اور جال بھی ساتھ رکھتا ہے۔ چونکہ وہ ہواؤں کا مالک ہے۔ اِس لئے موسموں
کا انتظام اور بارش کا اہتمام اِسی کے اختیار میں ہے۔ وہ برق اور رعد کو مناسب موقعوں پر مامور کرتا ہے۔
بارش برساتا ہے۔ بجلی چمکاتا ہے۔ زمینوں کو سرسبز کرتا ہے۔ بجلی اور طوفان پر حکمرانی کرتا ہے۔ اِس کے بدن پر ہزار
آنکھوں کے نشان ہیں۔ راون والی لنکا کا بیٹا میگھ ناد اُس کو گرفتار کرکے لنکا لے گیا تھا۔ اِسی سبب سے
میگھ ناد کو اندر جیت کہتے ہیں۔ دیوتا اُسے لنکا سے چھڑا کر لائے وہ رشیوں کی عبادت میں خلل ڈالنے کے لئے
اُن کے پاس بہشت کی حوروں کو بھیجتا رہتا ہے۔ برج کے باشندے پہلے اندر کی پرستش کیا کرتے تھے۔ سری کرشن
جی نے اُن کو اندر کی پرستش سے منع کیا۔ اندر نے ناراض ہوکر اُن کی سزا کے لئے بارش کا طوفان بھیجا۔
سری کرشن جی گوبردھن پہاڑ کو اپنی ایک انگلی پر لے کر کھڑے ہوگئے۔ تمام برج باشی اس پہاڑ کے نیچے آگئے
اور اُن کو طوفان سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ وہ ایک سفید ہاتھی پر سوار ہوتا ہے، جس کا نام ارادت ہے۔
اِس کے کئی صفاتی نام ہیں۔ مثلاً
وجر والا، دیوتاؤں کا سردار، ہوا کا مالک، بہشت کا مالک، اِس کے دارالحکومت کا نام امراوتی اور
اِس کے رتھ کا نام ومان ہے۔

مہادیوی، یا پاربتی، شوجی کی بیوی کو کہتے ہیں۔ مختلف صفات و افعال کے لحاظ سے اس کی مختلف

نام ہیں۔ مہربانی کی حالت میں وہ حسب ذیل ناموں سے پکاری جاتی ہے:۔

مادرِ دنیا، زرد فام اور درخشاں، ہردم شاداں۔ متوالی آنکھوں والی۔ مگر جب غضب ناک ہوتی ہے تو حسب ذیل ناموں سے پکاری جاتی ہے:۔

دُرگا، کالی، خوف ناک، غضب ناک، لال دامنوں والی، اس کے دس ہاتھ ہیں۔ ہر ہاتھ میں ایک ہتیار ہے۔ اُس کا رنگ زرد ہے۔ حُسن وجمال اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ یہ عام حالت ہے، مگر غصّے کی حالت میں اُس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ ہاتھوں اور دانتوں سے خون ٹپکتا ہے۔ سانپ اُس کے جسم کو حلقہ کیئے ہوتے ہیں۔ گلے میں سروں اور کھوپریوں کی مالا ہوتی ہے۔ اس کی پرستش اسی حالت میں کی جاتی ہے۔ اِس کی مورتی کے سامنے خون کبھی خشک ہونے نہیں پاتا۔

اہراون پاتال کا راجہ تھا۔ لنکا کی لڑائی میں جب میگھ ناد اور کمھکرن مارے جاچکے، تو راون نے اُس سے مدد طلب کی۔ وہ بھبوکھن کے لباس میں سری رام چندر جی کے لشکر میں داخل ہوگیا۔ کسی نے اُس کو نہیں پہچانا۔ سری رام چندر جی اور لچھمن جی دونوں اُس وقت سو رہے تھے۔ وہ دونوں کو غفلت کی حالت میں اُٹھالے گیا۔ پاتال پہنچ کر اُس نے چاہا کہ اپنے دیوتا کے سامنے دونوں کو ذبح کرے، ہنومان جی کو جب اِس واقعہ کی خبر ہوئی، تو فوراً، پاتال میں گئے۔ وہاں یگ ہونے کو تھا۔ تمام سامان فراہم کرلیا گیا تھا۔ ہنومان جی یگ کا سارا سامان کھاگئے۔ اہراون کو قتل کیا اور دونوں بھائیوں کو واپس لشکر میں لے آئے۔

برہما، مخلوق کو پیدا کرنے والا دیوتا۔ رنگ سرخ ہے۔ چار سر اور چار مُونھ ہیں۔ چار ہاتھ اور آٹھ کان ہیں۔ ایک ہاتھ میں تلوار، ایک میں کمان، ایک میں مالا اور ایک میں وید ہیں۔ برہما جی کی سواری ہنس ہے۔ یہ وشنو جی کی ناف سے پیدا ہوئے ہیں۔ اِن کا ایک دن دو ارب سولہ کروڑ سال کے برابر ہے۔

بلرام، سری کرشن جی کے بڑے بھائی ہیں۔ اِن کا رنگ گورا تھا اور سری کرشن جی کا سانولا۔ دونوں وشنو جی کے اوتار ہیں، جنھوں نے سفید اور سیاہ رنگ میں ظہور کیا ہے۔ مرتے وقت اُس کے مونھ سے ایک سانپ نکلا تھا؛ اِس لیئے اُن کو شیش ناگ کا اوتار بھی کہتے ہیں۔ بلرام جی شراب پیا کرتے تھے۔ سری کرشن جی پرہیز گار تھے۔ بلرام جی نہایت تند مزاج تھے، مگر سری کرشن جی نرم طبیعت رکھتے تھے۔ بلرام جی کے ہتیار

بل اور موصل ہیں۔

رام یعنی سری رام چندر جی، راجہ جسرت کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ راجہ جنک کی بیٹی سیتا سے اُن کی شادی ہوئی۔ راجہ جنک نے جب سویمبر کا جلسہ منعقد کیا، تو شرط یہ کی کہ جو بہادر آدمی میری کمان کو خم کر دیگا، سیتا کی شادی اُسی سے کر دی جائیگی۔ یہ کمان راجہ کو رکو دشنو نے عطا کی تھی۔ سری رام چندر جی اس کمان کے تین ٹکڑے کر ڈالے اور سویمبر کی شرط کو پورا کر دیا۔ شادی کے بعد راجہ جسرت نے سری رام چندر جی کو تخت پر بٹھانا چاہا؛ مگر بھرت کی والدہ رانی کی کئی نے ایک باندی کے بہکانے سے راجہ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بھرت کو تخت پر بٹھائے! اور رام چندر جی چودہ برس تک جلا وطن رہیں۔ سری رام چندر جی نے باپ کا کہنا منظور کیا۔ لچھمن جی اور سیتا کو ساتھ لے کر جنگل کو روانہ ہوئے۔ ان کی روانگی کے بعد راجہ جسرت کا انتقال ہو گیا۔ بھرت نے چتر کوٹ پہنچ کر سری رام چندر جی کو واپس چلنے اور تخت نشین ہونے کی صلاح دی؛ مگر اُنھوں نے یہ بات منظور نہیں کی۔ مجبوراً بھرت اُن کی کھڑاؤں لے گیا اور اُن کو تخت پر رکھ کر خود بطور نائب السلطنت کے راج کرنے لگا۔ دریاے گوداوری کے کنارے پنچ وٹی میں راون والی لنکا کی بہن سری رام چندر جی پر عاشق ہو گئی۔ بہت چاہا کہ اُن کو اپنی طرف مائل کرے؛ مگر کچھ اثر نہیں ہوا لچھمن جی نے اس گستاخی پر اس کے کان اور ناک کاٹ ڈالے۔ وہ روتی پیٹتی اپنے بھائی کے پاس پہنچی۔ نیز اُس نے سیتا جی کے حسن و جمال کی تعریف اِس قدر کی کہ راون اُن کے بھگا لینے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ عین اُس وقت جب کہ سری رام چندر جی اور لچھمن جی شکار کو گئے ہوئے تھے راون آیا اور سیتا جی کو جبر سے اپنے ساتھ لے گیا۔ دونوں بھائی جب شکار سے واپس آئے، تو یہ واقعہ معلوم ہوا۔ راجہ سگریو جو ان اطراف میں حکمراں تھا، اُس نے اور اُس کے جنرل ہنومان نے لنکا پر چڑھائی کرنے میں مدد دی ہنومان سمندر پھاند کر لنکا پہنچا اور سیتا جی کی خبر لایا۔ پھر سمندر پر پل باندھا گیا بندروں اور ریچھوں کی فوج ہنومان کی سرکردگی میں لنکا پہنچی۔ راون کے ساتھ جنگ کی گئی۔ راون کے بیٹے اور اُس کا بھائی اور خود راون اس لڑائی میں قتل ہوا۔ لنکا فتح ہوئی اور سیتا جی نے قید سے رہائی پائی۔

راون والیِ لنکا نہایت شریر، ظالم اور بدی کا پتلا تھا۔ اُس کے دس سر تھے۔ بیس ہاتھ تھے۔ آنکھیں سرخ

تھیں۔صورت خوف ناک تھی۔اس میں اس قدر طاقت تھی کہ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتا تھا۔سمندر کو متحرک کرسکتا تھا۔دیوتا اُس کی خدمتیں انجام دیتے تھے۔اگنی دیوتا باورچی کا کام کرتا تھا۔ورن دیوتا پانی بہم پہنچاتا تھا۔کوبیر دیوتا دولت مہیا کرتا تھا۔وآیو دیوتا اُس کے محلات میں جھاڑو دیتا تھا۔لنکا جس میں وہ حکومت کرتا تھا، اُس کے تمام مکانات سونے سے مغرق تھے اور جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔

کوبیر خزانوں کا دیوتا ہے۔کوہِ ہمالیہ پر ایک شہر الکا ہے، جہاں اُس کا قیام ہے، سونا چاندی اور جواہرات سب اُس کے قبضے میں ہیں۔اِس کا رنگ سفید ہے۔اِس کے تین پاؤں ہیں۔آٹھ دانت ہیں۔سارا جسم زیورات سے ڈھکا ہے۔اُس کو دھن پتی یعنی دولت کا مالک اور رتن پتی یعنی جواہرات کا مالک کہتے ہیں۔

وآیو ہواؤں کا دیوتا ہے۔اندر دیوتا کا رفیق ہے۔اکثر اُس کے ساتھ ایک ہی رتھ پر سوار ہوتا ہے۔خود اُس کا رتھ طلائی ہے جس میں ہزار گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔خوشبوؤں کا حامل اور دایم رواں اُس کے صفاتی نام ہیں۔

ورن سمندروں اور دریاؤں کا دیوتا ہے۔اِس کا صفاتی نام جل پتی ہے اُس کی سواری کا جانور مگرمچھ ہے۔

سرستی علم، عقل اور شاعری کی دیوی ہے۔رنگ سفید ہے۔ہاتھ میں کتاب ہے۔سفید کنول کے پھول پر جلوہ افروز ہے، برہما جی اِس کے شوہر ہیں۔

کورم اوتار۔اِس اوتار کی شکل کچھوے جیسی ہے۔ایک دفعہ دیوتاؤں کے مقابلے میں دیتوں نے غلبہ پایا۔اندر کی حکومت میں بھی خلل آگیا۔برہما جی اور نارائن جی کی ہدایت سے دیوتاؤں نے مشورہ کیا کہ سمندر کو بلو کر اس میں سے امرت یعنی آبِ حیات نکالیں اور اُس کو نوش کرکے دیتوں کا مقابلہ کریں اور اُن کو مار کر آرام کی زندگی بسر کریں۔چنانچہ سمندر کے بلونے کے لیئے کوہ بندھیاچل کی رئی بنائی گئی۔شیش ناگ کی رسّی بنا کر اُس کے گرد لپیٹی اور سمندر کو سب دیوتاؤں نے بلونا شروع کیا؛ مگر کوہِ بندھیاچل اپنے وزن کے سبب سمندر میں ڈوبا جاتا تھا اور ایک مقام پر کھڑا نہیں رہتا تھا۔کورم اوتار نے کچھوے کے روپ میں ظہور کیا۔وہ سمندر میں اُتر گیا اور کوہِ بندھیاچل کو اپنی پشت پر جما لیا۔سمندر بلونے سے حسبِ ذیل

چودہ رتن برآمد ہوئے :-

(۱) اَمرت یعنی آبِ حیات ۔ اسے دیوتاؤں نے پی لیا ۔

(۲) دھنونتری طبیب ۔ یہ ایک ہاتھ میں جونک اور ایک ہاتھ میں ہلیلہ لیئے برآمد ہُوا ۔

(۳) لچھمی دیوی ۔ یہ وشنوجی کے حصّے میں آئی ۔

(۴) شراب ۔ اِسے دیتوں نے نوش کیا ۔

(۵) چاند ۔ یہ شیوجی کے حصّے میں آیا ۔

(۶) رمبھا ۔ یہ ایک حسین بہشتی حور تھی ۔

(۷) اچی شرو ۔ یہ ایک اعلیٰ صفت گھوڑے کا نام ہے ۔ اسے سورَیہ نے لیا ۔

(۸) کوستبھ منی ۔ اسے وشنوجی نے لیا ۔

(۹) پارجات جسے کلپ برکش بھی کہتے ہیں ۔ یہ ایک بہشتی درخت تھا ۔

(۱۰) سُرَبھی ۔ یہ ایک اعلیٰ صفت گائے تھی، جو رشیوں کو دی گئی ۔

(۱۱) اَیراوت ۔ یہ ایک نایاب ہاتھی تھا، جو اندر کے حصّے میں آیا ۔

(۱۲) سنکھ، جس کو پھونکنے سے بادل کی گرج پیدا ہوتی تھی ۔ یہ وشنوجی نے لیا ۔

(۱۳) کمان ۔ یہ ایک عجیب کمان تھی ۔

(۱۴) وِش ۔

متسیہ، اِس کے معنی ہیں مچھلی ۔ یہ ایک اوتار کا نام ہے ۔ راجہ منو جس نے دو لاکھ برس ریاضت کی تھی، ایک دفعہ دریائے کرت مالا میں اشنان کر رہا تھا ۔ یکایک ایک خوب صورت مچھلی اُس کے ہاتھ آ گئی ۔ راجن اُسے ایک رات دن ہاتھ میں لیے رہا اور اُس کی خوب صورتی کو دیکھتا رہا ۔ پھر اُسے ایک گھڑے [illegible] مگر وہ گھڑے میں نہ سمائی ۔ راجہ نے اُسے ایک کنوئیں میں ڈال دیا؛ مگر کنوئیں میں بھی سما سکی ۔ کنوئیں سے خود راجن اُسے ایک تالاب میں پہنچایا ۔ جب تالاب میں بھی اُس کی گنجائش نہ ہوئی، تو دریائے گنگا میں؛ بھی اُس نے ہاتھ پاؤں پھیلائے اور سارے دریا میں نہ سما سکی ۔ مجبوراً اُسے سمندر میں پہنچا تھے ۔ آنکھیں سرخ

وہ اِس قدر پھیلی کہ تمام سمندر پر چھاگئی۔ اب راجہ سمجھا کہ یہ خدائی اسرار ہے۔ مچھلی نے راجہ سے کہا کہ ایک ہفتے کے بعد دریائے جلال موج زن ہوگا۔ طوفان کے سبب ساری دُنیا پانی میں غرق ہوجائیگی۔ تم فلاں کشتی پر دیوتاؤں کے ساتھ بیٹھ جانا اور کشتی کو میرے اِس سینگ سے جو پیشانی سے نکلا ہوا ہے، باندھ دینا۔ چنانچہ طوفان آیا اور سترہ لاکھ اٹھائیس ہزار برس تک رہا۔ تمام دنیا تباہ ہوگئی۔ صرف منو اور اُس کے ہمراہی محفوظ رہے۔ پھر منو کی نسل سے دُنیا دوبارہ آباد ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک سرکش دیت جس کا نام سنکھا سر تھا، ویدوں کو چرا کر سمندر میں چھپ گیا تھا۔ برہماجی کے فریاد کرنے پر یہ اوتار سمندر کی تہہ میں پہنچا اور دیت مذکور کو ہلاک کرکے ویدوں کو واپس لایا۔

وامن اوتار، جس کو باون اوتار بھی کہتے ہیں۔ اِس اوتار کے ظہور کا واقعہ برہمنوں نے اس طرح بیان کیاہے:۔ دیتوں کا ایک راجہ تھا جسے راجہ بلی کہتے۔ اُس نے تینوں لوک اپنے قبضے میں کرلیئے تھے۔ دیوتاؤں کو شکست دے کر اُن کا ملک چھین لیا تھا۔ دیوتاؤں کی حمایت کے لیئے یہ اوتار نمایاں ہوا۔ عین اُس وقت جبکہ راجہ بلی یگ کر رہا تھا، یہ اوتار اُس کے پاس پہنچا اور اُس سے تین قدم زمین کا سوال کیا۔ راجہ نے اس سوال کو حقیر سمجھ کر کہا۔ سوال میرے درجے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ وامن نے اپنے سوال پر اصرار کیا۔ راجہ نے اجازت دی کہ تین قدم ناپ کر زمین لے لے۔ وامن نے ایک قدم اوپر کے لوک پر رکھا۔ دوسرے قدم سے درمیانی لوک کو ناپا۔ تیسرے قدم کے لیئے کہا کہ ساری زمین میرے ایک قدم کے برابر ہے۔ راجہ اپنے اقرار پر ثابت قدم رہا اور اپنے تئیں اُس کے قدموں پر ڈال دیا۔ وامن جی نے خوش ہوکر پاتال کا ملک اُسے بخش دیا اور دیتوں کی صفات اُس سے دُور کردیں۔

کونبوا [illegible] راہ اوتار، اِس اوتار کے ظہور کا سبب یہ ہے کہ ایک نہایت سرکش اور طاقتور دیت ہرناکش نامی زمین کو مار کر آرا [illegible] پاتال تک کھینچ لے گیا تھا۔ برہماجی کی التجا پر اس اوتار نے نمایاں ہوکر ہاتھی کی شکل اختیار ناگ کی رسّی بر [illegible] اپنے بڑے دانت پر زمین کو رکھ لیا اور سمندر سے کھینچ لایا۔ پھر ہرناکش سے جنگ ہوئی، وزن کے سبب [illegible] تک جاری رہی۔ آخر ہرناکش مارا گیا۔

روپ میں ظہور کیا [illegible]، ہرناکش کا توام بھائی ہرناکاشیپ بھی نہایت ظالم اور مغرور تھا۔ شیوجی کی عبادت

کرنے سے اُسے یہ عطیہ ملا کہ نہ کوئی انسان اُسے ہلاک کرسکیگا، نہ کوئی حیوان۔ اُس کی موت نہ دن کے وقت ہوگی، نہ رات کو۔ وہ نہ آسمان پر مارا جائے گا، نہ زمین پر۔ اپنی موت کی طرف سے مطمئن ہوکر اُس نے سرکشی اختیار کی۔ دیوتاؤں سے لڑکر اُن کا سارا مُلک چھین لیا۔ اُس نے سارے مُلک میں منادی کردی کہ میری حکومت میں کوئی شخص نارائن کا نام نہ لے۔ اُس کا بیٹا پہلاد خدا پرست تھا۔ اُس کو بہت سمجھایا کہ وہ خدا پرستی چھوڑدے مگر اِس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک دفعہ پہلاد کے قتل کا ارادہ کرکے اُس نے تلوار اُٹھائی اور اُس سے کہا کہ اب دیکھوں تجھے میرے ہاتھ سے کون بچاتا ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے تلوار چمکائی کہ یکایک اُس کے قریب ایک ستون سے نرسنگھ اوتار نمایاں ہوئے۔ ان کا اوپر کا جسم شیر کا اور نیچے کا جسم انسان کا تھا۔ اُنھوں نے ہرناکاشپو کو پکڑ کر اپنے زانو پر بٹھالیا اور پنجے اور ناخنوں سے اُس کا پیٹ چیر ڈالا۔ اُس وقت شام کا وقت تھا۔ نہ دن تھا، نہ رات، اُس کی موت نہ آسمان پر ہوئی، نہ زمین پر اور نہ وہ کسی انسان کے ہاتھ سے مارا گیا، نہ حیوان کے ہاتھ سے۔ غرض کہ شیوجی کا کہنا ہر طرح پورا ہوا۔

پرسرام، یہ وشنوجی کا چھٹا اوتار ہے۔ سری رام چندر جی ساتویں اوتار تھے۔ یہ چھتریوں کا دشمن اور برہمنوں کا دوست تھا۔ اُس نے اکیس دفعہ چھتریوں سے جنگ کی اور اُن کو قتل کیا۔ سبب یہ تھا کہ ایک چھتری راجہ جس کا نام کارت ویریہ تھا اور جس کے ہزار ہاتھ تھے، ایک دفعہ اُس کے مکان پر آیا اور اُس کی غیبت میں اُس کی ایک اعلیٰ صفت گائے جس کا نام کام دھینو تھا، چُرا کرلے گیا۔ پرسرام کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی، تو اُس نے راجہ کا تعاقب کیا اور اِس سے لڑکر اُس کے ہزار ہاتھ کاٹ ڈالے اور اُسے قتل کردیا۔ پھر غصّے کی حالت میں بار بار چھتریوں سے جنگ کی اور پانچ جھیلیں اُن کے خون سے بھردیں۔ پرسرام کے ہاتھ میں ہتیار کی جگہ ہمیشہ ایک کلہاڑی رہتی تھی۔

کرشن، یہ مشہور اوتار ہیں۔ والدہ کا نام دیوکی، والد کا نام واسدیو تھا۔ اُس زمانے میں متھرا کا فرماں روا راجہ کنس تھا، جو نہایت ظالم تھا، نجومیوں نے خبر دی تھی کہ دیوکی کا لڑکا تجھے قتل کریگا۔ یہ سُنکر اُس نے واسدیو اور دیوکی کو قید کرلیا۔ چنانچہ دیوکی کے کئی حمل کے لڑکے اُس نے مار ڈالے۔ آخری حمل میں سری کرشن جی ظاہر ہوئے؛ خدا کو منظور تھا کہ وہ اُس کے ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ وہ عجیب طریقے سے محفوظ رہے۔

جوان ہونے پر بھی کنس نے بہت تدبیریں کیں کہ اُن کو قتل کر ڈالے؛ مگر اُس کا بس نہیں چلا اور آخر کار وہ خود سری کرشن جی کے ہاتھ سے قتل ہُوا۔ اُن کے عجیب عجیب کارنامے مشہور ہیں۔ جنگ مہا بھارت میں وہ پانڈو کی طرف تھے اور اُن کی فوج کوروں کی طرف سے لڑ رہی تھی۔ آٹھ رانیاں تھیں؛ مگر اُن کی محبوب لائق کا نام رادھا تھا۔

وشنو ہر دفعہ دنیا کے ظہور سے پہلے وشنو جی، شیش ناگ کے بستر پر لیٹے پانی پر تیرتے رہتے ہیں اِس حالت میں اُن کا نام نارائن ہے۔ یعنی پانی پر تیرنے والا۔ اُن کی ناف کنول کے پھول سے مشابہ ہے۔ برہما جی اِنھیں کی ناف سے پیدا ہوئے۔ شیو جی اِن کی پیشانی سے برآمد ہوئے۔ وشنو جی نے مختلف صورتوں میں ظہور کیا ہے۔ اِن صورتوں کو اوتار کہتے ہیں۔ نو اوتار ظاہر ہو چکے ہیں۔ یعنی قلسیہ، کورم، وراہ، نرسنگھ وامن، پرسرام، رام، کرشن، بدھ۔ نویں اوتار کا ظہور باقی ہے۔ اِس آخری اوتار کو ہندو کلکی اوتار کہتے ہیں۔ گنگا وشنو جی کے پاؤں سے ظاہر ہوئی ہے۔ یہ دنیا کی حفاظت اور پرورش کرتے ہیں۔ اِن کے ہزار نام ہیں۔ اِن کی بیوی کا نام لچھمی ہے۔ رنگت سانولی ہے۔ شکل حسین ہے۔ چار ہاتھ ہیں۔ پانچ ہتیاروں سے مسلح رہتے ہیں۔ اِن کی کمان کا نام شارنگ اور تلوار کا نام نندک ہے۔ ایک ہتیار کا نام سدرشن اور ایک کا نام گنو مکھی ہے۔ چند صفاتی نام حسب ذیل ہیں:۔

لافانی، لا انتہا، سانپ کے بستر والے، چار ہاتھ والے، گایوں کے محافظ، عنصروں کے مالک، پانی پر سونے والے، لچھمی کے شوہر، پانچ ہتیاروں سے مسلح، کنول جیسی ناف والے، زرد پوش، بہشت کے مالک وغیرہ۔

شیو، اِن کو مہادیو بھی کہتے ہیں۔ یہ وشنو جی کے پیشانی سے ظاہر ہوئے۔ مختلف صفات کے سبب مختلف نام ہیں۔ تباہ اور غارت کرنے والی طاقت کے سبب اِن کے نام ہیں مہاکال، سراپا غضب، لال جٹاؤں والے، اِس حالت میں اُن کی سواری کتا ہے۔ جسم پر سانپ لپٹے رہتے ہیں۔ شراب پی کر مست نظر آتے ہیں۔ اِن کا ایک نام بھوتیشور ہے۔ یعنی بھوتوں کے مالک، اِس صفت کے سبب وہ قبرستانوں اور مسانوں میں پھرتے نظر آتے ہیں۔ سر پر سانپوں کی جٹا، گلے میں کھوپریوں کی مالا ہوتی ہے۔ بھوتوں کی فوج

ساتھ رہتی ہے۔ بھوت اُن کے گرد مست ہو کر تیزی کے ساتھ ناچتے ہیں اور وہ خود بھی رقص کرتے ہیں۔ ان کے پانچ موںھ ہیں۔ تین آنکھیں ہیں۔ تیسری آنکھ پیشانی کے درمیان ہے، جس سے غصہ اور جلال ٹپکتا ہے۔ پیشانی کے گرد چاند حلقہ کیے ہے۔ گلا زہر نوش کرنے کے سبب نیلگوں نظر آتا ہے۔ ہاتھ میں ترسول ہے۔ پوشاک ہرن، شیر، یا ہاتھی کی کھال ہوتی ہے۔ نندی بیل ان کے ساتھ رہتا ہے۔ بعض صفاتی نام حسب ذیل ہیں:-

تین آنکھوں والا، نیلے گلے والا، چاند جیسے تاج والا، جٹاؤں والا وغیرہ۔

ہنومان، راجہ سگریو کا جنرل جس نے سری رام چندر جی کو لنکا کی جنگ میں مدد دی۔ اس کی شکل بندر جیسی ہے۔ اِس کی خدمت دیوتاؤں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ وہ ہندوستان کے جنوبی کنارے سے پھاند کر لنکا پہنچا ہے۔ سیتا جی کو سری رام چندر جی کا پیغام پہنچاتا ہے۔ راون کے باغ کو ویران کرتا ہے۔ جب اچھیوں نے اُس کی دُم پر روئی لپیٹ کر آگ لگا دی، تو وہ اپنی دُم کی آگ سے تمام لنکا کو پھونک دیتا ہے۔ اُس کا رنگ نہ زرد سُرخ و بکھتے سونے کی طرح درخشاں ہے۔ چہرہ لعل رمانی کی طرح نہایت سُرخ ہے۔ قد مثل بلند مینار یا پہاڑ کے ہے۔ وہ بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ پہاڑ کو سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ ہَوا پر اُڑتا ہے۔ بادلوں کو ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔ سورج کو اپنے موںھ میں چھپا لیتا ہے۔ اثنائے جنگ میں وہ کوہ ہمالہ سے دوائیں لاتا ہے، جس سے زخمی بندر تندرست ہوتے ہیں۔ جب لچھمن جی پر غشی طاری ہوتی ہے، تو وہ جیون بوٹی لاتا اور اُن کی غشی دُور کرتا ہے۔ اُس کا صفاتی نام مرت تیر یعنی ہَوا کا فرزند ہے۔ ہندوستان میں ہر جگہ اُس کی پرستش کی جاتی ہے۔

بھیشم، راجہ شانتو والی ہستناپور کا بڑا لڑکا تھا۔ اُس کی ماں کا نام گنگا تھا۔ گنگا ایک عہد شکنی کے سبب راجہ سے ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ راجہ نے ایک جوان اور حسین عورت ستیہ وتی سے شادی کرنی چاہی اُس کے والدین نے کہا کہ تمھارے بعد ستیہ وتی کی اولاد وارثِ تخت نہیں ہوگی؛ بلکہ یہ حق تمھارے بڑے بیٹے بھیشم کا ہے۔ اگر تم اقرار کرو کہ ستیہ وتی کی اولاد کو تخت دیا جائیگا، تو ہم اُس کی شادی کرنے پر راضی ہیں بھیشم کو جب یہ بات معلوم ہوئی، تو باپ کی آرزو پوری کرنے کے لیے اُس نے یہ اقرار کیا کہ نہ میں خود شادی کرونگا، نہ تخت لونگا۔ اِس اقرار پر ستیہ وتی سے راجہ کی شادی ہو گئی۔ اِس شادی سے راجہ کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ راجہ کے مرنے کے بعد بھیشم نے بڑے لڑکے کو تخت پر بٹھایا؛ مگر وہ ایک جنگ میں مارا گیا۔

اُس نے اُس کے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا۔ مگر وہ بھی جوان اور لاولد مرگیا۔ بھیشم نے ستیہ وتی سے کہا کہ تم ویاسؔ جی کو بُلا کر اپنے آخری بیٹے کی بیواؤں سے اولاد پیدا کراؤ۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ دو لڑکے اس طرح پیدا ہوئے۔ ایک کا نام پانڈو اور ایک کا نام دھرتراشٹر رکھا گیا۔ ان دونوں لڑکوں کی اولاد کورون پانڈو کے نام سے موسوم ہوئی۔ جب دونوں میں نفاق پیدا ہُوا، تو وہ صلح کا مشورہ دیتا رہا؛ مگر کچھ اثر نہ ہُوا۔ جنگ شروع ہوئی۔ بھیشم کورَن کا طرف دار تھا۔ اِس کا مقابلہ ارجن سے ہُوا۔ اُس کے تیروں سے اِس کا سارا جسم چھد گیا۔ دو اُنگل جگہ بھی زخموں سے خالی نہ رہی۔ جب وہ رتھ سے نیچے گرا، تو تیروں کو کھڑا کرکے اُس پر سُلایا گیا۔ زخم مُہلک تھے؛ مگر اس حالت میں بھی وہ (۵۸) دن تک زندہ رہا اور اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرتا رہا۔ تیروں کا بستر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بھیم پانڈو کا دوسرا شاہزادہ۔ یہ نہایت طاقتور، تند مزاج، بے رحم اور دراز قد تھا درختوں کو جڑسے اکھاڑ پھینکتا تھا۔ طمانچہ مار کر ہاتھی کا موہنہ پھیر دیتا تھا۔ گرز کی لڑائی اور کُشتی میں بے نظیر تھا۔ اس کی خوراک بہت تھی جتنا کھانا اُس کے چار بھائی اور اُس کی والدہ کھاتی تھی، اتنا یہ اکیلا کھا جاتا تھا۔ دریودھن نے اُس کو حسد سے زہر کھلایا تھا؛ یہ بچ نکلا۔ جنگ مہابھارت میں اس نے بڑے بڑے کارنمایاں دکھائے؛ مگر دریودھن کے ساتھ قواعد جنگ کے خلاف فریب کی چال چلا۔ اِس کا صفاتی نام دراز بازو ہے۔

جٹایو گِدوں کا پادشاہ تھا۔ جب راون سیتا جی کو لئکا لے جا رہا تھا، تو اُس نے رستے میں روکا؛ مگر راون کے ہاتھ سے زخمی ہُوا۔ سری رام چندر جی جب شکار سے واپس آئے اور سیتا جی کو تلاش کرنے لگے، تو اس نے پتہ بتایا اور سارا حال کہہ سُنایا۔

رُدّر طوفان اور ہَواؤں کا دیوتا ہے۔ جو لوگ حیوانوں اور انسانوں کو ایذا پہنچاتے ہیں، اُن کے لئے یہ دیوتا مہلک اور اُن کے سوا اوروں پر مہربان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوتا برہما جی کی پیشانی سے پیدا ہُوا۔ اِس کا آدھا جسم عورتوں جیسا اور آدھا جسم مردوں جیسا ہے۔ جب برہما جی نے اُسے حُکم دیا کہ وہ خلقت کو پیدا کرے، تو اُس نے بھوت اور راچھس پیدا کئے۔ یہ دیکھ کر برہما جی ناراض ہوئے اور اُنھوں نے کہا کہ اس بیہودہ مخلوق کو نابود کرکے اچھی مخلوق پیدا کرو۔ اُس نے کہا۔ میں ایسی مخلوق پیدا کرنا نہیں چاہتا، جو زندگی اور موت کے پنجے میں اسیر ہو۔ ایسی مخلوق آپ خود پیدا کریں۔

کمبھکرن راون کا بھائی تھا۔ اُس کی طاقت اور بھوک کا اندازہ لگانا محال ہے۔ وہ چھ مہینے سوتا اور ایک دن جاگتا تھا۔ راون نے اُس کو بیدار کرنا چاہا، تاکہ لڑائی میں مدد دے۔ بڑی مصیبت سے جاگا۔ شراب کے ہزار گھڑے بھائی سے پینے کئے اور اس اقرار پر آمادہ جنگ ہوا۔ ہزاروں بندر اُس نے کھا ڈالے۔ بندروں کے سردار سگریو کو گرفتار کرکے لنکا میں لے گیا۔ آخرکار قتل ہوا۔

شیش ناگ سانپوں کا راجہ ہے۔ پاتال کے ساتویں طبقے میں رہتا ہے۔ جب دنیا فنا ہوتی ہے، تو وشنوجی اس کو اپنا بستر بناکر پانی پر تیرتے ہیں اور یہ اپنے ہزار سروں سے اُن پر سایہ کرتا ہے۔ زمین اُسی پر ٹکی ہوئی ہے۔ جب وہ جمائی لیتا ہے، تو زلزلہ آتا ہے۔ جب دنیا کے خاتمہ کا وقت آتا ہے، تو اپنی پھنکار سے آگ نکالتا اور دنیا کو نیست و نابود کردیتا ہے۔ اس کی پوشاک ارغوانی رنگ کی ہے۔ گلے میں سفید مالا ہے۔ ایک ہاتھ میں ہل اور ایک ہاتھ میں موسل ہے۔ بلرام جی اسی کے اوتار تھے۔ اس کے محل کا نام منی منڈپ ہے۔

گنیش عقل کا دیوتا ہے، مصیبتوں کا دور کرنے والا ہے، اسی لیے ہر کتاب اس کے نام سے شروع کی جاتی ہے۔ اس کا جسم چھوٹا اور موٹا ہے۔ رنگ زرد ہے۔ پیٹ بڑا ہے۔ چار ہاتھ ہیں۔ سر ہاتھی کا ہے، مگر دانت صرف ایک ہے۔ ایک ہاتھ میں سنکھ، دوسرے ہاتھ میں چکر، تیسرے ہاتھ میں گدا اور چوتھے ہاتھ میں کنول کا پھول ہے۔ اس کی سواری کا جانور چوہا ہے۔ بعض صفاتی نام حسب ذیل ہیں:۔

ایک دانت والا۔ فیل چہرہ۔ دراز گوش۔ کلاں شکم وغیرہ۔

شنی سوریہ کا لڑکا ہے اور ستاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ رنگ سیاہ ہے۔ پوشاک بھی سیاہ رنگ کی ہے اگر شنی اوپر کی طرف نگاہ کرے، تو تمام دنیا نیست و نابود ہو جائے؛ اسی خیال سے وہ ہمیشہ سرنگوں رہتا ہے، تاکہ اس کی نگاہ کسی پر نہ پڑے۔

مرت ہوا کے طوفانوں کے دیوتا ہیں۔ ان کی تعداد اُنچاس ہے۔ رعد و برق ان کے ہتیار ہیں۔ آندھی ان کی سواری ہے۔

دکش، برہما جی کا لڑکا ہے۔ برہما جی نے اسے پرجاپتیوں کا سردار بنایا۔ اس خوشی میں اُس نے ایک یگ کا اہتمام کیا، جس میں دیوتا اور رشی بلائے گئے؛ مگر شیوجی نہیں بلائے گئے۔ شیوجی کی بیوی اُما یگ میں پہنچی؛ مگر اُنھیں

اور اپنے شوہر کی بے حرمتی دیکھ کر غیرت سے آگ میں جل گئی۔ دکش کو شیوجی سے عداوت تھی؛ اِسی لیئے اُن کو مدعو نہیں کیا گیا۔ شیوجی اِس واقعے کو سُن کر غضب ناک ہوئے۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے چبانے لگے۔ سر سے بالوں کی ایک لٹ اُکھاڑ کر پھینکی، جس سے ایک خوف ناک آواز نکلی۔ ساتھ ہی ایک مہیب صورت نمایاں ہوئی۔ جس کا نام ویربھدر مشہور ہے۔ اِس کے ہزار سر تھے۔ ہزار آنکھیں تھیں۔ ہزار پاؤں تھے۔ ہزار ہتھیار اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اُس کی شکل خوں خوار اور خوف ناک اور دہکتی آگ کی طرح روشن تھی۔ سر پر ایک ہلال نمایاں تھا۔ شیر کی کھال جو خون سے آلودہ تھی، اُس کے بدن میں تھی۔ شیوجی نے اُس کو حکم دیا کہ وہ دکش کے یگ کو خراب کر ڈالے۔ جب ویربھدر اپنی لاتعداد فوج لے کر چلا، تو زمین لرزنے لگی۔ پہاڑ آپس میں ٹکرا گئے۔ ہوا شور و غل سے بھر گئی۔ سمندر میں تلاطم پیدا ہوا۔ اُس نے یگ کو خراب کیا۔ دیوتاؤں میں سے جو اس یگ میں آئے تھے اندر کو زمین پر گرا دیا۔ یم کو زد و کوب کیا۔ سرستی اور ماتری کی ناک کاٹ لی۔ متر کی آنکھیں نکال لیں۔ پوشن کے دانت حلق میں اُتار دیئے۔ اگنی کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ بھارگو کی داڑھی مونڈ دی۔ چاند کے مونھ پر ایک طمانچہ مارا۔ برہمنوں پر پتھر پھینکے۔ دکش کا سر کاٹ کر آگ میں جھونک دیا۔ یہ حالت دیکھ کر دیوتاؤں نے معافی مانگی اور التجائیں کیں۔ آخر کار اُن کی خطا معاف کی گئی اور اُن کے اعضا پھر درست کر دیئے گئے۔

منو وہ ہیں، جن سے نسلِ انسانی چلتی ہے۔ یہ تعداد میں چودہ ہیں۔ پہلا منو سوایم بھو تھا۔ برہما جی نے اپنے جسم کے دو حصے کیئے۔ اِن سے ایک مرد اور ایک عورت پیدا ہوئی۔ مرد وراج تھا اور عورت شت روپا۔ پھر اِن دونوں سے سوایم بھو پیدا ہوا۔ (دیکھو لفظ برہما) اِسی منو کی طرف منوسمرتی منسوب ہے۔ زمانہ حال کی نسل ساتویں منو سے چلی ہے۔ اِس منو کا نام وئی وسوت ہے۔ متسیہ دیوتا نے اسی کو طوفان کی خبر دی تھی۔ (دیکھو لفظ متسیہ) چھ منو اس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ہر منو کی عمر (۴۳) لاکھ (۲۰) ہزار سال کی ہوتی ہے۔

شِوی، ایک زاہد اور سخی راجہ تھا۔ ایک دفعہ اگنی دیوتا نے کبوتر کی صورت اختیار کی اور اندر دیوتا نے باز بن کر اُس کا تعاقب کیا۔ کبوتر نے اس راجہ کی گود میں پناہ لی۔ باز نے راجہ سے کبوتر کا مطالبہ کیا۔ راجہ نے اپنے جسم سے گوشت کاٹ کر چاہا کہ اس کبوتر کے برابر تول کر دے؛ مگر کبوتر کا وزن زیادہ نکلا؛ اِس لیئے دوبارہ پھر گوشت کاٹا؛ مگر وہ بھی وزن میں پورا نہ اُترا۔ مجبوراً اپنا سارا جسم کبوتر کے مقابل ترازو میں رکھ دیا۔ تب تو

پتے برابر ہو گئے اور باز اُڑ گیا۔

ورآدھ یہ ایک مہیب آدم خور راچھس تھا۔ ونڈک کے جنگل میں اس نے سری رام چندر جی کا مقابلہ کیا۔ اس کے جسم پر کوئی وار کارگر نہ ہوتا تھا۔ پہاڑ جیسا قد تھا۔ آنکھیں کھو کھلی تھیں۔ موتہ حد سے زیادہ چوڑا تھا۔ پیٹ اُبھرا ہوا تھا۔ جسم لمبا اور شکل ہیبت ناک تھی۔ شیر کی خون آلودہ کھال اس کی پوشاک تھی۔ آواز میں گرج تھی۔ نیزہ ہاتھ میں تھا۔ شیر، چیتے، بھیڑیے اور ہاتھی کے سر لٹکائے ہوئے تھا۔ سری رام چندر جی نے تیر مارا، تو کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے سری رام چندر جی اور لچھمن جی کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ انھوں نے اس کے بازو توڑ ڈالے۔ گھونسوں سے خبر لی؛ مگر اسے قتل نہ کر سکے۔ مجبوراً ایک گڑھا کھود کر اسے زندہ درگور کر دیا۔

لوپامدرا رشی اگست کی نہایت حسین بیوی تھی۔ جب رشی مذکور نے چاہا کہ اپنی مرضی کے مطابق کسی عورت سے شادی کرے، تو اس نے مختلف حیوانات کے خوب صورت اعضا کو ترکیب دے کر ایک نہایت حسین لڑکی بنائی اور پوشیدہ طور پر ایک راجہ کے محل میں ڈلوا دی۔ وہاں راجہ کی لڑکی سمجھی گئی اور شہزادیوں کی طرح اس کی پرورش کی گئی۔ جب وہ جوان ہوئی، تو رشی اگست نے راجہ سے شادی کی درخواست کی۔ راجہ کا دل نہیں چاہتا تھا؛ مگر رشی کا سوال رد کرنا گناہ تھا۔ چنانچہ اس نے رشی سے لوپامدرا کی شادی کر دی۔

نل، دمن۔ نل عاشق اور دمن اس کی معشوقہ تھی۔ دونوں کا قصہ مشہور ہے۔ فیضی نے فارسی میں اس قصہ کو ایک مثنوی میں نہایت فصاحت سے بیان کیا ہے۔ دمن راجہ بھیم والیِ برار کی لڑکی تھی۔ نل دوسری ریاست کا راجہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا ذکر سن کر باہم عشق کرنے لگے۔ دمن نہایت حسین تھی۔ نل بہادر، حسین، نیک مزاج، شہ سواری اور سپہ گری کا ماہر تھا، ساتھ ہی قمار بازی کی لت بھی تھی۔ راجہ بھیم نے دمن کی شادی کے لیے سویمبر کی تیاری کی۔ امیدواروں میں نل بھی تھا۔ نل کے علاوہ چار دیوتا یعنی اگنی، اندر، ورن اور یم بھی امیدوار تھے۔ اگرچہ دیوتاؤں نے نل ہی جیسی شکل بنا لی تھی؛ مگر دمن نے اپنے مطلوب کو پہچان لیا اور اسی کا انتخاب کیا۔ دونوں کی شادی ہو گئی۔ راجہ نل کا ایک بھائی پشکر تھا، جو اس سے دل میں حسد رکھتا تھا۔ اس نے نل کے ساتھ جوا کھیلنے کی طرح ڈالی۔ پشکر کھیل میں فریب کر کے اس پر غالب آ گیا۔ نل کو اس بازی میں سب کچھ ہار دینا پڑا۔ اب تمام ملک پشکر کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اعلان کر دیا کہ میری رعایا میں سے کوئی نل اور دمن کو کسی قسم کی مدد نہ دے

ایک عرصے تک دونوں مصیبت زدہ جنگلوں میں پھرتے رہے۔ آخر کار نل نے اس خیال سے کہ دمن تکلیف نہ اٹھائے اور اپنے گھر چلی جائے، ایک دن سونے کی حالت میں اسے چھوڑ کر آگے کی طرف کوچ کر دیا۔ دمن اپنے گھر نہیں گئی ملک چیدی کے شہزادے کے ہاں پناہ گزین ہوئی؛ مگر اس کو دمن کا حال معلوم ہو گیا۔ اس نے اس کے باپ کے گھر بھجوا دیا۔ نل کو ایک سانپ نے کاٹا۔ موت تو نہیں آئی؛ مگر شکل بالکل بدل گئی۔ وہ بہت بدصورت اور کوتاہ قد ہو گیا۔ شدہ شدہ وہ راجہ رتو پرن والی اجودھیا کے ہاں ملازم ہو گیا۔ دمن کے باپ نے ہر چند نل کی جستجو کرائی؛ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک برہمن نے خبر دی کہ نل زندہ ہے اور کسی جگہ موجود ہے۔ اس نے برہمن کا جھوٹ سچ معلوم کرنے کے لیئے دوسری دفعہ سویمبر کی تیاری کی۔ راجہ رتو پرن سویمبر میں شریک ہوا۔ نل اس کا رتھبا تھا۔ دمن نے اسے کچھ کچھ پہچانا؛ مگر یقین نہیں ہوا۔ جب اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا دمن نے کھایا، تو فوراً اپنے شوہر کو پہچان لیا۔ دونوں باہم ملے۔ دیوتاؤں کی مدد سے نل اپنی اصلی صورت پر آیا۔ پھر اس نے اپنے بھائی پشکر سے چوسر کھیلنے کی تیاری کی۔ اس دفعہ وہ بازی جیت گیا۔ اپنی سلطنت واپس حاصل کی؛ بلکہ پشکر کی بیوی بھی جیت لی؛ مگر نل نے اس کو معاف کر دیا اور کوئی ایذا نہیں پہنچائی۔

خاتمۂ مضمون

ہندو ادبیات سے بطور مثال کے جو تلمیحات ہم نے اخذ کی ہیں اُن کا اس قدر بیان غالباً کافی ہوگا؛ مگر جس ہندو ذخیرہ کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں، اگر اس کو ہمارے شاعر اور ہمارے انشا پرداز غور کی نظر سے مطالعہ کریںگے، تو اُن کو اس ذخیرہ سے بہت سی دلچسپ تلمیحات مل سکینگی۔ اسی طرح جس اسلامی اور غیر اسلامی ذخیرہ کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، اگر اُن سے بھی کام لیا گیا، تو اولے خیالات کے بہت سے نئے سانچے ہاتھ آئینگے۔ آخر میں ہم دو باتوں کی طرف ناظرین کی توجہ کو خصوصیت کے ساتھ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔

(پہلی بات) تو وہی ہے، جس کو ہم شروع مضمون میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی" انسانی زندگی، انسانی اخلاق اور انسانی معاشرت کے اس قدر پہلو ہیں کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ہر پہلو کے لیئے ایک نمونہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فلاں انسان اس قسم کی زندگی بسر کرتا ہے۔ فلاں آدمی میں اس قسم کے اخلاق موجود ہیں؛ مگر یہ ضرور نہیں کہ ہماری گزشتہ تاریخ میں بھی کوئی ایسا نمونہ موجود ہو"۔ اس لیئے ضروری ہے کہ یا تو

(۱) ہم ایک خاص نمونے کے انسان کی صحیح تصویر قصّے کے پیرایہ میں کھینچیں۔ پھر دیگر مصنفین جب اس نمونے کے شخص کا ذکر کریں، تو اس قصّے کے نمونے کو تلمیح بنا کر اُس سے کام لیں۔ یا (۲) اگر ہماری زبان کے مشہور قصوں میں کسی خاص نمونے کے انسان کا ذکر کیا گیا ہے، تو اس نمونے کو تلمیح کا لباس پہنا دیں۔ یا (۳) اگر اُن قوموں کی تاریخ دیومالا اور ادبیات میں (جو ہمارے گرد وپیش آباد ہیں اور جن سے رات دن ہمارا سابقہ ہے مثلاً ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی وغیرہ) خاص خاص نمونوں کے اشخاص کی تصویریں دیکھنے میں آئیں، تو ان نمونوں کو بے تکلف تلمیح بنا لیں۔

(دوسری بات) یہ ہے کہ تلمیح کی بنیاد اکثر مشہورات پر ہوتی ہے، نہ کہ حقائق پر۔ اس لیے جن باتوں سے تلمیح اخذ کی جاتی ہے، اُن پر یہ اعتراض کرنا سراسر حماقت ہے کہ ان باتوں کا ثبوت عقلاً یا نقلاً نہیں ہوتا۔ جب ہر تلمیح کسی خیال کے ادا کرنے کا ایک سانچہ ہے اور یہ سانچہ اس لیے کام میں لایا جاتا ہے کہ اس خیال کی تصویر سننے والوں کی نظر کے سامنے آجائے، تو ضروری ہے کہ تلمیح کی بنیاد جس بات پر رکھی جائے وہ لوگوں میں مشہور ہو۔ اس بات کی ہم کو مطلق پروا نہیں کرنی چاہیئے کہ اصلی اور واقعی بات کیا ہے۔ کیوں کہ جو بات اصلی اور واقعی ہے اور جو عام لوگوں میں مشہور نہیں ہے اور جو صرف محققین کے دماغ میں ہے، اگر ہم اپنے خیال کے چہرے پر اُس کا نقاب ڈالینگے، تو اس نقاب سے اُس کا حُسن دوبالا نہیں ہوگا؛ بلکہ ماند پڑ جائیگا اور جو غرض تلمیح سے ہے، وہ بالکل فوت جائیگی۔ مثلاً سورج یعنی سورج کو عام ہندو ایک دیوتا مانتے ہیں۔ اُن کے ادبیات میں یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ اس دیوتا کے رتھ کے آگے سات گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ بس اسی خیال پر تلمیح کی بنیاد رکھنی چاہیئے۔ ایک زیرک طبع تعلیم یافتہ ہندو کہہ سکتا ہے کہ سورج کے رتھ میں سات گھوڑوں کا جوتا جانا محض ڈھکوسلا ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ سورج کی شعاع سات رنگوں سے مرکب ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یورپ نے سائنس کی اِس قدر ترقی کے بعد جس حقیقت کا سُراغ لگایا ہے، ہمارے بزرگوں کی نظر اُس پر ہزاروں سال پہلے پڑ چکی ہے۔ ممکن ہے کہ اس تعلیم یافتہ ہندو کا یہ خیال درست ہو؛ مگر جو شاعر اور انشا پرداز اس تلمیح سے کام لینا چاہتا ہے، اُس کو اس موشگافی کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ وہ اِسی عام اور مشہور خیال کو تلمیح کا لباس پہنانا پسند کریگا۔ اُمید ہے کہ ہمارے شاعروں اور انشا پردازوں کے لیے یہ اشارہ کافی ہوگا۔

وحید الدین سلیم

یاسمین

از

(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکنِ دارالترجمہ عثمانیہ یونی ورسٹی)

پہلی نظر اور پہلا اثر سب سے عزیز اور بے بہا چیز ہی۔ اِس کا قائم رکھنا اور اُسے مناسب الفاظ میں صحیح طور سے ادا کرنا اِنشا پردازی یا شاعری کی جان ہی۔

شام کا سماں ہی۔ چمن میں موتئے کا پھولوں بھرا پودا اپنی بہار دکھا رہا ہی۔ اتنے میں چاند نکلتا ہی اور اپنی سہانی روشنی سے اِس پُرلطف منظر میں عجیب کیفیت پیدا کر دیتا ہی۔ ایسے وقت میں شاعر کی نظر اُس پودے پر پڑتی ہی۔ اُس سے جو اثر اُس پر ہوتا ہی اور جو خیالات اور جذبات اُس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں وہ ذیل کے چند اشعار میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہی۔ یہی سچی شاعری ہی۔

(اڈیٹر)

تیرہ فامی شام کی اور باغ کا سبزہ اُداس — یاسمیں نے دیکھ کر اِک پھول روشن کر دیا!
چاندنی میں چاند کی خنکی بھی تھی نرمی بھی تھی — تجھ میں کس گُل کا رنگِ تبسّم بھر دیا؟

چشم و دل ظلمات ہیں اے پھول اِک سورج ہے تُو — مدتوں تک تیری صورت اِن میں غوطے کھائیگی
بانٹ دے اپنا اُجالا آج تو بیدار ہی — باغباں کی گود میں کل تجھ کو نیند آ جائیگی!

ہندی شاعری

(۱)

(از جناب پنڈت جنیشور پرشاد صاحب مائل دہلوی)

آج اڈیٹر صاحب اُردو کی فرمایش سے میں اپنے دوستوں کو ہندی کے چمن طرازوں کی طرزِ چمن طرازی دکھاؤں گا۔ خدا میری کوشش میں مجھے کامیاب کرے۔

ہندی کے باغبانوں نے اپنے اپنے دَوُر اور اپنی اپنی روشوں میں کیسے کیسے خوش رنگ خوش وضع اور خوشبودار پھولوں کے تختے سجائے ہیں۔ واللہ یہ امر بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

اگرچہ ہندی اور اُردو دونوں ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہیں۔ مگر دونوں کے حُسن و ادا میں مغرب و مشرق کا بُعد ہے۔ ایک بھولی بھالی۔ سیدھی سادی۔ اپنے[1] پیارے پریتم یا پتی کے سچّے پریم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تو دوسری بلا کی شوخ و شنگ اور عیار و طرار ہونے[2] کے علاوہ خود اپنے غرورِ حسن سے مست بسرشار ہے۔ ایک عاشق مزاج اور دوسری معشوق صفت مگر ہیں دونوں چرب انک اور چرب زبان۔ جب رزم اور بزم کی

---

[1] مدعا یہ ہے کہ ہندی شاعری کا معشوق خود عاشق بنکر اپنے عاشق کے ہجر میں بےچین و مضطرب نظر آتا ہے۔ سوت یا رقیب کا رونا اُس میں نہیں ہے۔ اور جہاں سَوت کا جلاپا پایا جاتا ہے وہ شاعری ادنیٰ اور ذلیل سمجھی جاتی ہے۔ بیان میں فصاحت۔ بلاغت۔ موزونیت اور شوکتِ لفظی کے ساتھ سادگی سنجیدگی اور لطافت پائی جاتی ہے[2] بخلاف اس کے اُردو شاعری کا معشوق پُورا ہرجائی اور پکّا عہد شکن ہوتا ہے۔ عاشق کو معشوق کے ظلم و جور کی شکایت کے ساتھ قدم قدم پر رقیب کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ بیان میں اور جملہ خوبیوں کے ساتھ نہایت خوشنما شوخی۔ طراری اور جذبات کی گہری تاثیر پائی جاتی ہے۔ اور ایسی زبان ہمیشہ زمانہ کے تغیرات کے ساتھ قوموں کے میل جول سے اَدَلتی بَدَلتی رہتی ہے۔ جیسے آج کل اُردو اور ہندی

داستانیں سناتی ہیں تو سننے والوں کو ہنسا کر یا رُلا کر ہی چھوڑتی ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہی کہ ابھی علمی مطالب کے ادا کرنے میں کم و بیش دونوں قاصر ہیں۔

یہ مانا کہ دونوں کی پیدائش کا وقت اور زمانہ بالکل ایک ہی۔ مگر تعلیم اور پرورش علٰحدہ علٰحدہ ہوئی ہی۔ ہندی کو اس کی ماں پراکرت[1] اور خالہ سنسکرت[2] نے اپنا دودھ پلا کر پالا ہے۔ اور اُردو کو عربی فارسی کی دایہ نے اپنی چھاتی سے لگا کر پروان چڑھایا ہی۔ اس لئے اُردو میں شوخی۔ طراری فصاحت۔ بلاغت۔ شجاعت اور جراری کے ساتھ اگر کافی شیرینی اور کسی قدر متانت بھی پائی جاتی ہے تو یہ اُس دایہ کے دودھ کا اثر ہی۔ اور ہندی میں اگر بیحد سادگی۔ سنجیدگی متانت۔ شانتی[3]۔ اور بھولے پن کے پہلو بہ پہلو کسی قدر شجاعت۔ بہادری بناؤ سنگار۔ رسیلا اور چٹکیلا پن بھی موجود ہی۔ تو یہ اُس نے اپنی ماں اور خالہ سے جائز طور پر وراثتاً حاصل کیا ہی۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں ہی۔

میرے دوستو! یہ ان دونوں زبانوں کی وہ دو خاص ادائیں ہیں جن سے ان کی صورت۔ سیرت او طرز و انداز میں ایک عجیب فرق اور غیریت پیدا ہو گئی ہی۔ ورنہ دراصل ذات۔ نسل اور خون دونوں کا ایک ہی۔ کیوں کہ آخر تو ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ ہاں صرف تعلیم و تربیت مختلف ہی اور اسی اختلاف نے دونوں کو دو جُدا جُدا سانچوں میں ڈھال کر رکھدیا ہی۔

جس گروہ نے ہندی کو اپنا بنایا اُس میں بھی ہندو اور مُسلمان دونوں قومیں پہلو بہ پہلو مشاطہ گری

---

[1] یعنی وہ زبان جو ہندوستان میں فطرتاً بولی اور سمجھی جاتی ہی جسے بچے اپنے والدین سے خودبخود دیکھ لیتے تھے [2] مگر سنسکرت ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ساں اور اٹل رہتی ہی۔ کیوں کہ سنسکرت اُسے کہتے ہیں جسے وقت کی موجودہ پراکرت سے ہر عہد کے عُلما الفاظ کو صرف و نحو اور قواعد کے سانچے میں ڈھال کر اپنے ڈھنگ اور مطلب کا بنا لیتے ہیں۔ لہذا اُس کی صورت اور رنگ روپ میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اگرچہ الفاظ اُس میں بھی ہمیشہ نئے نئے شامل ہوتے رہتے ہیں اور زبان کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہی۔ مگر بیاکرن یعنی صرف و نحو چوں کہ وہی قدیم اور مقررہ ہیں اس لئے اُن کے اثر سے اُس میں جو لفظ نیا شامل ہوتا ہے وہ کچھ ایسا اپنا رنگ اور دَور بدل کر ملتا ہی کہ دیکھنے والوں کو بالکل اسی نسل کا بچہ معلوم ہوتا ہی اور پھر کثرت استعمال سے اُسی کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص بلا سنسکرت کا بیاکرن پڑھے سنسکرت بولنا تو درکنار سمجھ بھی نہیں سکتا [3] یعنی سکون اور اطمینان۔

کرتی رہیں۔ اور جو گروہ اُردو کا دعوی دار بنا اُس میں بھی۔ جیسا کہ دونوں زبانوں کی تاریخ اور تذکروں سے
ثابت ہے۔ بلکہ آج بھی خدا کے فضل سے دونوں جانب جیتے جاگتے ہنستے کھیلتے نمونے اور ثبوت موجود ہیں۔
ہاں کثرت اور قلت کی بات دوسری ہے۔

میں جب مادرِ ہند کے دو فرزندوں کو آپس میں فقط اس امر پر لڑتے جھگڑتے اور بحث کرتے ہوئے دیکھتا
ہوں کہ ایک کہتا ہے "میری ہندی" اور دوسرا کہتا ہے "میری اُردو" تو مجھے سخت تعجب ہوتا ہے۔ واللہ میں
دونوں کو جھوٹا اور کاذب جانتا ہوں۔ بلکہ معاف کیجئے گا غاصب بھی کیوں کہ میں دیکھتا ہوں صریح
ایک دوسرے کا ورثہ اور حصّہ بالکل زبردستی ناجائز طور سے تلف اور غصب کر رہا ہے۔ مگر نہ دل شرماتا ہے
نہ آنکھ جھپتی ہے۔ مجھے شرمناک حرکت پر اکثر غصہ آتا ہے۔ مگر دل ہی دل میں جلتا ہوں اور مارِ دُم بُریدہ کی طرح
پیچ و تاب کھا کر بیٹھ رہتا ہوں بقول شخصے ع قہرِ درویش بجانِ درویش۔

تاہم میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ حماقت آمیز ظلم دونوں زبانوں کو یکساں نقصان پہنچا رہا ہے۔

میرے دوستو! میں ہندو بھی ہوں اور مُسلمان بھی۔ کیوں کہ ہندو ہندی کے مالک بنتے ہیں اور
مُسلمان اُردو کے۔ اس پر ایک کو دوسرے کی رائے اور پسند سے گریز اور نفرت بھی ہے۔ مگر میں مجبور ہوں کہ
مجھے دونوں زبانوں سے برابر کی محبت ہے۔ میری نظر دونوں کے حُسن و قبح پر یکساں جمی ہوئی ہے۔ میں دونوں
میں ایک ایسی دلچسپی اور دل لُبھانے والی آواز دیکھتا ہوں کہ مجھے یہ بھی محبوب و مطلوب نظر آتی ہے اور وہ بھی
میں کسی سے بھی اپنی محبّت کم نہیں کر سکتا۔ مجھے آدھا ہندو اور آدھا مسلمان یا مردودِ فریقین بننا منظور مگر میں
اُردو کو نظر انداز کر دوں، یا ہندی سے ترک محبت کر لوں یہ قطعی نامنظور ہے۔

کسی کے نزدیک ہندوستان کی ملکی زبان اُردو ہو یا ہندی مگر میرے نزدیک یہ دونوں خالص میری
اور اسی ملک کی زبانیں ہیں۔ قدرت نے جہاں مجھے پیدا کیا ہے وہیں ان دونوں زبانوں کو جنم دیا ہے۔ اور چونکہ
یہ مجھ سے بہت پہلے پیدا ہوئیں ہیں اس لئے مجھ پر ان کا بزرگانہ حق بھی ہے۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ میں کس کا حق فراموش
بن جاؤں کس کو یاد رکھوں اور کسے بھلا دوں۔

دونوں یہیں بڑھی چڑھی ہیں۔ یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اتالیق ہندو اور مسلمان دونوں رہے۔ آج ان دونوں

زبانوں کے طرز و انداز میں جو دلکشی اور دلربائی نظر آتی ہے۔ دونوں قوموں کی مشترکہ محنتِ عزیز کا نتیجہ ہے جس سے کوئی عقلِ سلیم رکھنے والا ہندو یا مسلمان انکار نہیں کرسکتا۔ لہٰذا کوئی لڑے یا جھگڑے۔ مگر جس کی مٹی جہاں کی ہے وہیں کی رہے گی اور وہیں کی سمجھی جائے گی بدل نہیں سکتی۔

اور مزہ یہ ہے کہ دلی۔ لکھنؤ اور پنجاب کو چھوڑ کر تمام ہندوستان میں دونوں زبانیں آج بھی بلاتکلف بولی جاتی ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں بولتے سمجھتے ہیں۔ البتہ مسلمان ہندی میں اور ہندو اُردو میں خصوصیت کے ساتھ قابلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میرے نزدیک یہ دونوں قوموں کی سخت غلطی ہے اور یہ غلطی نہ صرف ان دونوں زبانوں کے لئے بلکہ اس ملک کی علمی۔ اخلاقی۔ تمدّنی اور حقیقی زندگی کے لئے بھی ایک مہلک اور وبائی مرض سے کم نہیں ہے۔ کیوں کہ ہندوؤں کا لٹریچر ہندی میں زیادہ ہے اور مسلمانوں کا اُردو میں۔ لہٰذا جب تک دونوں زبانوں میں یکساں اور کافی مہارت نہ پیدا کیجائے گی ایک کا دوسرے کو صحیح طور سے سمجھ لینا قریب قریب ناممکن ہے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ آزاد اور قومی درسگاہوں میں خواہ وہ ہندوؤں کی ہوں یا مسلمانوں کی ہندی اور اُردو کی تعلیم ساتھ ساتھ دی جائے۔ اور دونوں کو لازمی قرار دیا جائے تاکہ ہندو اُردو کے ناز اُٹھائیں اور مسلمان ہندی کے چاؤ چونچلوں سے اپنا جی بہلائیں دونوں بلاتکلف آپس میں تبادلۂ خیالات کرسکیں۔ ایک دوسرے کو سمجھے، جانے، پہچانے تاکہ آپس کی مغائرت گھٹے اور محبّت سوا ہو۔ اور جب تک یہ نہ ہوگا ایک کی نظر میں دوسرے کی حقیقی اور واجبی عزّت پیدا نہیں ہوگی۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ جس دل میں اپنے رفیق یا ہمسایہ کی عزت نہیں ہے۔ اُس کی محبّت اور الفت بھی نہیں ہے اور بلا محبت کے ایک گھر میں دو بھائیوں کا یا ایک ملک میں دو قوموں کا آپس میں مِل جُلکر رہنا یا امن و اطمینان کی زندگی بسر کرنا بالکل ایسا ہی ناممکن ہے جیسا کہ نور و ظلمت اور آب و آتش کا ایک وقت اور ایک ہی جگہ جمع ہوجانا۔

"اُردو کے ناظرین حسنِ اُردو کا جلوہ تو ہمیشہ بے محابا اور بے حجاب دیکھتے ہیں اس لئے اُس کی تعریف و توصیف میں کاغذ سیاہ کرنا بے سُود ہے۔ البتہ ہندی اُن کے لئے اجنبی ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آج

اُس کا بھی ایک گوشۂ نقاب اُٹھا کر حُسن گلو سوز کی یونھی سی جھلک دکھا دوں تاکہ اربابِ فہم اُس کی حلاوت اور چاشنی سے بھی بے خبر نہ رہیں۔

میں اس مختصر تحریر میں صرف چھ شاعروں کا تذکرہ پیش کروں گا جن میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے باکمال سخنور کندھے سے کندھا ملائے ہندی کی خدمت کرتے ہوئے نظر آئیں گے جو اپنے نمونہ سے ہمیں اخلاق اور بے تعصّبی کا سبق دے کر آیندہ کے لئے ہماری زندگی کا دستور العمل یا طرزِ معاشرت سمجھائیں گے میں نے جن شعراء کو اپنے نزدیک قابلِ ذکر سمجھا ہے اُن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

پُورا نام	اور	تخلّص
۱ ۔ ملک الشعراء یا مہاکوئی پنڈت بہاری لال ۔		بہاری
۲ ۔ مہاتما شری سُور داس جی ۔		سُور یا سُور داس
۳ ۔ خان خاناں عبدالرحیم خاں ۔		رحیم یا رحمٰن
۴ ۔ سید مبارک علی بلگرامی ۔		مبارک
۵ ۔ مہاتما پنڈت بنارسی داس جی ۔		بنارسی
۶ ۔ پنڈت دولت رام جی		دَول یا دولت

پنڈت بہاری لال بہاریؔ

یہ ہندی شاعری کا سرتاج ککو رخاندان میں ایک ''ماتھر'' برہمن کے گھر بُسوا گوبند پور ضلع گوالیار میں پیدا ہُوا تھا۔ سنِ تولّد ۱۶۶۰ وکرمی یا ۱۶۰۳ عیسوی کہا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں اس کا بچپن بُندیل کھنڈ میں اور جوانی تمام کمال متھرا بندرابن میں گزری ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جنھیں ہندی یا برج بھاشا کی ٹکسال کہنا چاہیئے۔ لہٰذا اس باکمال شاعر کو ہندی کے اہلِ زبان ہونے کا پُورا پُورا فخر حاصل ہے۔

یہ زمانہ اَورنگ زیب کا زمانہ تھا اور بہاری لال میرزا مہاراجہ جے سنگھ سوائی والیِ جے پُور کے مدّاح تھے۔ اس لئے ان کی باقی تمام عمر اُسی دربار میں بسر ہوئی۔ دربار کی قدر دانیوں نے ان کی خوب

خوب حوصلہ افزائی کی۔ علاوہ پیٹے اور تنخواہ کے فی دوہا ایک اشرفی کا انعام مقرر تھا۔ لہذا میرزا مہاراجہ کے سایہ میں ربکران کی شاعری کا گلدستہ کچھ ایسا سجا اور ایسا مہکا کہ اُس وقت سے لے کر آج تک ہر دَور میں صدہا سخن سنج ہَو ترسے اُسی کی خوشبو کے متوالے رہے اور آج تک ہیں۔

شاید مہاراج سَوائی جے سنگھ دوہوں کے بڑے قدردان تھے۔ اس لئے اس کی شاعری میں صرف دوہے ہی دوہے ملتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انھوں نے اور بحروں میں بھی بہت کچھ لکھا ہو۔ مگر افسوس ان کا باقی کلام آج کل دستیاب نہیں ہے۔ اور وہ دوہے بھی بہت تھوڑے کل ۷۱۹ ہیں جو ایک کتاب کی صورت میں چھپے ہوئے ہیں اور بہاری "ست سئی" सतसई کے نام سے مشہور ہیں۔ اتنے بڑے شاعر کا اتنا تھوڑا کلام ہو نہیں سکتا۔ مگر خدا جانے اُس کے دوسرے بے بہا لالوں کو زمانے کی دست بُرد نے قدردانوں کی نگاہ سے چھپا کر کہاں کا کہاں پہنچا دیا۔

شکر ہے کہ وہ ۷۱۹ دوہے بھی ۷۱۹ گوہر نایاب ہیں جن کے آگے بڑے بڑے جوہریانِ سخن کی دوکانوں کے جواہرات بالکل مدھم اور بے آب نظر آتے ہیں۔ ان دوہوں پر تقریباً ۴۰ ہندی شعرا نے بڑی بڑی ضخیم ٹیکائیں[1] لکھی ہیں اور اکثر نے ان کے مضامین چرا چرا کر اپنی جدا جدا شاعری کی ہے مگر

ع حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ایک دفعہ میرزا مہاراجہ جے سنگھ ایک کم سن رانی یا گلِ نارسیدہ کے پریم میں لیسے پھنسے کہ محل سے برآمد ہونا اور دربار میں آنا بالکل ترک کر دیا۔ مصاحبوں اور اہلکاروں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ تب بہاری نے ایک دوہا لکھکر کسی حکمت عملی سے مہاراج کے پاس پہنچایا۔ کہا جاتا ہے کہ اُسی روز مہاراج محل سے برآمد ہوئے۔ دربار کیا۔ اور بہاری لال کو خلعت فاخرہ کے علاوہ عہدہ اور منصب بھی عطا فرمایا۔ وہ دوہا یہ ہے۔

दोहा

नहिं पराग नहिं मधुर मधु, नहि विकास इहि काल
अली कली ही तें बँध्यो, आगे कौन हवाल ॥

---

[1] ٹیکا شرح کو کہتے ہیں

دوہا

نہیں پراگ۔ نہیں مَدُھر مَدُھو۔ نہیں بِکاس اِہِبہ کال
اَلی کَلی ہی تیں بندھیو آگے کون حوال

شاعر کہتا ہے "ابھی اُس میں نہ تو زرِگُل یعنی وہ ذرّے ہیں جو پھول میں سے نکل نکل کر دُور تک لوگوں کے دماغوں کو مُعطّر کیا کرتے ہیں۔ نہ میٹھا شہد ہی اور نہ ابھی شگفتگی ہے۔ بھونرا صرف کلی یا غنچۂ ناشگفتہ ہی میں اُلجھکر رہ گیا ہے نہ جانے آگے چل کر اس کا کیا حال ہوگا"

اہا ہا بہاری نے اپنے بھونرے کی خیرخواہی کا کتنے اچھے لفظوں میں ثبوت دیا ہے۔ کیسی گہری دُور اندیشی ہے۔ کتنے میٹھے اور خوشگوار الفاظ میں نصیحت کا امرت پلایا ہے کہ داد نہیں دی جاسکتی ایک ذی مرتبہ شخص اپنی حیات کی لذّت میں اندھا ہوکر محو ہوگیا ہے اور اُس محویت سے آیندہ یقینی طور پر جو ناگوار نتیجہ پیدا ہونے والا ہے اُس سے خائف ہوکر ایک خیرخواہ دوست اُسے نصیحت کرنا چاہتا ہے مگر ساتھ ہی ڈرتا بھی ہے کہ کہیں میرے الفاظ سے میرے دوست کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ اُس کے لئے اِس سے اچھا اسلوب پیدا نہیں ہوسکتا۔ بہاری کہتا ہے۔

दोहा

वाम बाँह फरकत मिलैं, जो हीर जीवन मूरि।,
तौ तोही सौं भेटिहौं, राखि दाहिनी दूरि॥

دوہا

بام باہُ پھرکت ملیں جو ھر جیوَنْ مُورِ
تو توہی سون بھیٹ ہوں رَاکھ داہنی دُور

واضح ہو "شکن شاستر" یا علمِ شگون کی رُو سے مرد کے دائیں اور عورت کے بائیں بازو کا پھڑکنا کسی بڑی خوشی یا مسرّت کا مژدہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ امر مُسلّمہ ہے کہ ایک عاشق کے لئے اپنے معشوق سے بغلگیر و ہم آغوش ہونے کے سوا اور کوئی مسرّت نہیں ہے۔ چنانچہ مذکورۂ بالا دوہے کی موضوعہ یا "ہیروائن"[1] کہتی ہے کہ

---

[1] "ہیرو" اور "ہیروائن" یہ دونوں انگریزی لفظ ہیں۔ ہندی میں ان کی جگہ "نائک" اور "نائکہ" بولا جاتا ہے۔ میں بھی انھی لفظوں سے کام لیتا مگر اُردو میں چوں کہ ان الفاظ کا استعمال نہایت رکیک معانی میں کیا جاتا ہے۔ لہذا میں نے ان سے پرہیز کیا اور اُس کی جگہ موضوع اور موضوعہ استعمال کیا ہے۔ آیندہ بھی ایسا ہی کروں گا تاوقتیکہ کوئی اُن سے بہتر لفظ نہ ملے

اے بائیں بھجا[1] اگر آج تیرے پھڑکنے سے میری زندگی کے سبب اعلیٰ سر بھگوان یعنی کرشن چندر مجھسے آکر ملیں تو میں بغلگیر ہوتے وقت اپنی داہنی بھجا کو دُور رکھکر تجھ ہی کو آگے بڑھا دوں گی اور پہلے تجھ ہی سے بغلگیر ہوں گی۔

سُبحان اللہ کتنا پاک اور اچھوتا مضمون ہے شاعر نے شوق وصل کی کتنی بے لوث تصویر کھینچی ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ چوں کہ عاشق عورت ذات ہی۔ لہذا اُس کی کمزور فطرت۔ اوہام پرستی۔ احسانمندی بھولا پن اور حق خدمت کے اظہار کا خیال کتنے اچھے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ اُس پر طرہ یہ کہ جیسی خدمت ویسا انعام۔ چوں کہ بائیں بازو نے پھڑک کر وصل معشوق کی خوشخبری سُنائی ہی اس لئے اُس خوشی کا سب سے بڑا حصّہ پہلے اسی کو انعام میں دینے کا وعدہ کیا جاتا ہی: ع

تو تو ہی سون بھیٹ ہوں راکھ داہنی دُور

ان الفاظ میں کتنا اثر ہے اور کیسا دلکش جادو بھرا ہوا ہی۔ اسے میں بیان نہیں کرسکتا۔ پھر کہتا ہے۔

दोहा

मृग नैनी दृग की फरक, उर उछाह तन फूल।
बिन ही पिय आगम उमँग, पलटन लगी दुकूल॥

دوہا

مِرگ نَینی دِرِگ کی پھرک۔ اُر اُچھا د تن پھُول
بِن ہی پیہ آگم اُمنگ پلٹن لگی دُو کوُل

اس دوہے میں بہاری نے اور بھی غضب کر دیا ہی۔ یہاں بھی وہی شگون کا مضمون ہی ظالم کہتا ہی: ہرن کی سی آنکھ رکھنے والی موضوعہ جو اپنے پیارے پتی کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ اک ذرا کی ذرا بائیں آنکھ پھڑکنے سے دل میں اتنی خوش ہوتی ہی کہ پھُولی نہیں سماتی اور اس شگون سے اُسے اپنے پریتم کی آمد کا اتنا کامل یقین ہو جاتا ہے کہ جلدی اور گھبراہٹ میں آنکھ کو انعام دینے کا خیال بھی نہیں آتا۔ بلکہ خود ساڑھی بدلنے اور سنگار کرنے لگتی ہی۔

اس سے پہلے دوہے میں موضوعہ کو یقین نہیں ہوتا بلکہ شک رہتا ہی۔ اس لئے وہ کہتی ہی کہ اے بائیں "بھجا" اگر ایسا ہوا تو میں تجھے یہ انعام دوں گی۔ مگر یہاں وہ بات نہیں ہی۔ یہاں اتنا زبردست یقین ہی کہ خود محو تزئین د

---

[1] "بھجا" سنسکرت میں بازو کو کہتے ہیں چوں کہ بازو مذکر ہے اور بھجا تانیث مجھے یہاں تانیث ہی کی ضرورت تھی لہذا مجبوراً بھجا ہی لکھنا پڑا

آرایش ہوجاتی ہی۔ اور گویا سمجھتی ہے کہ وہ آ ہی گئے۔

خاقانیِ ہند حضرتِ ذوق علیہ الرحمۃ نے اسی مضمون کو ایک دوسرے پہلو سے ادا کیا ہی وہ فرماتے ہیں

سُن کے آمد اُن کی ازخود رفتہ ہوجاتے ہیں ہم   پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

اِس شعر میں معشوق کی آمد کی خبر سُن کر پیشوائی کو جانا اور دوہے میں محض اپنی ہی بائیں آنکھ کے پھڑکنے سے معشوق کی آمد کا یقین کامل ہوجانا۔ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہی۔ شعر کے خیال سے دوہہ کا خیال نہایت اعلیٰ درجہ کا ہی۔ مگر دوہے کا یہ خیال کہ معشوق کی آمد کے یقین سے فقط محوِ آرایش و زیبایش ہوجانا ایک معمولی بات ہی۔ تاہم موضوعہ کلام چوں کہ خود معشوق بمنزلہ عاشق ہے لہذا اُس کے لئے نہایت موزوں ہے اور شعر کے متکلم کا فقط لفظِ ازخود رفتہ سے پیشوائی کو جانے کے معنی پیدا کرنا گویا شاعری کا کمال ہی۔ اور معشوق کی آمد پر جو عاشق کے دل میں فطرتاً ایک اضطراب پیدا ہوتا ہی اُس کا نہایت موزوں اور بیّن ثبوت ہی۔

ہندی کا ایک اور شاعر "توش ندھی" اسی مضمون پر ایک کبت لکھتا ہی۔ اُس میں گو یقین کے بجائے وہی انعام کا قصّہ ہی۔ مگر کبت چوں کہ دوہے کی نسبت سے ایک بہت بڑی بحر کا نام ہے۔ لہذا اُس میں مضمون اور الفاظ کے لئے کافی گنجایش ہی۔ اس لئے شاعر مذکور کو اپنے مضمون کے ادا کرنے کا بہت اچھا موقعہ ملا ہی۔ وہ کہتا ہے :۔

कवित्त

पैंजनी गढाइ चोंच सोनेसढाइ दैहों, कर परलाइ पर रुचि सों सुधारहों।
कहै कवितोष छिन अटकन लैहो, कवौं कंचन कटोरे आटा खोर भारधारहों
एरे कारे काग तेरे शकुन सँजोग, आनमेरे पति आवैंतो बचनतेंन टार हो,
करती करार तौन पहिले करूँगीरब, अपने पिया को फिर पाछे अंग भारहों

کبت

پینجنی گھڑا چونچ سونے سے منڈائی دیہوں۔ کر پر لائی پر رُچ سون سُدھر ہوں
کہے کوی توش چھن اٹک نہ لیہوں۔ کبو کنچن کٹورے اٹا کھیر بھر دھر ہوں

اے رے کارے کاگ تیرے شگن سنجوگ - آج میرے پتی آویں تو بچن تے نہ ٹھہر ہوں
کرتی کرا رتوں پہلے کردوں گی سب - اپنے پیا کو پھر پیچھے انگ بھر ہوں
چوں کہ علم شگون میں کوّے کا کسی خاص سمت میں بولنا بھی اپنے پیارے کی آمد کا مبارک شگون سمجھا جاتا ہے۔ لہذا کبت کی موضوعہ کہتی ہے کہ میں تیرے لئے پینجنی[1] گھڑوا دوں گی۔ تری چونچ کو سونے سے منڈھوا دوں گی - ہاتھ پر بٹھا کر نہایت پیار سے تیرے پروں کو سنواروں گی۔ تجھے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھولوں گی۔ سونے کے کٹورے میں دودھ بھر کر تیرے لئے اٹاری پر رکھدوں گی۔ اے کالے کوّے آج تیرے شگون کے مطابق اگر میرے پیارے پریتم آجائیں گے تو میں اقرار کرتی ہوں کہ اپنے قول سے کبھی نہیں پھروں گی اور جب تک یہ تمام شرطیں پوری نہ کرلوں گی اپنے پتی سے بغلگیر نہیں ہونے کی۔

اللہ رے بے قراری اور شوق ملاقات۔ ایک مہجور عاشق جو عورت ذات ہے۔ اپنے پریتم یا معشوق کی فرقت میں کتنی بیچین ہے۔ ایک انتہا کے ذلیل اور حقیر جانور سے کیسے کیسے اقرار کر رہی ہے۔ اور پھر اُس اقرار نامے کی آخری شرط کتنی کڑی اور کیسی مشکل ہے کہ میں اپنے معشوق سے ہم آغوش ہونے سے پہلے تیری یہ تمام شرطیں پُوری کردوں گی۔" واہ واہ واہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اُس پر طرّہ یہ کہ خیالات جو ایک عورت کی زبان سے اَدا ہو رہے ہیں وہ اُس کے لئے نہایت موزوں اور فطری واقع ہوئے ہیں لہذا جس قدر داد دیجائے کم ہے۔ مگر بہاری نے اپنے دوہے کی بحر خفیف میں جو کچھ کہدیا ہے وہ کمال کیا ہے۔ اور سُنئے :-

दोहा

फिर फिर चित उती रहत, टूटी लाज की लाव।
अंग अंग छाव भौर मैं, भयो भौंर की नाव॥

پھر پھر چت اُت ہی رہت - ٹوٹی لاج کی لاوٗ
انگ انگ چھبی جھور میں بہیو بہَونر کی ناوٗ

---

[1] جیسے شوقین لوگ اپنے پالتو کبوتروں کو پہناتے ہیں۔

کہتا ہی" دل ہر پھر کر اُدھر ہی جاتا ہی۔ وہیں رہتا ہے۔ شرم کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ معشوق کی ہر حصۂ جسم کی صفائی۔ خوشنمائی اور لطافت اُسے رہ رہ کر اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس کھینچا تانی سے دل بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کی مثال بنا ہوا ہی"

اہا ہا "انگ انگ چھبی جھور" کا بھنور کتنا موزوں اور خوبصورت بھنور ہے کاش میں آپ کو الفاظ کی لذت سے محظوظ کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

दोहा

सखी सिखावत मान विधि, सैनन बरजति बाल।
हरु ये कहि मो हिय बसत, सदाँ बिहारी लाल॥

دوہا

سکھی سکھاوت مان بدھ سینن برجت بال
ہُرو یہ کہہ موہیئے بست سداں بہاری لال

میری دوستو! اس دوہی کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اس کا مضمون بھی جہاں تک میرا خیال ہی بالکل نیا ہی۔ ایک بھولے بھالے کم سن معشوق کو اُس کی سکھی یا سہیلی اپنے عاشق سے ناز کرنا سکھا رہی ہی۔ عاشق کون ہے؟ دوہی کا مصنف بہاری لال سکھی کیا سکھا رہی ہے؟ "مان بدھ" یعنی انداز ناز۔ اور غرور کرنے کا طریقہ جس میں بگڑنا۔ رُوٹھنا۔ ضد کرنا۔ مچلنا اور جلانا۔ ترسانا وغیرہ وغیرہ سب شامل ہی اور یہ اتنا لمبا چوڑا مطلب صرف "سکھی سکھاوت مان بدھ" کے جملے میں بھرا ہوا ہی۔

چوں کہ سہیلی کی یہ تعلیم اپنے پیارے پرتیم سے ایک قسم کی بغاوت کرنا سکھانا ہی اور بغاوت کی تعلیم میں اُستاد شاگرد دونوں کو یہ خوف رہتا ہی کہ ایسا نہو کوئی دیکھ لے سُن لے لہذا "سینن برجت بال" کا یہ مطلب ہی کہ وہ بھولی بھالی کم سن نازنین اُسے آنکھوں کے اشارے سے روکتی ہی۔ منع کرتی ہے اور کہتی ہی اری تو یہ کیا کہہ رہی ہے۔ خبردار وہ سُن لیں گے میرے دل میں ہمیشہ بہاری لال رہتی ہیں۔ واہ وا واہ۔

ع خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

اور مزہ یہ ہے کہ اس دوہے کا آخری جملہ "موہے بست سداں بہاری لال" اس غضب کا جملہ ہے کہ جس کی تعریف کسی طرح ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے جس پہلو سے دیکھئے اس کے ایک نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً "بہاری لال" خود شاعر کا نام ہے اور معرفت کا اس میں چوچلا یہ ہے کہ "بہاری لال" بھگوان کرشن چندر کا بھی نام ہے۔ اور بہاری اُسے بھی کہتے ہیں جو ہر جگہ پھرنے والا پورا ہرجائی ہو۔ اب غور کیجئے کہ یہ تینوں معانی اپنی اپنی جگہ اس دوہے میں کیا لطف دے رہے ہیں۔

"معشوق چوں کہ ہم طالب و ہم مطلوب ہے اُردو کے شاعروں کا سا بیوفا۔ ظالم اور قاتل معشوق نہیں ہے لہٰذا اُس کے دل میں اُس کے پیارے پریتم بہاری لال ہمیشہ بسے رہتے ہیں۔ وہ کم سنی اور بھولے بھالے پن کی وجہ سے عالم خیال کی موجودگی کو بالکل صحیح اور اصلی موجودگی سمجھتا ہے۔ اس صورت میں یہ ظاہر ہے کہ اُس کا ہر فعل بہاری لال ہی کا فعل سمجھنا ہوگا اور جو بات اُس سے کہی جائے گی اُسے "بہاری لال" بھی ضرور ہی سُنیں گے۔ بات چوں کہ بغاوت کی ہے۔ اس لئے وہ اتنا ڈرتا ہے۔ اپنے دوست کو اور اپنے آپ کو عاشق کے عتاب سے بچانے کے لئے آنکھ کے اشارے سے منع کرتا ہے مُنہ سے بھی نہیں کہتا۔"

اگر بہاری لال کے معنی بھگوان کرشن چندر مانے جائیں تو جو دل اتنا پاک اور پوتر ہے کہ اس میں ہمیشہ بھگوان بسے رہتے ہیں۔ وہ اپنے پیارے پریتم کے خلاف بغاوت کا مشورہ سُننا کیوں کر پسند کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ آنکھ کے اشارے سے منع کرتا ہے اور کہتا ہے خبردار یہ مت کہو میرے دل میں بھگوان بہاری لال بستے ہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

اور تیسرے معنی ہر جگہ پھرنے والے پورے ہرجائی کے لئے جائیں تو وہ کہتی ہے "دیوانی! جو شخص پورا ہرجائی تھا۔ جسے ۲۴ گھنٹے پھرنے کے سوا ایک لمحے بھی قرار نہیں تھا۔ وہ جب اپنی خلقی اور جبلی عادت چھوڑ کر ہمیشہ میرے دل میں رہتا ہے تو کیا ایسے شخص کے لئے مجھے یہ مناسب نہیں ہے کہ معشوق ہونے کی حیثیت سے جو غرور و ناز کرنا میری طبعی عادت ہے اُسے ترک کر دوں اور باوفا بن جاؤں؟

شاید بعض احباب کو یہ خیال ہوگا کہ یہ معنی زبردستی پہنائے جا رہے ہیں۔ مگر جو لوگ دوہے کے الفاظ پر غور رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ معنی زبردستی نہیں پہنائے گئے ہیں بلکہ حقیقتاً پیدا ہوتے ہیں۔ کیوں کہ

دوہے کے مصرعۂ اولیٰ کے معنی تو جوں کے توں قایم رہتے ہیں صرف مصرعۂ ثانی کے مطلب کی دل بدل پیدا ہوتی ہی۔ اور مصرعۂ ثانی کے الفاظ بہت مختصر ہیں اُن میں بھی "موہیئے بست سداں بہاری لال" کے جملے میں صرف بہاری لال کے معنی بدلتے ہیں۔ اور وہ بھی لغت کی اجازت سے خواہ مخواہ نہیں۔ "بہر و یہ کہہ" کا جملہ کچھ ایسا جامع جملہ ہے کہ جو سینکڑوں خیالات پر مبنی کیا جا سکتا ہے۔ بس یہی شاعری کا کمال ہی کہ سامع کا خیال جس طرف راغب ہو جائے شعر کے ایک خوبصورت اور دلکش معنی پیدا ہو کر سُننے والے کو محظوظ کر سکیں اور ایک شرح نگار اُس کی کئی کئی طرح سے شرح لکھ سکے۔ چنانچہ مجھ جیسا ہیچمیرز کج فہم بھی مذکور الصدر معانی کے علاوہ ایک اور نئے معنی پیدا کر سکتا ہے۔ سُنئے وہ کہتی ہی:-

"اُری تو یہ کیا کہہ رہی ہے نادان! جس دل میں ہمیشہ 'بہاری لال' رہتے ہیں یعنی جس دل پر وہ اپنا دوامی قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ بھلا اُس میں تیرے تعلیم کئے ہوئے غرور و ناز کو جگہ ہی کہاں مل سکتی ہی۔ اری اُس میں تو ایک کے سوا دوسرے کی گنجایش ہی نہیں ہی۔"

چوں کہ دوہے کے مصرعۂ اولے کا صرف یہ مطلب ہی کہ سہیلی ناز کرنا سکھاتی ہے اور موضوعہ اُسے آنکھ کے اشارے سے منع کرتی ہی۔ روکتی ہے۔" دوسرے مصرعہ میں شاعر یہ مفہوم ظاہر کرتا ہی کہ وہ اس لئے روکتی ہے کہ "میرے دل میں ہمیشہ بہاری لال رہتے ہیں تو ایسا نہ کہہ" مگر بہاری لال رہتے ہیں تو اس سے کیا ہرج ہوتا ہی اور وہ ایسا کیوں نہ کہے۔ یہ اُس میں کچھ نہیں ہے۔ بلکہ اُن لفظوں میں یہ خیال مقدر یا تقدیری ہے۔ اور بہاری لال ایک ایسا لفظ ہے جس کے ایک سے زیادہ معنی بھی ہو سکتے ہیں لہٰذا شارح بالکل آزاد ہی۔ اُسے اختیار ہی کہ وہ اپنی قابلیت سے جس قدر معنی چاہی پیدا کر سکتا ہے۔

تیرِ نظر کے مضمون کو ہمارے اُردو شعرا نے بکثرت نظم کیا ہی۔ جہاں تک میرا خیال ہے شاید ایک ہزار میں ایسا ایک شاعر بھی مشکل نکلے گا جس نے اس مضمون پر صدہا پہلو سے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ مگر ہمارے بہاری کے تیرِ نظر کا انداز سب سے نرالا ہی سُنئے:-

दोहा

तिय कित कमनैती पढी, बिन जिह भौंह कमान।
चल चित वेधे चुकति नहिं, बंक विलन वान ॥

رتیہ کت کنہیتی پڑھی - بن جہ بہو نہ کمان

دوہا چل چت بیدھے چکت نہیں - بنک بلوکن بان

اس دوہے کا ترجمہ کرنے سے پہلے اس کے دو لفظوں کی تشریح کر دینا نہایت ضروری ہے ایک "رتیہ" (तिय) اور دوسرا "چل چت" (चलाचित) "رتیہ" کے معنی ہیں "ابلا" یعنی کمزور عورت یا نازک معشوق اور "چل چت" ایک مرکب جملہ ہے جو چل اور چت دو لفظوں سے بنا ہے۔ جس میں "چل" کے معنی ہیں متحرک بیقرار۔ اور "چت" کے معنی ہیں من یا دل لہٰذا "چل چت" کے معنی ہوئے دلِ بیقرار یا دلِ مضطر۔

شاعر کہتا ہے اے نازک معشوق تو نے یہ فن تیر اندازی کہاں سیکھا؟ کیوں کہ تیری بھوں جو کماں ہے اُس میں تو زہ[1] نہیں ہے۔ بغیر چلّے کی ہے اور جسے تو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ وہ دلِ بیقرار ہے۔ اُسے کسی پہلو قرار ہی نہیں ہے۔ یہاں بیقراری دو معنی پر دلالت کرتی ہے۔ ایک تو عاشق کا دل ہے اس لئے بیقرار ہے اور ایک دل بالخاصہ بیقرار ہوتا ہے۔ لہٰذا جو شے متحرک اور بیقرار ہوتی ہے۔ اُسے نشانہ بنانا نہایت مشکل امر ہے اور وہ تیر بھی کیسے تیر ہیں؟ کہ "بنک بلوکن بان" یعنی ترچھی نظر کے تیر ہیں جو ہمیشہ ٹیڑھے بانکے ہوتے ہیں۔ سیدھے ہوتے ہی نہیں۔ مگر اس پر بھی "چکت نہیں" وہ خطا نہیں کرتے۔ کیسے تعجب کی بات ہے۔

آہا ہا ہا واہ وا واہ دوہے کی چھوٹی سی بحر میں کتنے متضاد اسباب جمع کئے ہیں نازک معشوق بغیر چلّے کی کمان۔ نشانہ متحرک۔ اور تیر کج مج۔ اگر اس پر بھی نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ تو پھر تیر انداز کے کمال قادر اندازی پر جس قدر تعجب کیا جائے بجا ہے۔ ناسخ لکھنوی جیسا مشہور اُستاد کہتا ہے ؎

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

سُبحان اللہ انداز بیان کی جس قدر تعریف کیجائے کم ہے مگر ان کا تیر انداز اناڑی ہے جسے چٹکی میں تیر تھامنا بھی نہیں آتا۔ آتش فرماتے ہیں ؎

---

[1] زہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جسے بہاری نے "جہ" لکھا ہے۔ معنی بھی وہی ہیں صرف ز اور ج کا فرق جس سے ہندی لب و لہجہ ہے اور اُن کے حروف تہجّی میں وہ حرف ہی نہیں ہے۔ مگر اس سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ اُس وقت بھی ہندو مسلمانوں کے میل جول نے اُردو ہندی پر بھی اپنا کتنا گہرا اثر ڈال دیا تھا اسی طرح جہاں تک میرا خیال ہے اور بھی کئی جگہ ایسے الفاظ آئے ہیں مگر میں نے سہواً اُن پر کوئی نوٹ نہیں

ترچھی نظر سے طائرِ دل ہو چکا شکار   جب تیر کج پڑے گا اُڑے گا نشانہ کیا

یہاں بھی وہی بات ہی۔ بلکہ ان کا اندازِ بیان بھی کچھ اچھا نہیں ہی۔ مصرعۂ ثانی میں پڑے گا اُڑے گا یہ وہ روڑے ایسے ایک جگہ جمع ہوگئے ہیں کہ سُننے اور سنانے میں بھی لطف نہیں آتا۔ ایک اور بزرگوار فرماتے ہیں۔ قیاساً کہا جا سکتا ہی کہ یہ شعر حضرت میر مہدی حسین مجروح دہلوی کا معلوم ہوتا ہی ؎

خطا کرتے ہیں ٹیڑھے تیر یہ کہنے کی باتیں ہیں   وہ دیکھیں ترچھی نظروں سی یہ سیدھی دل پرآتے ہیں

یہ شعر البتہ قابلِ داد ہی۔ اگر دوہے سے بڑھ نہیں گیا ہی تو دبا ہوا بھی نہیں ہے کم سے کم ہم مضمون و ہم معنی ضرور ہی۔ اگرچہ دوہے کی طرح بہت سے اسباب مخالف اس میں جمع نہیں ہوئے ہیں۔ مگر الفاظ کتنے موزوں اور اندازِ بیان کیسا سُلجھا ہوا ہی کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہی۔

بہاری کا ایک اخلاقی دوہا بھی ملاحظہ ہو۔

दोहा

कनक कनक तें सौ गुनी, मादकता अधिकाय।
उहि खाये बौराय जग, इहि पाये बौराय ॥

دوہا

کنک کنک تے سَوگنی مادکتا ادِھکائے
اُوہ کھائے بَورائے جگ اِیہہ پائے بورائے

یہ ایک سیدھا سادہ دوہا ہی جس میں بظاہر صرف ایک لفظ کی شاعری ہی۔ مگر اندازِ بیان کتنا دلچسپ ہے اور مصرعۂ ثانی کیسا برابر کے دو ٹکڑوں پر تقسیم کرکے رکھدیا ہے کہ بغیر داد دیئے دل نہیں مانتا۔

کنک سنسکرت میں دھتورے کو بھی کہتے ہیں اور سونے کو بھی۔ لہٰذا شاعر کہتا ہی کہ کنک یعنی سونے میں کنک یعنی دھتورے سے سَوگنا نشہ پیدا کرنے کی طاقت ہی۔ ثبوت میں کہتا ہی دیکھو اگر دھتورے کو لوگ کھاکر پاگل ہوتے ہیں تو سونے کو صرف پاکر ہی پاگل ہوجاتے ہیں۔ بقول شخصے ؎

بادہ نوشیدن وہشیار نشستن سہل ست   چوں بدولت برسی مست نگردی مردی

یادگارِ غالب میں مولانا حالی مرحوم و مغفور نے میرزا غالب اور حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے شعروں کا

ایک جگہ موازنہ کیا ہے۔ شعر مفصلۂ ذیل ہیں ؎

غالب

اُن کے آنے سے جو آ جاتی ہے مُنہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

سعدی

گفتا بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم   چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

اس موازنہ کا فیصلہ مولانا نے اس طرح کر دیا ہے کہ "مطلب تو دونوں شعروں کا تقریباً ملتا جلتا ہے مگر سعدی کے بیان میں اس قدر شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ ممکن ہے کہ معشوق اپنے عاشق کی ظاہری حالت سے اُس کے دل کی کیفیت کا اندازہ کر سکے۔ کیوں کہ وہ کہتے ہیں "معشوق کے آنے پر غم دل سے رخصت ہو جاتا ہے" مگر یہ نہیں کہتے کہ میری ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے اور میرزا کے ہاں ظاہری حالت کا بدل جانا ہی مقصود ہے۔ غمِ دل بیان کرنے کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔ لہذا یہاں معشوق کی غلط فہمی رفع ہونے کا امکان ہر طرح غیر ممکن ہے"۔ تاہم مرزا کے شعر پر شیخ کے شعر کو ضرور ترجیح دینی چاہیئے۔ کیوں کہ شیخ نے یہ شعر مرزا کے شعر سے پہلے کہا ہے۔

اب بہاری کا ایک دوہا مُلاحظہ فرمائیے۔ اُس نے بھی مرزا سے بہت پہلے لکھا ہے اور شیخ علیہ الرحمۃ سے اگر پہلے نہیں تو کم از کم فارسی نہ جاننے کی وجہ سے اُس کے کان اس شعر سے نا آشنا ضرور تھے۔

दोहा

जो वाके तन की दसा, देख्यौ चाहत आप।
तौ वलि नैकु विलोकये, चलि औचकचुपचाप॥

جو واکے تن کی دسا دیکھیو چاہت آپ
تو بَل نیک بِلوکئے چل آؤچک چُپ چاپ

دوہا

ایک ہمدم و ہمراز جو عاشق اور معشوق دونوں کا ہمدرد ہے وہ معشوق سے کہہ رہا ہے "اگر آپ اپنے عاشق کی حالتِ زار دیکھنا چاہتے ہیں تو میں صدقے جاؤں ذرا اچانک اور چُپ چاپ چل کر دیکھئے"۔

مفہوم یہ ہے کہ اُسے کسی طرح یہ پتہ نہ چل جائے کہ آپ دیکھنے آرہے ہیں ورنہ اس خوشی کی خبر سے اُس کی ت بدل جائے گی اور آپ اُس کی حالتِ صحیح کا اندازہ نہ کرسکیں گے۔

اب غور فرمایئے کہ مرزا کے شعر میں معشوق کے آنے سے مُنہ پر رونق آجاتی ہے اور سعدی کے شعر میں شوق کے آنے سے غمِ دل کا فور ہوجاتا ہے۔ مگر بہاری کے دوہے میں محض معشوق کے آنے کی خوشخبری سے شق کی حالت بدل جانے کا یقین ہے۔ میرے نزدیک تو شاعر نے نازک خیالی کی حد کردی۔ اس کے علاوہ ہاری نے جن ہندی محاورات کو نظم کیا ہے۔ جس بندش کی صفائی اور شوکت الفاظ سے کام لیا ہے اُس کا کر کرنا ہی فضول ہے۔ اب ایک اور دوہا سُنئے۔

दोहा

चिर जीवो जोरि जुरे, क्यों न सनेह गँभीर
को घटि ये बृषभानुजा, वे हलधर के वीर ॥

دوہا

چر جیو و جوری جُریئے کیوں نہ سینہ گنبھیر
کو گھٹِ یہ برشبھا نجا وہ ہل دھر کے بیر

ایک گوپی جو برابر کی ہجولی ہے وہ رادھا اور کرشن کو دیکھکر کہتی ہے۔ "یہ جوڑی ہمیشہ سلامت رہے۔ اگر انھوں نے آپس میں گہری محبت کا ناتا جوڑا ہے تو اس میں تعجب کیا ہے۔ کیوں کہ کوئی کسی طرح کسی سے کم نہیں ہے یہ برشبھا نجا" ہیں تو وہ "ہل دھر" کے بیر ہیں۔ یعنی یہ برشبھا نکی بیٹی ہیں تو وہ "ہل دھر" کے بھائی ہیں۔

برشبھان رادھاجی کے باپ کا نام تھا۔ اور ہلدھر بلدیو جی کا۔ کیوں کہ ہل ایک خاص وضع کے ہتیار کو کہتے ہیں جو بلدیو جی کا خاص حربہ تھا۔ لہٰذا اُن کا نام "ہل دھر" یعنی صاحب ہل مشہور ہے۔

یہاں تک ایک معمولی تعریف ہے جسے شاعر نے اپنی طرف سے محبت کی وجہ قرار دیا ہے۔ مگر فی الحقیقت تعریف کے قابل وہ میٹھی چٹکی ہے جو کہنے والی سہیلی برابر کی ہجولی ہونے کی حیثیت سے ایک مزیدار مذاق کے طور پر لیتی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

"برشبھ" سنسکرت میں بیل کو کہتے ہیں اور "انوجا" بہن کو لہٰذا رادھکا جی تو بیل کی بہن بھیا ہوئیں اور ہل

زمین جوتنے کا وہ اوزار ہی جسے ہندوستان میں ہمیشہ بیل ہی کھینچتا ہے۔ اس لئے ہل دھر کے معنی ہوئے بیل اور بیل کا بھائی بھی آخر بیل ہی ہوا۔ تو مطلب یہ رہا کہ رادھا تو بیل کی بہن بچھیا ہیں۔ اور کرشن چندر بیل کے بھائی بیل ہیں۔ لہٰذا دونوں ہمجنس ہیں پھر ان میں محبت ہونی ہی چاہیئے۔

واہ واواہ خدا کی قسم کی شاعری میں مذاق کی حد کردی اور پھر کس عالمانہ پہلو سے کہ سبحان اللہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ مگر اس میں شاعری کے ساتھ زبان کی وسعت بھی شامل ہی اگر زبان میں اتنی وسعت نہ ہوتی تو پنڈت بہاری لال کو یہ مضمون میسر نہ آتا۔

اب بہاری لال کا فن تصویر کشی ملاحظہ ہو۔ ظالم فقط لفظوں کے ہیر پھیر سے کتنا اچھا سین کھینچکر دکھاتا ہے

दोहा

हेर हिंडोरे गगनतें, परी परी सी टूट ।

धरी धाय पिय वीच ही, कारी खरी रस लूट ॥

دوہا

ہیر ہنڈورے گگن تے پری پری سی ٹوٹ

دھری دہائے پیا بیچ ہی کری کھری رس لوٹ

ایک شرمیلی نازنین ہنڈولے پر جھول رہی ہے۔ سامنے سے اپنے پیارے پریتم کو آتے ہوئے دیکھکر شرم سے گھبرا جاتی ہی۔ اور گھبرا کر اس طرح گرتی ہی جس طرح آسمان سے پری ٹوٹ کر گرتی ہی۔ پریتم بھی یہ دیکھکر گھبرا جاتے ہیں اور گھبرا کر اس طرح دوڑتے ہیں کہ پھرتی سے بیچ ہی میں لپک کر دبوچ لیتے ہیں۔ بہاری لال دور ہی سے یہ تماشہ دیکھکر فرماتے ہیں کہ "واہ بھئی واہ بڑی مزے کی لوٹ ہوئی"۔

اہا ہا کیسا مزیدار سین کھینچا ہی۔ اب تمثیل کی تمثال ملاحظہ فرمایئے:۔

दोहा कुटिल अलक छुटि परत मुख, वढ़िगो इतौ उदोत ।

वंक वकारी देत ज्यों, दाम रुपैया हात ॥

دوہا

کٹل الک چھٹ پرت مکھ بڑھ گوا تو ادوت

بنک بکاری دیت جیون دام رپیا ہوت

کتنا ہی معشوق کے چہرے پر کاکل خمدار چھٹ پڑی جس کے بیچ میں حائل ہو جانے سے چاہیئے تو یہ تھا کہ شعاعِ حسن پر حجاب آ جاتا۔ مگر ہوا یہ کہ حسن کی ضیا، اور روشنی اس طرح تیز اور اس قدر مجلا ہو گئی کہ جس طرح ایک "دام" پر ایک آڑا خط کھینچ دینے سے پورا ایک روپیہ بنجاتا ہی۔

دام ایک پیسے کے $\frac{1}{۲۵}$ ویں حصہ کو کہتے ہیں اور ہندی میں اُسے اس طرح لکھتے ہیں "؟" جب اسی دام پر ایک اور ترچھا خط اس طرح "؟" کھینچدیا جاتا ہے۔ تو وہ بجائے دام کے پورا ایک روپیہ پڑھا جاتا ہی اب دام اور روپیہ کے فرق پر نظر ڈالئے کہ وہ کتنا ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں تمثیل کی تمثال یعنی تشبیہ کی شبیہ کھینچکر دکھا دینا۔ اور بھی یک تمثیل اور اُس کے ساتھ شاعر کا قیاس اور اعتقاد ملاحظہ کیجئے۔

दोहा

पिय बिछुरन को दुसह दुख, हरख जात प्यौ साल।
दुरयोधन लौं देखियत, तजत प्रान यह बाल॥

دوہا

پیے بچھڑن کو دُسہ دُکھ ہرکھ جات پیو سال
دُریو دھن لَم دیکھئت تجت پران یہ بال

ناقابلِ برداشت دُکھ تو یہ ہی کہ پیارے پریتم سے جُدا ہوتی ہی۔ اور خوشی یہ ہے کہ اپنے میکے جا رہی ہی یہ رنج اور خوشی دونوں ایک ہی وقت میں واقعہ ہوئے ہیں لہذا ہماری لال کہتے ہیں دیکھئے کہیں ایسا نہو یہ ناسمجھ بھولی بھالی دُریو دھن کی طرح اپنی جان دیدے۔

یہ دوہا روایت طلب ہی۔ اس میں دُریو دھن کی موت کی مثال دی گئی ہے۔ دُریو دھن وہ شخص ہے جو مہابھارت کی لڑائی میں پانچوں پانڈوں کا حریف مقابل تھا اس کو "شراپ" یعنی بددُعا تھی کہ جب تجھ پر غم اور مسرت ایک ہی وقت میں طاری ہوں گے۔ ٹھیک اُسی وقت تیرا دم نکلے گا۔ چنانچہ جس وقت میدانِ جنگ میں بھیم کی گدا سے زخمی اور شکستہ ہو کر دُریو دھن خاک پر گرا تو بہت عرصے تک اُس کا دم نہیں نکلا۔ آخر جب سامنے سے اشوتھاما کو پانچ پانڈو پتروں[1] کے سر کاٹ کر لاتے ہوئے دیکھا تو فرطِ مسرت سے کھل اُٹھا

---

[1] یعنی پانڈوں کے پانچ بیٹے

اور سمجھا کہ میرے پانچوں دشمن مارے گئے انتقام پورا ہو گیا۔ مگر جب قریب سے دیکھا تو نہایت صدمہ ہوا۔ کیوں کہ معلوم ہو گیا کہ اشوتھاما نے دھوکا کھایا اور بجائے دشمنوں کے دشمنوں کی اولاد ماری گئی۔ بس ٹھیک اسی وقت دم نکل گیا۔

یہ واقعہ شاعر کے ذہن میں ہی اور اُس کے نزدیک گویا یہ قاعدۂ کلیہ ہو گیا ہی کہ جب کسی کو مسرّت و غم توام لاحق ہوا کرتے ہیں تو اُس کا دم نکل جایا کرتا ہی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ یہ بھولی بھالی کم سن نازنین جس کے دل میں اپنے پریتم کی جدائی کا ناقابل برداشت دُکھ موجود ہی خوشی سے ہنستی ہوئی اپنے میکے جا رہی ہی۔ کہیں ایسا نہو دُریودھن کسی طرح اس کی بھی جان نکل جائے۔

اس خیال اور مثال میں کتنا پریم بھرا ہوا ہی۔ شاعر نے ایک تاریخی روایت سے اپنا اعتقاد کیسے بھولے پن سے قایم کیا ہی۔ اور پھر اُسے نظم کرکے کتنی صفائی سے باندھ دیا ہی یہی چیز قابلِ داد ہے اور اسی کا نام مضمون آفرینی ہے۔

میرے دوستو! مجھے افسوس ہی کہ میں نے صرف بہاری کا رنگ کلام دکھانے میں ہی اپنی تحریر کی ۲۳ صفحے رنگ دیئے۔ شاید چھپنے میں کچھ کم ہو جائیں۔ پھر بھی بہت ہی اگر اسی طرح باقیماندہ پانچ شعراء کے کلام پھر بھی ریویو کیا گیا تو ایک رسالے کا مضمون کا ہیکو اچھی خاصی کتاب بن جائے گی۔ لہذا اب مجبوراً اختصار سے کام لینا پڑے گا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مضمون بالا میں کسی قدر طول کلامی ضرور ہی۔ تاہم اس خیال سے کہ میں ہندی شاعری کی دعوت اپنے ان احباب کو دے رہا ہوں جو ہندی زبان سے بالکل ناواقف ہیں اس لئے لازم آیا کہ اُنھیں ایک ایک لفظ کی تشریح کرکے سمجھاؤں۔ اور آیندہ بھی میرے لئے یہ امر ناگزیر ہی مگر اس میں شک نہیں کہ میں نے بہاری کے دوہے ضرورت سے زیادہ منتخب کر لئے۔ آیندہ میں صرف ایک ایک یا زیادہ سے زیادہ دو دو مثالوں پر اکتفا کروں گا اور وہی کافی ہو گا۔ بقول شخصے مشتے نمونہ از خروارے۔

باقی آیندہ ۔

اِصلاحِ رسمُ الخطَ

از

(جناب سید احمد علی صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ بھینسہ ضلع نان دیڑ)

مُندرجۂ عنوان پر سب سے پہلا مضمون مولوی عبدُاللہ یوسف علی صاحب کا رسالہ اُردو نمبر ۱ میں نکلا ہے۔ جس کا مقصد دو امور پر شامل ہے۔

(۱) رسم خط کی یکسانی

(۲) بعض حروف کی ساخت میں خفیف سی ترمیم تاکہ مبتدی اور اجنبی کو صحت تلفظ میں کوئی دقّت نہو۔

رسالہ نمبر ۳ میں اسی مقصد پر دوسرا مضمون مولوی ہاشمی صاحب کا اختلافات کے ساتھ درج ہوا ہے۔ عدم یکسانی کی اصلاح کی ضرورت کو لفظ کے جوڑ توڑ میں بتلایا ہے جس کے متعلق آئندہ نمبر میں تنقیدی بحث پیش کی جائیگی۔ حالانکہ یکسانی کی ضرورت حرف و اعراب کے رسم خط میں بھی معلوم ہوتی ہے۔

مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب کی مجوزہ اعرابی تنظیم پر مولوی ہاشمی صاحب کو اعتراض ہے کہ اس میں اعرابی حرکات کا استعمال ترک ہوگیا ہے۔ مولوی صاحب اول الذکر کی تجویز اس بنا پر ہے کہ اس کے ذریعہ ایک اجنبی اور مبتدی بلالحاظ سیاق عبارت اعرابی تلفظات پر حاوی ہو جائے۔ اس مقصد میں ہر ایک تلفظ اور اعراب کے لئے ایک جداگانہ مستقل شکل درکار ہے جس کا تعین رسم خط اُردو میں بہت دشوار ہے البتہ طباعت کی حد تک یہ دشواری دُور ہوسکتی ہے۔ لیکن روزمرہ کی کتابت میں یہ پابندی ذرا دقّت طلب معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ موجودہ رسم خط کی حالت اصلاح طلب ضرور ہے۔

رسم خط اعرابی

(متعلق بہ حرف و اعراب)

اعراب کی تقسیم دو طرح سے ہے۔ اعراب بالحرکت۔ اعراب بالحرف، جب اعراب کی تقسیم حرکت و حرف کے نام سے جدا جدا تسلیم کر لی گئی ہے۔ تو ایک دوسرے کی آمیزش کا استعمال خلاف اصول معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اعراب بالحرف میں حرکت کی آمیزش نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حرکت کا نشان مستقل شکل میں نہیں ہے۔ جو شبدیز قلم کی روانی میں قائم نہیں رہ سکتا بخلاف اس کے اعراب بالحرف ایک مستقل شکل واقع ہوتی ہے۔ جو تحریر کی روانی میں قائم رہ سکتی ہے۔ مگر حرکت کا ساتھ چھوٹ جانے سے اعراب بالحرف کا تلفظ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں حرکت کا التزام ہونے پر بھی تلفظ کی صحت بعض اوقات قابل اعتبار نہیں رہتی ہے۔ جیسے ”سیون“ کا تلفظ (سِ یُوَن) ہو جاتا ہے اگر حرکات و سکنات سے لفظ کی شکل لادی جائے تو روانی میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر بھی صحت لفظی کی توقع اصولاً بہت کم ہو جاتی ہے جیسے سیُون مگر اصولاً اعرابی حرف کی شکل جو بذاتہ کسی طرح بھی ملفوظ ہو نہیں سکتی ہرگز جزم کا نشان نہیں پا سکتی ہے۔ اسی طرح مختلف تلفظ کے دو لفظ (واؤ اعرابی و ملفوظی کے) سور۔ سُور اور روے اور رُوے (ر۔ وے) کی کتابت میں باہمی تلفظ کا امتیاز کسی طرح بھی پایا نہیں جاتا ہے۔ یہ مشکلات صرف اس وجہ سے پیش آتی ہیں کہ حرف اور اعراب کے نشان ایک ہی شکل میں واقع ہو گئے ہیں۔ جن میں حرفی اور اعرابی امتیاز نہیں پایا جاتا۔ ہاں ایک طریقہ امتیاز یہ قرار پا سکتا ہے کہ اعرابی حرف بعد میں واقع ہو تو وہ اعراب ہے ورنہ حرف۔ مگر اس طریقہ کی مطابقت میں ایک ہی شکل حرف آلف کی ہے کہ جس کا ایک ہی اعراب مقرر ہے بخلاف اس کے وٓ اور یٓ کا مختلف اور متعدد اعرابوں میں استعمال ہے۔ معروف۔ مجہول۔ ماقبل مفتوح اور معدول

علاوہ بریں یہی اشکال مخلوط بھی ہوتے ہیں اور ملفوظ بھی جیسے کیا۔ خوب۔ اودھ۔ پھُور۔ سیر۔ پیمبر

پس انہی مشکلات و خصوصیات کے احساس پر مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب نے واوی اعرابوں کا واؤ کے مستقل اشکال مختلفہ میں اور یائی اعرابوں کا خود اسی کے نقطوں کے ہیر پھیر اور نشیب و فراز سے ایک جداگانہ امتیاز قائم فرمایا ہے جو نہایت ضروری ہے۔ مگر ان کی مرتبہ اعرابی تنظیم میں بھی نقائص حالیہ کا تدارک کماحقہ نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ نسبتاً اضافہ کا احتمال ہے۔ جس میں خوش نمائی، صحت لفظی اور روانی کے امتیازات یک لخت نظر انداز ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ واؤ مجہول کی تشکیل (و) روانی میں مستقل نہیں رہ سکتی ہے۔ اور صورت میں (ف) سے مشتبہ ہو جاتی ہے۔ واؤ ماقبل مفتوح کی تصویر (ﻮ) سے مشابہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ لفظ (وہ) کا رسم خط موصول ہے۔

واؤ کی معمولی شکل درمیان یا اخیر میں واؤ معروف اور واؤ ملفوظ دونوں کا کام نہیں دے سکتی اور نہ معدول و مخلوط کا اظہار کر سکتی ہے۔ رُوی اور رِدی کا مختلف تلفظ مرتبہ تنظیم مذکور کی صورت (روی - روی) میں ممیز نہیں ہوتا اس تنظیم میں جمع مکسر واوی کی تحریر کے لئے کوئی خاص صورت قابل امتیاز پائی نہیں جاتی جیسے ہند سے ہندؤں ایسے ہی ایک لفظ واؤ ملفوظی کا واؤ کی معمولی شکل سے جو کہ معروف کی آواز کے لئے مقرر ہوئی ہے۔ تلفظ میں کچھ کا کچھ ہو جائیگا جیسے (اودھ) کا تلفظ اُودھ ہوگا اور سیوں کا تلفظ سیوں (واحد متکلم)

اسی طرح یائے معروف کے امتیاز کے لئے دو عرضی نقطوں کا اتصال اور یائے مجہول کے لئے ایک عرضی خط اور ماقبل مفتوح کے لئے دو طولانی نقطوں کا تعین قرار دیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ نقطوں کا تعین محض حرفیت کے لئے مخصوص ہے۔ نہ کہ اعراب کے لئے اور نقطوں ہی کے تعین و تعدد سے مختلف الصوت حروف کی اشکال میں اختصار و امتیاز کا کام لیا گیا ہے جس سے ایک ہی شکل (ب ح د ر س ص ع) کے حروف مختلف اصوات میں ملفوظ ہوتے ہیں۔ حروف تہجی کی تقسیم بھی نقطوں ہی پر ہوئی ہے۔ منقوط - غیر منقوط - غرض کہ اس نحیف الجثہ وجود نقطہ پر اختصاری اور امتیازی بار اتنا ڈالا گیا ہو کہ اُس کے سر سے اونچا اور جان سے بڑھکر ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم صورت الفاظ کے تلفظ میں صحت کے لالے پڑ گئے ہیں۔ جیسے

(نبی - بنی + نبات - بنات) کی اشکال ہیں۔

علاوہ ازیں عرضی نقطوں کا اتصال اور خطِ عرضی کا باہمی فرق امتیاز از روئے اصول ہندسہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ نقطوں ہی کے اتصال سے خط بنتا ہے۔ پھر اس کی درمیانی حالت ملفوظی و مخلوطی ہنوز تشریح طلب ہے۔ اور جمع مکسر یائی کا بھی کوئی امتیاز قائم نہیں ہوا۔ جیسے

لڑکی سے لڑکیاں

لہذا زیر بحث رسم خط اعرابی کی تنظیم حسب ذیل تجویز کی جاتی ہے جو جملہ اشکال و احوال پر حاوی ہے۔

نقشۂ تعریب نمبر ا

واوی

معروف + ملفوظ = وٗ .. . .. (معمولی)

مجہول + مخلوط = و .. .. .. (سر حلقہ دار)

(وٗا)

ماقبل مفتوح = وٖ .. .. .. (سرا نیچے کو مڑا ہوا)

معدول = خؔ و { (گردن کٹی ہوئی دو کشش کی واؤ ہی) اور یہ رسم خط مخصوص ہی حرف ماقبل خ سے

معروف ملفوظ { رو - کھاو .. . .. (بہت کھانے والا)

(۱) (درمیانی) منفصل ہو تو ماقبل سے ۔ موصول ہو تو مابعد سے دور رہے تاکہ واؤ معروف کے تلفظ کا التباس نہو ۔ جیسے اودھ - روے - روی - نول - پون - بھون -

(۲) (آخر لفظ) موصول ہو تو اُس پر جزم دیا جائے جیسے

گوْ - لکھنوْ

(۳) ماقبل اعراب ہو تو معروف و ملفوظ کا تلفظ ایک ہو جاتا ہی جیسے

کھاو - کھو و - رو و

(۴) عطف کی صورت میں واو مجہول کا تلفظ پیدا ہوتا ہی جیسے

آب و ہوا

مجہول - خود - خول
مخلوط - خواجہ - خواہش

ماقبل مفتوح - خوف - حوض - کون

معدول - خود - خور - خوش - آخوند - خویش

نوٹ (۱) رسم خط اُردو میں ضرورت و بلا ضرورت پر کہیں واو معدولہ کا تداخل ہو رہا ہے جیسے
مونہہ - پہونچ (منہہ - پہنچ)
اس سے ضمہ کا وجود معدوم ہو جائیگا۔ تو کسرہ کا اعراب خواہ مخواہ زیر دریافت پڑا رہیگا اور اعرابی تلفظ کے موقع اظہار پر تعلیم مقابلہ میں حرج واقع ہوگا۔

نوٹ (۲) معدول کے لئے معمولی واو استعمال کی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے ماقبل و مابعد کا حصہ ہو چکا ہے۔

واو معدول:
خ و + د ⎫
خ وٓ + د ⎭ د
خ و + ر
خ و + ز
خ و + ش ⎫
خ وی + ش ⎭ ش

نوٹ (۳) معروف - ملفوظ - معدول = و [۱] + مجہول - مخلوط = و [۲] + ماقبل مفتوح و [۳]

نقشہ تعریب نمبر ۲

(یائی)

	مروجہ	مجوزہ
یائے معروف آخر لفظ	دِي	دی

	مروجہ	مجوزہ	
یائے مجہول آخر لفظ	دیے	دے	
" ماقبل مفتوح " "	دیٔ	دی	
" معروف درمیانی	بِیر	بِر	(ی)
" مجہول "	بیر	بہر	(ی)
" ماقبل مفتوح "	بَیر	بہر	(ی)
" ملفوظ	×	سیر	(ی)

الفاظ آخر الیا کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے اور کوئی فقرہ کوئی سطر اس قسم کے الفاظ سے خالی نہیں جاتی اس لئے یائی اشکال آخر لفظ مندرجہ بالا کا رسم خط نہایت مفید اور ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک مفید تر سہولت سے انکار کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ اگر ضرورت اجازت دے تو بنظر سہولت الف واو کی طرح درمیانی (ی) کی اعرابی اشکال بھی مقطوع التحریر تصور کرلی جائیں مگر اس میں مختصر نویسی کا وصف قائم نہیں رہتا جو رسم خط اُردو کی جان ہے۔

نقشۂ تعریب نمبر ۳

یائے مخلوط

حروف مخلوط الیاء غیر متحرک اُردو میں جس قدر ملفوظ ہیں وہ یا تو الف کے ساتھ ہیں یا واو کی اعراب کے ساتھ۔

جو الف کے ساتھ ملفوظ ہو اس کے امتیاز کے لئے اسی الف کے سرے پر جزم موصول کی ذرا سی کشش ظاہر کردی جائے۔ جیسے

گیا۔ پیاری ۔ دھیان ۔ گیان

جو واوی اعراب کے ساتھ ملفوظ ہے اس کے امتیاز کے لئے یائی نقطوں اور واوی اعراب کا اظہار کافی ہے۔ اُلٹے سیدھے جزم کا نشان لگانے کی ضرورت نہیں جیسے

کیوڑا - کیوں وغیرہ

الفاظ مخلوط الاعراب میں کوئی حرف مخلوط الیا ومخلوط الواو نہیں ہوتا ہے اس لئے (ی) کو نقطہ اور جزم لگانے کی ضرورت نہیں جیسے

دلیو - ہنولا - جیوڑا - لیو (بہت لینے والا)

جیوڑا کا واو معروف ہے اور لیو کا ملفوظ لیکن دونوں کا تلفظ ایک ہے۔

حروف (و اور ی) میں سے ہر ایک میں قوت تجاذب اور لطافت اس قدر ہے کہ وہ ساکن ہو کر بھی اپنے ماقبل و مابعد (حروف اعرابی) کے باہمی تلفظ کو مانع ہوتا ہے۔ و اور ی کا یہ تجاذب ماقبل کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرف ماقبل کی آواز (و - ی) کے تلفظ میں سے ایسی گزر جاتی ہے جیسی کہ روشنی ہوا اور شفاف شیشہ میں سے۔ اس لئے (و - ی) مخلوطی کا امتیاز معمولی جزم سے قائم ہو سکتا ہے۔ مگر واو مخلوط کے لئے علیحدہ ایک مستقل شکل مشخص ہو چکی ہے۔ اب صرف یائے مخلوطی کے لئے جزم کا استعمال رہ گیا ہے۔ نقشہ ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہجّا

(۱) خوْ آ = خوا
(۲) خ وا = خوا

خواجہ

"

(۱) کيْ آ = کیا (کیا)
(۲) ک یا = کیا (کیا)

"

ک یو = کیو، کیوڑا
ک یو = کیو، کیوں

جزم و بلا جزم دونو طرح ظاہر کر سکتے ہیں

(حروف مخلوطی)

مولوی ہاشمی صاحب کے خیال کے موافق حرف غنہ کی تشکیل وتمثیل پر ہر ایک مخلوطی حرف کو الٹا جزم لگا کر ایک قاعدہ کی تحت میں نہیں لایا جاسکتا ہے ورنہ تمام مخلوطی حروف غُنغُنے ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ اُلٹا جزم محض حرف غنہ ہی کے لئے مخصوص ہے۔ یا نون غنہ خود نون مخلوط ہو جائے گا۔ جیساکہ دُنہ کا مخلوط حرف ہندی میں موجود ہے۔ مخلوط حرف کا ہر ایک جُز کم وبیش تلفظ کے ساتھ جدا گانہ ملفوظ ہوتا ہے۔ اجزائے مخلوط کے تلفظات میں (۱) ۲ کی نسبت ہوا کرتی ہے یعنی مقدم کا تلفظ تالی سے بہت کم ہوتا ہے مگر حرف غنہ میں مقدم ملفوظ ہے اور تالی غیر ملفوظ اس لئے نون غنہ جزو مخلوط نہیں۔ رسم خط اُردو کا نون غنہ وہ نہیں ہے جو عربی میں بصورۃ (ــً یانْ و یّ) تنوین یا نون ساکن ماقبل (و ۔ ی) مشدد، ملفوظ ہے۔ اُردو میں نون غنہ حرف نہیں بلکہ ایک مخرج نما یعنی انتقال مخرج کی ایک علامت (بشکل حرف بلا نقط) ہے جس کے ذریعہ ہر ایک حرف کی آواز سادہ یا اعرابی ناک کے مخرج میں منتقل ہو جاتی ہے یعنی مُنہ کا تلفظ ناک کے تلفظ سے بدل جاتا ہے۔

نون غنہ کا مخلوط ہونے سے پہلے کوئی مستقل وجود نہیں جیساکہ (ھ) مخلوطی کا مخلوط ہونے سے پہلے پایا جاتا ہے۔ حرف غنہ کا جوڑ دوسرے حرف مخلوط کی طرح بالا عراب ہونے کی حالت میں کسی طرح مستقل شکل میں نہیں پایا جاتا اس لئے اس کا شمار مخلوطی حروف میں نہیں ہو سکتا۔

اگر نون غنہ کا کسی حرف کے ساتھ جوڑ لگا کر یا اس کو حرامتِ بے جا میں رکھ کر اس کی مستقل شکل مان لی جائے تو خواہ مخواہ رسم خط اُردو کی تعمیر وتشکیل کچھ سے کچھ ہو جائیگی چنانچہ الفاظ (یاںّ ۔ یوںّ اور واںّ) کا رسم خط یوں ہو جائیگا۔

یںّا ۔ ینّو ۔ ونّا

نوٹ :۔ نون غنہ بلا نقطہ کے ہو اس پر الٹا جزم کافی ہے

پس جب حروفِ نونی (حروف غنہ) پر حروف مخلوطی کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے تو اُس کی مخصوص علامت اُلٹے جزم کا استعمال حروف مخلوط کی تخصیص پر حاوی نہیں ہو سکتا اور خود حرف غنہ باعتبار کتابت حرف مخلوط

ہو نہیں سکتا۔

اسی طرح ہائی حرف بھی بلحاظ تلفظ کے مخلوط حرف نہیں ہو سکتا۔

گو یہ حرف مرکب مانا اور دیکھا جاتا ہے مگر چونکہ تلفظ میں اس کی آواز ایک مستقل آواز ہوتی ہے اس لئے مستقل آواز کی شکل بھی مستقل ہونی چاہیئے نہ کہ مشترک۔

اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ بلا توسط اعراب وسطی ایک وقت میں دو سے زیادہ مخلوط حروف کا تلفظ ہو نہیں سکتا جیسا کہ حروف مخلوط واوی اور یائی کے تلفظات سے ظاہر ہے۔ پس اگر حرف ہائی کو تلفظ میں بھی مخلوط مان لیا جائے تو پھر اصولاً کوئی تیسرا حرف مخلوط اس کے ساتھ متلفظ نہ ہوگا اگر ہوگا تو وہ حرف مخلوط کا جزو ثانی متصور ہوگا اور پہلا حرف مخلوط نہیں بلکہ بلحاظ تلفظ صرف ایک حرف مستقل سمجھا جائیگا جیسا کہ دھیان اور گیان میں ہے۔ جس میں مخلوط کا جزو ثانی (ی) ہے اور جزو اول دھ اور گ۔ پس باعتبار تلفظ کے مخلوط کا ہر ایک جزو منجملہ دو کے ایک مستقل حرف ہوتا ہے اس لئے دھ کا تلفظ مفرد اور مستقل ہے مخلوط نہیں جو حرف آواز میں مستقل ہے وہ شکل میں بھی مستقل ہونا چاہیئے نہ کہ مشترک۔ مستقل حرف ہمیشہ (بجز نقطہ) بلا علامت کے ہوتا ہے اگر ایک مستقل حرف بھی علامت دار ہو تو وہ علامت اور اعراب سے لدا اگر خارجی اشکال کا باربردار ہو جائیگا مثلاً پھول کا سرِ حرف مضموم (پہتہ) قلم کی روانی میں تمام خارجی اشکال کا منقوط واقع ہوتا ہے مزید براں بچہ اور مبتدی کو بجائے مرد کے طومارِ بے تمیزی میں مبتلا ہو کر سرے سے حرف سازی و حرف بازی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اگر ہائی حرف کی کوئی مختص اور مستقل شکل علیحدہ نہ ہوگی تو ایک ہی شکل (ہ) پر تین مختلف تلفظات کا عمل و استعمال ایک بار گراں ہو جائیگا اور تلفظ کی صحت میں بھی احتمال و التباس کی مداخلت ایک حد تک جائز ہو جائیگی۔ مثلاً

رِتْرَہ - زِرہ - زرہ

ایک ہی شکل (ہ) کے تین نام ہوتے ہیں مخلوطی۔ ملفوظی۔ مختفی

زِرَہ کا ہائے ملفوظی اخیر میں ہے۔ اخیر حرف پر جزم کی ضرورت نہیں ہوتی حرف کا اخیر ہونا جزمی حالت حالت سمجھی جاتی ہے تو اس صورت میں ہائے ملفوظی (آخر لفظ) اور ہائے مختفی کی اشکال میں کوئی باہمی امتیاز نہیں یہ بے امتیازی خالی از التباس نہیں۔ یہاں رسم خط کی یکسانی میں تلفظ کی یکسانی کا احتمال قوی ہے۔ اسلئے

یہ امر گزیر ہوگیا ہے کہ ہر ایک (ہ) کی صورت کا رسم خط جدا جدا قرار پائے تاکہ تلفظ میں رفع التباس ہو۔

مختلف آواز کی مختلف صورتیں

(ہ)

مخلوطی	ملفوظی	مختفی
ھ	ہ	ے
رسم خط منفصل ۔ ریڑھ	زِرہ	زرہ
متصل ۔ پچھ	چہہ (کھنی وار بلا شوشہ زیریں)	چہ

نوٹ:۔ اشکال مذکورۂ بالا کا رسم خط فی الحال مروج ہے۔ حرف منفصل کے ساتھ بھی (ہ) مختفی کی شکل پیوستہ ہے۔

رسم خط اعرابی کی یکسانی

(۱) [ا - یٰ]

یک (ی) اور ہے جس کا رسم خط اب تک معین نہیں ہوا ہے وہ اپنی ہر سہ اشکال آخر میں لکھی جا رہی ہے یعنی معروف ۔ مجہول اور ماقبل مفتوح میں جیسے معنیٰ ۔ معنے ۔ معنی ۔ اِس کا تعین ضروری ہے۔ اس کی تشکیل اس کے تلفظ کے مطابق ہونی چاہئے ۔ یعنی اُس کا تعین شکل الف سے ہونا چاہیئے ۔ چنانچہ اکثر الفاظ ایسے ہیں بھی جن کی کتابت آلف اور آی دونو اشکال میں جاری ہے ۔ مگر اصولاً یکسانی لازم ہے ۔ پس الف ممدودہ کی کتابت قائم کرلی جائے تو املا کا دُبدھا دُور ہوجاتا ہے ۔

مثلاً

الف مقصورہ		الف ممدودہ	
معنٰی - معنٰی - معنٰے	....	معنا	وغیرہ
علٰحدہ	....	علاحدہ	
معرٰی	....	معرا	
مجرٰی	....	مجرا	
مولٰنا	....	مولانا	
مدعٰی	....	مدعا	
یحیٰی	....	یحیا	

اظہار وحذف (الف)

(۲)

وہ الفاظ جو الف کے اظہار وحذف سے دونو طرح لکھے جاتے ہیں۔ ان کو محض الف کے اظہار سے لکھا جائے۔

بحذف الف = ثلٰث - یٰسین - اسحٰق - سبحٰن - رحمٰن } وغیرہ
باظہار الف = ثلاثہ - یاسین اسحاق سبحان رحمان }

تلفظ کی یکسانی

(۳)

جس طرح رسم خط کی یکسانی ایک ضروری چیز ہے اسی طرح اس رسم خط کے تلفظ میں بھی یکسانی ہونا ضروری بات ہے۔ اس لئے الفاظ مندرجہ حاشیہ ع۱ سے یائے معروف کے الفاظ کو یائے معروف پر ختم کیا جائے جیسا کہ نمبر ۲ میں ہے۔ کیونکہ وہ مرکب ہیں۔ اُن + ہی - اِن + ہی سے ایسے ہی

نمبر ۱
اُنھیں } اُنھیں }
اِنھیں } اِنھیں }

نمبر ۲
اُنھی } اُنھے }
اِنھی } اِنھے }

یائے مجہول کے الفاظ کو یائے مجہول پر ختم کیا جائے کیونکہ وہ مرکب ہیں -

اُن + ے - اِن + ے سے یہاں یائے مجہول علامت مفعول ہے -

اِن لفظوں میں غنہ کی آواز قدرتاً پیدا ہو جاتی ہے نون غنہ لگانے کی ضرورت نہیں یہ صرف تلفظ غنہ کے اظہار پر نون غنہ کی زائد کتابت ہونے لگی ہے جس سے یائے معروف و مجہول کا اعرابی امتیاز قائم نہیں رہتا ہے ایسے ہی - وہی اور یہی کا رسم خط خلاف اصول کبھی کبھی وہ ہی اور یہ ہی بھی دیکھا جاتا ہے یہ صورت محض ضرورت شعری میں آسکتی ہے -

رسم خط کی یکسانی اور اس کا تعین مطابق تلفظ کے

مندرجہ حاشیہ الفاظ، متقابل الفاظ ہیں اور سب کا سرِ حرف الف ہے - اگر اعراب کا استعمال ترک کیا جاتا ہے تو تلفظ کی یکسانی اور اس کا تعین قائم نہیں رہتا اور اعراب کے استعمال میں قلم کی روانی رُک جاتی ہے - جیسا کہ نمبر ایک میں ہے -

نمبر (۱) مروجہ

اُس	اِس
اُسی	اِسی
اُن	اِن
اُنھی	اِنھی
اُنھے	اِنھے
اُدھر	اِدھر

اگر واو کا استعمال کیا جاتا ہے تو رکاوٹ اور بھی بڑھ جاتی ہے - جیسا کہ نمبر ۲ سے ظاہر ہے کہ جس میں پہلے تو اعراب کی قوت المضاعف کردی جاتی ہے پھر علامت نفی کے استعمال سے اس کی تنصیف بھی کی جاتی ہے پھر طول عمل یقیناً قلم کی روانی میں حائل ہو جاتا ہے - اگر علامت نفی کا استعمال جلدی میں ترک ہو جائے تو تلفظ مشتبہ ہو جاتا ہے - مثلاً

اوس (شبنم)

نمبر (۲) مروجہ

اوِس	اس
اوِسی	اسی
اوِن	ان
اوِنھی	انھی
اوِنھے	انھے
اوِدھر	ادھر

یہ اس وجہ سے کہ واو معدولہ کی کوئی خاص شکل معین نہیں اس کا تعین

نمبر (۳) مجوزہ

اس	اسی

واو ملفوظی "ں" خاص شکل کے ذریعہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے کہ ماقبل اس کے (خ) ہو اور مابعد (د - ر - ش - ند - ی) پس اس کے امتیاز کا طریقہ آسان یہی ہے کہ الف مضموم کو خط نسخ میں لکھا کریں تو ایک مستقل صورت ہو جاتی ہے جیسا کہ نمبر (۳) میں درج ہے۔ یہ ایک ہی کشش میں لکھا جاتا ہے اور اس کا استعمال بھی خاص خاص صورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس کے تلفظ میں مبتدی اور منتہی سب غلطی کر جاتے ہیں۔ پس بروے اصول ریاضی دو اجزا کے مجموعہ میں سے جب ایک جزو متمایز ہو جاتا ہے تو دوسرا از خود ممیز ہو جاتا ہے۔ اس لئے دوسرے متقابل لفظ میں الف مکسور کے اظہار میں کسی امتیازی علامت و صورت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اسی	اسی
ان	ان
انھی	انھی
انھے	انھے
ادھر	ادھر

نوٹ:- یہ شکل رسم خط زیر بحث میں ضمہ موصول کی تصور کی جائے۔

(باقی دارد)

اصطلاحات نباتات

Abama	لنگار
Abaxial	خارج المحور
Abelicea	ابلیشیه
Abelmoschus	(عربی) ابوالمسک
	(فارسی) مشک دانه—
Abies	تنوب
Abjoint	بندکشائی
Abroma	ناماکول
Abronia	زبیا
Abruptly Acuminate	بےطور نکیلا
Abruptly Pinnate	بےطور پریلا
Abrus	ناعمه
Abscise	کٹنا
Abscission	کٹاون
Absciss Layer	کٹ پرت
Absinthium	افسنتین
Abstricted	گریده
Abstriction	گریدگی
Absus	ابسوس
Abutilon	دوڑہ—ابوطیلون
Abuta	ادوبا
Acacia	اقاقیا
Acajou	کاشو—اکاژو
Acalepha	کوکلی—کھی—شبک
Acanaceous	خاردار—کانٹولا
Acantha	خار—کانٹا
Acanthaceae	شوکیله
Acanthocladous	کنٹ شاخه
Acanthopodous	خارپا
Acanthus	شوکیه
Acalycal	بے کاسه
Acalyculate	بے کاسه
Acanthocarpous	کنٹ پھلا
Acanthon	خار—کانٹا
Acaulescent	بے ساق
Acapsular	بے غلاف
Acarpelous	بےرچه—بےثمر
Acarpous	بے بر—بے ثمر
Acauline	بے ساق
Acaulose	بے ساق
Accessory Bud	اضافی کلی
Accessory Fruit	اضافی پھل

Accessory Shoot	اضافی ڈا
Accrescent	بالندہ
Acer	اسفندان
Aceraceae	اسفندایلہ
Aceraceous	اسفندالی
Acervulus	تودک
Acetabuliform	کاسکمان
Acetabularia	کاسکیہ
Achariaceae	اکارایلہ
Achariaceous	اکارایلی
Achene	بیفارہ
Achenial	بیفاری
Achilary	بےاب
Achillea	اکلیریہ
Achimenes	اکمنز
Achlamydeae	بےلبادیہ
Achlamydeous	بے لبادی
Achorion	قشارہ
Achras	ساپوطیہ- اشرس
Achroanthes	بے رنگلہ
Achyranthes	سبوس گلہ
Aciculate	سوزنیلا—سوزندار
Acheilous	بے لب
Achenocarp	بیفاز پھل
Achenodium	بیفاریقہ
Acinaceous	دانہ‌دار
Acinaciform	تیغہ‌نما
Acidaspis	نوکڈھال
Acinacifolfous	تیغ برگہ
Acinarious	دانہ پوش
Aconitum	بچھناگ—بیش
Acorus	لریریہ - شکرساق
Acondylous	بےرباط—بے بند
Acotyledon	بےفلقہ
Acrasia	دشامیز
Acrasiaceae	دشمیزایلہ
Acrasiales	دشمیزیلہ
Acrocarpi	سرثمرے
Acrocarpous	سر ثمری
Acrocomia	سر بال
Acrodromous	نوکرس
Acrogen	سر دم

Acrogenous	سردمی
Acramphibryous	ہر تنا دم
Acrobryous	سر نمو
Acrocarp	سر ثمرہ
Acrogamous	سرتخمہ
Acrogamy	سر تخمی
Acrogenic	سردمی
Acrogynous	سرمادی
Acropetal	سرجو
Acrospire	سرپیچ
Acrospore	سردانہ
Acrostichum	زیرتخمہ
Acrosporous	سردانی
Acrosarcum	سرگردہ
Acroscopic	سربین
Acrostichoid	زیرتخمان
Actaea	شہدار
Actinomyces	کرن کہمبی
Actinocarp	کرن پھل
Actinodromous	کرن دوڑ
Aculeate	سوزنک وار
Acuminate Leaf	نوکدار پتی
Acute Leaf	دھاردار پتی
Acuan	اکوان
Athyrium	لاتریمیہ
Atropa Belladonna	لفاح قدال
Auricula	اذنہ
Autogamy	خود باروری-خودباری
Autogamic	خودبارور-خودبار
Autogamous	خودبارور خودبار
Autophyllogeny	خودبرگ زائی
Autophyte	خودغذا
Azalea	خشکرو
Azolla	سکھاماں
Azygospore	طاق بزیرہ
Azygosperm	طاق نطفہ
Babiana	میمونیہ
Baccharis	بکریس
Bacillariaceae	چوبکایلہ
Bacillariaceous	چوبکایلی
Bacillariales	چوبکیلہ
Baccharoid	بکرتسا

Bacteroid	حرماسا
Balanophora	بلوطیلا
Balanophoraceae	بلوطیلایله
Balanophoraceous	بلوطیلالی
Balanops	بلوطمان
Balanopsidaceae	بلوطمانایله
Balanopsidales	بلوطمانیله
Balaustion	گلناره
Balsam	بلسان
Balsamea	بلسانیه
Balsameaceae	بلسابله - بلسانایله
Balsameaceous	بلسابلی - بلسانالی
Balsaminaceae	بلسمینایله
Balsaminaceous	بلسمینالی
Balsamine	بلسمین
Barbellate	ریشکدار
Barosma	گران بویه
Bartonia	بورطونیه
Basella	باسیله
Basellaceae	باسلایله
Basellaceous	باسلالی
Basidial	بنایکی
Basidiolichenes	بنایک حزاز
Basidiomycete	بناهمه
Basidiomycetous	بناهمه لی
Basidiophore	بنایک دار
Basidiospore	بنایک بزره
Basidiosporous	بنایک بزرلی
Basidium	بنایک
Basifugal	بناگریز
Basifugally	بناگریزانه
Basidiogenetic	بنادز
Basifixed	بناباینده
Basipetal	بناجو
Bassia	باسیه
Bauera	بوئریه
Bauhinia	بوهینیه
Beaumontia	بوماشیه
Bebeero	بی بی رو
Beggiatoa	بجاریه
Begonia	بگونیه
Begoniaceae	بگونایله

Begoniaceous	بگونالي
Belladonna	لفاح
Benzoin	لوبان
Berberidaceae	بربرايله
Berberis	دارهلد- بوباريس
Berberidaceous	بربرايلي
Berchemia	بركيميا
Bergamot	بيگ آرمودي
Bertholletia	برطوليشيه
Bessara	بسوريه
Bicarpellary	دوبرچي
Bicollateral	هم جانب
Bicollaterality	همجانبيت
Bicostate	دوپسليا
Bicrenate	دودنفيا
Bidental	دو نما
Bifarious	دونقطيا
Bitorate	دوسوراخه
Bitorine	دوده
Bignonia	بگنونيه
Bignoniaceae	بگنونايله
Bignoniaceous	بگنونايلي
Bijugate	دوجفته
Bikukulia	دوحوذه
Bilabiate	دولبه
Billbergia	بلبرجيه
Bilocellate	دو انكي
Bipetalous	دوگلبرگه
Bipinnate	دوپريا
Bipinnatiparted	دوپرباتيا
Bipinnatisected	دوپركتا
Bixa	بكسا
Blandfordia	بلنفوريه
Beohmeria	بومهريه
Boerhavia	بورهاويه
Boletaceae	بلوطايله

Boletaceous	بلوطالي
Boletus	بلوطيه
Bomarea	بوماريه
Bombacaceae	بنبايله
Bombacaceous	بنبايلي
Bombax	كپاس-پنبه
Borage	هويه
Boraginaceae	هوايله
Boraginaceous	هوايلي
Borago	هوايلا

تبصرہ

۱۔ مقالاتِ زرّیں [1]

۲۔ جذباتِ فطرت [2]

۳۔ اوراقِ سحر [3]

یہ تینوں ننھے ننھے کتابچے بہت چھوٹی تقطیع پر ہیں۔ ان کے مصنف جناب شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی ہیں۔ جن اصحاب نے روحِ ادب کو ملاحظہ فرمایا ہے وہ آپ کے طرزِ تحریر سے واقف ہیں۔ یہ کتابچے بھی اسی رنگ کے اور اسی کے بیچے ہیں۔

مقالاتِ زرّیں

مقولے، حکمت، تجربے اور ذوق کا عطر ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس قسم کی چیزیں لکھی ہیں مگر دنیا میں بہت ہی کم بلکہ گنتی کے چند ہی ایسے حکیم منش ادیب ہوئے ہیں جنھیں کامیابی ہوئی ہے۔ اور جن کے مقولے زبان زدِ خاص وعام اور مقبولِ خلائق ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک میں یا جہاں کہیں فارسی رائج ہے۔ یہ بلند رتبہ سعدی سے بڑھکر کسی کو نصیب نہیں ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے مقولے ادب حکمت کی جان ہیں اسی طرح فرانس میں پاسکل (Pascal) کو اور انگلستان بیکن و شیکسپیر کو یہ مقبولیت نصیب ہوئی۔ حضرت جوش

---

[1] مقالاتِ زرّیں صفحات ۶۰ قیمت ۱۱؍ [2] جذباتِ فطرت صفحات ۱۴ قیمت ۳؍

[3] اوراقِ سحر صفحات ۳۰ قیمت ۵؍

ملنے کا پتہ:۔ رئیس احمد خاں صاحب رئیس ملیح آباد۔ لکھنؤ

نے بڑی کٹھن منزل میں قدم رکھا ہے۔ ایک پرجوش نوجوان شاعر یا ادیب کو اس سرزمین پر پھونک قدم رکھنا چاہیے۔ اس کے لئے علاوہ شاعر یا ادیب یا صاحب ذوق ہونے کے پختگی اور تجربہ بھی ش ہے۔ عمر کی کئی منزلیں طے کرنے کے بعد انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے جو دلوں گھر کرسکے اور عام و خاص میں درجۂ قبولیت کو پہنچ سکے۔ اس کے سوا طرزِ ادا میں بھی شیرینی، لطافت اور ندرت درکار ہے۔ تاہم حضرتِ جوش کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ جو چیزیں انھوں نے اپنا دل کرنے کو لکھی ہیں وہ اُن کے بعض دوستوں کے لئے بھی موجبِ مسرّت ہوں گی۔ کم سے کم یہ ضرور ہے شایقینِ ادب کا آدھ گھنٹہ مزے سے گزر جائے گا۔ مگر انھیں وہ رُتبہ نصیب نہیں ہو سکتا جس کی کو آرزو ہے۔ ہنوز دلّی دور است۔ ابھی انھیں بہت مشق تجربہ اور اصلاحِ ذوق کی ضرورت ہے۔ اس مجموعہ میں کل مقولے (جن میں سب سے چھوٹا آدھی سطر کا اور سب سے بڑا تین سطروں کا ہے) ۴۶۲ ہیں بعض اخلاقی نکتے ہیں، کچھ تخیّل کی جولانیاں کچھ معمولی خیالات ہیں جنھیں شاعرانہ طرز میں ادا کر د ہے اور کچھ شاعرانہ تشبیہیں ہیں اور بعض بالکل سپاٹ ہیں۔ ہمارے سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے جملوں (یا کو اس مجموعہ میں داخل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

۱۔ بے سروسامانی میری محافظ ہے۔

۲۔ سلطنت جمہوری اچھی

۳۔ پبلک میں قوّتِ حکمرانی کا پیدا ہوجانا جمہوری سلطنت کی تمہید ہے۔

ان میں نہ کوئی خیال کی خوبی ہے نہ بیان کی۔

آخر میں ہم نمونے کے طور پر چند مقولے دیتے ہیں جن کا پڑھنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ یہ اُن مقولوں میں سے ہیں۔

دولت بہت سے ذائقے خراب کرچکی ہے، کہیں چکھ نہ لینا۔

پہلے دنیا ماں کی طرح تھپکتی ہے اور سو جاؤ تو گلا گھونٹ دیتی ہے۔

خوب رو لئے تو وہ نظر آنے لگا۔ پانی برس چکا تو دھنک نکل آئی۔ غریب کی عرق آلو

پر کوئی بوسہ نہیں دیتا۔

رواج بڑی سے بڑی چیز سے مصافحہ کرا دیتا ہے۔

بعض اس قدر مغرور رہیں کہ راستے میں اگر خدا بھی مل جائے تو وہ سلام طلب کریں۔

"آسانیاں" دراصل بھیس بدلے ہوئے "مشکلیں" ہیں۔

جھوٹے کا آغاز اس قدر بلند ہوتا ہے کہ لوگ گردنیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھتے ہیں۔ لیکن انجام میں لوگوں کو غاروں میں جھک جھک کر دیکھنا پڑتا ہے۔

تمام دنیا کے بہترین پھول۔ اور بہتر سے بہتر اُستادوں کے بنائے ہوئے عطر وہ خوشبو پیدا نہیں کرسکتے جو برسات کا پہلا چھینٹا پیدا کرتا ہے۔

کوئی جانور ایسا قابلِ مضحکہ اور شایانِ تمسخر نہیں جس طرح ایک مغرور مجتہد۔

جسے تو سر رشتۂ مسرت سمجھکر مضبوط پکڑے ہوئے ہے وہ تو دراصل اژدہے کی دُم ہے۔

آدمی کے تین رُخ ہوتے ہیں (۱) جیسا وہ اپنے کو سمجھتا ہے (۲) جیسا لوگ اُسے سمجھتے ہیں۔ (۳) جیسا وہ خود ہے۔

مولانا حالیؔ مرحوم نے اسی خیال کو کس خوبی اور نزاکت سے ادا کیا ہے اور اسی سے طرز بیان کا فرق معلوم ہو جاتا ہے ؎

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں — اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے — بس مجھکو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

جذباتِ فطرت

شاعر نے اس میں یہ راز بتایا ہے کہ کائنات کی ہر شے شاعر کو اپنی طرف بلا رہی ہے اور مظاہر قدرت اُسے اپنی دلآویزیوں کی طرف دعوت دے رہی ہیں۔ چنانچہ اس خیال کی بنا پر انھوں نے پہاڑ کی صدا، دریا کی صدا، طلوعِ سحر کی صدا، غروبِ آفتاب کی صدا، تارۂ سحری کی صدا، شفق کی صدا، چاند کی صدا، آفتاب کی صدا، آدھی رات کی صدا، فصلِ گل کی صدا سمندر کی صدا، پھول کی صدا کے نام سے چار

چار مصرعوں کی نظمیں لکھی ہیں، اور ہر ایک کے آخر میں پانچواں مصرعہ یہ ہے۔ ع

ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

نظمیں اچھی خاصی اور دلچسپ ہیں۔ اُردو زبان میں بہت غنیمت ہیں۔ نمونے کے طور پر دریا کی صدا نقل کی جاتی ہے ؎

مری لہروں میں بجلی کا خزانہ　　مری رَو میں محبّت کا خزانہ
مرے دھارے میں عظمت کا ترانہ　　مری گرداب میں چنگ و چغانہ
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

اوراقِ سحر

حضرتِ جوش صبح کے عاشق ہیں۔ وہ اسے دنیا کی ساری نعمتوں سے بڑھکر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اوراقِ سحر کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں" میں لٹریری کام اکثر طلوع آفتاب سے قبل ہی شروع کرتا ہوں ان نازک مضامین میں سے جو اِن اوراق میں جمع کئے گئے ہیں، اکثر آیتیں طلوع سے پہلے ہی نازل ہوئی ہیں یہ وہ پنکھڑیاں ہیں جو صبح صادق کی چاندنی میں چُنی گئی ہیں"

اس کتابچے کے پہلے دو صفحوں میں نظم ہے اور باقی نثر ہے۔ اس میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے مگر ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح صبح سے ہے۔ طرزِ تحریر ان کا مخصوص ہے۔ نثر کے سب مضامین وہ اسی طرز میں لکھتے ہیں۔ یعنی ٹیگور کی نقل اُڑائی ہے اور کہیں کہیں نبھائی ہے۔

کاغذ لکھائی چھپائی ان سب کتابچوں کی عمدہ ہے۔

رسالہ

صنعت وحرفت (صوبہ اورنگ آباد)

مصنّفہٗ

محمد نظام الدین صاحب اسسٹنٹ انجنیر۔ اورنگ آباد

یہ کتاب خاصی بڑی تقطیع پر ۴۲ صفحہ کی ہے۔ اس میں صوبۂ اورنگ آباد کی صنعت وحرفت کی تاریخی کیفیت

موجودہ حالت اور مختلف صنعتوں اور حرفتوں کی ترکیبیں اور طریقے جو اس وقت تک رائج ہیں درج کئے گئے ہیں جن میں سے بعض خاص بلدۂ اورنگ آباد سے مخصوص ہیں۔ علاوہ اس کے ان صنعتوں اور پیشوں کے بیان میں بہت سی مفید معلومات بھی درج ہیں۔ اس کے بعد مؤلف نے انگلستان کے ۱۰۰ کارخانوں کی فہرست دی ہے تاکہ جن پیشہ وروں کو ضرورت ہو خط وکتابت کرکے اپنے پیشہ کے متعلق نئی نئی کلیں منگا لیں اور اپنے پیشہ کو ترقی دے سکیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر قابل مؤلف انگلستان کے علاوہ امریکہ اور دیگر ممالک کے کارخانوں کی فہرست بھی دیدیتے۔ اس میں زیادہ آسانی ہوتی۔ اس فہرست کے بعد ایک فہرست ایسے اخباروں اور رسالوں کی دی گئی ہے جو خاص خاص پیشوں، صنعتوں یا تجارت سے متعلق ہیں۔ تاکہ پڑھے لکھے پیشہ ور یا شوقین اُن کے مطالعہ سے اپنی معلومات میں اضافہ کرسکیں اور دنیا میں جو ہر روز نئی ایجادیں ہوتی رہتی ہیں اُس سے باخبر رہیں۔ رسالوں کے علاوہ بعض بعض مستند اور مفید کتابوں کے نام بھی درج کردیئے گئے ہیں۔ یہ اخبار و رسالے سب کے سب ہندوستان کے ہیں۔ اگر امریکہ کے رسالے بھی درج فہرست کردیئے جاتے تو یہ فہرست زیادہ مفید ہوجاتی ہے۔ کیوں کہ امریکہ ان چیزوں میں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ اگر یہ کتاب دوبارہ چھپی تو مؤلف اس کا ضرور خیال رکھیں گے۔ اس کے بعد ایک فہرست اُن مدارس کی دی ہے جہاں مختلف صنعتیں اور پیشے سکھائے جاتے ہیں۔ اس میں بھی سب درسگاہیں انگلستان یا ہندوستان کی ہیں۔ کتاب کے آخر میں قابل مولف نے ایک بڑا نقشہ دیا ہے جو بہت دلچسپ ہے اس میں مختلف پیشہ ور کام کرتے ہوے دکھائے ہیں۔ تصویریں اچھی ہیں اور ہر تصویر کے ساتھ مختصر پُرلطف کیفیت درج ہے۔ اس نقشے کو دیکھکر ملک کے تمدن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

افسوس ہے کہ کتاب کی چھپائی اچھی نہیں ہے۔ لائق مؤلف کا یہ کام اس زمانہ میں قابلِ قدر ہے[1]۔

---

[1] کتاب مؤلف صاحب سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے

ہندوستانی گھروں میں تیمارداری

مصنفۂ

ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب

کتاب کی جلد اچھی، حروف جلی اور کاغذ عمدہ ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ زبان سلیس اور ہدایات وغیرہ بہت آسان ہیں جنھیں ہر شخص بہ آسانی سمجھکر عمل کر سکتا اور اُن سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب جس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے اُسے پُورا کرے گی۔ مگر چند امور اصلاح طلب معلوم ہوتے ہیں مثلاً ٹمپریچر چارٹ صرف ایک ہی ہے اگر کئی ہوں تو زیادہ مفید ہوں گے۔ اگرچہ تصاویر کافی تعداد میں ہیں لیکن اُن سہولتوں کے لحاظ سے جو اس زمانہ میں ہمیں مُیسّر ہیں قابل تعریف نہیں۔ بعض الفاظ کے ترجمہ میں بھی تبدیلی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً اسٹرلائزنگ کے معنی میری رائے میں صاف کے بجائے پاک لکھنے چاہئیں۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ ایک چیز صاف ہو مگر پاک نہو۔ اسی طرح سپس (سپسس) کو بخس کہا جائے تو مناسب ہوگا۔

اسی مضمون کی ایک اور کتاب موسومہ انڈین ہوم نرسنگ مصنفہ میجر آر جے بلیکم مترجمہ زیر نگرانی علیا حضرۃ سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال بھی میری نظر سے گزری ہے۔ یہ کتاب کتاب زیر تبصرہ سے دقیق ہے۔

حیدر علی خاں

ایف آر سی ایس (اڈنبرا) ایم۔ آر سی ایس (انگلینڈ)

ڈسٹرکٹ سول سرجن۔ اورنگ آباد

فہرست کتب

(سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو)

البیرونی کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا رتبہ تعریف سے مستغنی ہے دسویں صدی کا فاضل ہے مگر تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہے ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفہ، تاریخ اور مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی البیرونی اس کے حالاتِ زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے عہ/

فلسفۂ اجتماع تالیف ہے اور اس کا موضوع نفس اجتماعی جماعت کے لیئے اعمال و قوائے دماغی کے تحلیل و تشریح ہے موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ اِس پر انگلستان و ہند کے علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔ عہ

قاعدہ و کلید قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے۔ ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی نے اپنے صوبہ کے گورنر سے تحریک کی ہے کہ اس قاعدہ کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ جن اُصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیئے اُن کی تشریح کے لیئے ایک کلید بھی تیار کی ہے۔ قاعدہ ۲ر کلید قاعدہ ۴ر

دریائے لطافت ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے اُردو صرف و نحو اور محاورات و الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں۔ قیمت عہ/

طبقات الارض اِس فن کی پہلی کتاب ہے۔ تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند ہیں انگریزی اور اُردو دانوں کے لیئے یکساں طور پر مفید ہے۔ کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک کردی گئی ہے۔ قیمت عہ

مشاہیر یونان و روما۔ پلوٹارک لائوز کا ترجمہ ہے سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا رتبہ دو ہزار برس ۔۔۔ سے

آج تک مُسلّم الثبوت چلا آتا ہی۔ ادبیاتِ عالم بلکہ شکسپیر تک نے
اِس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہی۔ وطن پرستی و بے نفسی، عزم
و جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ لبریز ہی۔
ہماری قوم کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں اس کا ایک نسخہ
ضرور ہونا چاہیئے۔ دُنیا کی تمام مہذّب زبانوں میں اس کا
ترجمہ ہو چکا ہی۔ جلد اوّل غیر مجلد عہ جلد دوم مجلد عہ

اسباق نحو دو حصے ملک کے ادیب کامل مولٰنا
مولوی حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف سے
ہیں اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری
مسئلہ درج ہی عربی خواں طلبا کے لیئے نادر تحفے ہیں
قیمت فی رسالہ ۴ ر

علم المعیشت اسرارِ تمدن کے سمجھنے کے لیئے
اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمّد الیاس برنی
صاحب ام اے نے ملک پر بڑا احسان کیا ہی۔
حجم (۵۰۰) صفحے قیمت صرف للعہ

تاریخ اخلاق یورپ اصل مصنّف لیکی کا نام علم
و تحقیق و صداقت کا مرادف ہے یہ کتاب کئی ہزار
برس کے تمدن و معاشرت اُصول اخلاق مذہب و خیالات
کا مرقع ہی۔ ترجمہ مولوی عبد الماجد صاحب بی اے
حصہ اول مجلد سے، دوم مجلد سے

مبادیِ سائنس فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی
سے اُردو میں ترجمہ کی گئی ہی اس کا بیان سلیس اور مقبول
عام ہی اُردو ترجمہ صرف ایک حصّہ کا ہی اور آخر کتاب
میں فرہنگ مصطلحات بھی ہی قیمت عہ

تاریخ یونانِ قدیم ۔ یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتب
کا خلاصہ ہی اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی
اِس کا نقطہ خیال خالصًا ہندی ہی۔ ایف اے کلاس
طلبا جو یونانِ قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس
کو انتہا درجے مفید پائینگے۔ مجلد قیمت عہ

انتخاب کلام میر ۔ میر تقی سرتاج شعرائے اُردو
کا انتخاب ہی مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن
نے یہ انتخاب ایک مدّت کی سعی و محنت کے بعد کیا
شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر
کا ایک مقدمہ بھی ہی۔ قیمت عہ

رسالہ نباتات - اس موضوع کا پہلا رسالہ ہی علمی اصطلاحات سے معرّا - سلاست روانی مملو اور دلچسپ و مفید ہی - طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اسی رسالہ میں مطالعہ کریں - قیمت مجلد عہ

دیباچہ صحت - اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہوا، پانی، غذا، لباس وغیرہ پر مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہی زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دل پذیر ہے - ملک کی بہترین تصنیف ہی - اس کا مطالعہ طبیبوں کے کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا - حجم ۵۵۰ صفحے مجلد قیمت للعہ

قواعد اُردو ارباب فن کا اتفاق ہی کہ اُردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھی گئی بسیط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہی کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہی اس کو ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم بمبئی نے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہی قیمت عہ

القول الاظہر ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف الفوز الاصغر کا اُردو ترجمہ ہی - ابن مسکویہ آسمان علم و فضل کا آفتاب تھا یہ کتاب فلسفہ انھیں کے اُصول پر لکھی گئی ہی اور مذہب اسلام پر انھیں اُصول کو منطبق کیا گیا ہی اس کو بمبئی یونیورسٹی نے سرکاری کتب خانوں کے لیئے تجویز کیا ہی قیمت عہ

اُمرائے ہنود پانسو سے زیادہ ہندو امرا کے حالات قلم بند ہیں - یہ اُمرا سلاطین مغلیہ کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے کتاب گویا ان متعصب اور ناواقف مورخوں کا جواب ہی جو اسلامی حکومت پر تعصب کا الزام لگاتے ہیں - قیمت حصّہ اوّل عہ

حصّہ دوم عہ

القمر قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی طرح اور چاند کے متعلق جتنی جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہی طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے - قیمت ۸ر

تاریخ تمدن - سر ٹامس بکل کی شہرہ آفاق کتاب کا ترجمہ ہی الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہی - ہر بحث کے لیئے ایک دلچسپ

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

تاریخ ہندوستان کامل ۱۰ جلد	عیہ/
تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ ۳ جلد	سے/
آئین قیصری	عمہ/
کرزن نامہ	/۶
صحیفہ فطرت	/۶
محاربات عظیم	/۸
فلسفہ امثال	/۱۲
تقدیم اللسان	/۶
تعلیم الانتظام	/۱۲
اہل عرب کا جبر و مقابلہ	/۶
جغرافیہ ریاضیہ	/۱۲
جغرافیہ طبعی	/۸
رسالہ علم تناسب	/۶
رسالہ علم مساحت	/۱۲
معاون الحساب	/۱۲

مولوی عبدالرزاق کانپوری

البرامکہ	سے/
نظام الملک طوسی ۲ جلد	صر

مولوی عبدالسلام مرحوم

خیالات عزیز	عیسر
حکم ارسطو	عیسر

نواب محسن الملک مرحوم

آیات بینات ۳ جلد	معہ/
مضامین تہذیب الاخلاق	للعہ/
مجموعہ لکچر	للعہ/
تقلید و عمل بالحدیث	/۸
کتاب المحبت والشوق	/۸

سید محمود مرحوم

کتاب الطلاق	/۶
کتاب الشفعہ	/۶
شرح قانون شہادت	سے/
لکچر	/۸

خلیفہ محمد حسین مرحوم

اعجاز التنزیل	سے/
سفرنامہ برنیر ۲ جلد	للعہ/
تاریخ پٹیالہ	سے

مولانا اشہری مرحوم

حیات انیس	/۶
ایشیائی شاعری	عسہ/
نورجہان بیگم	/۸
ٹیپو سلطان	عمہ/
حیدر علی سلطان	عیسر

مولوی چراغ علی مرحوم

مضامین تہذیب الاخلاق	عیسر
تحقیق الجہاد	سے/
اعظم الکلام ۲ جلد	سے/
مجموعہ رسائل	سے/

مولوی احسان اللہ عباسی

ترجمہ قرآن مجید	صہ/
تاریخ الاسلام	للعہ/
الاسلام	/۶
المجاہدہ	عسہ/
زاہدہ	عیسر
نشتر سخن	سے

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی

علمائے سلف	عسہ/
اسلامی اخلاق	/۸
نقش وفا	/۸
ذکر جمیل حبیب	عیسر
سیرۃ الصدیق	

منشی سعید احمد مارہروی

آثار اکبری	/۶
حیات خسرو	/۱۲
حیات صالح	/۴

مولانا اسلم جیراجپوری

حیات	عیسر/۴
حیات جامی	/۸
علوم عرب	عیسر
خواتین	عیسر
رسالہ محجوب الارث	/۴

نواب علی حسن خان حسام الملک

فطرت الاسلام	/۶
المدنیۃ فی الاسلام	عیسر

مولوی رشید احمد انصاری

تحریر المراۃ	عیسر
المدنیۃ الاسلام	/۶

منشی محمد حسن خان

ترکوں کی معاشرت	/۶
ہاجرہ	/۶

مسٹر ظفر علی خان بی اے

جنگل میں منگل	/۶
سیر ظلمات	/۶
ڈراما جنگ روس و جاپان	عیسر
فلسفہ ابن سینا	/۸

معاشرت	/۱۰
اپریل فول	/۸

مولوی عبدالغنی وارثی مرحوم

مسلمانان اندلس	عیسر
تنقیح حقوق نسواں	/۱۲

خواجہ غلام الثقلین مرحوم

روزنامہ سیاحت	/۶
ایک فلسفیانہ لکچر اسلام	/۴

مسٹر عنایت اللہ خان بی اے

دعوت اسلام	سے
زلفی	/۸

مسٹر ظفر عمر بی اے

نیلی چھتری حصہ اول	عسہ
پولیسین حصہ دوم	عسہ/۸

مرزا محمد ہادی بی اے

امراؤ جان ادا	عسہ
شریف زادہ	/۸
خونی مصور	عہ
لیلیٰ مجنوں	/۸
مثنوی امید و بیم	/۴

منشی امیر احمد مینائی مرحوم

امیر اللغات	عسہ
مینائے سخن	عمر
محامد خاتم النبیین	۸/
نظم نگارین	عمر
رسالہ تذکیر و تانیث	۸/
قواعد المنتخب	۴/
افادہ تاریخ	۸/

پروفیسر نواب علی

تذکرۃ المصطفیٰ	عبر
معارج الدین	عمر
صحف سماوی	سے/

انیس احمد عباسی بی اے

احمد و کیتھرینا	۶/
نازنین آرمینیا	عمر
زلیخا	۱۲/

مرزا داغ دہلوی مرحوم

مہتاب داغ	سے/
گلزار داغ	عبر
انتخاب داغ	عمر
یادگار داغ	۸/
فریاد داغ	۵/

جلال مرحوم

مضمونہائے دلکش	عمر

منشی سید برکات احمد

جمیلہ	۱۲/
بیوفا	۱۲/
یادگار سلف	۶/

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الدین	۸/
حاجی بغلول	زیر طبع
پیاری دنیا	۱۰/
طلسمی فانوس	۶/
میٹھی چھری	۶/
کایا پلٹ	۱۲/

پنڈت رتن ناتھ سرشار

فسانۂ آزاد	عسہ
جام سرشار	عمر
ہشو	۶/
پچھڑی دلہن	۸/
پی کہاں	۵/
کامنی	عمر
خدائی فوجدار	ہر
سیر کہسار ۲ جلد	سے/

منشی جوالا پرشاد برق

مرنالنی	۱۲/
مار آستین	۱۲/
بنگالی دلہن	۱۲/
پرتاب	۱۲/
معشوقۂ فرنگ	۱۰/
بروگ	۵/

مولانا عبد الحلیم شرر

جنید بغدادی	عمر
ابوبکر شبلی	عمر
عزیزۂ مصر	عمر
دولت اسپانیہ عرب حصہ ۲	معہ
صقلیہ میں اسلام	۱۴/
قیس و لبنیٰ	عمر
فلپانا	عبر
ماہ ملک	۶/
منصور موہنا	۸/
شوقین ملکہ	عمر
رومۃ الکبریٰ	عمر
فلورا فلورنڈا	۶/
خوفناک محبت	عمر
حسن کا ڈاکو ۲ جلد	عبر
دربار حرامپور	۱۰/
الفانسو	۱۲/
فاتح و مفتوح	عمر
جویائے حق ۲ جلد	للعہ
بابک خرمی ۱ جلد	عبر
لعبت چین	عمر

رسوم دہلی	عمر
تسخیر شوہر	۱۲/
مہر افروز بیگم	۱۰/
کنز الفوائد	۸/
اشاعۃ تحریر النسا	عمر
تعلیم طبعی	۸/
لغات النسا	للعہ

حکیم محمد علی خان

عبرت کامل	ہے
حسن سرد کامل	ہے
دیول دیوی	عمر
گورا	۶/
نیل کا سانپ	عمر
جعفر و عباسہ	عمر
اختر و حسینہ	۶/

مرزا حیرت دہلوی

سیرۃ الرسول ۱ جلد	سے/
کتاب شہادت ۳ جلد	سے/
مضامین حیرت	۶/
حاجی بابا اصفہانی	عبر
الف لیلیٰ دنیازاد	ہے
الف لیلیٰ شہرزاد	۶/
روز الیبرٹ ۲ جلد	سے/
کثرت ازدواج	۸/
تزک تیموری ۲ جلد	عبر

منشی احمد علی شوق قدوائی

ترانۂ شوق	۶/
عالم خیال	۸/
قاسم و زہرہ	۱۲/
گنجینہ	۸/

مولوی سید احمد دہلوی مرحوم

راحت زمانی	عمر

خواجہ عشرت لکھنوی

قواعد میر	۶/
زبان دانی	۴/
اصلاح زبان اردو	۶/
شاعری کی پہلی کتاب	۸/
شاعری کی تیسری کتاب	۸/

حکیم احمد حسین الہ آبادی

تاریخ ابن خلدون جلد اول	عمر
〃 جلد دوم	عمر
〃 جلد سوم	عمر
〃 جلد چہارم	۱۲/
پنجم (زیر طبع) ششم	۱۲/
〃 ہفتم	۱۲/
〃 ہشتم	۱۲/
〃 نہم	۱۲/
〃 دھم	۱۲/
〃 یازدھم	۱۲/
صلاح الدین	عمر
نورالدین محمود	عمر

مولوی انشاء اللہ

تزک تیموری	عمر
حالات قسطنطنیہ	عمر
تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ	۱۲/

مولوی محمد حلیم انصاری

تمدن اسلام ۳ جلد	سے
اسلام و النظریة	۸/
اسلام و فرض جہاد ...	۸/
فتح اندلس	عمر
... و ...	۱۲/

مولوی عبد اللہ العمادی

کتاب المعارف	عمر
محکمات	عمر
تاریخ عرب قدیم	۱۰/
علم الحدیث	۸/
صناعة العرب	۴/
فلسفة القرآن	۳/
محرم کی یتیمین	۴/

مولانا سید سلیمان ندوی

ارض القرآن ۲ جلد	۱۲/
لغات جدیدہ	عمر
مکاتیب شبلی ۲ جلد	۸/
اہل السنة والجماعت	۸/
سیرۃ عائشہ رضی اللہ عنہا	۱۲/

مولوی عبد السلام ندوی

سیرۃ امام مسلم	۴/
سیرۃ عمر بن عبد العزیز	عمر

پروفیسر عبد الباری ندوی

مبادی علم انسانی	عمر
برکلے کا فلسفہ	عمر
عقلیات اسلام	۶/

خواجہ حسن نظامی

روزنامہ بلاد شرقیہ	۱۲/
روزنامچہ ہندستان	۱۲/
میلاد نامہ	عمر
محرم نامہ	عمر
یزید نامہ	عمر
طمانچہ بر رخسار یزید	عمر
محفل نامہ گیارھوین	۱۲/
کرشن بیتی	۱۲/
آپ بیتی	عمر
جگ بیتی	۹/
خطوط حسن نظامی	۱۲/
بیوی کی تعلیم	عمر
اتالیق خطوط نویسی	۱۲/
چٹکیاں اور گدگدیاں	۱۰/
بچوں کی کہانیاں	۱۰/
اُردو دعائیں	۱۰/
اسلام کا انجام	۸/
سیر دہلی	عمر
غدر دہلی کے افسانے ۸ حصے	عمر
اسرار	۴/

پروفیسر شہباز مرحوم

زندگانی بے نظیر	عمر
خیالات شہباز	عمر

مولانا راشد الخیری

صبح زندگی	عمر
شام زندگی	عمر
غب زندگی	عمر
نوحۂ زندگی	۱۲/
منازل السائرہ	عمر
جوہر قدامت	عمر
عروس کربلا	عمر
الزہراء	۱۲/
بنت الوقت	۸/
سراب مغرب	۸/
سات روحوں کے اعمال نامے	۶/
مودودہ	۸/
ماہ عجم	عمر

مولوی بشیر الدین دہلوی

تاریخ بیجاپور ۳ جلد	سے
حرز طفلان	عمر
نشاط عمر	عمر
عصائے پیری	عمر
حسن معاشرت	عمر
اصلاح معیشت	عمر
اقبال و طن	عمر
بچوں سے دو دو باتیں	عمر
عزم بالجزم	۴/

نیاز فتحپوری

جذبات بھاشا	عمر
گیتانجلی مجلد	عمر
گہوارۂ تمدن	عمر
کیوپڈ اینڈ سائکس	۱۲/
مرچی سلاچ کی ڈائری	عمر

سیماب اکبر آبادی

خدیجۃ الکبریٰ	۱۲/
بنت الرسول	۸/
سیرۃ الحسین	۸/
جام کوثر	۶/

صفدر مرزاپوری

بزم خیال	
مشاطۂ سخن	

مہاشے پرکاش

حضرت محمد صلعم	عمر
مہاتما بدھ ۲ جلد	عمر
مارٹن اور لوتھر	عمر
خدا اور روح	عمر
سیتو المستورات	عمر
بچوں کی کہانیاں	۴/

مینیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

ضروری اعلان - فرمائش کرتے اس بات کا حوالہ ضرور دیں کہ کس اخبار میں آپنے ہماری فہرست ملاحظہ کی ہے - نیازمند مینیجر

اُردو

۱۔ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کریگا

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔ حجم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحے ہوگا

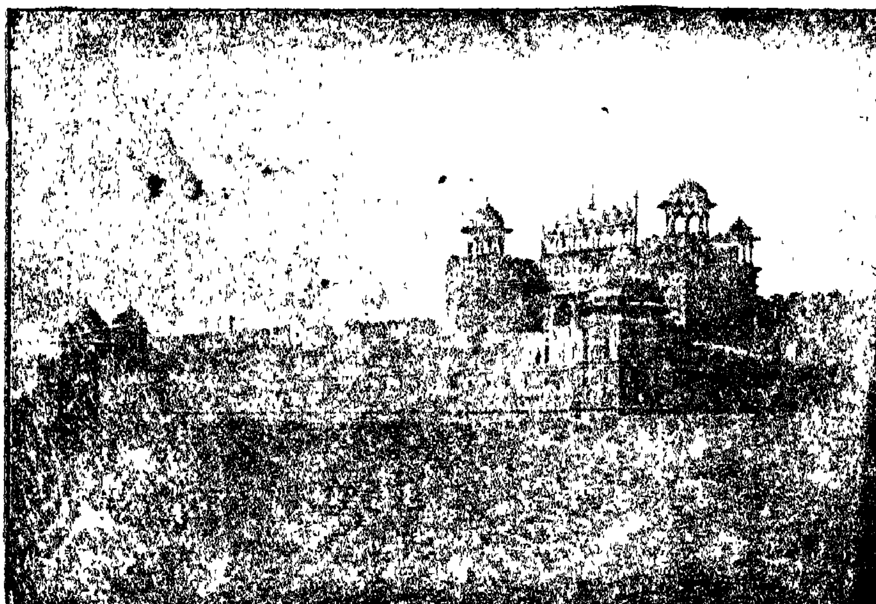
۳۔ قیمت لعہ سالانہ مع محصول ڈاک اور ارکانِ انجمن ترقی اُردو سے عہ

۴۔ تمام خط و کتابت:- آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اُردو اورنگ آباد دکن سے ہونی چاہیئے

(باہتمام محمد مقتدی خان شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)

جلد دوم	بابت اپریل سنہ ۱۹۲۲ء	حصہ ششم

اُردو



انجمنِ ترقی اُردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

یوسف و زلیخائے فردوسی

از جناب حافظ محمود خاں صاحب شیرانی

دیباچہ نگار بایسنغر خانی اور اس کی تقلید میں دیگر تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ فردوسی نے اہالی بغداد کی خوشنودی کے لیے اپنے قیام بغداد کے دوران میں مثنوی یوسف و زلیخا تصنیف کی یہ کتاب (طبع دار الطباعۃ خاصۂ مدرسۂ مبارکہ دار الفنون طہران ۱۲۹۹ھ) اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس میں کوئی ایسی تصریح یا تلمیح موجود نہیں جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ بغداد میں یا بغداد والوں کے لیے لکھی گئی تھی نہ اس کو کسی خلیفہ یا بادشاہ کی طرف منسوب ہونے کا دعویٰ ہے۔

مغربی مستشرقین میں ٹرنر میکین طابع شاہنامہ (کلکتہ) قابل ذکر ہے جس کا بیان ہے کہ فردوسی نے یہ کتاب والی عراق کے لیے تصنیف کی تھی۔ ڈاکٹر ایتھے جس نے یورپ میں اس مثنوی کا سب سے پہلا منتقدانہ ایڈیشن شایع کیا ہے۔ نیز پروفیسر براؤن کا عقیدہ ہے کہ یہ مثنوی فردوسی نے مجد الدولہ ابو طالب رستم کے لیے لکھی تھی۔

لیکن یہ حقیقت فراموش نہیں کی جاتی کہ یوسف زلیخا جب کہ متاخرین میں مشہور ہے متقدمین میں اس کی شہرت جلوہ فرد زطاق نسیاں ہی ہے اور نویں صدی ہجری سے قبل کی ایک سند بھی ایسی نہیں ملتی جو اس کتاب کا ذکر یا اس کا علاقہ فردوسی سے تسلیم کر سکے اگرچہ فردوسی اور اس کے شاہنامہ کا ذکر متقدمین کے ہاں اکثر ملتا ہے اور یہ قضیہ ہمیں اس سوال پر آمادہ کرتا ہے کہ آیا موجودہ یوسف زلیخا فردوسی کی تصنیف کہلانے کی مستحق ہے یا نہیں کیونکہ ہمارے پاس بعض ایسے وجوہ ہیں جن کی بنا پر اس مسلّمہ عقیدہ کو شبہ کی نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

بعض حلقوں میں یوسف زلیخا پر اعتراض ہوا ہے کہ اس کی زبان بہت کمزور ہے لیکن ساتھ ہی دفع اعتراض میں کہا گیا ہے کہ فردوسی بزم نگاری میں استاد نہیں بلکہ میدان جنگ اور رزمیہ کارنامے بیان کرنے میں اس کی طبیعت کا قدرتی رجحان تھا۔

کتاب یوسف زلیخا اگرچہ ایک ایسے مضمون پر لکھی گئی ہے جو اسلام میں مقبول رہا ہے اور کلام پاک میں حضرت یوسفؑ کے قصّہ کا ذکر آنے سے اس کے ہر دلعزیزی کو اور بھی فروغ مل گیا ہے۔ لیکن صاحب قرآن العجم کی یوسف زلیخا کی جو قدر فارسی خواں دنیا نے کی ہے چنداں محتاج بیان نہیں، لوگ مشکل سے اس سے واقف ہیں۔ برخلاف اس کے یوسف زلیخائے جامی اب قدر

مشہور ہے کہ بچے سے لے کر بوڑھے تک سب اس کو جانتے ہیں حالانکہ تاریخی حیثیت سے دیکھتے ہوئے خواہ باعتبار قدامت خواہ بلحاظ روایت قصہ یوسف زلیخائے فردوسی نہایت مستند اور یوسف زلیخائے جامی اس کے مقابلے میں بالکل بے وقر ہے۔ سبحان العجم کی تصنیف کے نامقبول اور ناپسند ہونے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ وہ آگ جس کے لیے فردوسی مشہور ہے اس مثنوی میں بالکل خاموش ہے۔ نہ شاہنامہ کی متانت برجستگی اور جدت کا اس میں سراغ چلتا ہے۔

شاہنامہ اور یوسف زلیخا کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم معلوم کرتے ہیں کہ دونوں کتابیں اگرچہ قریب العصر اور ایک شخص کی تصنیف ہونے کی مدعی ہیں لیکن طرز بیان اور زبان میں مختلف ہیں۔ شاہنامہ جن باتوں کو عموماً اجمال کے ساتھ بیان کرتا ہے مثلاً تعریف حسن یوسف زلیخا ان کو شرح وبسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ شاہنامہ سے فردوسی کی خو بو مزاج پسند ناپسند اخلاقی نصب العین اور سوانح زندگی کے متعلق بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے لیکن زلیخا میں شاعر نے اپنی شخصیت کو اس حد تک چھپانے کی کوشش کی ہے کہ باوجود تمام کتاب پڑھ چکنے کے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

یہ ایک مسلمہ عقیدہ ہے کہ فردوسی نے عربی الفاظ سے احتراز کرکے شاہنامہ کو خالص دری زبان میں لکھا ہے لیکن اس کی کوئی اصلیت نہیں شاہنامہ میں سینکڑوں عربی الفاظ موجود ہیں فردوسی نے اس باب میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے بلکہ جس تناسب سے عربی الفاظ رودکی دقیقی اور دیگر معاصرین میں پائی جاتی ہیں اور جو زبان وقت میں رائج تھی اسی تناسب سے فردوسی کے ہاں بھی ملتی ہیں اس لیے اس بارہ میں فردوسی کوئی استثنا قائم نہیں کرتا ہے بلکہ قاعدہ اس کے برعکس یوسف زلیخا میں عربی لغات کا استعمال ایک ضروری حد تک افراط کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اگر واقعی فردوسی اس نظم کا مالک ہے تو دشوار معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس طرز رائج الوقت کو جو ساٹھ ستر ہزار ابیات لکھنے کے بعد اس کی طبیعت میں بمنزلہ طبیعت ثانیہ جاگزیں ہو چکی ہوگی نغمۂ خارج از آہنگ سمجھ کر جدید روش اختیار کرتا جو کسی صورت میں نقش اول سے مستوجب ترجیح نہیں بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو ناقص کمزور اور غیر مستقل ہے۔

فردوسی کے ہاں برخلاف دیگر اساتذہ کے اظہار مطالب میں تنوع بوقلمونی اور رنگا رنگی نہایت محدود پیمانے پر ملتی ہے۔ جب کوئی خاص خیال اس کو بار بار ادا کرنا ہوتا ہے تو دو چار مرتبہ مختلف پیرایوں میں اظہار کے بعد اس کی قوت معنی آفرینی ختم ہو جاتی ہے اور آیندہ اس خیال کے ادا کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ وہی پرانا پیرایہ کسی قدر

تبدل اور تغیر کے ساتھ یا بعینہٖ اسی شکل میں اختیار کرلے اس لیئے تکرار شاہنامہ کی دل کش چہرہ کا نہایت بدنما خال ہے یہ نقص زیادہ تر اس عصر کی زبان کی نادری اور افلاس کی بنا پر ہے لیکن مثنوی یوسف زلیخا میں یہ خامی ایک بڑی حد تک غیر حاضر ہے۔

یوسف زلیخا کے مقدمہ میں فردوسی گویا ہے کہ میں نے اکثر داستانیں اور پرانے قصّے نظم کیئے ہیں جن میں رزم بزم، دوستی عداوت بلندی اور پستی سے بحث کی گئی ہے عشاق کے حالات لکھے (معشوقوں کا تذکرہ کیا) قصہ مختصر ہر قسم کی نظم لکھی۔ ان مشغلوں سے اگرچہ دل کو فرحت حاصل ہوئی لیکن واقع میں میں نے تکلیف اور گناہ کی کشت کاری کی جس سے پشیمان ہوں۔ دل اور زبان پر سکوت کی گرہ دیتا ہوں آیندہ جھوٹے افسانے لکھ کر رنج اور معصیت کی تخم ریزی نہیں کرونگا اس لیئے کہ میرے بال اب سفید ہو چکے۔ فریدوں سے سیر ہوں مجکو کیا نفع اگر ضحاک تازی کا تخت اس نے چھینا۔ کیقباد اور اس کی مملکت سے دل گیر ہوں اور تخت کیکاؤس برباد ہو چکا ہے۔ کیخسرو اور افراسیاب کی داستانیں لکھنے سے عذاب کے سوا اور کوئی پاداش نہیں مل سکتی۔ میری اس حماقت پر جس میں نصف عمر کھو کر رستم کا نام زندہ کیا اگر عقلا ہنسیں تو موزوں ہے۔ سہراب اور اسفندیار سے دل خستہ ہوں کیوں کہ میری شمشاد نما قد پر اب سوسن زار کھل آیا ہے۔ زمانہ نے میرے چہرے سے مشک چرا کر اس کی بجاے کافور خشک چھڑک دیا ہے۔ باز سفید نے یکایک آکر میرے کوّوں کو جان سے مایوس کر دیا ہے یہ باز میرے باغ میں اوّل اِدھر اُدھر اُڑتا پھرا پھر زاغ کی نشست گاہ کو اس نے اپنی مستقل قیام گاہ بنا لیا وہ کچھ ایسا جم کر بیٹھا ہے کہ کبھی نہیں اُڑیگا۔ میرا خیال تھا کہ باز زاغ کی خاطر آیا لیکن میں کیوں اپنے آپ کو شبہ میں رکھوں اس کا صید زاغ نہیں ہے بلکہ میں خود ہوں۔ اب مجکو دنیا کے اشغال سے دل اُٹھا کر اپنی تدبیر کرنا چاہیئے دیوانوں اور نادانوں کا رویّہ ترک کر کے عقلمندوں کا شعار اختیار کرتا ہوں اور بقیۃ العمر بجز نیکی اور راہِ راست پر گام زن ہونے کے کسی اور راستہ پر قدم فرسائی نہیں کرونگا۔ داستانِ ملوک لکھنے سے توبہ کرتا ہوں اُن کے دربار سے سیر ہو چکا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ آیندہ لغو اور فضول داستانیں ہرگز نہیں لکھونگا کیونکہ وہ قطعی غلط ہیں مستقبل میں انبیاء کرام کے قصص لکھونگا اس لیئے کہ ان کی اصل صدق پر مبنی ہے (ص ۱۴-۱۵)

اِس بیان سے ظاہر ہے کہ فردوسی تائب ہو کر زندگی کا ایک نیا ورق لوٹتا ہے وہ اپنے اِس حصۂ عمر سے جو

شاہ نامہ کی خدمت میں صرف کیا ہی پشیماں ہی۔ آستان ملوک اور دنیا کے اشغال سے بیزار ہو چکا ہی۔ چنانچہ اشعار

کنوں چارۂ بایدم ساختن — دل از کارِ گیتی بپرداختن
گرفتن یکے راہ فرزانگاں — نہ رفتن بہ آیینِ دیوانگاں
سر از راہِ داد ار و نہ برتافتم — کہ کم شد ز من عمر و غم یافتم
کنوں گر مرا روز چندی بقاست — دگر نسپرم جز ہمہ راہِ راست
نہ گویم دگر داستانِ ملوک — دلم سیر شد ز آستانِ ملوک — ص ۱۵

آخری شعر سے کم سے کم اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہی کہ یہ مثنوی کسی والی امیر یا پادشاہ کے واسطے نہیں لکھی ہی بلکہ مذہبی اثرات سے اثر پذیر ہو کر شاعر نے ایک دینی خدمت انجام دینے کی غرض سے لکھی ہی ؂

نہ گویم سخنہائے بیہودہ ہیچ — بہ بیہودہ گفتن نہ گیرم بسیچ
چہ باشد سخنہائے پرساختہ — شب و روز اندیشہ پرداختہ
ز پیغمبراں گفت باید سخن — کہ جز راستی شاں نہ ہند بیخ و بن — ص ۱۵

لیکن اب وقت آگیا ہی کہ ان بیانات کی صحت کا امتحان کیا جائے۔ فردوسی بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہوگا جب اِس نے زلیخا میں لکھا ہی ؂

بریں نیز گر بخندد خرد — ز من خود کجا کے پسندد خرد
کہ یک نیمہ از عمر خود گم کنم — جہانے پُر از نامِ رُستم کنم — ص ۱۴

پُور زال سے فردوسی کی بغاوت کے قصہ پر ہمارے کان مشکل سے یقین کر سکتے ہیں اِسی رستم کے لیئے شاہ نامہ میں کہتا ہی ؂

جہاں آفریں تا جہاں آفرید — سوارے چو رستم نیامد پدید

کسی دوسرے مقام پر گویا ہی ؂

کسے را کہ رستم بود پہلواں — سزد گر بماند ہمیشہ جواں

شاہ نامہ کی نظم کے وقت فردوسی ان داستانوں نے کے لیئے گویا ہی کہ تم ان کو دروغ اور افسانہ مت

جانو اور واقعات کی رفتار کو اپنی زمانہ کی معیار کے مطابق قیاس نہ کرو جو باتیں قرینِ عقل ہوں اُن کو باور کرو باقی کی ترجمانی رمز اور ایما کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ شاہ نامہ ؎

تو ایں را دروغ و فسانہ مداں — بیکساں روشن در زمانہ مداں

ازو ہر چہ اندر خورد با خرد — دگر بر رہ رمز و معنی برد

اساطیر عجمیہ کی نسبت شاعر کا یہ نقطۂ نظر معقولیت کا پہلو لیے ہوئے ہے لیکن زلیخا میں غیر ضروری سختی کے ساتھ قائل ہے ؎

کہ آں داستانہا دروغ است پاک — دو صد زاں نیرزد بیک مشت خاک

چہ باشد سخنہائے پُرساختہ — شبے روز زاندیشہ پرداختہ   ص ۱۵

یہ عام تکذیب اور تردید پہلے نقطۂ نظر کے مقابلہ میں نہ صرف غیر منصفانہ بلکہ معاندانہ ہے کیوں کہ شاہ نامہ کا وہ حصہ جو ساسانی بادشاہوں کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے حقیقت میں صحیح تاریخ ہے اور نہ افسانہ اس کو "دروغ پاک" یا "سخنہاے پرساختہ" جو محض تخیل کی امداد سے بنالیے گئے ہوں کہنا ایک صریح زبردستی اور ظلم ہے۔

فردوسی کو شاہ نامہ میں اپنی تصنیف پر ایک غیر معمولی فخر اور غرور تھا تمثیلاً سلطان محمود کو خطاب کرکے فخریہ لہجہ میں یہ غیر فانی ابیات لکھتا ہے ؎

یکے بندگی کردم اے شہریار — کہ ماند زمن در جہاں یادگار

بناہائے آباد گردد خراب — ز باراں و از تابشِ آفتاب

بنا کردم از نظم کاخے بلند — کہ از باد و باراں نیابد گزند   (جلد دوم ص ۲۴۵)

کسی اور موقع پر یہی جوشِ مفاخرت یوں ادا ہوا ہے ؎

بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم گرم کردم بدیں پارسی   (خاتمۂ شاہ نامہ قلمی ص ۵۰۲)

لیکن جب توبۂ نصوح سے ذوق یاب ہو چکا ہے تو خیالات میں ایک انقلابِ عظیم مشاہدہ کیا جاتا ہے چنانچہ زلیخا ابیات

ازاں تخم کشتن پشیماں شدم — زبان او دل را گرہ برزدم

نگویم کنوں نامہائے دروغ — سخن را ازگفتار ندہم فروغ   ص ۱۴

ہم اُن دعاوے پر صدق دل سے ایمان نہیں لا سکتے کیونکہ عمر بھر عجم اور صنادید عجم کی پرستاری میں مصروف رہ کر آخری ایام میں فردوسی کے لئے زندگی کا ایک نیا ورق انبیا د کرام کی خدمت گزاری کے لئے لوٹنا تمام واقعات اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہے اور بقولِ شاعر ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

لیکن ذیل کے اشعار ہیں جو زیادہ تر ہم کو محوِ حیرت و استعجاب کرتے ہیں۔

نگارم کنوں تخم رنج و گناہ — کہ آمد سپیدی بجائے سیاہ (زلیخا ص ۱۴)

دیگر

زمن دست گیتی بدزدید شک — بجایش پراگندہ کافور خشک
برآمد زناگاہ باز سفید — گسستند زاغانم از جاں اُمید
زمانے ہمی گشت زاغ از باغ — سرانجام بنشست بر جائے زاغ
نہ بنشستنے کش پریدن بود — نہ پیوستنے کش بریدن بود (زلیخا ص ۱۴)

دیگر

پر از خاکِ شمشاد بود از نخست — کنوں برکراں سوسنِ تازہ رست (زلیخا: ص ۱۴)

ان اشعار کا خلاصہ اسی قدر ہے کہ ہمارا شاعر بوڑھا ہو گیا ہے اور اس کے بال سفید ہو گئے۔ شاعر کے طرزِ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر میں یہ انقلاب یعنی پیری کی آمد اور بالوں کا سفید ہونا ایک تازہ واقعہ ہے جو مصرع "کنوں برکراں سوسنِ تازہ رست" سے صاف ظاہر ہے۔

ہم شاہ نامہ میں بھی فردوسی کو بعض اوقات اپنی پیری کی شکایت میں مصروف دیکھتے ہیں مثلاً ذیل کے اشعار ؎

من از شصت و شش سست گشتم چو مست — بجائے عنانم عصا شد بدست
رخ لالہ گوں گشت بر سان کاہ — چو کافور شد رنگ ریشِ سیاہ

ز پیری خم آورد بالائے راست ٭ ہم از نرگسان روشنائی بکاست (جلد دوم ص ۲۴۴)

دیگر

دو گوش و دو پائے من آہو گرفت ٭ تہیدستی و سال نیرو گرفت (جلد سوم ص ۴۵)

دیگر

دو تائے شد آں سرو نازان بباغ ٭ ہماں تیرہ گشت آں فروزاں چراغ
پُر از برف شد کوہسار سیاہ ٭ ہمی لشکر از شاہ بیند گناہ (جلد سوم ص ۷۰)

دیگر

چو شصت و سہ سالم شد و گوش کر ٭ ز گیتی چرا جویم آئین و فر (جلد سوم ص ۱۰۳)

دیگر

مرا در خوشِ آب سستی گرفت ٭ ہماں سرو آزاد پستی گرفت
خروشاں شد ایں نرگسانِ دژم ٭ ہمی گرد داز سستی و رنج و نم
چل و ہشت بد عہدِ نوشیرواں ٭ تو بر شصت رفتی نمانی جواں

(خاتمۂ جلد سوم صفحہ ۱۴۵ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

اِن متفرق اشعار سے جو اوپر منقول ہیں اور شاعر نے اپنے ساٹھ اور چھیاسٹھ سال کی عمر کے درمیان میں لکھی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر شاہ نامہ کے دورانِ تصنیف میں ہی بالکل ضعیف اور بوڑھا ہو چکا تھا نہ صرف اس کے بال سفید ہو چکے ہیں جو منازل پیری میں اوّلین منزل ہے بلکہ بصارت بالکل ضعیف ہو چکی ہے۔ پیری سے قد خم ہو گیا اور کمر جھک گئی۔ دست و پا میں رعشہ نمودار ہے اور عصا کی مساعدت کے بغیر نقل و حرکت دشوار ہے۔ دانت گر چکے اور کانوں سے اپنے عمر کے تریسٹھویں سال ہی سے بہرا ہو گیا ہے۔ جب شاہ نامہ ختم ہو چکا ہے وہ قریبًا اسّی سال کا ہو چکا تھا مصرع (کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد) وہ خود معترف ہے۔

اگر مثنوی زلیخا فردوسی نے لکھی ہے تو ظاہر ہے کہ اس عمر کے بعد لکھی ہوگی اور شاہ نامہ کے بعد لکھی جانے کا خود اس تصنیف کو اعتراف ہے اگر یہ صورت ہے تو یوسف زلیخا میں اس اسّی بیاسی سال کے بوڑھے کو استیلائے

پیری سے جو شکایت ہی تو اسی قدر ہی کہ مصرع کہ آمد سپیدی بجاے سیاہ پیری کی اس قسم کی شکایت پچاس پچپن سالہ بوڑھے کی زبان پر بھلی معلوم ہوتی ہی نہ اسّی بچاسی برس کے پیر فرتوت کے مُنھ پر۔ تعجب ہی کہ یہ پیر ضعیف یوسف زلیخا میں پیری کی موجودگی سے اپنے میں یہ انقلاب دکھیتا ہی کہ اس کے بال سفید ہوگئے اِسی مطلب کو شاعرانہ پیرایہ میں ظاہر کیا تو کہا کہ مشک کافور بن گیا اور جدت دکھانا چاہی تو کہا کہ سیاہ زاغ کی بجائے سفید باز نمودار ہوگیا اِس کے علاوہ وہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

اِس موقع پر اُصول تنقید ہم سے کہتے ہیں کہ یہ الفاظ فردوسی کے نہیں ہیں بلکہ کسی اجنبی کے جو مداح ہونے کی حیثیت سے فردوسی کو اسلامی دنیا میں مقبول بنانے کی غرض سے اس تصنیف کا ذمہ دار ہی لیکن چونکہ فردوسی کا ہم عہد اور ہمعصر نہیں ہی اور نہ زیادہ واقفیت رکھتا ہی اس لیئے شاعر کی عمر کے اندازہ کرنے میں غلطی کا مرتکب ہوگیا ہی۔

شہادتِ کلام یہ اوپر دکھایا جا چکا ہی کہ واقعاتی شہادت کی رو سے کتاب یوسف زلیخا فردوسی کی تسلیم نہیں کی جا سکتی یہاں اسی مقصد کے لیئے کسی اور پہلو سے بحث کی جاتی ہی۔ اس سے ہمارا مقصد شہادتِ کلام ہی۔ شہادتِ کلام ہمارے پاس ایک ایسا زبردست آلہ ہی جس کی رہنمائی میں ہم ایک یقینی اور قطعی فیصلہ کرنے کے قابل ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ امتداد زمانہ اور انقضائے ایام کے ساتھ ساتھ ہر زبان میں تغیّرات واقع ہوتے ہیں سیاسی انقلاب جس طرح قوموں کی مستقبل کی تاریخ بدل دیتے ہیں اسی طرح زبان کا مستقبل بھی ان تغیرات سے محفوظ نہیں رہتا۔ ہر وقت اور ہر عصر کی زبان میں ایک نوعیت کی خصوصیت مشاہدہ کی جاتی ہی جو اُس کو دوسرے ازمنہ کی زبان سے ممیّز کرتی ہی۔ جوں جوں ایک قوم تمدّن اور معشرت کے مدارج میں ارتقا حاصل کرتی ہی اُس کو نئی ضروریات قدم قدم پر لاحق ہوتی ہیں، نئی ضروریات نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات ایجاد کرتی ہیں اور جس طرح ہم پرانا لباس بدن سے اتار کر پھینک دیتے ہیں اسی طرح مندرس اور پارینہ الفاظ ایک فرسودہ سکہ کی طرح ٹکسال سے خارج کردیئے جاتے ہیں۔ زبان کی نبض شناسی کے لیئے لازمی ہی کہ ہم اُس کے تغیر و تبدل کی تاریخ اور الفاظ کے حقائق زیست و ممات سے بالکلیہ واقف ہوں۔

ایک اور اُصول ہے جس کا علم ہر محقق کے لئے ضروری ہے انسان جس طرح شکل صُورت رنگ و لون اخلاق طبائع اور مذاق میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح اظہارِ خیالات اور اداے مطالب میں ایک دوسرے سے منفرد ہیں تمثیلاً اگر ایک عہد کے دو انشا پرداز لیئے جائیں جو ایک ہی مضمون پر طبع آزمائی کررہے ہیں تو ہم دیکھینگے کہ ان میں اداے مضمون انتخابِ الفاظ اور اسلوب کلام میں نمایاں تفاوت ہوگا باوجود اس اختلاف کے ان دونو معاصرین کی تحریرات میں ایک مماثلت قریبہ بھی مشاہدہ کی جائیگی جو باوجوہ معاصرت دونوں میں عام ہے کیوں کہ ہر چیز پر خواہ وہ مصنوعات دماغی سے تعلق رکھے یا مصنوعات دستی سے زمانہ اپنا داغ ضرور چھوڑتا ہے اور وہ خاتم جس کو ایام نے کسی چیز پر ثبت کیا ہے اس کے نقوشِ نگیں کو کوئی ہاتھ نہیں مٹا سکتا۔ اِس خصوصیت کو اسالیب ایّامی کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔

علیٰ ہذا بعض خصوصیات اس قسم کی ہیں جو کسی خطّۂ ملک میں رائج ہیں اگر مصنف اِسی حصّۂ ملک کا باشندہ ہے تو یہ مقامی خصوصیت اِس کے کلام میں بھی پائی جاویگی مثلاً ہم شاہ نامہ میں دیکھتے ہیں کہ فردوسی نانبائی کو نانوا، ساربان کو ساروان اور برزیگر کو ورزیگر اور پیش باز کو پیش واز لکھتا ہے۔ اس سے ہم یہ قیاس مرتب کرنے میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں کہ فردوسی اور اس کے ہم وطنوں میں یہ الفاظ بائے ابجد کو واو ہوز سے بدل کر تلفظ کئے جاتے تھے اس خصوصیت کا نام اسالیب مقامی رکھا جاسکتا ہے۔

ہمیں یہ بھی یاد رہے کہ ہر مصنف خواہ وہ کسی پایہ کا کیوں نہ ہو الفاظ کا ایک خاص ذخیرہ رکھتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنے مطالب ادا کرتا ہے۔ اس ذخیرہ میں بعض الفاظ ترکیبات محاورات کنایات، تشبیہات، توصیفات اور استعارات اِس قسم کے ہونگے جو مُصنّف کے نزدیک زیادہ مقبول اور مطبوع ہونگے اس بنا پر ان کا استعمال بالارادہ یا بلاارادہ تحریر میں زیادہ کریگا کیوں کہ وہ اِس کے روزمرّہ میں داخل ہوچکے ہیں اور یہ سرمایہ اس کی تحریر کا اسلوبِ خصوصی ہے۔

جس طرح ایک مصوّر کسی شخص کی تصویر میں اس کی ظاہری شکل و صورت اور خط و خال رنگوں کے ذریعہ سے دکھا سکتا ہے اسی طرح ایک منتقد کسی مصنف کی ان تمام خصائص کی جو اس کی تصنیف کے مخصوصی خط و خال ہیں سُراغ رسانی کرسکتا ہے اور اس سے ہم کو انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ کسی شاعر کا قول ہے ؎

ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانۂ
ہست فرد دفتر احوال صاحب خانۂ

جب صاحب بصیرت کے نزدیک ایک خشت دفتر احوال کی ایک فرد ہے تو ایک کتاب جو مصنف کے دل و دماغ کا عکس خیالات معلومات اور معقولات کا آئینہ ہے اور جس میں اس نے اپنی شخصیت کی تمثال کو الفاظ کے جامہ میں یادگار چھوڑا ہے نظر امعان میں اس صاحب تصنیف کی ہستی کو مشخص اور اس کے وجود کو دوسرے افراد سے جدا گانہ شخصیت تسلیم کروانے کے لئے کیا کافی مواد اور ذخیرہ نہیں ہو سکتی جس کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر فقرہ حقیقت میں بجائے خود ایک تاریخ ہے؟

جب ایک ماہر آثار قدیمہ کسی شکستہ و ریختہ عمارت پر نظر ڈال کر اس کے عمومی وضع محرابوں کی ہیئت گنبدوں کی ساخت ستونوں کی نقاشی و نقاری چھت اور دیواروں کی گلکاری اور نقش و نگار سے اس کی تعمیر کا صحیح زمانہ قائم کر سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک محقق کسی کتاب کے مقالات کنایات اور محاورات کو دیکھ کر اس کے عہد تولید کا سراغ نہ لگا سکے۔

قصہ مختصر شہادت کلام سے استفادہ کی خاطر ہم کو اس نظر سے یوسف زلیخا کا مطالعہ کرنا ہوگا جس کا مختصر سا خاکہ اوپر دیتے ہیں۔ سب سے مقدم زلیخا کی مخصوصی خط و خال دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور حتی الامکان شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

اس مضمون کے دوران میں یوسف زلیخا اور شاہنامہ کے جن نسخوں سے میں نے کام لیا ہے وہ ذیل کے مطابع سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) یوسف زلیخائے حکیم فردوسی مصور۔ طبع ایران۔ دار الطباعہ خاصہ مدرسہ مبارکہ دار الفنون طہران ۱۲۹۹ھ

(۲) شاہنامہ فردوسی۔ طبع میرزا محمد باقر بمبئی ۱۲۷۵ھ ہجری

اسالیب خصوصی گوش داشتن۔ بمعنی گوش کردن و متوجہ شدن و کنایہ از نگہ داشت و حفاظت۔ شاہنامہ میں پہلے معنوں میں عام طور پر رائج ہے۔

ذیل میں چند امثال مرقوم ہیں - شاہ نامہ :-

(۱) گشتاسپ گفت ای پسر گوش دار | کہ تندی نہ خوب آید از شہریار | (جلد دوم ص ۲۰۹)

(۲) کہ اے مادرِ مہرباں گوش دار | کہ ما بے گناہیم زیں کارزار | (جلد چہارم ص ۳۳)

(۳) بدیں گفت من گوش داریدپاک | روا تر مخواہید جائے مغاک | (جلد سوم ص ۶۰)

(۴) باندازِ من سر بسر گوش دار | پذیرندہ باش و بدل ہوش دار | (جلد سوم ص ۵۸)

اِن امثال میں نگہداشت کے معنی دیتا ہے :-

(۵) سلاحِ سوارانِ جنگی بپوش | بجان و تنِ خویشتن دار گوش | (جلد اول ص ۱۵۶)

(۶) تبد با بتہ اشکش تیز ہوش | کہ دارد سپہ را بہر جائے گوش | (جلد دوم ص ۲۱۷)

لیکن اس شعر میں منتظر رہنے کے معنوں میں آیا ہے :-

(۷) نباید کہ جوید کسے جنگ و جوش | برہام گودرز دارید گوش | (جلد دوم ص ۲۵۰)

گزشتہ دو امثال کے سوا گوش داشتن شاہ نامہ میں حفاظت کے معنی نہیں دیتا - زلیخا میں وہ کنایہ بن کر

عام طور پر حفاظت اور نگہداشت کے معنی دیتا ہے - زلیخا - امثال :-

(۱) نباید درا چوں شما گوش دار | کہ خود گوش دارد درا کردگار | (ص ۱۷۰)

(۲) کہ او را بجاں گوش داریم پاک | بجان و دل و دیدہ داریم باک | (ص ۴۸)

(۳) گر ایزد بدیں نو بہ یاری کند | تر او مرا گوش داری کند | (ص ۹۰)

(۴) من این پیرہن گوش دارم کنوں | نشویم زروے ہر گز ایں تیرہ خوں | (ص ۶۶)

نظامی | بزرگاں درآں حال دارند گوش | دگر نہ ز دل پائدارو نہ گوش | (سکندر نامہ بحری ص ۳۰۵ مطبع نولکشور)

سعدی | ہمہ سنگھا گوش دار اے پسر | کہ لعل از جہانش نباشد بدر | (ص ۱۶۰ بوستان مطبع فاؤلم)

مرزبان نامہ "گفت اے ہدہد ایں جا کہ نشستہ گوش بخود دار و متیقظ باش کہ ایں جا

کمیں گاہ یغمائیان قفاست" (ص ۱۱۱ مطبوعہ بریل ۱۹۰۹ء)

اس مطالعہ سے ہم کو اس قدر علم ہوا - کہ فردوسی جب کہ اس کنایہ کا عادی نہیں ہے صاحب زلیخا کے ہاں

وہ روزمرہ بن کر بالعموم مستعمل ہے۔ گوش داشتن کوئی ایسا کنایہ معلوم نہیں ہوتا جو اساتذہ کے ہاں مقبول ہو۔ سنائی کے ہاں جب کہ حدیقہ میں مطلق غیر حاضر ہے۔ نظامی اور سعدی کے ہاں صرف ایک ایک مثال میں ملتا ہے۔

گرہ برزدن یہ محاورہ شاہنامہ میں اس کے لغوی معنوں میں ملتا ہے۔ شعر

دو دست از پس پشت بستش چو سنگ — گرہ زد گردنش برپالہنگ (جلد سوم ص ۱۸)

اسدی — برآمیخت خرطوم پیل از زرہ — بپیچید چون رشتہ برزد گرہ

(ص ۳۳ گرشاسپ نامہ طبع آقا محمد شیرازی ۱۳۱۴ء)

یوسف زلیخا میں وہ کنایہ بن کر خاموش ہونے کے معنی دیتا ہے:- امثال از زلیخا ؎

(۱) از آں تخم کشتن پشیماں شدم — زباں او دل اگرہ برزدم (ص ۱۴)

(۲) چو شمعوں بپرداخت ایں داستاں — زباں را گرہ زد ہم اندر زماں (ص ۱۶۵)

(۳) ولیکن تو گفتی بعمدا کسے — ہمی برزبانم گرہ زد بسے (ص ۱۲۲)

گماں زدن۔ بمعنی گماں کردن یہ زلیخا کی شان خصوصیت ہے کہ اس میں گمان زدن ملتا ہے فردوسی شاہنامہ میں اس سے ناواقف ہے امثال از زلیخا ؎

(۱) تو گفتی ہمی زد دلش را گماں — کہ آید بلا ہا زماں تا زماں (ص ۴۸)

(۲) گماں زد دلم اے شہ کامیاب — کہ بنویسی آں نامہ ام را جواب (ص ۱۹۰)

(۳) گہش دل براں ساں ہمی زد گماں — کہ دے را بکشتند جائے نہاں (ص ۶۸)

(۴) گماں زد دل پاک دے کیں پسر — زبیکان شایستہ دارد گہر (ص ۹۵)

فردوسی ایسے موقعوں پر گماں کردن اور گماں بردن لاتا ہے جو زلیخا میں بھی آتی ہیں۔

دل برگماردن۔ شاہنامہ میں غیر مستعمل ہے اور زلیخا سے امثال ذیل ؎

(۱) ایا مادر مہربان زینہار — یکے گوش و دل را بمن برگمار (ص ۸۳)

(۲) کنوں گوش بر حال یعقوب دار — زمانے دل و ہوش دل برگمار (ص ۶۴)

(۳) بدو گفت کاے پرہنر شہریار — دمے دل بریں داستاں برگمار (ص ۱۵۴)

(۴) ایا اے پدر دل بریں برگمار | تامل کن اندر نہان و آشکار | (ص ۱۹۱)

فردوسی ایسے موقعوں پر نگہ کن - بژرفی نگہ کن - گوش دار یا بپن بکشاے گوش لاتا ہے۔

آئین بستن - زلیخا میں رائج ہے۔ امثال ؎

(۱) بہ بستند آئینِ بازارہا | ہمہ شہر شد ہمچو گلزارہا | (ص ۲۱۰)

(۲) چو آئینہا بستہ شد در سرائے | تو گم بد سرا از بہشتِ خدائے | (ص ۲۲۲)

شاہنامہ میں اس کے بجائے آذین بستن کا رواج زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ شاہنامہ ؎

(۱) چو نزدیک شہر اندر آمد سپاہ | بہ بستند آذین بپیراہ و راہ | (جلد دوم ص ۲۶۳)

(۲) بہ بستند آذین بشہر و براہ | ہمہ برزن و کوے و بازارگاہ | (جلد دوم ص ۲۶۶)

(۳) بہ بستند آذین بشہر اندروں | پُر از خندہ لبہا و دل پُر زخون | (جلد سوم ص ۶۱)

(۴) بہ بستند آذین بشہر و براہ | کہ شاہ آمد از دشت نخچیرگاہ | (جلد چہارم ص ۱۰۴)

(۵) بہ بستند آذین بشہر و براہ | درم ریختند از بر تخت شاہ | (جلد چہارم ص ۲۳)

گرمی نمودن - گرم جوشی کا اظہار کرنا شاہنامہ سے یہ محاورہ مفقود ہے۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) بشد مرد بسیار گرمی نمود | بجا آورید آنچہ فرمودہ بود | (ص ۱۶۱)

(۲) ہزاران لطف کرد و گرمی نمود | ابر مہر دوشین فراوان فزود | (ص ۲۶)

(۳) فراوان بہ پرسید و گرمی نمود | دلش را بدو مہربانی فزود | (ص ۲۱۸)

صورت بستن شاہنامہ میں نہیں ملتا زلیخا سے یہ امثال ؎

(۱) خریدش البت صورت عزیز | بچنداں کہ بودش ز ہر نوع چیز | (ص ۹۴)

(۲) مکن اے پدر صورت بد بلند | زما بر برادر نباید گزند | (ص ۱۴۱)

(۳) کہ صورت ہمی بندم اندر میاں | کہ ہست آں دلارام من در جہاں | (ص ۱۹۰)

قابوس نامہ "ولیکن من چنداں کہ صورت بندد بگویم و ساماں ہر یک بتو نمایم"
(باب سی ویکم در طالب علمی و فقیہی ص ۱۴۲ طبع ایران)

مرزبان نامہ "و بوقت گزشتن ازیں منزل انقطاع و جدائی او صورت نہ بندد"
(باب سوم داستان ملک اردشیر و دانائے مہران بہ ص ۲۰)

تخت زدن زلیخا میں عموماً مستعمل ہے اور تمام شاہنامہ میں صرف ایک مقام پر ملتا ہے امثال از زلیخا ؎

(۱) میاں جائے میدان دہ تختِ زر — عزیزا ز سرِ تخت با تاج زر (ص ۹۱)

(۲) زدندے یکے تختِ زرّیں ایل — نشستی برآں یوسفِ کامراں (ص ۱۶۰)

(۳) یکے تختِ زرّیں میانش زدہ — سرِ پایۂ آں تخت بر مہ زدہ (ص ۱۶۸)

(۴) زدن تختِ زرّیں گوہر فگند — قد مہاشش چوں قدر شاہاں بلند (ص ۱۷۴)

شاہنامہ میانِ سراپردہ تختے زدہ — ستادہ غلاماں بہ پیشش زدہ (جلد اول ص ۹۳)

اسدی یکے تخت پیروزہ ہمرنگ نیل — زدہ پیش تخت ایستادہ دو پیل
(گرشاسپ نامہ ص ۳۰ طبع آقا محمد شیرازی ۱۳۱۵ھ)

کلّہ زدن باثانی مشدد سقف و پردہ زدن شاہنامہ میں نہیں ملتا اور زلیخا میں ملتا ہے امثال از زلیخا

(۱) زدہ کلّہ و تاجِ گوہر نگار — برآئیں درآویختہ شاہوار (ص ۱۷۶)

(۲) زدہ کلّہ بالائے شاہانہ تخت — نشستہ برو یوسفِ نیک بخت (ص ۲۲۲)

اگرچہ شاہنامہ اس محاورہ سے نابلد ہے اسدی کے ہاں ملتا ہے چنانچہ ؎

(۱) رسیدند زے آبگیرے فراز — زدہ کلّہ زربفت از وے فراز (گرشاسپ نامہ ص ۱۴)

(۲) زدہ کلّہ برگشتہ کرگس ز ابر — طمع کردہ روبہ بخونِ ہزبر (ص ۶۴)

مسعود سعد سلمان بدرّ و گوہر آراستہ پدید آمد ع چو نو عروسے در کلّۂ از میاں
حجاب حکیم سنائی غزنوی ؎

دستِ انصاف تا تو بکشادی — ایں جہاں بست کلّۂ شادی (حدیقہ ص ۹۹ مطبع نولکشور)

عتاب برداشتن شاہنامہ سے غیر حاضر ہے اور زلیخا سے یہ امثال ؎

(۱) چنیں گفت یوسف علیہ السلام — کہ برداشتیم آں عتاب و کلام (ص ۲۰۲)

(۲) شنیدم کہ یوسف سبک خواست اُو — چو برداشت او آن عتاب از میان (ص ۲۰۳)

غریویدن لغات میں شور و غوغا نیز فریاد کے معنوں میں مستعمل ہے زلیخا میں مطلق رونے کے معنوں میں مستعمل ہے امثال از زلیخا ؎

(۱) بہر دلش تنگ در بر گرفت — وزاں پس غریویدن اندر گرفت (ص ۵۰)

(۲) زمانے غریوید و بارید خوں — بر آں پیر بیچن دینار گوں (ص ۲۱۸)

(۳) پس آمد غریوان بہ بنگاہ باز — دلش بے شکیب و تنش در گداز (ص ۵۲)

(۴) غریویدن آں فرزاں چراغ — ہمی کرد یعقوب را دل بداغ (ص ۳۰)

(۵) فراواں غریوید و نالید زار — ازاں خواب و اثر وزۂ نابکار (ص ۴۳)

(۶) غریویدن وزاری اندر گرفت — زہر گونہ نوحہا بر گرفت (ص ۵۰)

(۷) غریوید یوسف دگر بارہ زار — بغلطید بر خاکِ رہ زار و خوار (ص ۵۹)

یاد رہے کہ صاحب یوسف زلیخا اِس لفظ کا بہت مشتاق معلوم ہوتا ہے اور اسی لیئے اس کا استعمال کثرت کے ساتھ کرتا ہے۔ شاہنامہ میں وہ اوّل تو قلّت کے ساتھ ملتا ہے اور اگر ملتا ہے تو محض شور للکار یا فریاد کے معنی دیتا ہے۔ امثال شاہنامہ سے

(۱) غریویدنِ مرد و غرندہ کوس — ہمی کرد بر رعد غرّاں فسوس (ص ۶۰، جلد اول)

(۲) غریویدن آمد ز توراں سپاہ — ز سر بر گرفتند گرداں کلاہ (ص ۲۲۰، جلد دوم)

(۳) وزاں پس ز ہم رستے برگاشتند — غریویدن و بانگ برداشتند (ص ۲۳۶، ")

(۴) سبک دشتباں گوشہا بر گرفت — غریواں از و ماند اندر شگفت (ص ۶۸، جلد اوّل)

افعالِ متعدّی بیک مفعول

زلیخا کی ایک خصوصی شان یہ ہے کہ اس میں بعض افعال جو عموماً متعدی بیک مفعول لائے جاتے ہیں متعدّی بدو مفعول باندھے گئے ہیں بعض تمثیلیں یہاں درج ہیں۔

پوشیدن بمعنی جامہ پوشانیدن زلیخا میں امثال ؎

(۱) بپوشید آں جامہ فرزند را بشانہ زد آں موئے دلبند را (ص ۵۱)

(۲) درو جامہ پوشید دیبائے دم کہ چون نقش مانی بدش نقش بوم (ص ۸۷)

لیکن شاہنامہ میں تن ڈھانکنے کے معنوں میں ایک مقام پر ملتا ہے ؎

تنش را یکے پہلوانے قبائے بپوشید و از کوہ بگزارد پائے (ص ۲۹) جلد اوّل

پرہیزیدن بجائے پرہیزانیدن زلیخا امثال ؎

(۱) کہ ایں بندہ را اندریں تعزیجا بپرہیزد از آب دارش نگاہ (ص ۶۲)

(۲) مکن یاد ہ نام و نشانِ مرا بپرہیز جان و روانِ مرا (ص ۱۱۵)

(۳) بپرہیز از اہرمن بیسرہم ہمی دار دست از بدی کوتہم (ص ۲۲۴)

شاہنامہ میں یہ صورت نامعلوم ہے۔

شنیدن بجائے شنوانیدن زلیخا ؎

(۱) بشک بود یعقوب فرخ سیر سرانجام پرسید زاں پرہنر
کہ یوسف چو بشنید پیغام خویش نشانیت بنمود زاندام خویش (ص ۱۰۶)

شاہنامہ میں یہ صورت نہیں ملتی۔

اسالیب مقامی

خرید و فروش بجائے خرید و فروخت۔ زلیخا شعر

بر بیناں خرید و فروش اوفتاد ستد یوسف آں درہا بداد (ص ۹۰)

فردوسی خرید و فروخت لاتا ہے شاہنامہ ؎

(۱) ہمی بود چندے خرید و فروخت بیاباں ز لشکر ہمی بر فروخت (ص ۲۲) جلد سوم

(۲) بُرا ز خورد و داد و خرید و فروخت تو گفتے زباں چشم ایشاں بدوخت (ص ۶۲) جلد دوم

قابوس نامہ "بندہ کہ ہر کارے فروخت خواہد از خرید و فروخت خویش عیب ندارد دل بروے منہ کہ از وے فلاح نیاید۔"

(باب بست و سیم در بندہ خریدن ص ۱۰۹)

سعدی بریدند ازاں جا خریدو فروخت زراعت نیا بد رعیّت بسوخت (بوستان ص۲، مطبع رفاہِ عام)

پرس بجائے پرسش زلیخا سے

چو یعقوب فرخ بہ پرس و درود ابا ابن یامیں سخن گفتہ بود (ص۲۰۹)

طلحہ مروزی چوں صبر رمیدہ شد پیام تو چہ سود جاں رفت ز پرسش و سلام تو چہ سود

شاہنامہ میں پرسش اگرچہ رائج ہے لیکن موجودہ صورت قطعی غیر حاضر ہے۔

بند وکشاے بجائے بند وکشاد یا بست وکشاد۔ شاہنامہ میں ان تینوں صورتوں میں سے ایک بھی نہیں ملی۔ پہلی صورت زلیخا میں ملتی ہے امثال سے

(۱) ز سختی و سُستی و بند وکشاے کہ دیدند پیغمبرانِ خدائے (ص۱۵)

(۲) تن و جاں سپردم بحکم خدائے بسختی و بہ بست و بہ بند وکشائے (ص۰)

(۳) چنیں تا بہ تقدیر بحکمِ خداے کہ بے حکم او نیست بند وکشائے (ص۲۲۲)

بند وکشاد کی مثال میں انوری کا شعر دیا جاتا ہے۔

زمانہ ملکے کز مہر خاتمش در ملک ہزار بند وکشاد و ہزار برگ ونواست

مثال بست وکشاد۔ مرزبان نامہ " کاہلی و خامی را خور سندی مخواں کہ نقش عالم حدوث در کارگاہ جبر وقدر چنیں بستہ اند کہ تا تو در بست وکشاد کار ہا میانِ جہد نہ بندی ترا ہیچ کار نکشاید۔"

دادخواہ یعنی دادپسندلے خدلئے تعالیٰ۔ اِن معنوں میں شاہنامہ میں نہیں ملتا زلیخا سے امثالِ ذیل سے

(۱) من اوّل خطا کردم لے دادخواہ مقدّم بداں کار زشت وگناہ (ص۲۱۶)

(۲) بداں پایگاہ و بدیں دستگاہ سپردی بمن نازش اے دادخواہ (")

(۳) ہمی ترسم از داورِ دادخواہ کہ ہرگز نیامرزدم زیں گناہ (ص۱۲۶)

شاہنامہ میں فریادی کے معنی دیتا ہے۔ امثال سے

(۱) ہمی راہ جویند نزدیک شاہ ز راہِ دراز آمدہ دادخواہ (ص۲۰۵، جلد دوم)

(۲) زخویشان کاموس چندیں سپاہ بہ نزدیک خاقاں شدہ دادخواہ ص ۱۸۹

خواربار لغات میں (برہان قاطع) اِس کے معنی خوراک اندک دیئے ہیں شاہنامہ میں اس لفظ کی تلاش بے سود ثابت ہوئی اس سے ظاہر ہے کہ فردوسی اس سے ناواقف تھا۔ عطا ابن یعقوب الکاتب جو قرن پنجم کے منصفِ دوم کا شاعر اور سلطان ابراہیم غزنوی کا مادح ہے لکھتا ہے کہ:۔

آں کہ نامش خوار بارہ وزیر بارش خلق خوار   خورد چوں دنداں ہا روکردہ شہری چوں سلیم

(لباب الالباب محمد عوفی۔ باب ششم ص ۵۵۔ طبع بریل)

بُرہان الاسلام تاج الدین عمر بن مسعود مقتول ۶۰۰؁ ہجری شعر

من خود عزیز بار نیم خوار بار گیر   آخر نہ گاہ بہ بود از خوار بار دور

(لباب، باب ہفتم ص ۱۵۰ حصہ اول)

زلیخا میں یہ لفظ روزمرہ کا حکم رکھتا ہے۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) دہم خوار بار و کنم نیکوئی   نہ گردم بہ گردِ درِ بدخوئی (ص ۱۹۹)

(۲) دہم تاں ازیں بیشتر خوار بار   گلِ سرخ تاں بشکفانم ز نار (ص ۱۶۶)

(۳) زکنعاں کشیدیم سختے جہاز   کزیں خوار بارست ما را نیاز (ص ۱۶۱)

(۴) یکے دانہ تاں ندہم از خوار بار   کنم تاں بروں از در مصر خوار (ص ۱۶۹)

(۵) خبر یافتیم از تو اے شہریار   کہ داری بمصر اندروں خوار بار (ص ۱۶۴)

اسالیبِ ایّامی

ملکت بمعنی مملکت فی زماننا متروک ہے شاہنامہ میں غیر رائج ہے اس لیئے قیاس یہی چاہتا ہے کہ سلجوقی دَور میں اس کا رواج پھیلا۔ اِس عہد کے شعرا منوچہری معزی عثمانی مختاری حکیم سنائی اور عمعق بخاری وغیرہ وغیرہ کے ہاں ملتا ہے۔ بعض امثال حوالۂ قلم ہیں ؎

منوچہری۔ آفتابِ ملکت سلطاں کہ دستِ جودِ او   خواہد او را کز میانِ خلق بے ہمتا کند

امیر معزی   مویدے کہ موید بد وست ملکت شاہ

حکیم سنائی   شاہ عادل نکو نیت دستور   ملکت آباد دست ظالم دُور (حدیقہ ص ۷۲، طبع نولکشور)

حدیقہ میں یہ شعر کثرت سے ملتا ہے۔ استاد عمعق بخاری ؂

"کنوں شد ایں مثل اے پادشاہ معلوم　　　بامتے کہ ہلاک ست دملکتے کہ ہباست"

(لباب۔ حصّۂ دوم۔ باب دہم ص ۱۸۵)

مثنوی یوسف زلیخا سے یہ مثال پیش ہے ؂

گرفتم دل از ملکتِ کیقباد　　　ہماں تخت کاؤس کے برد باد　(مقدمۂ زلیخا ص ۱۴)

غریو و غرنگ یا بالعکس معنی گریہ و زاری۔ شاہنامہ میں اس کا سراغ نہیں چلتا ؂

اسدی　　بگفت ایں و شد با غریو و غرنگ　　　بہ لالہ ز لولو ہمی شست رنگ

(ملحقات شاہنامہ ص ۵ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

ازرقی　　موافق تو کند در صعود و ناز و طرب　　　مخالف تو کند در نغاں غریو و غرنگ

(لباب الالباب۔ حصّۂ دوم باب دہم ص ۹۹)

زلیخا میں کئی مقام پر ملتا ہے۔ امثال از زلیخا ؂

(۱)　نہ شد کور آدم بچنداں درنگ　　　کہ بد سال و مہ با غریو و غرنگ　(ص ۴۲)

(۲)　شتابان شتر در بیاباں چو دیو　　　دلِ یوسف اندر غرنگ و غریو　(ص ۸۱)

(۳)　درا دید جفت غریو و غرنگ　　　نہ در دل شکیب و نہ در چہرہ رنگ　(ص ۱۲۰)

(۴)　کہ ایں نالہ و زاری از بہر چیست　　　غریو و غرنگ تو از بہر کیست　(")

(۵)　ہمہ روز بد با غریو و غرنگ　　　دلش تنگ و عالم بد و گشتہ تنگ　(ص ۱۱۶)

از بہر چیزے یا کسے را یہ ایک اور صورت ہے جس سے ہم شاہنامہ میں روشناس نہیں ہوئے اور زلیخا میں دو چار ہوتے ہیں۔ امثال از زلیخا ؂

(۱)　تو بپذیر از و یوسف خوب را　　　ہمی دار شں از بہرِ یعقوب را　(ص ۳۷)

(۲)　من اے روشنائی ز بہرِ چرا　　　بباید ہمی آزمودن ترا　(ص ۱۱۴)

قابوس نامہ   "دو دانگ ذخیرہ کن از بہرِ دو ضرورت را   دیگر بپرداز کن بہر خللے از دے یاد میار"

(باب بست ویکم در جمع کردن مال ص ۹۶)

حکیم سنائی   یارب ایں خسر بطانِ عالم را   گم کن از بہر غرا آدم را   (حدیقہ ص ۱۴۹)

سنائی کے ہاں یہ محاورہ بہت مقبول ہے؎

عبدالواسع جبلی   ہر روز بامداد ز بہرِ مرا نہی   از مشک سودہ بر سمن تازہ خالہا

(لباب ۔ باب دہم ص ۱۰۸ حصہ دوم)

لطف   بہ تحریک اوّل و ثانی بقاعدۂ تفریس درست ہے چنانچہ منوچہری ع

از لطف ہرچہ کند با تو سزائے تو کند

اور ادیب صابر   قطب فضل و فلک دولت و مجموع علوم   قبلۂ ہمت و حلم و لطف و جود و کرم

مثال از زلیخا   فراواں لطف کرد و گرمی نمود   ابر مہر دو شیس فراواں فزود   (ص ۲۶)

عفو   بروے تفریس بفتح اوّل و ضم ثانی ۔ یوسف زلیخا دونوں تلفظ سے واقف ہے۔ امثال از زلیخا؎

(۱)   دگر راست گوئید با من سخن   عفو تاں کنم کردہائے کہن   (ص ۱۴۷)

(۲)   صلاحِ جہاں را از و خواستی   تنِ خویشتن را عفو خواستی   (ص ۱۵۲)

(۳)   عفو کردمت زاں گناہِ عظیم   بحاجت بخواہم ز ربِّ عظیم   (ص ۲۰۷)

(۴)   ایا داد فرہنگ با بیخ و بُن   عفو کن مرا زیں برہنہ سخن   (ص ۱۱۶)

سعدی   عفو کردم از وے عملہای زشت   در آرم بفضلِ خودش در بہشت

فردوسی اوّل تو شاہ نامہ میں اس لفظ کا استعمال ہی نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو قاعدۂ تفریس سے نابلد ہے
در صحیح تلفظ سے لکھتا ہے؎

شاہنامہ   بکن عفو یارب گناہِ ورا   بیفزاے در حشر جاہِ ورا   (دیباچہ ص ۳)

عمدا   بسکونِ دوم ۔ استاد عمعق بخاری؎

اے صنوبر قدنہ دانی تو چگونہ فتنۂ   یا ہمی دانی بعمدا خویشتن ناداں کنی   (لباب حصہ دوم، باب دہم ص ۱۹۰)

حکیم ضیا الدین محمود الکابلی - شعر

بگاہِ حسلم عمدا از نہیبِ ضربتِ عدلت   بریزد زہر از مار و بیفکندنیش از کژدم

(لباب - حصّۂ دوم باب یازدہم ص۲۱۶)

زلیخا میں ایک مقبولہ روزمرّہ بن گیا ہے - زلیخا ؎

(۱)	بعمدا ہمی تاختندش براہ	باندک زماں پائے وے شد تباہ	(ص۵۳)
(۲)	بعمدا سوئے سقف کردش نگاہ	ہماں سیم تن دید چوں مہر و ماہ	(ص۱۲۵)
(۳)	ولیکن تو گفتی بعمدا کسے	ہمی برزبانم گرہ زد بسے	(ص۱۴۴)

شاہنامہ نہ صحیح اور نہ مفرّس لاتا -

عماری زلیخا اگرچہ صحیح تلفظ سے باخبر ہے - حرفِ دوم کو مشدّد بھی باندھا ہے - امثال از زلیخا ؎

(۱)	یکے کارواں ساخت چوں نو بہار	زبس مہد و عمّاریِ زرنگار	(ص۲۰۰)
(۲)	زناں شاں بعمّارے اندر ہمہ	عماری بزرّ و بزیور ہمہ	(ص۲۰۹)
(۳)	کہ از مہد و عمّاریِ زرنگار	شود خیرہ چشم و دلِ روزگار	(ص۲۰۷)

شاہنامہ میں عماری کا ذکر اگرچہ پچاسوں مقام پر آیا ہے - لیکن تشدّد کی ایک مثال بھی دستیاب نہیں ہوئی -

شاہنامہ (۱)	عماری بسیچید و دیبا جلیل	کنیزک ببردند چینی و خیل	(ص۲۶ جلد سوم)
(۲)	عماری چہل جملہ از سیم و زر	بدو اندروں لعبتِ سیمبر	(ص۲۰۶ جلد دوم)
(۳)	عماری بسیچید و رفتن براہ	مرآں خفتہ را اندروں جایگاہ	(ص۲۰۷ جلد دوم)
(۴)	عماری بماہ نو آراستہ	پسِ پشت او اندروں خواستہ	(جلد اوّل ص۶)
(۵)	عماری بسیچید و آمد براہ	نشستہ بدو اندراں جفتِ شاہ	(ص۱۴۳ جلد سوم)

زلیخا کے دوران میں عماری کا نیا تلفظ فردوسی کے لیے سیکھنا قابلِ استعجاب ہے -

مشاطہ بلا تشدد دوم شاہنامہ میں فردوسی اس لفظ سے واقف نہیں - امثال از زلیخا ؎

(۱)	زیعقوب زہر کس اندر نہفت	مشاطہ بلیبا فرستاد و گفت	(ص۲۵)

(۲) مشاطہ شد آراست آں ماہ را   وآں مہرباں دخت دل خواہ را   (ص ۲۵)

اسدی   ہمیدوں نموز ودیش چاکرست   بہارش مشاطہ خزاں زرگرست   (ص ۶) گرشاسپ نامہ

مسعود سعد سلمان   مگر مشاطہ بستاں شدہ ست باد سحاب   کہ ایں بہ بستش پیرایہ واں کشاد نقاب

حکیم سنائی   خرد آمد مشاطۂ جانت   خرد آمد چراغِ ایمانت   (حدیقہ ص ۳۴۶)

میشوم بمعنی شوم، مشئوم کی بگڑی شکل ہی، شاہنامہ میں نامعلوم ہی اور زلیخا سے امثال ذیل ؎

(۱) ازاں رو زمیشوم کاں بدخبر   شنیدم بگوشِ دل و ہوش سر   (ص ۱۷۳)

(۲) ازاں رو زمیشوم و تاریک بد   کہ مہجور شد یوسفِ با خرد   (″)

قابوس نامہ "دبار شد کہ نہ چنیں بود ولیکن میشوم بود و صاحب کش بود"

(باب بست و پنجم در چہار پائے خریدن ص ۱۱۳ طبع ایران)

سنائی غزنوی   کاں کہ گوید منم شدہ معصوم   اوست برنفسِ خویشتن میشوم   (حدیقہ ص ۴۴۴ نولکشور)

نکوئی بمعنی حسن و جمال، ان معنوں میں شاہنامہ میں یہ لفظ غیر مستعمل ہی اور زلیخا میں بالعموم ملتا ہی

امثال۔ زلیخا ؎

(۱) تراہست چنداں جمال و کمال   نکوئی و کشّی و غنج و دلال   (ص ۱۱۶)

(۲) نکوئی سپاہست شاہش توئی   زمیں آسمان ست و ماہش توئی   (ص ۱۱۷)

(۳) دو صد بار زاں خوب تر گشتہ بود   نکوئیش زاندازہ بگزشتہ بود   (ص ۹۷)

سنائی غزنوی   رفت وقتے زنے نکو در راہ   شدہ از کارہائے مرد آگاہ   (حدیقہ ص ۳۷۹)

کارگراں زلیخا میں ملازمین اور چاکروں کے معنوں میں آتا ہی زلیخا ؎

(۱) ازاں شادمانی ہم اندر زماں   بفرمود پنہاں بکارگراں   ص ۱۶۷

(۲) چو اسباط بیروں شدند از سرائے   بفرمود فرخ شہ نیک رائے

(۳) بکارگراں تا بہ بندند بار   تمامی صد اشتر ہمہ خوار بار

(۴) بکردند آں چاکراں کار خویش   بفرمانِ شاہِ جہاں دارِ خویش   ص ۱۸۱

شاہنامہ میں یہ لفظ معمار اور دیوار گر کے معنی دیتا ہے۔ امثال از شاہنامہ ؎

(۱) دگر گفت کاریگراں آورید | گچ و سنگ و خشتِ گراں آورید

(۲) چہل روز تا کار نشنیدم | زکاریگراں شاہ نگزیدم

(۳) بدانست کاریگر راست گوے | کہ عیب آورد مرد دانا بدوے

(۴) برفتند کاریگراں سہ ہزار | زہر کشورے ہر کہ بد نامدار

(ساختن خسرو شہر مداین را ص ۱۰۱ جلد چہارم شاہنامہ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

زلیخا میں آکر اس لفظ کو نئی معنوں میں استعمال کرنا فردوسی سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

جلدی بمعنی چالاکی و زودی شاہنامہ میں غیر رائج ہے۔ زلیخا سے یہ مثالیں پیش ہیں ؎

(۱) بجلدی زنِ چابکِ پیش دست | کیانی کمر بر میانش بہ بست (ص ۳۹)

(۲) بدانست کاں بد زحکمِ خدائے | نہ از روئے جلدی بد و جہد رائے (ص ۲۰)

(۳) زجلدی دگر بارہ فریاد زد | چنیں گفت کاے ناخردمند مرد (ص ۱۲۹)

حکیم سنائی غزنوی سگ اگر جلد بودی و فربہ | یک شکارے نماندے اندر دہ (حدیقہ ص ۲۴۶)

قضا را شاہنامہ میں اس کا رواج نہیں معلوم دیتا اگرچہ ذیل کی مثال میرے قول کے مخالف ہے

شاہنامہ کہ ایرج بر و مہر بسیار داشت | قضا را کنیزک ازو بار داشت جلد اول ص ۳۰

تمام شاہنامہ میں اس قسم کی ایک نظیر ملنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فردوسی اِس محاورہ کا عادی تھا ممکن ہے کہ بعد کی ترمیم ہو۔ زلیخا میں البتہ یہ روزمرّہ کا حکم رکھتا ہے۔ زلیخا ؎

(۱) قضا را شبے دید روشن بخواب | کہ دہ گرگ با خشم و کین و عتاب (ص ۴۳)

(۲) قضا را یکے روز یوسف نگاہ | بروں شد بامید یک لخت راہ (ص ۱۰۳)

(۳) قضا را یکے دایہ سال خورد | بناگہ بداں سیم تن باز خورد (ص ۱۲۰)

(۴) ہمیں بود غمگیں دلِ شہریار | قضا را فراز آمد آں آبدار (ص ۱۴۳)

اسدی طوسی قضا ہر دو برہم رسیدند تنگ | ردہ برکشیدند و برخاست جنگ (ملحقات شاہنامہ ص ۹)

سنائی غزنوی   از قضا را و باے گاو ان خاست   ہر کہ را پنج بود چار بکاست

سعدی   قضا را من و پیری از فاریاب   رسیدیم در خاکِ مغرب بآب

وریج بفتح اوّل قدر و قیمت و شان و شکوہ حد و اندازہ کے معنوں میں آتا ہے زلیخا میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے اور شاہنامہ میں عنقا ہے۔ زلیخا ؎

(۱)   ز وریج تو نز زانہ یک دلہ   ہم حجلہ شد ساختہ ہم کلہ   (ص ۲۷)

(۲)   ہمی گفت ہر کس کہ از وریج اوست   کہ ایں بچگان اینک است پوست   (ص ۲۹)

(۳)   فرو خفت تا از زمیں چیز زر   برآمد بغیر از زری و وریج و فر   (ص ۱۱۱)

(۴)   بخاصہ جوانی دل از بخت شاد   کہ باشد در و وریج و بخت و مراد   (ص ۱۲۶)

(۵)   کہ دادی مرا یوسفِ پارسا   کز و ملکِ من یافت وریج و بہا   (ص ۱۵۳)

شاہنامہ اس کے بجائے ارج لاتا ہے۔ امثال ؎

(۱)   کنوں اے خردمند ارجِ خرد   دریں جاے کہ گفتن اندر خورد   (ص ۹) جلد اوّل

(۲)   کہ او ارج زر را نداند ہمی   بہر جاے زر را فشاند ہمی   (ص ۱۲۵) جلد سوم

(۳)   یکے را مشے نامہ خوانید نیز   کز آن جا و داں ارج یابید و چیز   (ص ۱۱۲) ؍؍

(۴)   مرا ارج ایراں بباید شناخت   بزرگ آں کہ با نامداراں نساخت   (ص ۱۲۸) ؍؍

اگرچہ ارج اور وریج اصل میں ایک ہی لفظ ہیں اور ان کے معنی قدر و قیمت شان و شکوہ وغیرہ کے ہیں لیکن زلیخا میں وریج کے معنوں میں اور بھی عمومیت ہے۔ امثال اوّل و دوم میں وریج زیادہ تر برکت کرامت وغیرہ کے معنوں میں لایا گیا ہے۔

ہمزاد اس کے معنی لغت میں ہم سن اور ہم سال ہیں ایسے رفیق پر بھی اطلاق ہوتا ہے جو سفر و حضر میں ہم پیالہ و ہم نوالہ ہو۔ نظامی ؎

نگہ کرد ہمزاد او خفتہ بود   ہماں کرد با او کہ او گفتہ بود

(سکندر نامۂ بحری ص ۲۱)

مثنوی یوسف زلیخا میں عموماً برادر کا مرادف ہے۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) چو ہمزاد را آں چناں بستہ دید — دلِ خستہ از دیدہ بیروں چکید (ص ۹)
(۲) بدیدند ہمزاد خود را نژند — سراپاے گشتہ گرفتارِ بند (ص ۹)
(۳) توئی آں کہ ہمزاد را گرگ خورد — ترا از برادر چنیں فرد کرد (ص ۱۰۷)
(۴) منم آں کہ بر من ستم گرگ کرد — منم آں کہ ہمزاد را گرگ خورد (ص ۱۰۸)

زلیخا میں جب کہ وہ بیسیوں مقام پر ملتا ہے اور صاحب زلیخا کا روزمرہ بن گیا ہے۔ تمام شاہنامہ میں باوجود تلاش صرف ایک مثال داستان فرود میں ملی ؎

کہ پیوند شاہست و ہمزاد اوے — سوارے ست نام آور و جنگجوے (ص ۱۵۶) جلد اوّل

قابوس نامہ "کہ ملک ترا از برادرے مشفق ہمزاد و دوست تر است"

(باب چہل و دویم اندر شرط اسفہسالاری ص ۲۱۱)

استوار داشتن یا بودن اعتماد رکھنے کے معنوں میں زلیخا میں بالعموم رائج ہے۔ امثال ؎

(۱) ز بیم استوارش نبودی بکس — خود او را نگہ دار بودی و بس (ص ۳۳)
(۲) بیا یوسفِ خویش را گوش دار — مدارش بہیچ آدمی استوار (ص ۳۶)
(۳) ہمی داردش روز و شب در کنار — ندارد بہر کس ورا استوار (ص ۳۷)
(۴) بکس یک زماں استوارش نبود — بجز خود شب و روز یارش نبود (ص ۹۹)
(۵) بہیچ آدمی استوارش نبود — شب و روز بے او قرارش نبود (ص ۱۶۵)

اِن معنوں میں شاہنامہ میں صرف ایک مقام پر ملتا ہے۔ شاہنامہ ؎

(۱) پرستندہ با وے بیامد چہار — کہ خاقاں بدیشاں بدی استوار (ص ۲۳) جلد چہارم

ساقِ عرشِ خداے شاہنامہ میں یہ ترکیب نامعلوم ہے اور زلیخا میں مقبول ہے۔ امثال ؎

(۱) ز میداں چو بنہی قدم در سراے — سرِ قبّہ بر ساقِ عرشِ خداے (ص ۱۶۸)
(۲) خروشیدنِ کوس و زرینہ ناے — ہمی رفت تا ساقِ عرشِ خداے (ص ۲۱۱)

(۳) یکے نور زاندام آں دلکشاے / بہ پیوست تا ساقِ عرشِ خدائے (ص ۹۰)

آہ اظہارِ تاسف و حسرت کے وقت زلیخا میں ملتا ہے۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) بنالید و گفت آہ درد دریغ / کہ خواہد شدن ماہ عمرم بہ میغ (ص ۳۴)

(۲) ہمی راند سیل و ہمی گفت آہ / کہ فالیست ایں بس سیاہ و تباہ (ص ۳۶)

(۳) چو یوسف چنیں دید بر جایگاہ / دلِ مہرباں بر تنش گفت آہ (ص ۵۲)

(۴) بسے گفت مسکیں بسے گفت آہ / زتیمار یعقوب دانش پناہ

(۵) پس آں اشک از دیدہا کرد پاک / برآورد آہ از دلِ دردناک (ص ۱۲۰)

(۶) ہمہ روز من گشت چوں شب سیاہ / شبم شیون و زاری و درد و آہ (ص ۱۶۴)

شاہ نامہ میں آہ کا لفظ کل چار پانچ مقام پر ملتا ہے اور ایسے نازک وقت پر جب کہ انسان کاری زخم کھاتا ہے جس سے جانبری محال ہے۔ سہراب کی موت، شاہ نامہ ؎

(۱) بہ پیچید زاں پس یکے آہ کرد / زنیک و بد اندیشہ کوتاہ کرد (ص ۹۰) جلد اول

شغاد کی موت (۲) شغاد از پس زخم او آہ کرد / تہمتن بہ دست کوتاہ کرد (ص ۴۷) جلد سوم

بہرام چوبیں کا قتل (۳) چو بہرام گفت آہ مردم زراہ / برفتند پویاں بہ نزدیک شاہ (ص ۹۶) جلد چہارم

معمولی تحسر اور تاسف کے وقت فردوسی بادِ سرد لکھتا ہے۔ شاہنامہ ؎

(۱) چو روئے پدر دید خسرو بدرد / برآورد از دل یکے بادِ سرد (ص ۶۶) جلد چہارم

(۲) بشد مغز و جان و سرم پُر ز درد / برآورد از دل یکے بادِ سرد (ص ۱۸۱) جلد دوم

(۳) بیامد بہ نزدیک خاقاں چو گرد / پُر از خوں دل و لب پُر از بادِ سرد (ص ۱۸۹) ״

(۴) کز ایرانیاں چند جستم نبرد / نزد پیشِ من کس جز از بادِ سرد (ص ۲۲۴) ״

گویا قدما کی بادِ سرد کا قائم مقام متاخرین کے ہاں آہِ سرد ہے۔

دیرہ بیائے مجہول و زائے فارسی خاصہ و خالص و بےغش۔ اس صورت میں یہ لفظ دونوں مثنویوں میں ملتا ہے اور دونوں تصنیفات میں روزمرہ کا حکم رکھتا ہے۔ اس کی جمع ویژگان ہے اس صورت میں خواص اور

ندا کے معنوں میں آتا ہے اور شاہنامہ میں بالعموم رائج ہے۔ امثال از شاہنامہ ؎

(۱) خود و دیڑگاں با ہیونان چست — بیامد بہ آسودگی راہ جست (ص ۱۷، جلد سوم)

(۲) ازان دیڑگاں پنج تن را ببرد — کہ بودند با مغز و ہشیار و گرد (ص ۲۸۷، جلد دوم)

(۳) چو از قلبِ شاپور لشکر براند — چپ و راست و دیڑگان انجواند (ص ۱۰۰، جلد سوم)

(۴) ازاں پس خود و دیڑگاں بر نشست — میان کئی تاختن را بہ بست (ص ۹۶) ؍؍

(۵) پس لشکر اندر ہمی رفت شاہ — خود و دیڑگاں تا بہ نخچیرگاہ (ص ۱۲۴) ؍؍

نظامی — یکے روز با خاصگانِ سپاہ — چو مینوے کے مجلس آراست شاہ

دیڑگاں یوسف زلیخا سے مطلق غیر حاضر ہے اور یہ امر قرین حیرت ہے کہ فردوسی اگر وہ یوسف زلیخا کا مالک ہے تو دیڑگان کے استعمال سے اس مثنوی میں کیوں محترز ہے۔ اسی سلسلہ میں مجکو بویژہ کا بھی ذکر کردینا چاہیئے جو تاکید اور تخصیص کے لیئے آتا اور شاہنامہ میں علی العموم پایا جاتا ہے اور جس کو زلیخا میں قطعاً ترک کر دیا گیا ہے۔

بویژہ مرادف ہے بالخصوص کا شاہنامہ سے مثالیں اور بھی واضح کردینگی ؎

(۱) بویژہ دلاور سپہدار طوس — کہ در جنگ بر شیر دارد فسوس (ص ۴، جلد اول)

(۲) ہمہ راستی خواہم و نیکوئی — بویژہ کہ سالار ایران توئی (ص ۵۶، جلد سوم)

(۳) مبادا کہ تنہا بود نامجوے — بویژہ کہ دارد سوے جنگ روے (ص ۴۲، جلد چہارم)

(۴) یکے تاج بودی ازاں بر سرش — بویژہ کہ بیمار شد دخترش (ص ۹۵) ؍؍

(۵) کہ چونیں سخن نیست جز کار زن — بویژہ زنے کو بود رائے زن (ص ۹۹) ؍؍

قرن پنجم میں بویژہ کا رواج گرشاسپ نامۂ اسدی ۴۵۸ھ سے ثابت ہے ؎

اسدی — بویژہ دو کس را بہ بخشاے و بس — مداں خوار و بیچارہ تر زاں دو کس

(ص ۱۷ طبع آقا محمد شیرازی بمبئی)

کیا یہ حقیقت حیرت بخش نہیں کہ بویژہ پر بھی زلیخا میں دیڑگان کی طرح خط بطلان کھینچ دیا گیا ہے۔ مثنوی یوسف و زلیخا ایک بڑی کتاب ہے جو کم و بیش آٹھ نو ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ اس میں یہ قیاس کرنا

کہ بویژہ کے لئے کوئی مناسب موقعہ اور محل نہیں ملا ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ جہاں کہیں اس کے استعمال کا موقعہ آتا ہے شاعر اس کا مرادف بخاصہ لاتا ہے چنانچہ زلیخا ؎

(۱) بخاصہ کہ یوسف چو او آدمی — ندیدہ ہمی آسمان و زمی (ص ۳۴)

(۲) بخاصہ یکے بندہ بے نوا — کہ ہجدہ درم باشد او را بہا (ص ۸)

(۳) بخاصہ کہ از روم و چین آورند — نہ زین شہرہا وین زمین آورند (ص ۱۰۹)

(۴) بہ یوسف بر آزار واجب ندید — بخاصہ چنان کاں گواہی شنید (ص ۱۳۰)

(۵) بخاصہ ابر ابن یامین فرد — کہ گرگ از برادر ورا فرد کرد (ص ۱۶۹)

قابوس نامہ "و با مردم ناداں صحبت مکن خاصہ با نادانی کہ پندارد داناست"

(باب ششم در فزونی گوہر در آموختن ص ۳۵)

حکیم سنائی حبذا آں جمالِ دہر آرائے — مرحبا آں سپہرِ قلعہ کشائے

خاصہ وقتے کہ در مصاف بود — پائے او بر دماغ قاف بود (حدیقہ ص ۶۵)

ارژنگ اس کی اور صورتیں یہ ہیں ارتنگ۔ ارثنگ۔ ارجنگ۔ ارسنگ۔ ارغنگ۔ تنگ چنگ اور ژنگ۔ جس قدر اس کی شکل میں اختلاف ہے اسی قدر اس کے معنوں میں اختلاف ہے اور اہل قلم نے طرح طرح کی طبع آزمائیاں کی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ارژنگ مانی کا اصلی نام ہے ان کا اعتقاد ہے کہ مانی ایک دعائیہ کلمہ تھا جو کثرت استعمال سے بالآخر لقب ہو گیا۔ بعض کی رائے میں وہ کسی چینی بت خانہ کا نام ہے۔

بعض کا قول ہے کہ وہ اس تختہ یا کتاب کا نام ہے جس پر مصوّر اشکالِ غریبہ نقش کر کے اپنے سامنے رکھتے ہیں مصورانِ روم اس کو تنگ اور نقاشانِ چین ارتنگ بتاے قرشت (نہ بثائے ثخذ، کیونکہ فارسی میں یہ حرف نہیں آتا) کہتے ہیں۔ (رشیدی) گویا یہ اسدی کو اصلاح دی گئی ہے جیسا کہ آیندہ دیکھا جائیگا۔

بعض کا خیال ہے کہ اس کا اطلاق زبان پر بھی آتا ہے اور تاریخ کے معنی بھی دیتا ہے۔ (جہانگیری)

بعض کی رائے میں وہ کسی نقاش کا نام ہے جو چینی الاصل اور مانی سے علیحدہ ہے اور کمال میں مانی کا ہم پایہ: امیر خسرو دہلوی ؎

کہ در چین دیدہ ام ارژنگ پرکار | کہ گردی دائرہ بے دور پرکار

(ولہ)

بقصرِ دلبرم مانی و ارژنگ | طرازِ نقش می بستند بر سنگ

امیر خسروؒ نے شاید یہ معنی نظامی سے لیئے ہیں ؎ نظامی

رواں کرد کلکِ شبہ رنگ را | ببرد آب مانی و ارژنگ را

گر قول مقبول یہ ہے کہ وہ مانی کے نگارخانہ کا نام ہے ؎ سیف اسفرنگ

اگر مانی شود زندہ چو بیند نقشِ توصیفش | بمیرد باز از شرمِ نگارستانِ آرنگش (جہانگیری)

استاد عمعق بخاری

ایں چوں بہار خانۂ چیں پُر ز نقشِ چیں | واں چوں نگارخانۂ مانی پُر از بہار (لباب باب دہم ص۱۸۶)

عطا ابن یعقوب الکاتب المتوفی ۴۹۱ھ

بماند بت خانہ چین منقش | بکردار ارژنگ مانی مصور

(لباب۔ حصہ اوّل۔ باب ششم ص۳۰)

متأخرین کا قریب قریب یہی عقیدہ ہے۔

لیکن سب سے قدیم اور وقیع عقیدہ جو متقدمین میں عام تھا یہ ہے کہ وہ مانی کی کتاب اشکال کا نام ہے۔ چنانچہ یہی معنی لغات اسدی میں دیئے گئے ہیں اور مثال میں فرخی کا یہ شعر منقول ہے ؎

ہزار یک ز ان کاندر سرشت او سرشت | نگار و نقش ہما نا کہ نیست در ارژنگ

اسدی نے ساتھ ہی یہ بھی تشریح کردی ہے کہ تاسے قرشت کی بجائے زبان دری میں ثائے ثخذ سے لکھا جاتا ہے۔ وہ محض مرقع نہیں تھا بلکہ مصور کتاب تھی۔ فرخی کے اِس شعر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے ؎

نامۂ فتح تو اے شاہ کنوں باید برد | تا چوں مخوانند آں خوانند آرنگ

مسعود سعد نے اس کو اور بھی واضح کردیا ہے ؎

دو نسخ آر دیرستشِ ایشاں | راست ہستند نامۂ ارژنگ

ولہٗ

جہاں بزیبِ بزینت چو لعبتِ آذر　　زمیں بنقش و بصورت چو نامۂ ارژنگ

تنہا ارژنگ مسعود سعد سلمان کے ہاں یوں آیا ہے ؎

زاں کہ بستاں شدہ از حسن بسانِ بتکدہ　　زاں کہ صحرا شدہ از نقش بسانِ ارتنگ

سنائی کے ہاں بھی یہی معنی دیتا ہے ؎

گر نہ ارتنگ مانی است آں خط　　از چہ خطہاے مقلہ گشت سقط

ولہٗ

چشمِ بد دور سخت با معنی ست　　ہمچو ارتنگ خامۂ دکذا مانی ست

(حدیقۂ سنائی صفحہ ۵۱، ۵۲، نولکشور ۱۳۰۴ء)

لیکن ابو المحاسن ازرقی کے ہاں گزشتہ معنوں میں سے کوئی بھی چسپاں نہیں ہوتا ؎

شگفت شاخِ سمن گرد بوستاں گوئی　　ہمی برآورد دُرِّ ثمیں سر از ارتنگ

(لباب باب دہم ص ۹۶)

آدم بر سرِ قصّہ، یوسف زلیخا تنہا ارژنگ سے واقف نہیں لیکن اضافت کے ساتھ ارژنگِ مانی اس میں آتا ہے۔ زلیخا ؎

(۱)	سر و پاے او چوں بتِ آذری	چو ارژنگِ مانی و جانِ پری	(ص ۱۲۴)
(۲)	ہمہ لشکر و پیل چوں نو بہار	چو ارژنگِ مانی برنگ و نگار	(ص ۱۶۷)
(۳)	سرائے ست در پیش آراستہ	چو ارژنگِ مانی بہ پیراستہ	(ص ۱۶۸)
(۴)	بماہے درش پیے دو در ماہ سر	چو ارژنگ مانی ہمہ پر صور	(ص ۱۵۹)

اِن اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب یوسف زلیخا کے نزدیک ارژنگ خواہ مصوّر کتاب ہو یا نگارخانہ مانی سے علاقہ رکھتا ہو کیونکہ یہ مصنف ارژنگ کو مانی سے منسوب کیے بغیر لکھتا جانتا ہی نہیں۔ اِس اعتقاد میں وہ سنائی مسعود سعد سلمان، عطا بن یعقوب الکاتب، اسدی اور فرخی کا ہم زبان ہے۔

فردوسی شاہنامہ میں ارژنگ کو جن معنوں میں لاتا ہے ان سے عموماً نہ ہمارے ادیب اور نہ اہلِ لغات واقف معلوم ہوتے وہ حسب ذیل ہیں ؎

(۱) ارژنگ دیو مازندرانی اور تورانی پہلوان پسر زرہ کا نام ہونے کے علاوہ جیسا کہ صاحب جہانگیری نے لکھا ہے ایک اور تورانی پہلوان کا نام ہے جو نژاد کی فوج سے علاقہ رکھتا ہے۔ شاہنامہ ؎

یلانش بدا ارژنگ مرد سے شیر | کہ ہرگز نہ بودند از جنگ سیر
("گریختن نژاد از بیژن و گرفتاری اسپنوی" ص ۱۶۰۔ جلد اول۔ طبع بمبئی)

(۲) ایک کنوئیں کا نام بھی ہے جس میں بیژن بن گیو افراسیاب کے حکم سے قید کیا جاتا ہے۔ شاہنامہ

بہ پیلان گردن کش آن سنگ را | کہ پوشد سرِ چاہ ارژنگ را
(داستان بیژن ص ۲۰۹ جلد دوم)

اور فرخی | نشستگاہ تو بر تخت خسروانی باد | نشستگاہ عدوی تو بر چہ ارژنگ

(۳) وہ طلسم جادو اور نیرنگ کے معنی بھی دیتا ہے۔ جب فریدوں ضحاک کے ساختہ طلسم کو توڑ کر ضحاک کے محلسرا میں داخل ہو جاتا ہے اس واقعہ کی اطلاع کندرو ضحاک کو جا کر دیتا ہے اور کہتا ہے ؎

ترا دشمن آمد بگاہت نشست | یکے گرزۂ گاؤپیکر بدست
ہمہ بند و نیرنگ ارژنگ برد | دلآرام بگرفت و گاہت سپرد
(شاہنامہ۔ جلد اول ص ۱۳)

(۴) اور عموماً تصویر کے معنوں میں آتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ فردوسی شاہنامہ میں ارژنگ مانی کی ترکیب سے بالکل نابلد ہے۔ شاہنامہ میں یا تو تنہا ارژنگ ملتا ہے جیسے اس شعر میں ؎

یکے نامہ بنوشت ارژنگ وار | براو کردہ صد گونہ رنگ و نگار
(نامۂ پشنگ بکیقباد و آشتی خواستن ص ۹۱ جلد اول۔)

نیز اس شعر میں ؎ (۲) یکے نامہ بنوشت ارژنگ وار | پر آرائش و رنگ و بوے و نگار
(فرستادن خاقان دختر خود را با نامہ و خواستہ ہمراہ مہربان بہ نزد نوشیروان۔ ص ۲۳ جلد چہارم)

اور اس شعر میں ؎

(۳) بخاقاں یکے نامہ ارژنگ وار … نوشتند بر بوسے و رنگ و نگار

(نامہ بہرام چوبیں بخاقان و سکّہ بنام خسرو پرویز زدن و فرستادن آن نزد ہرمزد ص ۶۲ جلد چہارم)

یا اضافت کے ساتھ ارژنگ چیں ملتا ہے جس کے معنی چینی تصویر لیے گئے ہیں۔ چنانچہ شاہنامہ ؎

(۴) یکے نامہ بنوشت پر آفریں … سخندانِ چینی چو ارژنگ چیں

(آگاہی یافتن خاقان از رسیدن لشکر نوشیرواں بگرگاں و نامہ نوشتن او در بارۂ آشتی ص۲۰ جلد چہارم)

اور یہ شعر ؎

(۵) یکے نامہ بر سانِ ارژنگ چیں … بنشتند و کردند صد آفریں

(خواندن خسرو گردیہ را بدرگاہ ص۸ جلد چہارم)

اِن اشعار میں ارژنگ کا اطلاق تصویر پر ہوا ہے اس کی تائید نظامی کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے ؎

(۱) یکے بود پیکر دو ارژنگ را … تفاوت نہ ہم نقش و ہم رنگ را

(۲) کہ چوں کرد اندیں دستور گزار … دو ارژنگ را در یکے ساں نگار

(مناظرہ رومیاں و چینیاں در صورتگری۔ سکندر نامہ بری ص۳۱۱ مطبع نامی لکھنؤ ۱۹۱۶ء)

یہ یاد رہے کہ فردوسی نے علی الرغم دیگر اساتذہ ارژنگ کو تصویر کے معنوں میں باندھا ہے جس میں نظامی کے سوا کسی اور نے اس کی تقلید بھی نہیں کی اور نہ یہ معنی کسی کتاب لغات یا فرہنگ میں پائے جاتے نظامی کے شارحین میں ان ہی ابیات کی تشریح میں جو یہاں درج ہیں ارژنگ کے معنوں کے متعلق بہت کچھ تذبذب اور پس وپیش ہے مثلاً پہلے شعر کی نسبت کہا گیا ہے "ازیں بیت صاف معلوم می شود کہ ارژنگ نام کار مصوّران ست نہ نام نقاش نظیر مانی"۔ اور ؎ دو ارژنگ ایں نقش چینی پزند … قلم بت بسانِ نقش بند۔ اسکندر نامہ بری ص۳۰۵) کی شرح میں کہا ہے (حاشیہ ۵) "بداں کہ ارژنگ از شعر خسرو علیہ الرحمۃ معلوم می شود کہ نام نقاشے ست و دریں جا ایں معنی درست نمی شود و مراد از ارژنگ ایں جا نقاشے ست اے دو نقاش چینی پزند"۔

دوسرے شارح نے اس قدر اور اضافہ کیا ہے کہ "ارژنگ نگارخانۂ مانی باشد" اور اس شعر کے واسطے ؎

زبس جادو بہائے فرہنگِ او بدو بگروید ندوارژنگ او

کہا ہے کہ "ازیں بیت ہم ظاہر می شود کہ ارژنگ بمعنی کارمانیست ای فنِ نقاشی وصنعتِ آں"۔ لیکن شعر نمبر (۲) کو جو اوپر لکھ آیا ہوں خاموشی کے چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ وہاں حضرت شارح کے مفروضہ معنی چسپاں نہیں ہوتے اصل یہ ہے کہ نظامی نے سکندرنامہ میں ارژنگ کو کل دو معنوں میں باندھا ہے پہلے وہ ہے جو ہم فردوسی کے ہاں دیکھ آئے ہیں یعنی تصویر دوسری وہی جو اسدی اور فرخی کے ہاں ملتی ہیں یعنی کتابِ مانی۔

یہ تفاوت آسانی سے مفہوم ہو سکتا ہے کہ زلیخا میں ارژنگ یا نگارنامہ ہے یا نگارخانہ اور شاہنامہ میں تصویر اب یہ خیال کرنا کہ ایک مصنف نے اپنی دو تصانیف میں ایک لفظ کو دو مختلف معنوں میں باندھا اور جو معنی اور ترکیب ایک تصنیف میں اختیار کی دوسری تصنیف میں ترک کر دی کوئی صحیح حجت معلوم نہیں ہوتی۔ فردوسی کے نزدیک اِس کے معنی یا تصویر تھی یا کتاب اگر پہلے معنی تھے تو دونوں نظموں میں وہی معنی پائے جاتے اگر دونوں معنی جانتا تھا تو دونوں مثنویوں میں وہی معنی لاتا یہ کہا کہ ایک مثنوی میں ایک اور دوسری مثنوی میں دوسرے معنی لائے جائیں اور ترکیبیں بھی بدل دی جائیں، ایک میں کہے ارژنگ چیں اور دوسرے میں کہے ارژنگ مانی۔ شاہنامہ میں فردوسی کو ارژنگ مانی کے فقرہ کے استعمال سے اگر وہ اس سے واقف تھا کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی تھی جس طرح کہ یوسف زلیخا میں ارژنگ چیں کے استعمال سے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان مثنویوں کے ناظم دو مختلف شخص ہیں جن کی معلومات مختلف ہیں فردوسی کی شخصیت کو صاحب زلیخا کی شخصیت سے امتیاز کرنے کے لیے ہمارے واسطے اِسی قدر کافی ہے کہ وہ ارژنگ کو ایسے معنوں میں باندھتا ہے جو نہ صرف صاحب زلیخا بلکہ عام طور پر دیگر اساتذہ کو بھی معلوم نہیں۔

فرخی اور اسدی اگرچہ ارژنگ یا ارتنگ کو مانی کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن فردوسی جو بحیثیت زمانہ ان دونوں شاعروں سے مقدم ہے نیز بحیثیت مورخ ایران مانی کے حالات سے مذکور الصدر شعرا کے مقابلے میں زیادہ باخبر ہونا چاہیے ارژنگ کا مانی سے کوئی علاقہ تسلیم نہیں کرتا اگرچہ وہ مانی کی صورتگری کا معتقد ہے چنانچہ شاہنامہ ؎

بیامد یکے مرد گویا زچیں   کہ چوں او مصوّر نہ بیند زمیں
بداں چیرہ دستی رسیدہ بکام   یکے پرمنش مرد مانی بنام
بصورت گری گفت پیغمبرم   ز دیں آوراں جہاں برترم

(آمدن مانی مصوّر نزد شاپور بدعوے پیغمبری وکشتہ شدن او ۔ ص۱۰۱ جلد سوم)

اور نظامی ؎ شنیدم کہ مانی بصورت گری   ز ری سوئے چیں شد بہ پیغمبری

(سکندر نامۂ بری ص۳۱۲)

مانی کی نسبت یہ عقیدہ عرب مورخین کے بیانات پر اعتبار کرتے ہوئے غلط معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نہ فردوسی اور نہ مانی کی۔ عرب مورخ مانی کی مشہور کتاب ارژنگ یا ارتنگ کا ذکر کرتے ہیں اور فردوسی نہ شاہنامہ میں اور نہ مانی کے حالات میں کسی مقام پر بھی اِس عام عقیدہ کا معتقد اور پابند نظر آتا ہے جس میں فرخی، اسدی، عطا بن یعقوب، مسعود سعد سلمان اور حکیم سنائی اعتقاد رکھتے ہیں۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر یوسف زلیخا فردوسی کے قلم سے نکلتی تو مانی کے متعلق یہ ایک غیر تاریخی بیان جو ارژنگ مانی کے فقرہ میں مرموز ہے فردوسی کے قلم سے ادا نہ ہوتا۔

نامہ۔ اِس لفظ کے استعمال سے زلیخا میں کئی کنایے حاصل کیے گئے ہیں شاہنامہ میں یہ صورت نظر نہیں آتی۔ زلیخا۔ امثال ؎

(۱) وگرنہ شود جانت جفتِ ہلاک   شود اسمت از نامۂ عمر پاک (ص۱۳۰)
(۲) عزیز اندراں اوری خیرہ ماند   دلش نامۂ راہ اندیشہ خواند (〃)
(۳) بہفت آسماں رفرشتہ نماند   کہ او نامۂ درد یوسف نخواند (ص۸۴)
(۴) تو اے با تو ایں نامہ را در نورد   بگرد سخنہائے بیہرہ مگرد (ص۱۱۵)
(۵) دو رہ بر من ایں داستاں خواندہ   ہمیں نامہ بر من دو رہ خواندہ (ص۱۱۸)

ادائے مطالب شاہنامۂ عظیم کا مصنّف فردوسی ہمارا خیال تھا کہ ادائے مطالب میں غیر محدود الفاظ گوناگوں بندش اور ترکیب کے ذخیرہ کا مالک ہوگا اور جس طرح اور جس پہلو چاہتا ہوگا

اپنا مطلب ادا کر دیتا ہوگا۔ اس بارہ میں وہ ہم کو بالکل مایوس کرتا ہے۔ جب کوئی ایک خیال شاہنامہ کے دوران میں اس کو کئی مقام پر ادا کرنا ہوتا ہے تو وہ اس کے اظہار میں زیادہ تنوّع رنگارنگی اور اختلاف سے کام نہیں لیتا بلکہ قریب قریب ان ہی الفاظ میں اس کو دُہراتا ہے جس سے نتیجہ یہ نکلا کہ خیالات کی تکرار کے ساتھ الفاظ اور جملوں کی تکرار شاہنامہ میں اکثر مقامات پر مشاہدہ کی جاتی ہے۔ تمثیلاً میں ادائے سجدہ کے خیال کو لیتا ہوں۔

فردوسی اس مقصد کو ان صورتوں میں ادا کرتا ہے۔

(۱) نماز بُردن (۲) روئے بر زمیں مالیدن (۳) رُخ بر خاک نہادن (۴) روئے بر خاک مالیدن
(۵) رُخ بر تیرہ خاک مالیدن (۶) رُخ بر زمیں مالیدن (۷) رُخ بخاک مالیدن (۸) رخسارگان بر زمیں مالیدن

زلیخا شاہنامہ کے مقابلہ میں اگرچہ ایک مختصر نظم ہے لیکن اس مثنوی میں یہی مقصد ذیل کی شکلوں میں اظہار ہوا ہے۔

(۱) نماز بردن (۲) روئے زمیں بُرخ ستردن (۳) روئے زمیں بچہرہ ستردن
(۴) روئے بر خاک تاری نہادن (۵) چہرہ بر خاک تاری بسودن (۶) رُخ بر خاک تیرہ بسودن
(۷) رُخ بر روئے زمیں نہادن (۸) رُخ بر زمیں نہادن (۹) چہرہ بر خاک تاریک مالیدن
(۱۰) رو بخاکِ سیہ مالیدن (۱۱) زمیں بچہرہ رفتن (۱۲) خاک زمیں را برد رفتن
(۱۳) روئے بر خاک مالیدن (۱۴) رخ بر تیرہ خاک نہادن (۱۵) رُخسار بر تیرہ گل مالیدن
(۱۶) دو رُخ بر زمیں نہادن (۱۷) چہرہ بر خاک مالیدن

اِسی طرح گستردن کا حال ہم دیکھتے ہیں۔ شاہنامہ میں عموماً اس فعل کے ساتھ یہ اسماء آتے ہیں۔

(۱) فرش گستردن (۲) دام گستردن (۳) کام گستردن (۴) مہر گستردن
(۵) پر گستردن (۶) آفریں گستردن (۷) داد گستردن (۸) کیں گستردن
(۹) بساط گستردن

زلیخا میں اس کے ساتھ مرقومۂ ذیل اسماء آتے ہیں۔

(۱) سخن گستردن (۲) آگہی گستردن (۳) بلا گستردن (۴) داستان گستردن

(۵) قصہ گستردن (۶) خردمندی گستردن (۷) گفتار گستردن (۸) دیں گستردن
(۹) فرمان گستردن (۱۰) نعمت گستردن (۱۱) دعا گستردن (۱۲) راز گستردن
(۱۳) نامہ گستردن (۱۴) عاشقی گستردن (۱۵) تخم گستردن (۱۶) لابہ گستردن
(۱۷) دام گستردن (۱۸) فرش گستردن (۱۹) بساط گستردن (۲۰) داد گستردن

اِن امثلہ سے دیکھا جا سکتا ہے کہ صاحبِ زلیخا کے ہاں جو رنگارنگی اور بوقلمونی ہے فردوسی میں اس کا نصف بھی نہیں۔ اِس سے فردوسی پر کوئی حرف گیری نہیں کی جا سکتی بلکہ یہ ماننا ہوگا کہ زلیخا کے زمانہ میں فارسی زبان فردوسی کے عصر کے مقابلہ میں بدرجہا ترقی کر چکی تھی۔ جب کہ صاحبِ زلیخا کو ادائے مطالب کے لیے ایک بے حد وسعت اور گنجائش مِل گئی ہے۔ فردوسی ایک محصور تنگنا میں سلسلہ برپا ہے۔

کسی اور موقع پر دونوں اُستاد اسے ایک مقصد کے اظہار میں ایک ہی پیرایہ کو دہرا رہے ہیں۔ ذیل کی امثال سے روشن ہوگا کہ دونوں اُستاد کس قدر مغائر اور اپنی اپنی طرز میں مصر ہیں دونوں اسقدر کہنا چاہتے ہیں کہ فلاں عہد سے فلاں عہد تک۔

شاہنامہ	یوسف زلیخا
زگاہِ منوچہر تا کیقباد ؛ ازان نامداران کہ داریم یاد	از آدم دَرون تا بدین روزگار ؛ نہان اند کردہ ایم آشکار
زگاہِ منوچہر تا کیقباد ؛ زکاوس تا شاہ فرخ نژاد	از آدم دَرون تا بحشر گناہ ؛ بہ بخشی بیک رحمت ای دادخواہ
زگاہِ منوچہر تا کیقباد ؛ کسے دین یزدان نیاورد یاد	از آدم دَرون تا بروزِ شمار ؛ ازین خوب تر کس ندیدست کار
زگاہِ کیومرث تا یزدگرد ؛ بہ نظمِ من آید پراگندہ گرد	از آدم دَرون تا بدین روزگار ؛ کہ او بود پیغمبرِ روزگار

فردوسی جب کہ معمولی اور صاف الفاظ میں اپنا مطلب ظاہر کر رہا ہے صاحبِ زلیخا اِسی مقصد کو ایک محاورہ کے ذریعہ سے ادا کرتا ہے یعنی از آدم درون تا الخ یہ ایک ایسی نادر صورت ہے جس سے فردوسی شاہنامہ میں قطعًا نابلد ہے البتہ گرشاسپ نامہ میں ہم اِس سے دوچار ہوتے ہیں ؎

اسدی ز توران دَرون تا کہ گرشاسپ تاخت ؛ گزر کردہ بد چار صد سال راست

(گرشاسپ نامہ ص ۲۳)

علیٰ ہذا خواب دیکھنے کے مقصد کو فردوسی عموماً در حرف ظرف یا بائے ظرف کے ساتھ ادا کرتا ہے مثلاً در خواب دیدن یا بخواب دیدن۔ خال خال صورتوں میں حروف ظرف ترک بھی کر دیئے گئے ہیں لیکن اسقدر قلّت کے ساتھ کہ کل شاہنامہ میں شاید دو تین مثالیں اس قسم کی ملیں۔ صاحب زلیخا اس مطلب کو بالعموم بلا وصل حروف ظرف خواب دیدن لکھتا ہے اگرچہ بعض اشکال میں وہ حروف ظرف بھی لاتا ہے۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) یکے خواب دیدم من ای شہریار   کہ ہرگز ندیدہ کسے در دیار (ص ۴۴)

(۲) دگر خواب دیدی کسے سخت و سست   پسندیدہ تعبیر کردی درست (ص ۱۳۹)

(۳) دلم دوش دیدہ است خوابی شگفت   ندانم چہ اندازہ باید گرفت (")

(۴) دگر گفت من خواب دیدم چنان   کہ بر سر کشیدم ہمی بار زنان (ص ۱۴۰)

چند مثالیں شاہنامہ سے بھی نقل کی جاتی ہیں ؎

(۱) چنین دید در خواب کز کوہ ہند   درفشے برافراختندے بلند (ص ۲۹) جلد اوّل

(۲) بپرسید از دو دخت افراسیاب   کہ فرزانہ شاہا چہ دیدے بخواب (ص ۱۲۵) "

(۳) چنان دید روشن روانش بخواب   کہ رخشندہ شمعے بر آمد ز آب (ص ۱۷۰) جلد دوم

(۴) چنان دید گوینده یک شب بخواب   یک جام مے داشتے چون گلاب (ص ۲) جلد سوم

اسی طرح ہاتھیوں کے پاؤں میں روندے جانے کے خیال کو دونوں استادوں نے باندھا ہے۔ فردوسی کہتا ہے ؎

دگر ہیچ کڑّے گمانے برم   بزیر پئے پیل تان بسپرم (ص ۳۳) جلد اوّل

زلیخا میں آتا ہے ؎

بزیر پئے پیل تان افگنم   بن و بیخ تان از جہان برکنم (ص ۱۶۳)

ظاہر ہے کہ مدِ مقابل فقروں میں افعال سپردن اور افگندن میں فرق ہے اور سپردن افگندن کے مقابلہ میں زیادہ فرسودہ اور پارینہ معلوم ہوتا ہے۔

کسی اور مثال میں دونوں استادوں کے خیالات ایک ہی سمت سفر کر رہے ہیں۔ فردوسی کہتا ہے ؎

و دیگر کہ از تو مگر کردگار   نشاید یکے کودکم در کنار (ص ۸۶) جلد اوّل

صاحب زلیخا یہی مطلب یوں قلم بند کرتا ہے؎

دعا کن مگر ایزد کردگار — نشاند مرا کودکے در کنار (ص ۱۰۰)

مقابلہ دونوں آخری مصرعوں میں ہے اور فرق اس قدر ہے کہ فردوسی کے ہاں ترکیب ذرا پُرانی ہے اور زلیخا میں مقابلۃً جدید۔

کنایات و محاورات | ذیل کے محاورات جو زلیخا سے منقول ہیں شاہنامہ میں نظر نہیں آتے۔

(۱) خلیدہ جگر زیر دنداں ربودن (۲) برآوردن درخت مراد از بُن (۳) دارو ے مہر کسے خوردن۔
(۴) چہرۂ بخت را طپانچہ زدن (۵) نامۂ چیزے در نوردن (۶) در عاشقی فرو کوفتن
(۷) گلِ دولت از باغ شادی چیدن (۸) ارزیز بر چشم بخت ریختن۔

اِن کی بندش کہہ رہی ہے کہ وہ ایسے وقت کی یادگار ہیں جب کہ زبان میں ایک معتد بہ حصّہ تک رنگینی اور حلاوت کی چاشنی پیدا ہو چکی تھی جو بات فردوسی کے عہد میں قلّت کے ساتھ معلوم تھی۔

برخلاف اِس کے شاہنامہ میں ایسے محاورات اور کنایات آتے ہیں۔

(۱) گلیم اندر آب افگندن (۲) گوز بر گنبد افشاندن (۳) آب در زیر کاہ بودن
(۴) طبل بزیر گلیم کوفتن (۵) گاو میسہ بچرم اندر بودن (۶) ماہی بخشکی بردن
(۷) کار امروز را بفردا ماندن (۸) آب از تارک برتر گزشتن۔

شاہنامہ میں ایک کنایہ خشت خام در آب افگندن (کنایہ از کار بے سود کردن) آتا ہے۔ شاہنامہ؎

چو کردار با ناسپاساں کنی — ہمی خشت خام اندر آب افگنی

زلیخا میں اس کے قریب قریب یوں آتا ہے شعر

ہر آں گہ کہ افتاد در آب خشت — مرا باک نبود ز باراں چو کشت

لیکن صاحبِ زلیخا کا مقصد بالکل مختلف ہے جس کو شاہنامہ میں کشتی بہ آب انداختن کے ذریعہ سے ادا کیا گیا ہے؎

توکشتی بآب اندر انداختی — زرستم ہمی چاکری خواستی (ص ۲۰) جلد سوم

لا اعلم مصرع — ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

فردوسی کے ہاں ایک اور کنایہ خورشید را چوں توان نہفتن آتا ہے شاہنامہ ؎

یکایک بمرد گراں مایہ گفت — کہ خورشید را چوں توانی نہفت (ص ۲۱) جلد اول

یوسف زلیخا میں اس کی شکل شمس اندوہ داشتن بگل میں تبدیل کر لی گئی ہے۔ زلیخا

کہ او لاد او فائیند (کذا) دخجل — ہمی شمس اندوده دارد بگل (ص ۷)

اسدی طوسی ؎ چنیں داد پاسخ بت دل گسل — کہ خورشید پوشید نتواں بگل (گرشاسپ نامہ ص ۱۸)

مولانا نظامی گنجوی برآشفت نوشابہ زاں شیر دل — کہ پوشید خورشید را زیر گل

ولہٗ

کہ با من چہ سود است کوشیدنت — بگل روئے خورشید پوشیدنت

(سکندر نامۂ بری ص ۲۱۶ مطبع نامی لکھنؤ ۱۸۹۸ء)

بہاء الدین محمد بن المؤید بغدادی یشعر

چو آفتاب یقینت شود کہ در جرمم — گر آفتاب بگل بیش ازیں نیندائی

(لباب باب ششم۔ ص ۱۴۱)

قاضی امام مجد الدین الغنوی ؎

چو ماہ عمر تو اندر محاق پیری شد — تو آفتاب حقیقت بگل چہ اندائی

(لباب۔ فصل دوم باب ہفتم ص ۲۲۵)

اس کنایہ کی آخری شکل یہ قرار پائی۔

"فصل فضل او اثبات کردن آب دریا بغربیل پیمودن بود و چشمۂ آفتاب را بگل اندودن۔"

(محمد عوفی۔ لباب الالباب فصل دوم از باب ہفتم ص ۲۲۹)

سعدی — بگفت آنچہ دانست پاکیزہ گفت — بگل چشمۂ خور نشاید نہفت (بوستاں)

امثال بالا سے ہم کو اس قدر علم ہوگیا ہے کہ کم سے کم فردوسی اور اس کا تتبع اسدی طوسی آفتاب بگل اندودن
کے کنایہ سے واقف نہ تھے۔ یعنی اس کی یہ شکل ان ایام میں رائج نہ تھی۔ برخلاف اس کے صاحب زلیخا اس محاورہ
سے واقف معلوم ہوتا ہے جب کو بصر درت شعر "شمس بگل اندودن" لکھتا ہے۔

توصیفات

زلیخا میں اسمائے صفات ذیل کی صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔

(۱) سپہر وفا آفتاب ہنر (۲) کہ اے گلشن حسن و خورشید جاہ
(۳) خرد مند لاوے چراغ بصر (۴) چراغ جہاں یوسف ژرف یاب (۵) ہنرمند یوسف چراغ زمن
(۶) سرافراز۔ اصیل پاکیزہ کیش (۷) یہ لبیاے پرمہر فرہنگ یاب (۸) زلیخائے مہ پیکر پیش بیں
(۹) نکونام یعقوب فرخ خصال (۱۰) رخ روشنش کیمیائے جلال (۱۱) بوائے زلیخا بت سنگ دل

ان میں اکثر مرکبات توصیفی اس قسم کے ہیں جن کو تشبیہی اضافات نے ترکیب دیا ہے شاہنامہ میں تشبیہی اضافات کا قلت کے ساتھ رواج دیکھا جاتا ہے اور ایسے مرکبات مثلاً کیمیاے جلال۔ گلشن حسن۔ چراغ بصر۔ چراغ جہاں چراغ زمن۔ چراغ دل اور فرہنگ یاب بالکل نامعلوم ہیں۔ چراغ کی تشبیہ زلیخا میں بالخصوص بہت عام ہے۔ شاہنامہ اس قسم کی ایک مثال بھی نہیں ملی۔

علاوہ ازیں زلیخا میں دیکھا جاتا ہے کہ اسمائے صفات کے انتخاب میں خوش سلیقگی سے کام نہیں لیا جاتا۔

بعض مثالیں پیش ہیں زلیخا ؎

بنزدیکی خواں بدانش نشست   کشیدش سوے خوان فرہنگ دست (ص ۱۸۰)

یہ شعر اس وقت آتا ہے جب کہ حضرت یامین حضرت یوسف کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھتے ہیں۔ خوان کے لیئے خوان دعوت، خوان نعمت وغیرہ مشہور صفات ہیں۔ شاعر نے ان سے احتراز کرکے خوان فرہنگ لکھا ہے۔ ناظرین خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ خوان کو فرہنگ سے کیا مناسبت ہے؟

کہ مسکیں زلیخائے فرہنگ جوے   بدیں بندۂ خود سیہ کرد روے (ص ۱۳۰)

یہ وہ موقع ہے کہ عزیز مصر پر حضرت یوسف کی بے گناہی کا نقش جم جاتا ہے لیکن بدنامی کے خیال سے زلیخا کو بھی سزا دینا نہیں چاہتا۔ اس موقع پر زلیخا کو فرہنگ جوئے کہنا کون سی خوش مذاقی کی دلیل ہے۔

ذیل میں کچھ امثال شاہنامہ سے پیش ہیں ؎

(۱) چمانندۂ دیزہ ہنگام گرد — چرانندۂ کرگس اندر نبرد
فزایندۂ باد آورد گاہ — فشانندۂ خوں ز ابرِ سیاہ
گرایندۂ تاج و زرّیں کمر — نشانندۂ شاہ بر تختِ زر (ص ۳۵) جلد اوّل

(۲) گرایندہ گرز و کشایندہ شہر — ز شادی ہر کس رسانندہ بہر
کشندہ درفشِ فریدوں بجنگ — کشندہ سرافراز جنگی پلنگ (ص ۳۹) جلد اوّل

(۳) پناہِ گواں پشتِ ایرانیاں — فرازندۂ اخترِ کاویاں
سرافراز گردن کشِ پیل تن — سزاوار ہر شہر و ہر انجمن
خداوند نیروی و فرزانگی — نگہدار گیتی بمردانگی (ص ۴۷) جلد اوّل

(۴) نبیرہ جہاندار کاؤس کے — دل افروز و پردانش و نیک پے (ص ۲۴۷) جلد دوم

(۵) خداوند دولت خداوند زور — جہاں گیر و بخشندہ بہرام گور (ص ۱۳۰) جلد سوم

(۶) وزاں پس شود شہریاری بلند — جہاندار و نیک اختر و سودمند (ص ۸۰) "

(۷) سخن گوی و روشن دل و یادگیر — خردمند و دانا و گرد و دبیر (ص ۶۷) جلد چہارم

(۸) جہاندار باداد و نیکو کنش — فشانندۂ گنج بے سرزنش
فزایندۂ نام و تختِ قباد — گزارندۂ تاج دادر ند و داد (ص ۳۰۵) جلد چہارم

حرف عاطفہ کے ساتھ اسمائے صفات کو ترکیب دینا فردوسی کے ہاں زیادہ رائج ہے زلیخا میں یہ صورت خال خال موقعوں پر ملیگی - علی ہذا ایسی ترکیبیں مثلاً نشانندۂ شاہ - ستانندۂ گاہ - فشانندۂ گنج - گزارندۂ تاج - فزایندۂ نام - زلیخا میں غیر حاضر ہیں -

عربیت پیشتر ایما کیا جا چکا ہے کہ زلیخا میں عربی الفاظ کی آمیزش ایک غیر ضروری حد تک دیکھی جاتی ہے یہاں اس مفہوم کو زیادہ وضاحت دینے کے ارادہ سے اس قسم کی چند مثالیں دی جاتی ہیں ؎

امثال (۱) چنیں گفت الٰہی بالآئے خویش — باجلال و اعزاز و نعمائے خویش (ص ۹۰)

(۲) ہماں شہرہا و نواحی تمام　　ہمہ ملک معمور با آں نظام (ص ۱۵)

(۳) چو بر شد بمنبر بدیں حسن و زیب　　گسست از ہمہ خلق صبر و شکیب (ص ۹۳)

(۴) بدیں ظن زناں جملہ دیدند فرض　　بد و خویشتن جملہ کردند عرض (ص ۱۳۵)

(۵) وفادادہ بد مر براہیم را　　مر آں اصل تبجیل و تعظیم را (ص ۴۴)

(۶) زنادانی آں خواب را خاص و عام　　نہادند اضغاث و احلام نام (ص ۱۴۴)

(۷) مرا با چنیں حسن و چندیں جمال　　نخواہی حدیثے ست صعب و محال (ص ۱۱۴)

عربی الفاظ کی فارسی افعال کے ساتھ ترکیب کی مثالیں:۔ نظم آوردن۔ نظم آراستن لطف کردن۔ تضرع نمودن۔ فرح دادن۔ سفر افتادن۔ نسب ساختن۔ کفارت کردن۔ نقصان بودن۔ معزول کردن۔ مخذول کردن۔ تحیات کردن۔ عفو خواستن۔ فضل داشتن۔ عزت نہادن۔ منع کردن۔ فرو کردن۔ بضاعت داشتن۔ موقع فتادن۔ عقوبت رساندن۔ سیاست کردن۔ ضائع شدن۔ رسوم نہادن۔ عقد بستن۔ خطبہ خواندن۔ فلاح یافتن۔ اِن مرکب افعال میں سے اکثر شاہنامہ سے غیر حاضر ہیں۔

فارسی اضافت کے ساتھ عربی الفاظ کی ترکیب:۔ اصلِ تبجیل۔ عیبِ عظیم۔ تاویل احلام عزیز ذلیل۔ مالک رقاب۔ قرشِ عظیم۔ حرمتِ عظیم۔ کمالِ عظیم۔

عربی فارسی الفاظ کی ترکیب:۔ تعبیر خواب۔ رؤے ایجاب۔ آیت دوری۔ کیش عظیم۔ جاہِ عظیم نقش مانی۔ درِ عاشقی۔ نقشِ چینی۔ نامۂ عمر۔ سلیہاے زر۔ کارسمائی۔ گل معجزہ۔ خون فرزّر۔

اضافات کا استعمال:۔ قرصۂ شمس گیتی فروز۔ سررشتۂ صبر۔ قرصۂ آفتاب۔ شکر خدای جہان آفریں

فارسی حروف کے ساتھ عربی الفاظ کا استعمال:۔ ازیں نوع۔ بدیں نوع۔ بے مونس۔ قضارا بارضا۔ حرمتگہ۔ کثیر و قلیل۔ بے محابا۔ با نظام۔ اندک نظیر۔ گزشتہ بالا ترکیبوں میں سے جو زلیخا سے منقول ہیں۔ اکثر صورتیں شاہنامہ سے غیر حاضر ہیں۔

زلیخا کے برخلاف شاہنامہ میں عربیت کا اثر نہایت دھندلا ہی اس کا اصلی سبب یہ ہی کہ فردوسی کے عہد تک فارسی زبان عربی کے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی تھی۔ ابتداءً صرف چند

ضروریات کی بنا پر عربی خرمن سے خوشہ چینی کی گئی تھی اِن میں سب سے پہلے مذہبی ضرورت تھی اس بنا پر ہر مُسلمان کے لیئے اپنے مذہبی مصطلحات کا جاننا ضروری تھا جو عربی تھیں مثلاً نماز۔ دعا۔ درود۔ سلام۔ حلال۔ حرام۔ حمد۔ ثنا۔ حدیث وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے اس عہد کی ضروریات زندگی کی بنا پر بھی عربی الفاظ کا ایک محدود اور ضروری ذخیرہ مستعار کیا گیا تھا مثلاً صندوق۔ شمع۔ منبر۔ قرطاس۔ قبر۔ قار۔ لحم۔ معصفر۔ منزل۔ مجلس۔ صحرا۔ حرف۔ جمال۔ حُسن۔ عشق۔ عید۔ ساقی۔ قدح۔ تیسری ضرورت میں علمی اصطلاحات تھیں جن کے لیئے فارسی زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں تھا۔ مثلاً نظم۔ نثر۔ شعر۔ بیت۔ غزل۔ قصیدہ۔ خط وغیرہ وغیرہ۔ چوتھی قصائد میں شعر الفظی شان و شوکت۔ لفّاظی اور قوّافی کی ضروریات سے بھی عربی الفاظ مُستعار لیتے رہے تھے۔ تاہم یہ عربی ذخیرہ فارسی میں ایک محدود پیمانہ پر تھا اور اکثر ایسا تھا جس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔

شاہنامہ اس کی سب سے بہتر مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں وہی عربی الفاظ ملتے ہیں جو مختلف ضروریات کی بنا پر فارسی میں رائج الوقت ہو چکے ہیں اور فارسی روزمرّہ میں داخل ہیں۔ اِن میں سے بعض کی امثال اوپر دی جا چکی ہیں۔ علاوہ ازیں فردوسی خود بھی ایسے الفاظ عربی سے دام لیتا ہے جن کی اشد ضرورت محسوس کرتا ہے۔ مثلاً بیت اور نظم فارسی میں اِن کا کوئی مرادف نہیں ملا اس لیے اِن ہی پر متصرف ہو گیا۔ نظم و نثر کا ترجمہ اِس نے پیوند اور پراگندہ کیا ہے لیکن ان پر خود اس کو اطمینان نہیں ہے قافیہ کی ضرورت سے بھی وہ گاہی گاہے عربیت کا منت پذیر ہوتا ہے مثلاً منجنیق شاہنامہ میں اس لفظ کے بغیر گزارہ دشوار تھا اِس لیے وہ تو لے لیا لیکن قافیہ کی ضرورت سے ایک اور لفظ کی تلاش ہوئی فارسی میدان میں اس کی تجسّس بے سود تھی ناچار عربی سے جاثلیق وام کیا۔ اب شاہنامہ میں جہاں کہیں قافیۂ اوّل منجنیق ہے قافیۂ ثانی بلا استثنا جاثلیق ہے۔ اِسی طرح لفظ نیا (جد مادرے و پدرے) کے قافیہ کے لیئے کیمیا اور کف کے لیئے صف تلاش کیئے گئے۔

یا بعض مصطلحات جنگ ہیں۔ مثلاً ساقہ۔ میمنہ۔ میسرہ۔ قلب۔ جناح وغیرہ ابتدا میں دقیقی کے تتبع میں فارسی راست۔ چپ۔ میاں گاہ۔ پسِ پُشت۔ یک دست اور دست دگر کی ترویج کی لیکن بعد میں اُن کو ترک کر کے عربی اصطلاحات پر ہی قناعت کر لی۔ عربیت سے فردوسی کا اجتناب اس ایک چھوٹی سی مثال سے ظاہر

ہو جاتا ہے کہ مختصر اور پیش پا افتادہ الفاظ تعبیر معتبر سے اعراض کرکے اِن کی بجائے لمبے لمبے فارسی الفاظ مثلاً "گزارشِ خواب" "گزاریدنِ خواب" اور گزرانندہ خواب لاتا ہے قدمانے یہی سلوک "عید قرباں" کے ساتھ کیا ہے جس کو "جشن گوسفند کشاں" یا "عید گوسفند کشاں" کہا جاتا تھا۔ رودکی سے

باد بر تو مبارک و خنشاں   جشنِ نوروز گوسفند کشاں

لیکن سلجوقی عہد سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ اقلیم زباں پر بھی انقلاب لاتا ہے اس دور کی نسلوں کا مذاق بدل چکا تھا۔ اس عہد میں دری فارسی یا خالص فارسی لکھنا بد مذاقی میں داخل تھا۔ عربی نمونوں کے مطابق سجع نے فارسی میں بھی اپنا قدم جمایا جس کے خلاف بعض حلقوں میں صدائے احتجاج بھی بلند کی گئی۔ نئے مذاق اور سجع پسندی نے زبان پر عربی الفاظ کا عنصر غالب کر دیا جس کے لیے کوئی خط حدبندی قائم نہیں تھا۔ اِس زمانہ کے ادیب خالص فارسی لکھنے سے لوگوں کو مانع آتے تھے۔ امیر کیکاؤس قابوس نامہ میں لکھتا ہے:-

"و اگر نامہ بود پارسی۔ پارسی مطلق منویس کہ ناخوش بود۔ خاصہ پارسی دری کہ نہ معروف بود" (باب سی وہشتم)

عربی کے واسطے جو جنون اس دور میں محسوس ہو رہا تھا اس کی وسعت اِس مثال سے مفہوم ہو سکتی ہے کہ قدما کے ہاں "شگفت ماندن" ایک عام محاورہ ہے۔ شاہنامہ سے

زگفتارِ او ماند خسرو شگفت   چو شرم آمدش پوزش اندر گرفت   (ص ۶، جلد چہارم)

اب یہ محاورہ اگرچہ جاری رہتا ہے لیکن اس اصلاح کے ساتھ کہ شگفت ماندن کی بجائے عجب ماندن نے رواج پایا اور میدان وقت گزرنے پر موخر الذکر ہی کے ہاتھ رہا۔

یہی سلوک قدما کے محاورہ "بند بستن" کے ساتھ کیا گیا ہے۔ شاہنامہ سے

(۱) بفرمود تا رفت مہراب پیش   بہ بستند بندے بہ آئین و کیش   (ص ۴۴، جلد اول)

(۲) بہ بستند بندے بہ آئین و کیش   بدانساں کہ بود آنزماں دین و کیش   (ص ۶،)

متاخرین نے اِس میں بھی یہی ترمیم کی کہ فارسی بند کو ترک کرکے اس کی جگہ عربی عقد کو رواج دیا۔ زلیخا سے

بتزویج پیغمبرِ پاک دیں　　بدیں پرہنر دخترِ مہ جبیں
بخواں خطبۂ و عقد شاں بستہ کن　　دلِ ہر دو شاں را زہم رستہ کن　(ص ۲۲۲)

آج بندبستن اسی قدر غیر معروف ہی جس قدر کہ اس کا متحلف عقد بستن یا عقد کردن مشہور ہی۔

زلیخا کی عربیت پر نظر ڈالتے ہوئے مشکل سے اُمید کی جاتی ہی کہ وہ فردوسی یا اس کے عہد کی تصنیف ہو۔ کیونکہ جب شاہنامہ اِس نے زبان رائج الوقت میں لکھا ہی تو زلیخا کی زبان کو سکۂ رائج نہیں کہا جا سکتا۔ زلیخا کے عہد کی زبان پر عربیت زیادہ غالب تھی۔ اِن دونوں کی زبان کا فرق دکھانے کے لیئے میں ذیل کی مثال پیش کرتا ہوں۔ شاہنامہ ؎

ازیں راز جانِ تو آگاہ نیست　　دریں پردہ اندر ترا راہ نیست

(جلد اول ص ۵۵۸ تمہید داستانِ سہراب)

زلیخا　　کس از سرِ ایں حکمت آگاہ نیست　　دریں پردہ مخلوق را راہ نیست　(ص ۱۵۱)

صاحبِ زلیخا نے اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق عربی الفاظ لاکر فردوسی کی زبان کی کھنگی کو برطرف کر دیا ہی۔ اور شعر پر اپنا قبضہ کر لیا ہی۔

شاہنامہ پر ایک سرسری نظر

اِس وقت تک تصویر کا ایک پہلو مُعائنہ کیا گیا ہی۔ تصویر کے دوسرے پہلو کے بغیر ہماری تحقیقات کا پورا مرحلہ طے نہیں ہو سکتا۔ زلیخا کے بعد ضروری ہوا کہ شاہنامہ پر بھی ایک نگاہ ڈالی جائے۔ اِس مثنوی کا سرسری مشاہدہ اس علم کے لیئے کافی ہی کہ مُصنف یُوسف زلیخا فردوسی کے ایسے کلمات اور فقرات سے جو شاہنامہ میں روزمرّہ کا حکم رکھتے ہیں اور فردوسی جن کی تکرار سے تھکتا نظر نہیں آتا، یوسف زلیخا کے دوران میں بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہی۔ یہاں ایسے سینکڑوں کلمات سے بخوفِ طوالت صرف چند نمونوں پر اکتفا کی جاتی ہی۔

ابی۔ کلمۂ نفی بمعنی بی۔ امثال از شاہنامہ ؎

(۱)　ابی آں کہ بد ایچ بیمار ئیے　　نہ از درد ہا ہیچ آزار ئیے　(ص ۴۹)، جلد اوّل
(۲)　ہمہ چیں بسوز ارہ و گریاں شدند　　ابی آتش از درد بریاں شدند　(ص ۹۶)، جلد چہارم

شاہنامہ میں اگرچہ عموماً مستعمل ہے زلیخا سے قطعاً خارج کر دیا گیا ہے۔ اسدی ؎

اے آقا با تراچیست حال   چنیں تیرہ شب دل گرفتم ملال

(گرشاسپ نامہ ص۶۰۔ طبع آقا محمد شیرازی بمبئی)

ایدون - بمعنی اکنوں وچنیں شاہنامہ ؎

(۱) سر با نوانی و ہم مہتری   من ایدون گمانم کہ تو مادری (ص۱۰۵، جلد اوّل)

(۲) من ایدون شنیدم کہ جائے مہی   ہمی مردم ناسزا را دہی (ص۱۱۳، جلد چہارم)

یہ لفظ بھی زلیخا سے غیر حاضر ہے اور اسدی کے ہاں موجود ہے ؎

من ایدون ز طبعم بہار آورم   مرایں شاخ را نو بہار آورم (ص۱۱، گرشاسپ نامہ)

چناں چوں - یہ ترکیب قدما کے ہاں اکثر رائج ہے۔ دقیقی ؎

نوشتم من ایں نامۂ شاہوار   چناں چوں بود درخور شہریار

(شاہنامہ ص۴ جلد سوم)

فردوسی (۱) بیاید نہ بازار مردے ہزار   چناں چوں نہ زیبندۂ کارزار

(شاہنامہ ص۱۳ جلد سوم)

(۲) چناں چوں بدم کہتر کیقباد   کنوں از تو دارم دل و مغز شاد

(شاہنامہ ص۳۲ جلد سوم)

اسدی زدل برکشندی تف درد و تاب   چناں چوں بخارا زز میں آفتاب (ص۱۵، گرشاسپ نامہ)

زلیخا میں متروک ہے۔

تفت - بمعنی گرم - شاہنامہ میں عام طور پر ملتا ہے۔ امثال ؎

(۱) سپہ بدبدر روئے بنہاد تفت   بکردار بازار گاناں برفت

(شاہنامہ جلد سوم ص۲۳)

(۲) مقاتورہ از پیش خاقاں برفت   بیامد سوئے خرگہ خویش تفت (شاہنامہ جلد چہارم ص۵۵)

اسدی وزآں جا سپہ اندر شتاف تفت بشادی بشہری زنجاب رفت (گرشاسپ نامہ ص۵۹)

زلیخا میں رائج نہیں۔

یارمند شاہنامہ میں عام طور پر ملتا ہے امثال ؎

(۱) بدارندۂ آفتابِ بلند کہ با شم شمارا بدو یارمند

(شاہنامہ۔ جلد چہارم ص۴۳)

(۲) نخواہم کہ آید شمارا گزند میاشید با من بہ بد یارمند (ص۱۲۳) جلد چہارم

اسدی بود کاخرت یارمندی کند ہمہ دشمنت دل نژندی کند

(ملحقاتِ شاہنامہ ص۹)

گمانیدن ۔ امثال از شاہنامہ ؎

(۱) گمانند کیں بیشہ پر خوں شود ز دشمن زمیں رود جیحوں شود (ص۱۲۱) جلد چہارم

(۲) ازاں کو ہم آد از دہم کیش و ست گمانم کہ قیصر تن خویش است (ص۱۰) ؍

اسدی ز رستم ہمی چونکہ خواہی شنود گمانے کہ چوں او دبر دی نبود (گرشاسپ نامہ ص۱۰)

زلیخا میں نظر نہیں آتا۔

گرایدونکہ ۔ قدما کے ہاں یہ ترکیب مستعمل ہے۔ دقیقی ؎

گرایدونکہ بندپر داو پند ما نشاید ہمی پاے او بند ما

(شاہنامہ جلد سوم ص۴)

فردوسی گرایدونکہ از دشت نیزہ وراں بنالد کسے از کراں تا کراں

(شاہنامہ جلد چہارم ص۵)

(۲) گرایدونکہ باز آرد آں اگفت گناہِ گزشتہ باید نہفت

(شاہنامہ۔ جلد دوم ص۱۹)

زلیخا میں مہجور الاستعمال معلوم ہوتا ہے۔

درایدونکہ - زلیخا میں سکۃً غیر رائج ہے۔ دقیقی ؎

درایدونکہ بپذیری این پندِمن — بسائی گران آہنیں بندِمن

(شاہنامہ، جلد سوم ص۲)

فردوسی — درایدونکہ زین کاہستم گناہ — جہاں آفرینم ندارد گناہ

(شاہنامہ جلد اوّل ص۱۰)

(۲) — درایدونکہ پیران کند دست پیش — بخواہد سپہ یاوراز شاہِ خویش

(شاہنامہ جلد دوم ص۱۲۸)

ارایدونکہ قدما اکثر یہ ترکیب استعمال میں لاتے ہیں۔ دقیقی ؎

ارایدونکہ بپذیری این نیک پند — زترکان بجانت نیاید گزند

(شاہنامہ جلد سوم ص۴)

فردوسی — بدو گفت ارایدونکہ کین نیا — بجوئی نداری بدل کیمیا

(شاہنامہ جلد سوم ص۱۵)

(۲) — ارایدونکہ پیران نخواہد نبرد — بانبوہِ لشکر بیارد چو گرد

(شاہنامہ جلد دوم ص۲۳۵)

زلیخا میں نامعلوم ہے۔

برآہم نشاں - یعنی ہماں طور، شاہنامہ میں یہ ترکیب کثرت سے ملتی ہے زلیخا میں نہیں ملتی ؎

شاہنامہ — بریزند خونش برآہم نشاں — کہ او ریخت خون سر سرکشاں (ص۵۰) جلد چہارم

(۲) — برآں ہم نشاں تاقبادِ بزرگ — کہ از دادِ او میش شد خویش گرگ (ص۵۰) ء

تنگ اندر آمدن - نزدیک آمدن، بالعموم شاہنامہ میں آتا ہے۔ شاہنامہ ؎

چو جاماسپ تنگ اندر آمد زجاہ — ورا بازدانست فرزند شاہ (ص۴۴) جلد سوم

(۲) — دو لشکر چون تنگ اندر آمد زراہ — از انسو سپہدار ازین سو شاہ (ص۱۶) جلد چہارم

مثنوی زلیخا میں یہی مقصد یوں ادا ہوا ہے

(۱) شدم تا بہ نزدیک آں شہر تنگ — کہ ناگہہ برآمد یکے بوے و رنگ (ص ۱۰۶)

(۲) بگفت این و تنگ اندرش شد برش — کہ بوسہ باید زدو شکرّش (ص ۱۰۹)

فرماں کردن - اطاعت کردن - شاہنامہ میں کثرت کے ساتھ آتا ہے - امثال

(۱) چنین داد پاسخ کہ فرماں کنم — بدیں آرزو جاں گروگاں کنم (ص ۲۸۳) جلد دوم

(۲) اگر باژ خواہی تو فرماں کنیم — بنوے یکے باز پیماں کنیم (ص ۵۳) جلد سوم

زلیخا میں غیر مستعمل ہے -

بزار - اسے بزاری - شاہنامہ میں آتا ہے - امثال

(۱) خروشے برآمد ز ایراں بزار — جہاں شد پر از نام اسفندیار (ص ۴۴) جلد سوم

(۲) کہ بگریستی بر مسیحا بزار — دو رخ سرخ و مژگاں چو ابر بہار (ص ۷۹) جلد چہارم

زلیخا میں معدومیت کا حکم رکھتا ہے -

کیمیا - حیلہ و تدبیر - شاہنامہ میں عموماً نظر آتا ہے - امثال

(۱) یکے آں کہ گفتی کہ کین نیا — بجستم من از چارۂ کیمیا (ص ۲۶) جلد سوم

(۲) بزیں اندر افگند گرز نیا — پر از جنگ سر دل پر از کیمیا (ص ۲۱۲) جلد دوم

زلیخا اس نقطے سے واقف نہیں -

پیراں سر - اے پیرانہ سر - شاہنامہ امثال

(۱) گر باز گردد ز بد نام من — بہ پیراں سر ایں بد سر انجام من (ص ۲۱۳) جلد دوم

(۲) نہ بینی کزیں بے ہنر دخترم — چہ رسوائی آمد بہ پیراں سرم (ص ۲۰۹) "

دست بکش کردن اسے دست بر سینہ نہادن - شاہنامہ میں عموماً آتا ہے - امثال

(۱) بکاخ اندروں شد پرستار وش — بر شاہ بر دست کردہ بکش (ص ۲۰۹) جلد دوم

(۲) بفرمود تا لنبک آب کش — بر شاہ بر دست کردہ بکش (ص ۱۱۴) جلد سوم

زلیخا میں نایاب ہے۔

گروگاں کردن لے گرو کردن بالعموم شاہنامہ میں ملتا ہے اور زلیخا میں نادر ہے امثال از شاہنامہ ؎

(۱) شما دادجوئید و فرماں کنید — روان را بہ پیماں گروگاں کنید (ص ۶۰) جلد سوم

(۲) ہمہ پیش تو باں گروگاں کنیم — زدیدار تو رامش جاں کنیم (ص ۱۶) "

بادگشتن شاہنامہ میں عموماً نظر آتا ہے اور زلیخا میں نہیں ملتا۔ امثال ؎

(۱) کنوں آں بہ بد بود برما گزشت — گزشتہ ہمہ نزد من بادگشت (ص ۱۶) جلد سوم

(۲) بدارا بگفت آنچہ اندر گزشت — چناں دان کہ یکسر ہمہ بادگشت (ص ۵۳) "

باد در مشت یا بدست ماندن۔ شاہنامہ کا عام محاورہ ہے۔ امثال ؎

(۱) کہ مارا کنوں جان بسپا اندرست — چو سستی کند باد ماند بدست (ص ۵۶) جلد سوم

(۲) سپاہ اندر آید پس پشت من — نماند بجز باد در مشت من (ص ۲۲۲) جلد دوم

(۳) بگیرند گردن کشاں پشت اوے — نماند بجز باد در مشت اوے (ص ۲۲۹) "

(۴) بدیں شہر درویشی و رنج ہست — ازیں بگزری باد ماند بدست (ص ۶) جلد سوم

زلیخا میں معدوم ہے۔

ہوش باز آوردن۔ زلیخا میں نظر نہیں آتا۔ شاہنامہ ؎

(۱) چنین داد پاسخ کہ بازار ہوش — کہ من پور قیدافہ ام قید روش (ص ۶۷) جلد سوم

(۲) بدو گفت گرگیں کہ باز آر ہوش — سخن بشنو و پہن بگشائے گوش (ص ۲۱۰) جلد دوم

کام کژی خاریدن شاہنامہ میں دیکھا جاتا ہے اور زلیخا نا واقف ہے امثال ؎

(۱) بجاں اشبے دمت زینہار — بایوان رسی کام کژی مخار (ص ۳۹) جلد سوم

(۲) چنیں گفت با شاہزادہ نخوار — کہ با مردمی کام کژی مخار (ص ۱۰۹) جلد چہارم

آب از تارک برتر گزشتن شاہنامہ ؎

(۱) زتارک مرا آب برتر گزشت — غم و شادمانی ہمہ بادگشت (ص ۹۶) جلد چہارم

(۲) سپہ از کوشش سخن در گزشت — ز تارک دم آب برتر گزشت (ص ۵۷) جلد سوم

کسے را بکس نداشتن شاہنامہ ؎

(۱) بگیتی ندارد کسے را بکس — تو گوئی کہ نوشیروان ست و بس (ص ۱۷) جلد چہارم

ندارد ز شاہاں کسے را بکس — چہ کہتر چہ از شاہ فریاد رس (ص ۴۱) ״

کس بکس نشمردن۔ شاہنامہ ؎

(۱) ز مردی و گردی بانگ برید — ازیں مرز کس را بکس نشمرید (ص ۱۲۸) جلد سوم

(۲) ز دیدار من گوے بیروں برد — ازیں انجمن کس بکس نشمرد

زلیخا میں عنقا ہے۔

بیدار دل باش و روشن رواں ایک قسم کی دعا ہے جو شاہنامہ میں اکثر آتی ہے۔ امثال ؎

(۱) سپہ آفریں خواند بر پہلواں — کہ بیدار دل باش و روشن رواں (ص ۱۸۱) جلد دوم

(۲) چنیں داد پاسخ بدو پہلواں — کہ بیدار دل باش و روشن رواں (ص ۱۷۹) ״

زلیخا میں نامعلوم ہے۔

کلید و بند اِن کی ترکیب سے شاہنامہ میں کئی محاورے بنائے گئے ہیں۔ امثال ؎

(۱) خبر چوں بہ نزدیک توراں رسید — مر آں بند را ساختہ شد کلید (ص ۱۰۹) جلد اوّل

(۲) ستم بر سیاوش از ایشاں رسید — کزو آمد ایں بند بد را کلید (ص ۱۸۷) جلد دوم

(۳) بسے بر نیامد کہ پاسخ رسید — یکے نامہ بد بند او را کلید (ص ۲۹) ״

(۴) منوچہر ازاں تخمہ آمد پدید — شد آں بندہا را سراسر کلید (ص ۱۲۶) جلد چہارم

زلیخا میں مطلق غیر حاضر ہے۔ نظامی کے ہاں بند کے بجائے قفل آتا ہے۔

آب و جوی اِن کی ترکیب سے شاہنامہ میں کئی محاورے ملتے ہیں۔ امثال ؎

(۱) بمنذر چنیں گفت بہرام گور — کہ اکنوں کہ شد آب در جوی شور (ص ۱۰۹) جلد سوم

(۲) یکے چارہ سازم کہ بدگوے من — تراند بزشت آب در جوی من (ص ۸۶) ״

(۳) چنیں گفت رستم کہ ایں روے نیست | رہ آب گرد اں بدیں جوے نیست (ص ۲۰۰) جلد دوم

(۴) ہمہ زیں شمارند ایں روے نیست | مر ایں آب او رجہان جوے نیست (ص ۱۸۹) "

بادِ سرد از جگر کشیدن فردوسی شاہنامہ میں اس محاورہ کا بہت مشتاق معلوم ہوتا ہے اور بار بار اس کو دُہراتا ہے اور تکرار سے تھکتا نظر نہیں آتا۔ میں صرف چند امثال پر قناعت کرتا ہوں حیرت ہے کہ فردوسی کا نہایت مقبول محاورہ زلیخا سے بالکل متروک ہے۔ شاہنامہ ؎

(۱) چو پیغام گرگیں برستم رسید | یکے بادِ سرد از جگر بر کشید (ص ۲۱۳) جلد دوم

(۲) یکے بادِ سرد از جگر بر کشید | بسوئے گلہ دار قیصر کشید (ص ۲۸۰) "

(۳) بدو داد پس گنجہا را کلید | یکے باد سرد از جگر بر کشید (ص ۴۹) جلد سوم

(۴) چو ردمی سر و تاج کسریٰ بدید | یکے بادِ سرد از جگر بر کشید (ص ۴۲) جلد چہارم

محاکمہ تصویر کے دونوں پہلو امتحان کرنے اور گزشتہ بیانات کو ذہن میں رکھنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ شاہنامہ اور یوسف زلیخا کی زبان میں وہ فرق بیّن موجود ہے جو کسی صورت میں ایک وقت کے دو معاصرین کی زبان میں تصوّر نہیں کیا جاسکتا چہ جائے کہ ایک ہی مُصنّف کی زبان میں خیال کیا جائے۔ اِس لیئے ہم مجبور ہیں کہ اُن کو دو شخص مانیں اور وہ بھی ایسے مختلف العصر اور مختلف الوطن ہوں۔

اور ہمارے وجوہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) دونوں مثنویوں کی مخصوصی خط و خال جو ایک مصنف کی جملہ تصنیفات کا عام جوہر ہونا چاہیئے باہم مشترک نہیں مثلاً ابی - ایدوں - گرایدونکہ - ورایدونکہ - کیمیا - پیران سر - بر آں ہم نشان - نزاد - گُرد گاہ کردن - باد در مشت ماندن - کس بکس شمردن - بادِ سرد از جگر کشیدن - وغیرہ وغیرہ جن سے شاہنامہ کے دوران میں علی التواتر ہم روشناس ہوتے رہتے ہیں۔ زلیخا میں ابتدا ہی سے نامعلوم ہیں علیٰ ہذا زلیخا کے ایسے الفاظ مثلاً بخوئی - خوار بار - جلدی - ہمزاد - غریو و غرنگ - بند و کشاے وغیرہ وغیرہ شاہنامہ میں ایک نامعلوم کمیت کا حکم رکھتے ہیں۔

(۲) بعض مفرّس الفاظ مثلاً ملکت - عفو - لُطف - مشوم - عمدا - عمّاری - مشاطہ کی ترویج بظاہر سلجوقی

عہد میں ہوئی ہے اسی لئے اِس دور کے شعرا میں انکا رواج زیادہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً منوچہری۔ ناصر خسرو۔ اسدی۔ امیر معزی۔ مسعود سعد سلمان۔ عثمان مختاری۔ حکیم سنائی۔ عمعق بخاری۔ ادیب صابر وغیرہ۔ فردوسی جیسا کہ گزشتہ سطور میں دیکھا جاتا ہے ان الفاظ کے لیے کم سے کم قاعدۂ تفریس سے بالکل بے خبر ہے اور جب زلیخا میں ان کا رواج ہے تو بدیہی ہے کہ سلجوقی دور میں کسی وقت لکھی گئی ہوگی۔

(۳) بعض محاورے مثلاً گوش داشتن، گرہ بر زدن جب کہ فردوسی کے ہاں اکثر لغوی معنوں میں آتے ہیں مثنوی یوسف زلیخا میں کنایات کا درجہ حاصل کر کے کچھ اور ہی مفہوم ادا کرتے ہیں اور یہ بات ایک عہد میں حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۴) بعض محاورے جو زلیخا میں بالعموم نظر سے گزرتے ہیں فردوسی ان سے واقف معلوم نہیں ہوتا مثلاً صورت بستن۔ عتاب برداشتن۔ دل برگماردن۔ گرمی نمودن۔ گمان زدن وغیرہ ان کی صورت کہہ رہی ہے کہ ہماری ولادت فردوسی کے عہد سے بہت عرصہ بعد ظہور میں آئی جب کہ تکلف اور رنگینی زبان میں شائع ہو چکی تھی۔

(۵) بعض الفاظ جب کہ شاہنامہ میں رائج ہیں، زلیخا میں مہجور الاستعمال معلوم ہوتے ہیں اور ان کی بجائے اور لفظ لائے گئے ہیں مثلاً بویژہ اور ویژگان شاہنامہ میں ملتے ہیں اور زلیخا میں پہلے لفظ کی بجائے بخاصہ آتا ہے۔ شاہنامہ کے بند بستن کی بجائے زلیخا میں عقد بستن ملتا ہے۔ شاہنامہ کے بادِ سرد کا قائم مقام زلیخا میں آہ ہے۔ اور شاہنامہ کے گذاریدن خواب کے بدلے زلیخا میں تعبیر ملتا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ اور زلیخا کی زبانوں میں بہت فرق ہے۔ اگر شاہنامہ فردوسی کی زبان کا معیار صحیح ہے تو زلیخا فردوسی کے قلم سے ہرگز ہرگز نہیں لکھی گئی۔ کیونکہ فردوسی کے لیے یہ خیال کرنا کہ جب وہ آفتاب لب بام اور پا بلب گور ہو رہا تھا اُس وقت اپنی تازہ تصنیف زلیخا کے لئے نیا اسلوب نئی اصطلاحات اور نئے معانی ایجاد کر رہا تھا ایک ناممکن اور محال عقیدہ ہے۔

(۶) دونوں اساتذہ کی وطنیت میں بھی اختلاف ضرور پایا جاتا ہے۔ ہمارے پاس اس خیال کے مؤید یہ قرائن ہیں فردوسی شاہنامہ میں ساربان کو ہمیشہ ساروان لکھتا ہے۔ زلیخا میں ساربان آتا ہے۔ اب ساربان اور

سارواں ایک ہی خطۂ ملک میں نہیں بولی جاسکتی۔ علیٰ ہذا ابرج اور دبرج ایک ہی شہر میں نہیں بولے جاسکتے جس وطن میں خرید و فروخت بولنے کے عادی ہیں وہاں خرید و فروش رائج نہیں ہوسکتا۔ جس شہر میں کاریگر معمار کے معنی دیتا ہے وہاں یہ لفظ ملازم کے معنی نہیں دے سکتا جس وطن میں آذین بستن عوام میں بولا جاتا ہے وہ آئین بستن نہیں کہینگے۔ اور غریدین جہاں ۔۔ شور اور فریاد کے معنوں میں مستعمل ہے وہاں اس کو گریہ و زاری کے معنوں میں نہیں بولینگے۔ علیٰ ھذا اپرس اور پرسش ایک جگہ نہیں بولے جاسکتے۔ اسی طرح پوشیدن بجائے پوشانیدن پرہیزیدن بجائے پرہیزانیدن اور شنیدن بجائے شنوانیدن ایک وطن کی بولیاں نہیں ہیں۔ اگر فردوسی کے وطن میں یہ الفاظ جو زلیخا میں ملتے ہیں بولے جاتے تھے تو فردوسی شاہنامہ میں اِن کو ضرور لاتا اور یہ مابہ الامتیاز فرق دونوں تصنیفات میں نہ پایا جاتا لیکن اس فرق کی موجودگی دلیل ہے اس امر کی کہ دونوں اساتذہ کی وطینت میں اختلاف ہے۔

(۷) بعض محاورے اور الفاظ جب کہ دونوں مثنویات میں مشترک ہیں اُن میں یہ امتیاز دیکھا جاتا ہے کہ زلیخا میں جب کہ وہ روزمرّہ بنگئے ہیں شاہنامہ میں من قبیل شاذ لائے گئے ہیں۔ مثلاً گوش داشتن۔ تخت زدن۔ ہمزاد۔ قضارا۔ اُستوار وغیرہ۔ اس سے یہی عقیدہ مستنبط ہوتا ہے کہ دونوں اُستاد مختلف العہد ہیں۔

(۸) بعض امثال کے ذریعہ سے دکھایا جاچکا ہے کہ فردوسی جس حالت میں کہ ادائے مطالب کے لیے ایک محدود میدان میں کدو کاوش اور تنگ و دو کرتا نظر آتا ہے صاحبِ زلیخا ایک فضائے بسیط پر قابض اور متصرف معلوم ہوتا ہے اس سے یہی احتمال ہوتا ہے کہ دونوں شاعروں کو ایک مدّت دراز ایک دوسرے سے جُدا کررہی ہے اور فارسی زبان اس عرصہ میں ترقی کرکے بہت کچھ وسیع ہوچکی ہے۔

(۹) فردوسی اور صاحبِ زلیخا کو ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک دلیل یہ بھی ہے کہ دونوں اساتذہ کی معلومات میں فرق ہے۔ فردوسی ارژنگ کو جادو نیرنگ اور تصویر کے معنوں میں لاتا ہے اور یہ معنی ایسے ہیں جن سے صاحبِ زلیخا واقف تک نہیں۔ یہ بہت غیر مشہور معنی ہیں اور دیگر اساتذہ بھی عام طور پر نہیں جانتے۔ شاہنامہ میں ارژنگ پانچ موقعوں پر تصویر کے معنوں میں آیا ہے اس تکرار سے ظاہر ہے کہ فردوسی کے نزدیک یہی معنی تھے وضاحت کے خیال سے "ارژنگ چین" بھی لکھ دیا ہے۔ تاکہ کسی کو مانی کی ارژنگ کا

دھوکا نہ ہو۔ فردوسی اگر یوسف زلیخا لکھتا تو کیا وجہ ہی کہ وہ اپنی معلومہ معنی زلیخا میں ارژنگ کو نہ دیتا۔ زلیخا میں "ارژنگ مانی" چار مقام پر آیا ہی اور ہر مقام پر مانی کی کتاب یا مانی کے نگارخانہ کے معنی دیتا ہی۔ لیکن شاہنامہ والے معنی کبھی بھول کر بھی نہیں آتی۔ کیا بقول شاعر ؎

پس از سی سال این معنی محقق شد بخاقانی

کہ یورانی ست با دنجان و با دنجان بورانی

فردوسی کو اسی برس کی عمر کے بعد زلیخا تصنیف کرتے وقت محقق ہوا کہ ارژنگ مانی کی کتاب کا نام ہی نہ تصویر اور زنگیر جو معنی اس نے شاہنامہ میں دکھلائے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہی کہ فردوسی مانی کی تاریخ سے واقف ہونے کی بناء پر مانی کی کتاب ارژنگ کے وجود کا قائل نہیں تھا۔ اسی لیئے شاہنامہ میں اس کا ذکر نہیں کرتا اور اگر زلیخا لکھتا تو اس میں بھی اس قسم کی غلطی کے ارتکاب سے پرہیز کرتا۔

(۱۰) یہاں کچھ منٹ کے لیئے میں اپنی بحثِ اصلی سے اعراض کرکے چند الفاظ ایک نئے مضمون کے متعلق کہنا چاہتا ہوں اس سے میرا مقصد اسدی اور اس کا گرشاسپ نامہ ہی۔ اسدی کے متعلق ہمارے ہاں بہت کچھ غلط بیانیاں رائج ہیں اکثر اس کو فردوسی کا اُستاد مانتے ہیں۔ نیز شاہنامہ داستان یزدگرد خاتم تاجداران عجم سے خاتمہ تک اسدی کا نظم کردہ بتایا جاتا ہی۔ لیکن یہ ناقابلِ تسلیم قصہ ہی۔ حقیقت یہ ہی کہ شاہنامہ اور گرشاسپ نامہ میں پورے اٹھاون سال کا تفاوت ہی۔ گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ ہجری میں تصنیف ہوا ہی چنانچہ گرشاسپ نامہ ؎

زہجرت بد ور سپہری کہ گشت

شدہ چارصد سال و پنجاہ و ہشت

گرشاسپ نامہ کا عہد معلوم کرکے سب سے پہلے ہمیں یہ تحقیق کرنا ہی کہ آیا بحیثیت عمر گرشاسپ نامہ متقدم ہے یا مثنوی یوسف زلیخا۔

گرشاسپ نامہ اور مثنوی یوسف زلیخا میں بعض الفاظ اور محاورے عام ہیں مثلاً از آدم دردن تا الخ تخت زدن۔ کِلّہ زدن۔ قضارا۔ مشاطہ۔ نغز و غرنگ۔ اب یہ الفاظ زلیخا گرشاسپ نامہ سے لے رہی ہی یا گرشاسپ نامہ زلیخا سے، اِس کا تصفیہ یوں ممکن ہی کہ "قضارا" زلیخا میں اس کی مکمل شکل میں ملتا ہی جیسے

بوستاں میں لیکن گرشاسپ نامہ میں وہ محض قضا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ "قضا" اور "قضارا" میں قضا زیادہ قدیم ہے اسی طرح "بویژہ" شاہنامہ اور گرشاسپ نامہ میں عام ہے لیکن زلیخا میں متروک ہے اور اس کا قائم مقام "بخاصہ" لایا گیا ہے۔ ان میں ظاہر ہے کہ "بویژہ" قدیم ہے اور "بخاصہ" جدید اس استدلال سے یہ قرینہ برآمد ہوتا ہے کہ زلیخا گرشاسپ نامہ کے بعد کی تصنیف ہے لیکن اس قیاس کو درجۂ یقین تک ارتقا دینے کے لئے ہمیں شاہنامہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے ہم دیکھتے ہیں کہ شاہنامہ اور گرشاسپ نامہ میں ایسے الفاظ مثلاً ابی۔ ایدوں۔ بویژہ۔ چنانچوں تفت۔ یارمند۔ گمانیدن وغیرہ عام ہیں لیکن یہی الفاظ مثنوی یوسف و زلیخا میں مہجور الاستعمال ہیں۔ اگر زلیخا گرشاسپ نامہ سے مقدم ہوتی تو یہ الفاظ اس میں قطعی پائے جاتے چونکہ زلیخا میں موجود نہیں اس سے یہی قابل پذیرائی نظریہ قائم کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ گرشاسپ نامہ کے دور میں رائج تھے لیکن زلیخا کے عہد میں متروک ہونے جاکر آرائش طاق نسیاں بنادیئے گئے تھے اس سے زلیخا پر گرشاسپ نامہ کا تقدم ثابت ہوتا ہے جب گرشاسپ نامہ کا تقدم ثابت ہوگیا تو شاہنامہ کا تقدم خود بخود ظاہر ہے کیونکہ شاہنامہ تو اسدی کی تصنیف سے پورے اٹھاون سال بڑا ہے۔

(۱۱) ہم دیکھتے ہیں کہ فردوسی کے محاورہ اور روزمرہ کے بیسیوں کیا بلکہ سینکڑوں الفاظ صاحب یوسف و زلیخا کے نزدیک مہجور الاستعمال ہیں اور یہ ہمیں ماننا ہوگا کہ سینکڑوں کی تعداد میں الفاظ اور کلمات ایک قلیل مدت یا مہلت میں قلمرو زبان سے اخراج نہیں پاسکتے۔ کیونکہ زبان کسی ایک شخص کی ملک نہیں ہے وہ تمام قوم اور ملک کی زبان ہے اور یہ ہم جانتے ہیں کہ جب تک تمام قوم کسی کلمہ یا لفظ کو اپنی گفتگو سے خارج کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے وہ کلمہ ترک نہیں ہوسکتا۔ ہزاروں بشر ایک دم قتل اور ہلاک کیئے جاسکتے ہیں اور لاکھوں نفوس چند لمحوں میں صفحۂ ہستی سے محو کیئے جاسکتے ہیں لیکن الفاظ کا قتل عام اس طرح عمل میں نہیں لایا جاسکتا ان کی اگر موت ہوتی ہے تو اکثر طبعی ہوا کرتی ہے جب کہ ملک کو اُن کی ضرورت نہیں رہتی اور ان سے بہتر جانشین اور قائم مقام پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً فردوسی کا "خورشید چوں تواں نہفتن" اسدی کے ہاں "خورشید بگل نتواں پوشیدن" بنا اور یوسف زلیخا میں "شمس بگل اندودہ داشتن" بن کر لباب الالباب میں "چشمۂ آفتاب بگل اندودن" بن گیا۔ قس علیٰ ذالک۔ فردوسی کی ضرب الامثال "بفردا مماں کار امروز را" اور "زآب زنا رگ بتر گرشتر

اِصلاح پاکر موجودہ شکل میں "کارِ امروز بفردا مگزار" اور "آب از سر گزشتن" بن گئے۔

مختصر یہ کہ الفاظ اور محاورات کا روزمرّہ سے اخراج ایک دردراز عمل ہے اور یہ عمل عمروں میں ختم ہوتا ہے سینکڑوں کلمات اور محاورات کا اقلیم زبان سے اخراج اور اس کا عمل دس بیس پچیس سال کا کام نہیں ہے بلکہ صدیوں کا۔ اِس سے میرا مقصد شاہنامہ اور یوسف زلیخا کے زمانوں کی طرف ایما کرنا ہے جن کے درمیان میں میری رائے میں کم و بیش ایک اور نصف صدی کا فاصلہ حائل ہے۔

زلیخا کی تصنیف کو ایک خاص مدت میں حصر کرنے کے لیئے میرے پاس دو قرینے ہیں پہلا گرشاسپ نامہ اسدی ۴۵۸ھ اور یہ پیشتر دکھایا جاچکا ہے کہ زلیخا بلحاظ عصر گرشاسپ نامہ سے متاخر ہے دوسرے سکندر نامہ مولانا نظامی گنجوی جو ۵۹۷ھ ہجری میں تصنیف ہوا ہے ؎

بتاریخ پانصد نود ہفت سال
کہ خوانندہ را زو نگیرد ملال

سکندر نامہ اور زلیخا میں مادّہ فارق کی جستجو کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ زلیخا کے ایسے الفاظ مثلاً "ابا" بمعنی با۔ "ابر" بمعنی بر۔ "کجا" (بالکسر) (اُردو میں جس کے معنی جو۔جب۔جہاں۔ اور جیسے ہونگے) خوانند رانند اور افشاندند۔ (جن کے پڑھتے وقت پہلا نون بضرورت شعری پورا ظاہر کرنا ہوگا قدما میں یہ رواج بہت عام تھا مثلاً انوری ؎

اختراں را شوکتت بر سمت طاعت رانده
آسماں را نعمتت در زیر فرماں یافته

اِس میں رانده کا نون بضرورت وزن پورا ظاہر کرنا ہوگا) ۔سکندر نامہ میں یک قلم متروک ہیں۔ اگرچہ یہ کلمات زلیخا کے عہد میں بھی آفتاب لبِ بام کا حکم رکھتے ہیں کیونکہ دیکھا جاتا ہے۔ زلیخا میں وہ بہت کمی کے ساتھ آتے ہیں مثلاً کجا صرف پانچ مقام پر ملتا ہے اور خوانند وغیرہ صرف دو موقعوں پر ملتے ہیں اس سے یہی قیاس کیا جاتا ہے کہ زلیخا کی ایّامِ تصنیف میں ہی متروک ہو چلے تھے۔ آمدم برسرِ قصہ جب یہ الفاظ زلیخا میں موجود ہیں اور سکندر نامہ میں غیر حاضر تو ظاہر ہے کہ سکندر نامہ زلیخا سے بعد کی تصنیف ہے اور زلیخا کا عصر سکندر نامہ سے مقدم ہے۔

اس طرح قرن ششم کے منتصف اوّل میں زلیخا کی تصنیف کے واسطے ہماری نگاہ جمتی ہے۔

حدیقۂ حکیم سنائی جو ۵۲۴ھ و ۵۲۵ھ کے درمیان لکھا گیا ہے چنانچہ حدیقہ ؎

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام

پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

اگرچہ بعض آثار اور علامات سے پایا جاتا ہے کہ وہ زلیخا کی ہم عہد ہے لیکن بعض خط و خال اس قسم کے ہیں جو حدیقہ پر زلیخا کے تقدم کو ثابت کرتے ہیں مگر اس سے میرا اسی قدر مقصد ہے کہ قرن سادس کا منتصف اوّل زلیخا کی ولادت کا بہتر زمانہ ہو سکتا ہے۔ ان ہی ایّام میں زلیخا کی تصنیف منضبط کرنے کے لیئے ہمارے پاس ایک اور قرینہ ہے اور وہ یہ ہے کہ :-

علاوہ اور اسالیب یامی کے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے زلیخا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب افعال معطوف و معطوف علیہ آتے ہیں فعل معطوف علیہ عام اِس سے کہ واحد ہو یا جمع۔ غائب ہو یا حاضر یا متکلم فعل معطوف بصیغۂ واحد غائب لایا جائیگا۔ امثال ؎

شعر

قبا بست و چابک نوردیدہ دست

قبایش دریدند و دستش شکست

(بوستانِ سعدیؒ ۶۵۵ھ)

اِس مثال میں دریدند کی تبعیت میں شکستند لایا جاتا۔

مثالِ دیگر

"اسعاف ملتمس او را رحمہ اللہ لازم شمردم و اجابت دعوتش فریضۂ دانست" المعجم فی معابیر اشعار العجم من شمس الدین محمد بن قیس ۶۱۴ھ۔ (اس مثال میں فریضہ دانستم آنا چاہیئے تھا)۔

مثالِ دیگر

زندہ شد مردمی حاتم و مردی رستم

چوں بہ بزم اندر نشستی و بر زم اندر خاست

لطیف الدین زکی مراغۂ در مدح معز الدین سنجر حسین بن علی۔ (لباب۔ باب یازدہم ص ۳۰)

اِس مثال میں خاستی ہوتا۔

مثالِ دیگر

از پائے در فتادم و از دست شد کہ چشم
روزے ندید از تو مراعات سرسری

محمد بن علی الکاشانی (لباب باب ہفتم ص۱۸۲) - اس مثال میں از دست شدم آتا -

مثالِ دیگر

دادی بوصل وعدہ و آنگہ بطنز گفت
چیزے کہ کس نیافت تو از من مدار چشم

جمال الدین الازہری المروزی (لباب فصل دوم از باب ہفتم ص۲۱۵) - اس مثال میں گفتی موزوں تھا -

مثالِ دیگر

"و یکے از لطافتِ طبع او آں بود کہ مطائباتی کہ در حقِ او گفتہ بودند یاد داشتی و حکایت کرد"

محمد عوفی - (لباب الالباب - باب یازدہم ص۳۹۳) - یہاں حکایت کردی درست تھا -

مثالِ دیگر

"آں اسیراں را اگر بریں جملہ کہ فرمودیم باوطان و بلاد خویش نرسانند یک کودک باز گیرند ہرچہ پرانیدیم و بقلم آورد - و بنوشت جملہ بجا آوریم"

نامۂ سلطان سنجر بتعظیم الروم از انشائے معین امم (لباب - تعلیقات میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی ص۳۱۷)

یہاں بقلم آوردیم و بنوشتیم لایا جاتا -

یہی اسلوب مثنوی یوسف زلیخا میں مشاہدہ کیا جاتا ہے - امثال سے

(۱) چو فارغ شد از پند و اندرز مرد — بہ بستند پیماں و سوگند خورد (زلیخا ص۵۱)

یہاں بہ بستند کی تبعیت میں سوگند خوردند لایا جاتا -

(۲) نہ سوگند خوردی و پیماں گرفت — گوا برتن خویش یزداں گرفت (زلیخا ص۵۳)

اس مثال میں گرفتی لایا جاتا -

(۳) گرستند دیگ چند زاری نمود ولیکن گرستن نمی داشت سود (ص۱۸) زلیخا

اس موقع پر زاری نمودند کہا جاتا۔

(۴) سراسر بدان دہ برادر سپرد ہمہ راہ کنعاں گرفتند و برد (ص۲۰۰) ″

اس مقام پر بردند آتا۔

میں یہاں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اسلوب شاہنامہ سے مطلق غیر حاضر ہی نہ گرشاسپ نامہ حدیقۂ سنائی اور سکندر نامہ میں پایا جاتا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تمام ممالک ایران میں اس کا رواج نہیں رہا ہے بلکہ خاص خاص خطوں میں جن میں ماوراءالنہر کا نام قابلِ ذکر ہے کیونکہ امثلۂ بالا کے اکثر قائل ماوراءالنہری ہیں مثلاً محمد عوفی۔ محمد بن علی الکاشانی اور لطیف الدین زکی مراغہ۔ جوں جوں خروجِ چنگیز خاں کا زمانہ قریب آتا جاتا ہے یہ اسلوب اور بھی مقبول ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ قرنِ سابع کے رُبع اوّل کے مصنّفین کے ہاں اس کو ایک ممتاز پایہ مل گیا ہے۔ اور بقول علّامہ میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی یہ اسلوب غریبہ لباب الالباب جوامع الحکایات تذکرۃ الاولیاء فرید الدین عطار اور المعجم فی معاییر اشعار العجم میں عام طور پر رائج ہے۔

گزشتہ امثال میں اس اسلوب کا سب سے پرانا نمونہ معین الدین اصم دیوان انشائے سلطان سنجر کے ہاں ملتا ہے چونکہ یہ سلطان سنجر سلجوقی کا عصر ہے اس لئے اسی دور میں مثنوی یوسف و زلیخا سے فردوسی بھی کسی وقت تصنیف ہوئی ہوگی جس کا مصنّف بھی غالباً ماوراءالنہری ہوگا۔

صاحبِ زلیخا کی مضمون دُزدی

فردوسی کے مضمون دُزدوں میں اسدی۔ امیر کیکاؤس سنائی نظامی۔ سعدی۔ خسرو اور جامی کا نام تو سرِ داستان ہی لیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی نامعلوم ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے فردوسی کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے اور جو آج گوشۂ خمول میں بالش نشیں ہیں ان میں سے میں اپنے مضمون کے حدود اندازہ کو نگاہ رکھتے ہوئے یہاں صرف صاحبِ زلیخا کی مضمون دزدی کے انکشاف پر قناعت کرتا ہوں۔

مُصنّفِ یوسف زلیخا ایسا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہنامہ سے بخوبی واقف تھا کیونکہ وہ فردوسی کی مشہور شعروں کی اکثر نقالی یا مقابلہ کی کوشش میں مصروف دیکھا جاتا ہے یہ ایک اور غیر مترقبہ تائید ہے ہمارے اس

دعوے کی کہ مصنفینِ شاہنامہ و یوسف زلیخا دو مختلف ہستیاں ہیں کیونکہ فردوسی کی نسبت یہ خیال کرنا کہ زلیخا کے دوران میں وہ اپنے مشہور اشعار کی ایک تبذل قسم کی نقالی کرنے لگا تھا بعید از عقل ہوگا۔

ذیل میں چند امثال پر جو بلا مزید تفحص میری معلومات میں آئیں قناعت کی جاتی ہے اگر توجہ سے اور تلاش کی جائیگی تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ فہرست المضاعف ہو جائیگی۔

یوسف زلیخا (طبع طہران)	شاہنامہ (طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)
۲ مرا خوشتر آید بزندانِ دوں ص۱۳۶ بزیرِ زنخ دست کردہ ستوں	درا دید با دیدگاں پُر ز خوں ص۲۰ ج۲ بزیرِ زنخ دست کردہ ستوں
کسے کو گریزد ز خورشید و ماہ ″ چگونہ کند سوئے اختر نگاہ	دلِ من چو شد بر ستارہ تباہ ص۳۲ ج۱ چگونہ تواں شاد بودن بماہ
چو من بودے بر سرِ کارِ خویش ص۱۱۴ دلم بستہ بر شغلِ بازارِ خویش	بدیں بندگی از من آزار بیش ص۲۱۴ ج۲ کہ دل بستہ بودم بہ بازارِ خویش
ازیں ہر دو تن راست گفتار کیست ص۱۲۹ وزیں ہر دو مادہ گنہگار کیست	بہ بینیم کزیں دو گنہگار کیست ص۱۰ ج۱ بباد آفرہ بر سزاوار کیست
دعا کن مگر ایزدِ کردگار ص۱۰۰ نشاند مرا کودکے در کنار	دو دیگر کہ از تو مگر کردگار ص۵۶ ج۱ نشاند یکے کودکم در کنار
بہر ہفت کشور درون کس نماند ص۱۹۶ کہ او نامۂ نام نیکت نخواند	بگیتی جز از پاکِ یزداں نماند ص۱۰ ″ کہ منشور تیغ ترا بر نخواند
کس از سرِ ایں حکمت آگاہ نیست ص۱۵۱ دریں پردہ مخلوق را راہ نیست	ازیں از جانِ تو آگاہ نیست ص۸۵ ″ دریں پردہ اندر ترا راہ نیست
بزیرِ پئے پیلتاں افگنم ص۱۶۳ بنِ بیختاں از جہاں برکنم	دگر ہیچ کرتے گمانے برم ص۳۳ ″ بزیرِ پئے پیلتاں بسپرم
بآرامگہ شد ہمہ دام و دد ص۱۸۲ بخفتند ہر جانور نیک و بد	نہ آوائے مرغ و نہ ہرائے دد ص۱۵ ج۲ زمانہ زباں بستہ از نیک و بد
ز کشور بکشور سپاہت بود ص۱۸۱ فلک زیرِ فرّ کلاہت بود	ز دریا بدریا سپاہِ ویست ص۲۴۴ ″ جہاں زیرِ فرّ کلاہ ویست
شب و روز بادت چنیں ارجمند ص۱۹۶ ز چشمِ بدانت مبادا گزند	بکامِ تو بادا سپہرِ بلند ص۱ ج۳ ز چشمِ بدانت مبادا گزند
بدل گفت خورسند گردم برنج ص۱۹۴ کہ در رنج باشد سرانجام گنج	برنج اندر ست اے خردمند گنج ص۱ ج۱ نیابد کسے گنج نابردہ رنج
از آغاز بنوشت نامِ خدائے ص۲۰۳ کہ بودہ است و ہموارہ باشد بجائے	سرِ نامہ کرد آفرینِ خدائے ص۶۵ ج۳ کجا ہست و باشد ہمیشہ بجائے
ہمی داشتش صد رہ از جاں فزوں ص۳۰۳ از اندازۂ مہربانی فزوں	ہمی داشتم چوں یکے تازہ سیب ص۱ ج۱ کہ از باد نامد بمن بر نہیب
دگر روز ہنگامِ بانگِ خروش ص۲۱۰ بغرّید بر درگہہ شاہ کوس	تبیرہ بہنگامِ بانگِ خروس ص۲۹ ج۳ ز درگاہ برخاست آوائے کوس
ز آئینۂ پیل و ہندی درائے ص۱۶۲ خروشِ نوا رفتہ تا دو رجائے	ز بس نالۂ بوق و کوس و درائے ص۱۶۳ ج۱ ہمی آسماں اندر آمد ز جائے

ان امثال سے ناظرین پر یہ بھی روشن ہوسکتا ہے کہ صاحب زلیخا نی فردوسی کی طرز اڑانی میں ایک بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے لیکن شاہنامہ اور یوسف زلیخا کا پایہ نظم کے لحاظ سے کوئی مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ جدت اور معنی آفرینی جوش اور برجستگی جو فدائے سخن کا حصہ ہے زلیخا سے مطلق غیر حاضر ہے۔ مجکو کل دو تین شعر زلیخا میں پسند آئے ؎

(۱) زمین زان کند فخر بر آسماں ... کہ دارد زنعل سمندت نشاں (ص ۹۵)

(۲) بناخن گرہ بافت از مشکناب ... درآویخت از گوشۂ آفتاب (ص ۱۲۲)

حدائق البلاغت میں آخری شعر فردوسی کے نام پر ہی نقل کیا ہے۔ نظامی کے ہاں اسی مضمون پر اور ان ہی قوافی میں مجکو تین شعر ملے ؎

(۱) نہ گیسو کہ زنجیر از مشکناب ... فروہشتہ چوں ابری از آفتاب

(سکندر نامہ بری ص ۲۷۶ طبع مطبع نامی لکھنؤ ۱۸۹۰ء)

(۲) شکن گیر گیسوش از مشکناب ... زدہ سایہ بر چشمۂ آفتاب (سکندر نامہ بری ص ۱۸۶)

(۳) کمر بستۂ زلف او مشکناب ... کہ زلفش کمر بستہ بر آفتاب (" " ص ۳۲۲)

اور سچ تو یہ ہے کہ نظامی کی تینوں کوششیں اس شعر کے مقابلہ میں ناکام رہی ہیں۔

ذیل میں کچھ مثالیں اس قسم کی دی جاتی ہیں جن میں فردوسی اور صاحب یوسف زلیخا کو ایک ہی مضمون پر طبع آزمائی کرتے دیکھا جاتا ہے۔ ان مثالوں میں شاہنامہ سے مقابلہ کی خاطر مجکو زلیخا سے کچھ اشعار نکال دینا پڑے ہیں اور ایک مقام پر ایک شعر اضافہ کیا ہے۔

یوسف زلیخا	شاہنامہ
تن پاک پیوستہ دارم بتو ... دل مہرباں بستہ دارم بتو	تن و جان شیریں ترا دادہ ام ... من اینک بپیش تو استادہ ام
بہرساں کہ فرماندہی بر سرم ... تراچوں پرستندہ فرماں برم	برآرم نہ پیچم سر از دام تو ... زمن ہر چہ خواہی ہمہ کام تو
پانچ شعر کے بعد	
بگفت این و تنگ اندر دں شد برش ... کہ بوسہ بباید زدو شکرش	ہمانا کہ از شرم نادر دیاد ... سرش تنگ بگرفت و یک بوسہ داد

چو یوسف چنین دید بر پای جست — ز دستِ زلیخا برون برد دست

گرد اندکی از شرم چون بود چون — که از شرم رخسارش شد چو خون

چنان گشت لرزان ز بیم خدای — ندل ماند با وی نه دانش نه رای

(آمدن زلیخا نزدِ یوسف و صحبت داشتن ص۱۰۹)

رخانِ سیاوش چو خون شد ز شرم — بیاراست مژگان بخوناب گرم

چنین گفت با دل که از کارِ دیو — مرا دور دارد گیهان خدیو

رفتن سیاوش بارِ دوم پیش سودابه صفحات ۵-۱۰۴ ج ۱

از آغاز تا دیده ام چهرِ تو — گرفتار اندر کفِ مهر تو

نماندست زین پیش آرام دل — همی داد خواهی مرا کام دل

سه سال ست تا زار و دلخسته ام ص۱۱۹ — ابا آتش و آب پیوسته ام

گرامروز با من شوی سازگار — درختِ مرادِ من آری ببار

بمه برنهم پایه تختِ ترا — کنم بنده خورشید بختِ ترا

ز شاهان سرت را کنم تاجدار — کمر بسته پیشت جهان بنده وار

اگر سر بتابی ز پیوند من — نیاری دلِ خویش در بندِ من

چو دیوانه زین خانه تازم برون — به تیره چه اندر رفتم سرنگون

رفتن زلیخا در آن عمارت و طلب نمودن یوسف و بستن درها ص۱۲۳

که تا من ترا دیده ام مرده ام — خروشان و جوشان و آزرده ام

همی روز روشن نه بینم ز درد — برآنم که خورشید شد لاجورد

کنون هفت سالست تا مهر من — همی خون چکان را بر چهر من

یکی شاد کن در نهانی مرا — به بخشاے روز جوانی مرا

فزون زانکه دادت جهاندار شاه — بیارایمت تاج و تخت و کلاه

وگر تو نیائی بفرمانِ من — نپیچی ز رای و ز فرمانِ من

کنم بر تو بر پادشاهی تباه — شود تیره بر چشم تو هور و ماه

(رفتن سیاوش بارِ سوم پیش سودابه - ص ۱۰۵ - ج ۱)

من از پشتِ یعقوب پیغمبرم — پرستندهٔ خالقِ اکبرم

سرائیل الله جز او کس نبود — زبانِ خرد هوش او را ستود

چنان دان که یعقوب و اسحق را — که پیغمبر آن را همه داد داد

ذبیح الله او بد ز پیغمبران — پسندیدهٔ داورِ داوران

همیدان تو اسحق پاکیزه رای — ز پشتِ خلیلِ ستوده خدای

براهیم کش خواند یزدان خلیل ص۱۵۵ — فرستاد نزدش همی جبرئیل

نژادِ من از پشت گشتاسپ ست — که گشتاسپ خود پور لهراسپ ست

که لهراسپ بد پور اورند شاه — که او را بدی آن زمان تخت و جاه

هم اورند از تخمهٔ کی پشین — که کردی پشین بر پدر آفرین

پشین بود از تخمهٔ کیقباد — خردمند شاهی دلش پر ز داد

همی رو چنین تا فریدون شاه — که اصلِ کیان بود زیبای گاه

ستایش کردن اسفندیار پهلوانی و نژاد خود را پیش رستم ج ۳

میرا مضمون اپنے آخری مراحل تک پہنچ گیا ہے لیکن اس کو خاتمہ تک پہونچانے سے پیشتر چند کلمات دیباچۂ زلیخا کے بیانات کی نسبت جو اس مضمون کی ابتدا میں درج ہو چکے ہیں کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ مقدمۂ یوسف زلیخا کے یہ بیانات موجودہ تحقیقات اور مشاہدات کی روشنی میں نہایت عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں۔ ہم ان کو ایک نئی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ یہ نامعلوم مصنف جس کو ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ فردوسی کے عہد سے جدا کر رہا ہے اور جو فردوسی کے اصل واقعاتِ زندگی سے بھی زیادہ باخبر معلوم نہیں ہوتا کیوں چند سال اپنی زندگی کے صرف کرکے اس مثنوی کو فردوسی کے نام پر شائع کرتا اس کے پاس ایسی کون سی محرکات تھی۔

صحیح واقعات جو آٹھ صدیوں کی گہرائیوں میں مدفون ہیں آج کسی ممکن ذریعہ سے روشنی میں نہیں لائے جا سکتے۔ لیکن ہم اس سے واقف ہیں کہ انسانی طبیعت کی نوعیت کا معیار آج بھی وہی ہے جو اس وقت تھا۔ قدامت پرستی میں جہاں اور محاسن ہیں وہاں ایک عیب بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنی مردہ پرستی کے جوش میں ان محترم اسلاف کو جن سے ہم کو اعتقاد ہے بعض اوقات ایسے پیرایہ میں ظاہر کرتے ہیں جس سے ان کو حقیقت میں کوئی سروکار نہ تھا مثلاً اسکندر فیلقوس کو اسلام میں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ گویا وہ مسلمان تھا بعض نے اس کو ذوالقرنین تسلیم کیا ہے اور نظامی نے تو پیغمبر مان ہی لیا۔ اسی سلف پرستی کی ایک شان ہے جس نے ناصر خسرو کی مجعول سوانح عمری تالیف کروائی۔ کچھ اسی قسم کے اثرات میں تیمور مصنف بنا دیا گیا اس سے میرا مقصد توزک تیموری ہے یہ تالیف سب سے پیشتر جہانگیر کے عہد میں اشاعت پاتی ہے۔ اسی سلف پرستی کے طفیل زیب النساء بیگم کے نام اخلاف نے دیوان مخفی منسوب کر دیا۔ میری خیال میں اسی قسم کے محرکات نے فردوسی کے نام پر یہ کتاب مکمل کروائی۔

اسلامی حلقوں میں فردوسی غیر مقبول ضرور رہا ہے اس کے خلاف ناپسندیدگی کے اسباب زیادہ تر شاہنامہ کے اس حصّہ سے تعلق رکھتے ہیں جو ایران پر استیلائے عرب کا مذکور کرتا ہے۔ مصنف پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے عربوں کے ساتھ نہایت بے انصافی کی ہے۔ ان کی جس قدر کارنامے ہیں ان کا ذکر یا دانستہ چھوڑ دیا یا نہایت خفیف کرکے دکھایا ہے اس طرح نہ صرف وہ عربوں کے قومی وقار کو پامال کرنے کا

مجرم ہے بلکہ اسلامی جذبات کو بھی صدمہ پہونچاتا ہے۔ بعض اصول کا جو اسلام سے تعلق رکھتے ہیں اگر بے ادبی سے نہیں تو ادب سے بھی ذکر نہیں کرتا۔ مذہبی حلقوں میں بالخصوص اس پر بہت لعن وطعن ہوئی ہے اس کو رافضی معتزلی دہریہ اور مجوسی تک بنا دیا گیا ہے حتیٰ کہ گزشتہ صدی میں صاحب صولت فاروقی نے دل کھول کر مغلظات سنائی ہیں۔ اس سب دشتم کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ فردوسی کو ہمارے شیعہ بھائیوں نے اپنی طبقہ میں نہایت محترم جگہ دی اور قاضی نوراللہ شوستری نے مجالس المومنین میں شیعہ شعرا کی فہرست میں پہلے کرسی ہمارے شاعر ہی کو دی

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معاملہ ابتدا ہی سے ایک قسم کی غلط فہمی تھی جس کی نازک اور کمزور بنیاد پر الزمات کے عالی شان قصر تعمیر کرلیئے گئے ہیں۔ فردوسی ایرانی شاعر تھا اور ایرانِ مرحوم کی عظمت اور شکوہ کے افسانہ خوانی کررہا تھا۔ کتاب جو اس کے پیش نظر تھی پہلوی تھی یا پہلوی ذرائع سے تدوین ہوئی تھی۔ جس کا تمام نقطۂ نظر ایرانی بلکہ یوں سمجھو ساسانی تھا اور ہم جانتے ہیں کہ جب قومی فخر ومباہات کا صنم کدہ تعمیر ہورہا ہے تو دوسرے قوموں کے کارناموں کی اس میں گنجایش نہیں ہوتی جس حالت میں کہ رقابت کی آتش بھی زیر خاکستر ہو۔ فردوسی صنادید عجم کی تاریخ لکھ رہا تھا ساسانی ایران اور کیانی ایران کے مرثیہ خوانی کررہا تھا وہ تاریخ عرب نہیں لکھ رہا تھا۔ علاوہ بریں اس معاملہ میں اس کی حیثیت ایک ترجمان سے زیادہ نہیں تھی جو واقعات اِس کو پہلوی ذرائع سے ملے وہی اِس نے نقل کردیئے۔ اِن ذرائع میں جو زیادہ تر افسانہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور تاریخی نقطۂ نظر سے چنداں وقیع بھی نہیں۔ اگر جذباتِ عرب کی آبگینہ پر سنگ اندازی کی گئی تو اُن کی ترجمانی میں فردوسی جس نے کہ ہم جان سکتے ہیں ان کی شدت کے معتدل کرنے میں ایک حد تک جدوجہد بھی کی ہے عقلاً وانصافاً چنداں ملزم نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ بحیثیت مورّخ اس کا یہی فرض تھا کہ جو واقعات اس کی روایات نے اس تک پہونچائے ہیں ذکر کردی۔ مثلاً ایک معاند اسلام رستم سپہ سالار یزدجرد نے جب کہ وہ قادسیہ کی مہم کی تیاریاں کررہا تھا اِسلام کے بڑھتے سیلاب کو دیکھ کر عربوں کے لئے کہا۔ شعر

زیانِ کساں از پئی سود خویش	بجویند و دیں اندر آرند پیش

(شاہنامہ، جلد چہارم ص۱۲۱)

اور فردوسی نے اس قول کو نقل کردیا تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ فردوسی کیوں مستوجب تشنیع ٹھہرایا جائے لیکن

کچھ اسی قسم کے اسباب تھے جنھوں نے فردوسی کو بدنام کر دیا۔

آخر وہ زمانہ آیا جب کہ خدائے سخن کی حمایت میں ردّ عمل شروع ہوا۔ ایک روز امام احمد الغزالی نے اثنائے وعظ میں بر سرِ منبر حاضرین کو خطاب کر کے کہا کہ:-

"اے مسلمانو تم کو وعظ و موعظت کرتے مجھکو چالیس سال گزر گئے ہیں اس چالیس سال کے عرصہ میں جو کچھ تم کو میں نے پند و نصیحت کی ہے فردوسی نے اس کو ایک شعر میں ادا کر دیا ہے اور وہ شعر یہ ہے ؎

ز روز گزر کردن اندیشہ کن   پرستیدن دادگر پیشہ کن   (شاہنامہ ج ۱ ص ۱۳)

اگر اس پر عمل کرو تو پھر کسی وعظ و نصیحت کی تم کو ضرورت نہیں۔

(مرزبان نامہ - باب سوم - داستان سہ رہزن انباز بایکدگر ص ۸۰)

جب فردوسی کے اشعار منبر سے منقول ہونے لگے ہیں تو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ غیر مذہبی حلقوں میں شاہنامہ ان ایام میں بہت کچھ مقبول ہو چکا ہوگا۔ غالباً انہی ایام میں فردوسی کے معتقدین اور مداحین میں کوئی ایسا جوشیلا بھی نکل آیا جس نے مذہبی حلقوں میں عزیز بنانے کے خیال سے فردوسی کے نام پر یوسف و زلیخا تصنیف کی۔ اسلامی ادبیات میں یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ لوگ جب مذہبی امور میں تصرفات تحریفات اور موضوعات سے باز نہیں آئے تو یہ تو محض ایک ادبی معاملہ تھا اوروں نے قرآن مجید کے جواب لکھے ہیں حدیثیں موضوع کی ہیں اس لیے فردوسی کے لیے ایک مثنوی کا نظم کیا جانا کون سی بڑی بات تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور یہ کتاب شاہزادہ بایسنغر میرزا کے عہد تک جس کے حکم سے ۸۲۹ ہجری میں شاہنامہ پر ایک نیا دیباچہ لکھا گیا ہے معرض گمنامی میں رہی۔ سب سے پیشتر ہم اس دیباچہ میں مثنوی یوسف زلیخا کا ذکر پڑھتے ہیں کہ جب فردوسی بغداد میں پناہ گزیں ہوتا ہے تو خلیفہ اور اہالی بغداد شاہنامہ بوجہ مدح ملوک عجم پسند نہیں کر سکتے تھے اس لیے اس نے ان کی خوشنودی کے خیال سے کتاب یوسف و زلیخا نظم کی یہ مثنوی بہت پسند کی گئی اور دربار میں اس سے فردوسی کی قدر و منزلت میں افزائش ہوئی۔   (شاہنامہ - دیباچۂ بایسنغر خانی ص ۱۳)

بغداد میں فردوسی کا قیام جس کو میں ایک غیر تاریخی واقعہ خیال کرتا ہوں ایک تاریخی قصہ کے انضمام سے پایۂ ثبوت کو پہونچایا گیا ہے۔ وہ قصہ دیباچۂ بایسنغر خانی میں یوں درج ہے کہ جب فردوسی کی رہائش کی اطلاع

سُلطان محمود غزنوی کے گوش گزار ہوئی تو اُس نے فردوسی کی طلبی کی اُمید میں ایک مکتوب بارگاہِ خلافت میں روانہ کیا جس میں علاوہ اور شرر فشانیوں کے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر امیرالمومنین نے فردوسی کو میرے پاس واپس نہ کیا تو میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادونگا اور دارالخلافہ کی خاک ہاتھیوں پر بار کرواکر غزنین لے آؤنگا۔ مستقل مزاج خلیفہ القادر باللہ سلطانی تہدید سے مطلق مرعوب نہ ہوا بلکہ اُس نے جواب میں صرف ایک لفظ "الم" لکھ بھیجا۔ محمود کے دبیر خلیفہ کے اس مختصر جواب کی عقدہ کشائی سے عاجز رہے انجام کار بڑے غور و خوض تلاش و تجسس کے بعد سب نے یہ رائے قائم کی کہ چونکہ سلطان نے اپنے خط میں خلیفہ کو خاک بغداد کی نسبت ہاتھیوں سے تہدید کی تھی۔ اس لیئے جواب میں خلیفہ نے سورۃ الفیل کی طرف تلمیح کی ہے کہ "الم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل"۔ سلطان اس جواب سے بہت خوش ہوا۔

میں اس واقعہ کی اصلیت پر کوئی اشتباہ پیدا کرنا نہیں چاہتا اس لیئے کہ اس کا ذکر اکثر تاریخوں میں ملتا ہے اور سب سے پہلی تاریخ جس میں اس کا ذکر ہے اور میری نگاہ سے گزری ہے تاریخ گزیدہ ہے جو آٹھویں صدی کی ربع اول کی یادگار ہے تاریخ گزیدہ اور نگارستان میں بنائے مخاصمت سلطان اور خلیفہ کے مابین بالتصریح فردوسی بتایا گیا ہے لیکن ان تاریخوں کے باوجود وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ واقع میں فردوسی کا اس قصہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ امر متنازعہ فیہ سلطان اور خلیفہ کے درمیان ملک ماوراءالنہر تھا۔ سلطان خواہشمند تھا کہ ملک ترکستان پر متصرف ہو اور خلیفہ مانع تھا۔ جب سلطان نے دیکھا کہ عجز و لجاج سے کار برآری دشوار ہے تو ضرورتاً تشدد کا لہجہ اختیار کیا جس کے جواب میں خلیفہ نے وہ مشہور لفظ "الم" لکھا۔ میرے بیان کا سب سے قوی اور بہتر ثبوت کتاب قابوس نامہ ہے جو فارسی نثر میں پانچویں صدی ہجری کے ربع سوم کی ایک شاندار اور دقیع یادگار مانی جاسکتی ہے۔ اس کے مصنف امیر عنصرالمعالی کیکاؤس والی طبرستان نے بعض تاریخی واقعے جو خود اُس کی سرگزشت یا اس کے قریب زمانوں کے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اس کتاب میں درج کیے ہیں۔ اِن ہی قصّوں میں اتفاقیہ سلطان محمود اور خلیفہ القادر باللہ کا واقعہ بھی لکھا گیا ہے۔ یہاں (باب سی و نہم در آئین کاتب ص ۱۰۵ و ص ۱۰۶) ہم صاف دیکھتے ہیں کہ سلطان اور خلیفہ کے مابین بنائے مخاصمت حقیقت میں ملک ماوراءالنہر تھا نہ فردوسی۔ قابوس نامہ میں یہ تمام واقعات برخلاف دیباچہ بایسنغرخانی کے نہایت تفصیل

کے ساتھ درج ہیں۔ (تاریخ روضۃ الصفا میں ان ہی بیانات کی تائید کی گئی ہی)۔ قابوس نامہ سلطان محمود غزنوی کے صرف تریپن[۵۳] سال بعد تصنیف ہوا ہی اور اِس واقعہ کے لیے اس کتاب سے بہتر کوئی قدیم اور معتبر شہادت فی زمانا دستیاب نہیں ہو سکتی باوجود ایسی معتبر شہادت کے اِس قصہ کا انضمام فردوسی کے نام کے ساتھ ان قرون کی فردوسی پرستی کے تصوّر سے سمجھ لیا جا سکتا ہی اور بس۔

کلام غالبؔ (اُردو) کی شرحیں

(از جناب مولانا سید ہاشمی صاحب رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

تمہید

اُردو زبان میں صرف مرزا غالبؔ کا کلام ایسا ہی جس کی گزشتہ چالیس برس میں کئی شرحیں لکھی جاچکی ہیں اور اس کی روز افزوں قبولیت یقین دلاتی ہی کہ آیندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہیگا اور اُمید رکھنی چاہیئے کہ ایک سے ایک بہتر و مُفصّل شرح لکھی جائے گی۔ اس رُجحان کو دیکھکر خاکسار کاتب الحروف کو موجودہ شرحوں پر یہ مضمون لکھنے کا خیال آیا۔

ان شرحوں میں سب سے مقبول اور عام پسند شرح تو مولانا حسرتؔ (موہانی) کی ہی جو کئی بار طبع ہوکر ملک میں شایع ہوئی۔ لیکن سب سے مفصّل شرح نواب حیدر یار جنگ (مولوی علی حیدر صاحب طبا طبائی لکھنوی) کی ہی جو سنہ ۱۳۱۸ء میں حیدر آباد دکن میں طبع ہوئی تھی۔ اس شہر کے ایک اور فاضل مولوی عبد العلی صاحب والہؔ نے بھی ایک مختصر شرح تحریر فرمائی تھی اور اس اعتبار سے کہ وہ سب سے پہلی شرح ہی جو "وثوق صراحت" کے نام سے سنہ ۱۳۱۱ھ میں چھپی۔ تقدّم کی فضیلت اسی شرح کو حاصل ہی۔ ایک اور شرح حضرت شوکتؔ (میرٹھی) "مجد دالنہ مشرقیہ" کے زورِ قلم کی یادگار ہی اور یہ سنہ ۱۳۱۱ء میں طبع ہوئی تھی۔

ان مستقل شرحوں کے ساتھ اس تبصرہ میں راقم الحروف نے یادگارِ غالبؔ اور ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم کے اُس مضمون کو بھی شامل کرلیا ہی جو رسالہ اُردو کے پہلے پرچے میں شایع ہُوا تھا۔ یہ دونوں مضمون پورے دیوان کی باقاعدہ شرح نہیں ہیں لیکن ان میں مرزا غالبؔ کے بہت سے منتخب اشعار کے نکات و معانی کو نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہی اور حق یہ ہی کہ یادگارِ غالب ہی وہ کتاب ہی جس نے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں

کلامِ غالب کو مقبول و مروج کیا۔ ڈاکٹر بجنوری کے دلکش مضمون کو بھی اُس پیڑ کا پھل سمجھنا چاہیئے جس کا بیج مولوی حالی مرحوم نے بویا تھا۔ میری نظر میں اس مضمون کی وقعت کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ اسے دیکھکر ہم اس بات کا بہت عمدہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ گزشتہ چالیس[1] برس میں زبانِ اُردو کی ترقی اور مغربی علوم و خیالات کی اشاعت نے کلامِ غالب کی قبولیت پر کیا عجیب اثر ڈالا ہے اور آج زبان اُردو کے بہترین ادیب غالب کی شاعری کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ کم سے کم اپنے اُردو کلام کے متعلق تو مرزا صاحب مرحوم کی اس حسرتناک پیشین گوئی کے پورے ہونے میں اب کوئی شبہ باقی نہیں ہے کہ

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن!

(۱) یادگارِ غالب

اگر کلام کی خصوصیات کو ناظرین کے ذہن نشین کرنا، شرح کے مقاصد میں داخل ہے تو اس کام کو مولوی حالی صاحب مرحوم سے بہتر کسی شارح نے انجام نہیں دیا۔ انھوں نے مرزا غالب کی بلند خیالی اور جدت پسندی پر ایک دلچسپ بحث کرنے کے بعد اُن کے اُردو کلام کی چند خصوصیتیں بیان کی ہیں اور تمثیل میں منتخب اشعار فراہم کیے ہیں۔ اور ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان خصوصیات اور ان کی ذیل کے بعض اشعار کو معہ شرح خود مولوی صاحب مرحوم کے الفاظ میں نقل کریں:-

(۱) علاوہ جدتِ مضامین اور طرفگیِ خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ اوّلاً عام اور مبتذل ۔ ۔ ۔ تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے بلکہ تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادِ یاں

---

[1] یادگارِ غالب کی طبع دوم کا جو نسخہ علی گڑھ میں چھپا اور راقم کے پیش نظر ہے اس سے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کتاب کب چھپی تھی۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے یادگارِ غالب پہلی مرتبہ ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۷ء یعنی ۱۳۱۴ھ میں شائع ہوئی ہے۔

یہاں سُورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہی اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال وفنا ہیں چراغِ رہگذارِ باد سے تشبیہ دی ہی جو بالکل نئی تشبیہ ہی۔

دوسری جگہ سورج کو اس لحاظ سے کہ حسنِ معشوق کے مقابلہ میں اُس کو ناقص الخلقۃ قرار دیا ہی ماہِ نخشب کے ساتھ تشبیہ دی ہی چنانچہ کہتے ہیں ؎

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا!

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہی کہ مرزا نے استعارہ وکنایہ وتمثیل کو جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے اور جس کی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہی ریختہ میں بھی نسبتاً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا۔ ۔ ۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کی جاتی ہیں ؎

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا   بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہاں اس مطلب کو کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھا دی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہی اس طرح ادا کیا ہی کہ ع

بجلی اک کوند گئی ——— الخ

دوسری مثال ؎

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اُس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہی۔ اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہی اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا۔ ایسے بلیغ شعر اُردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں۔ جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہی ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہی جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔

(۳) تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں اور کیا فارسی میں کیا نظم میں اور کیا نثر میں باوجود سنجیدگی ومتانت کے شوخی اور ظرافت ہی جیسا کہ انتخابی اشعار سے ظاہر ہو گا۔

(۴) چوتھی خصوصیت مرزا کی طرزِ ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے اور جس کو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں ما بہ الامتیاز کہا جا سکتا ہے (یعنی) اُن کے اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد اُس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں۔ ۔۔۔ یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں :-

(پہلی مثال) ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے یعنی دہشت معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہو گی مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

(دوسری مثال) ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مےَ مرد افگنِ عشق　　　ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں مےَ مرد افگنِ عشق کا ساقی، یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا اس لئے اُس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے۔ مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے اس شعر میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں وہ یہ کہ پہلا مصرع ساقی ۔۔۔ ۔۔۔ ایک دفعہ تو بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریفِ مےَ مرد افگنِ عشق" یعنی کوئی ہے جو مےَ عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے کہ "کون ہوتا ہے حریفِ مےَ مرد افگنِ عشق"!! یعنی کوئی نہیں ہوتا"

اسی قسم کے ذو معنی اشعار کی چند اور مثالیں تحریر کرنے کے بعد مولوی حالی صاحب لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور بات قابلِ ذکر ہے جو مرزا اور اُن کے بعض معاصرین و متبعین کی غزل میں عموماً

پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اُنھی مضامین اور خیالات کو جنھیں پہلے شعرا آسان و سلیس پیرایے اور سادہ الفاظ میں لکھ گئے ہیں، مرزا نے نہایت ندرت اور عجیب عجیب نزاکتوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً ؎

(۱) ضعف سے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں — رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

(۲) غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ۔ دیکھو جرم کس کا ہے — نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

(۳) کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں — آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

(۴) خند کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں — بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

(۵) دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اُسے دیکھوں ؟ بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے!

"پہلے شعر میں خون کا رنگ ہو کر اُڑ جانا، دوسرے میں عاشق کے جذبے اور معشوق کی کشیدگی سے کشش کا لازم آنا، تیسرے میں نکہتِ گل سے حیا آنی، چوتھے میں بھولے سے سینکڑوں وعدے وفا کرنے، پانچویں میں آپ اپنے پر رشک آنا۔ ۔۔ ۔۔ یہ سب متاخرانہ نزاکتیں ہیں جو ولی سے لے کر میر، سودا اور درد تک کے کلام میں نہ تھیں اور اگر تھیں تو صرف اس قدر جیسے آٹے میں نمک۔"

اس کے بعد مولوی حالی صاحب مرحوم نے مرزا کی غزلیات میں سے دو سَو سے زیادہ اشعار منتخب کئے ہیں اور اُن کی حسبِ ضرورت شرح اور محاسن کو نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے۔ اس شرح کے بھی چند نمونے نقل کرنے کے لائق ہیں :۔ ؎

(۱) ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

مولوی حالی صاحب شرح میں لکھتے ہیں کہ اس میں سارا زور "ہم" کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اُس وقت تک راہِ معرفتِ الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِّ راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بُت توڑنے میں سُبک دستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ ؟ یہ بڑا بھاری بُت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔"

(۲) فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا — کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

کہتا ہے کہ (کل) تمھارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو گئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی۔ اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدّل بہ زمانۂ حال ہو جائیں

پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گزر گئی۔ قیامت گزر جانے کے دونوں معنی ہیں: نہایت سختی کا زمانہ گزرنا اور خود قیامت کا آجانا۔"

(۳) رونے سے اور عشق میں بیباک ہوگئے دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

دھویا جانا = بیشرم و بیباک ہونا۔ پاک = آزاد یا شہدا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس ولحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بیشرم و بے حجاب ہوگئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھُل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ "رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہوگئے"، بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے۔"

(۴) اے پرتوِ خورشیدِ جہانتاب، ادھر بھی سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

مولوی حالی صاحب نے اس شعر کے جو معنی بیان کئے ہیں ان کی طرف کسی شارح کا خیال نہیں گیا اور نہ عام طور پر جاتا ہے۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس شعر میں آفتابِ حقیقت کی طرف خطاب ہے۔ "کہتا ہے کہ جیسے سایہ متہم بوجود ہے اور فی الواقع اس کی کچھ ہستی نہیں اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں (کہ ہمارا کوئی مستقل وجود ہے۔ پس) اگر آفتابِ حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ افگن ہو جائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنافی الشمس ہو جائیں۔ کیوں کہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا۔"

(۵) توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

"دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اسی کے موافق اس کی تائیدِ غیب ہوتی ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے اگر اس کی ہمت جب کہ وہ دریا میں تھا، موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو . . . اُس کو یہ درجہ (آنکھوں میں جگہ ملنے کا) حاصل نہ ہوتا۔"

(۶) رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

"کہتے ہیں کہ دُنیا میں اگر اہلِ ہمت کا وجود ہوتا جو دُنیا کو محض ناچیز سمجھکر اُسی کی طرف التفات نہ کرتے تو دُنیا ویران ہو جاتی۔ پس یہ جاننا چاہیئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح

میخانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہی کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہی اسی طرح عالم کا آباد ہونا دلالت کرتا ہی کہ اس میں اہلِ ہمت معدوم ہیں۔"

بعض اشعار کی جو شرح مولوی حالی صاحب نے تحریر فرمائی ہی اس میں اختلاف و گفتگو کی گنجائش نظر آتی ہی۔ مثلاً ؎

رونقِ ہستی ہی عشقِ خانہ ویراں ساز سے انجمن بے شمع ہی گر برق خرمن میں نہیں

اس شعر کے مولوی صاحب نے یہ معنی تحریر کئے ہیں کہ "تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہی وہ عشق و محبت کی بدولت ہی ۔ ۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس انجمن کی ہی جس میں شمع کی روشنی نہیں" راقم الحروف کے نزدیک ان معنی میں سب سے اہم پہلو بیان ہونے سے رہ گیا۔ درحقیقت مرزا غالب نے یہاں فلسفۂ رواقیہ کا یہ عقیدہ بیان کیا ہی کہ خود ہستی کا مقتضیٰ اور لازمہ فنا یا نیستی ہی۔ اس مضمون کو مرزا صاحب نے اور بھی کئی جگہ ادا کیا ہی مثلاً اس مشہور شعر میں :- ع

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی الخ

مذکورہ بالا شعر میں بھی اس مضمون کو ایک نئے پیرائے میں ادا کیا ہی اور فنا کی بجائے "عشقِ خانہ ویراں ساز" لاکر اُسے بہ اعتبار تغزل نہایت دلکش و واضح ترقی دی ہی ورنہ مطلب صرف یہ ہی کہ ہستی اسی وقت ہستی کہلانے کی مستحق ہوتی ہی جب کہ خود اُس کے اندر نیستی کی اہلیت اور استعداد موجود ہو!

اس غزل کا مقطع ہی کہ ؎

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس وہ گلخن میں نہیں

مولوی حالی صاحب اس شعر کے یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ "اپنے تئیں خس یعنی پھونس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہی یعنی جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہی تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی یہی حال میرا ہی کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں" لیکن راقم الحروف کو ان معنی میں کلام ہی۔ شاعر کا اصلی مطلب یہ معلوم ہوتا ہی کہ دیس اور پردیس کہیں بھی میرے گُنی جوہر ظاہر نہ ہو سکے اور دونوں جگہ میں ایسا ہی ناکارہ سمجھا گیا جیسا گھاس پھونس کا ایک ڈھیر جو بھٹی میں نہ ڈالا جائے تو محض کوڑ

اور بادی النظر میں بالکل بیکار و بے حقیقت شے ہی حالاں کہ اگر وہ اپنے موزوں مقام یعنی گلخن میں ہوتا تو اس کے کمالات ظاہر ہوتے اور وہ روشن و منور ہو جاتا۔ خس اور گلخن کے اس نادر مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور شعر میں اس طرح تحریر کیا ہی :-

فنا کو سونپ گر مشتاق ہی اپنی حقیقت کا فروغِ طالعِ خاشاک ہی موقوف گلخن پر!

اسی طرح ممکن ہی کہ اور بھی ایک دو مقامات پر مولوی حالی صاحب کے بیان کردہ معنی قابلِ تسلیم نہ سمجھے جائیں۔ لیکن مجموعی طور پر جس خوبی سے انھوں نے اشعار کی شرح کی ہی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ خاص کر فارسی اشعار کے محاسن و معانی بیان کرنے میں مولوی صاحب مرحوم نے سخن سنجی اور انشا پردازی کا حق ادا کر دیا ہی اور اسے دیکھ کر خواہ مخواہ دل چاہتا ہی کہ مرزا غالب کے پورے اُردو دیوان کی شرح بھی اسی دلنشین پیرائے میں لکھی جائے۔ کیوں کہ یادگارِ غالب میں اوّل تو سارے کلام کی شرح نہیں ہی دوسرے انتخاب میں بھی اکثر وہی اشعار چھوڑ دیئے گئے ہیں جو زیادہ پیچیدہ و ادق اور اس لئے زیادہ شرح طلب تھے۔ بات یہ ہی کہ مرزا غالب کے شاگرد اور مداح ہونے کے باوجود مولوی حالی صاحب مرحوم اُس رائے کے اثر سے محفوظ نہ تھے جو مرزا کے اُردو کلام کے متعلق ان کے اکثر ہمعصروں نے قایم کر رکھی تھی۔ ہمارے خیال میں یہ رائے کسی محکم و واضح اصول پر مبنی نہ تھی اور گو اس پر مفصل بحث کرنے کا یہ محل نہیں تاہم اجمالاً اس قدر عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہی کہ مرزا غالب کے زمانہ میں شاعری محض تفنن سمجھی جانے لگی تھی دوسرے اُردو کلام کو بھی لوگ شعرِ فارسی کی سلاست و شگفتگی کے معیار پر جانچتے تھے اور اس لئے مرزا کا وہ سنجیدہ اور ادق کلام جس میں نہایت بلند و عمیق فلسفیانہ خیالات کی تعلیم تھی اُس زمانہ میں مقبول نہ ہو سکتا تھا چنانچہ خود اُن کے قدرداں دوستوں نے صدہا شعر دیوان اُردو میں سے خارج کر دیئے[1] اور پھر بھی مولوی حالی صاحب لکھتے ہیں کہ اس "انتخاب کے وقت بہت سے اشعار جو فی الواقع نظر میں کھٹکنے کے قابل تھے

---

[1] اسے تایید غیبی سمجھنا چاہیئے کہ اب جب اس کی قدردانی کا وقت آیا تو وہ متاعِ گم گشتہ بھی دستیاب ہو گئی یعنی مرزا غالب کا وہ اُردو کلام جسے اپنے دوستوں کے مشورے سے انھوں نے تلف کر دیا تھا محض حسنِ اتفاق سے ایک جگہ محفوظ رہ گیا اور حال میں ریاست بھوپال کی اعانت سے طبع ہوا ہی۔

اُن کے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اُٹھ سکا۔"

لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ کچھ تو فارسی کی شاعری سے ناواقفیت اور زیادہ تر زبان اُردو کی روز افزوں وسعت و ترقی، عام تعلیم اور لوگوں میں غور و فکر کا شوق بڑھنے کے باعث مرزا غالب کے ادق مگر حکیمانہ کلام کی وقعت و قبولیت برابر بڑھتی جاتی ہے اور آیندہ یقین ہے کہ اور زیادہ بڑھیگی۔ دوسرے آج کل جب کہ نثر اُردو میں (بلا ضرورتِ شعر بھی) بعض صاحبوں کو نئے نئے الفاظ وضع کرنے کی دُھن لگی ہوئی ہے اور کہیں نامانوس و ثقیل عربی یا سنسکرت الفاظ کی افراط ہے اور کہیں ایسے مرکبات کی بھرمار کہ جن کو بلا لحاظِ اصول و موزونیت، عربی کا ہندی سے اور فارسی کا انگریزی سے پیوند لگا کر بنایا گیا ہے کوئی وجہ نہیں کہ مرزا غالب کے اُن شاعرانہ مرکبات کو دیکھکر ناک بھوں چڑھائی جائے جو اگرچہ نئے اور عسیر الفہم ہیں لیکن زبان کے مسلّمہ اُصول کے مطابق اور نہایت لطیف و نادر مطالب پر مشتمل ہیں اور ان کی تہ میں خیالاتِ عالیہ اور جذباتِ صادقہ کا ایک عجیب عالم نظر آتا ہے جیسا کہ خود فرماتے ہیں:- ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھئے　　جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے!

(۲) وثوقِ صراحت

جیسا کہ اوپر بیان ہُوا دیوان غالب کی یہ اُردو شرح ایک دکنی فاضل مولوی عبدالعلی صاحب والہ مرحوم نے تحریر فرمائی ہے جو نظام کالج حیدرآباد میں پروفیسر تھے۔ اس کالج کا تعلیمی تعلق مدراس یونیورسٹی سے ہے اور اس یونیورسٹی کی اعلیٰ جماعتوں میں اُردو زبان بطور ایک اختیاری مضمون داخلِ درس ہے اور بی اے کے اُردو نصاب میں دیوانِ غالب بھی پڑھایا جاتا تھا۔ نظام کالج میں یہ خدمت مولوی عبدالعلی صاحب کے سپرد تھی اور اسی کی انجام دہی کے ضمن میں انھیں دیوان غالب کی ایک مستقل اور باقاعدہ شرح لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ شرح ۱۳۱۱ھ میں تکمیل کو پہنچ گئی اور "وثوق صراحت" اس کا تاریخی نام ہے۔ مگر شائع کرنے سے قبل شارح مرحوم اس پر نظرثانی کرنی چاہتے تھے کہ وفات پائی اور کتاب ان کے انتقال کے ڈیڑھ دو سال بعد مرحوم کے فرزند مولوی عبدالواجد صاحب کے اہتمام سے طبع ہوئی۔

لیکن اس شرح میں اس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہی کہ غالباً عام طلبہ اُس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے البتہ ممکن ہی کہ اساتذہ کو حضرت والا کے "اشارات" سے اشعار کے معنی سمجھانے میں مدد ملے۔ مثلاً مرزا صاحب کے مطلعِ دیوان ہی کے معنی میں شرح کرنے والوں نے بڑی بڑی مونشگافیاں کی ہیں۔ صاحبِ وثوق صراحت اس کی شرح اس طرح کرتے ہیں:- ؎

نقش فریادی ہی کس کی شوخیِ تحریر کا　　　کاغذی ہی پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

"پیرہن کاغذی = فریادیوں کا لباس جو قدیم میں دستور تھا۔ یہ کنایہ ہی عجز و بیچارگی و تظلم و زاری سے" (انتہیٰ کلامہ)

یا اس شعر کی شرح میں لہ "مری تعمیر میں مضمر ہی ایک صورت الخ" صرف ایک لفظ "ہیولی = مادہ" لکھنا کافی سمجھتے ہیں۔

بعض جگہ شعر کے الفاظ کے نیچے صرف ہندسے لکھ کر اُن کے مشبہ اور مشبہ بہ ہونے کا تعلق ظاہر کر دیا ہی اور کوئی شرح نہیں کی۔ مثلاً ؎

"بقدرِ ظرف ہی ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی　　　جو تو دریائے مے ہی تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا"

اکثر مقامات پر جہاں زیادہ وضاحت سے کام لیا ہی وہاں خود شرح کی عبارت بہت اُلجھی ہوئی نظر آتی ہی۔ مثلاً ؎

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہی اب　　　اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "رہ گزر مذکور میں جو پیشتر نزاکتِ موفور کے سبب جلوۂ گل باعثِ گردِ کدورت تھا، اب عاشقی میں اس دل و جگر کا یہ حال ہی" پھر اُستاد فصیحی کا یہ شعر نقل کرتے ہیں ؎

"پامالِ دو صد قافلۂ خوں ست دریں راہ　　　آں دیدہ کہ از سایۂ مژگاں گلہ دارد"

لیکن وثوق صراحت پر ہم زیادہ تفصیل سے تنقید کرنی نہیں چاہتے۔ یہ ایک غیر معروف سی کتاب ہی اور جہاں تک ہمیں علم ہی کلام غالب کے شایقین یا طلبہ کا کوئی گروہ اس شرح کو مستند نہیں سمجھتا نہ اس کے آئندہ کسی خاص شہرت و قبولیت پانے کی توقع ہی۔ لہذا مناسب ہوگا کہ ہم یہاں دیوان غالب کی دو چھوٹی چھوٹی

غزلیں اور ان کے اشعار کی جو شرح وثوقِ صراحت میں لکھی ہی اسے بعینہٖ نقل کر دینے پر اکتفا کریں تا کہ خود ناظرین کو اس شرح کے محاسن و اسقام کا ایک سرسری اندازہ ہو جائے :-

اشعارِ غالب	شرح (وثوقِ صراحت صفحہ ۱۰۶)
(۱) مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکّر ہی مرے پاؤں میں زنجیر نہیں	"چکّر = ایہام بمعنی گردشِ حلقۂ زنجیر"
(۲) شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں	"دشت = دشت بے کنار و سرو رگم (؟) جادہ غیراز ـــ الخ جادہ معدوم و ناپیدا ہی جیسے نگاہ دیدۂ تصویر میں"
(۳) حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہی جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں	"رہی جاتی ہے اگر اس جادہ پر سلوک نہ کریں"
(۴) رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں	"زبونی کش = عاجزی اُٹھانے والا"
(۵) سر کھجاتا ہی جہاں زخم سر اچھا ہو جائے لذّتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں	"سر کھجاتا ہی = ایہام - پھر زخم سنگ کھانے کے لئے اور خراش میں جو ایک مزہ ہوتا ہی معلوم ہے - سنگ = سنگِ طفلاں جس کی ماریں جراحت والتیام دونوں کا اثر ہی - سر کھجانا = کنایہ ہی دوبارہ مار کھانے کی خواہش پیدا ہونے سے - نظیر اس کی سر توقع خاریدن یعنی متوقع شدن"
(۶) جب کرم رخصتِ گستاخی و بیباکی دے کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں	"کرم = کرم محبوب - کوئی تقصیر ـــ الخ بیباکی تقصیر کی شرمندہ ہونا ہی بڑی تقصیر ہی"
دوسری غزل	(وثوق صراحت صفحہ ۱۳۵)
(۱) نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے	"نقشِ ناز، صنم طنّاز کا رقیب کی آغوش میں ایسا بدنشین و بدنما ہی کہ اس کی تصویر کھینچنے کو پائے زشتِ طاؤس واسطے خامۂ مانی

دوسری غزل

(۲) تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
(۳) وہ تپِ عشق تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تانبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

(وثوقِ صراحت صفحہ ۱۳۵)
(مصوّرِ چین) کے چاہیے کیوں کہ نگارِ طلعت زیبا بہ نقشِ بال
طاؤس اور آغوشِ رقیب بمنزلۂ پائے طاؤس ہے۔ لہذا پائے طاؤس
کا خامہ نقاشیِ نقش مذکور کے لئے ضرور ہوا۔ واللہ اعلم"
"تحیّر کو = حیرانیِ عاشق کو جس کا لازم سکوت ہے۔ غم = غمِ عشق
آشفتہ بیانی مانگے = پریشان گفتاری چاہے جو ضدِ حیرانی ہے"
"وہ تمنّا ہے = مجھے آرزو ہے۔ شعلہ = تپ مذکور کا شعلہ
نبضِ جگر = نبضِ جگرِ شمع۔ کنایہ ہے رشتۂ شمع سے جس میں ریشہ
دوانی شعلے کی روش ہے"

(۳) شرح مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی

(المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ)

یہ دیوانِ غالب کی سب سے مفصّل اور کئی لحاظ سے باوقعت شرح ہے۔ مولوی علی حیدر صاحب جنھیں ہم اُن کے ریاست حیدرآباد کے خطاب کے مطابق "نواب صاحب" لکھیں گے، زبان اردو کے مشہور و معروف ادیب ہیں۔ اکثر اہلِ لکھنؤ انھیں فنِ شعر کا مسلّم الثبوت اُستاد جانتے اور اُن کی آرا کو قابلِ استناد مانتے ہیں اُن کی تصانیف میں دیوانِ غالب کی یہ شرح غالباً سب سے بڑی اور مشہور کتاب ہے اور مولانا حسرت موہانی صاحب نے بھی اپنی شرح کے آخری حصّے کے لکھنے میں اس کتاب سے ایک حد تک مدد لی تھی۔ انھی وجوہ سے راقم الحروف نے اس شرح کا بہت غور سے مطالعہ کیا اور چاہتا ہے کہ اس کے متعلق اپنی بُری بھلی رائے کو وضاحت سے تحریر کرے۔

شروع ہی میں یہ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس شرح کے متعلق لوگوں کو عام طور پر دو شکایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ شرح کی عبارتیں زیادہ صاف اور سلیس نہیں اور بعض جگہ خود شارح کا مفہوم سمجھنا دشوار

ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مجھسے ایک صاحب کہتے تھے کہ حضرتِ طباطبائی نے دیوان غالب کی جو شرح لکھی ہے خود اس کا مطلب سمجھنے کے لئے ایک اور شرح ہونی چاہیئے! مگر ہمارے خیال میں یہ اعتراض چنداں وقیع نہیں اور نواب صاحب کی طرف سے اس کا یہ مختصر جواب کافی ہوگا کہ انھوں نے جو شرح لکھی ہے وہ مبتدی طلبہ کے واسطے نہیں ہے۔

دوسری شکایت جس کا ہم نے اکثر اربابِ ذوق میں چرچا سنا یہ ہے کہ نواب صاحب نے غالبؔ کے اشعار پر جا و بیجا بہت سے اعتراض کئے ہیں اور انھیں دیکھکر گمان ہوتا ہے کہ شرح لکھنے سے شاید نواب صاحب کا ایک مقصد یہ تھا کہ مرزا صاحب کی شاعری کو بدنام کیا جائے اور اُن کے کمالات پر خاک ڈالی جائے۔ لیکن ہماری دانست میں نواب صاحب کی نسبت اس قدر بدگمانی بھی مناسب نہیں ہے۔ بے شبہ انھوں نے مرزا صاحب کے اشعار پر بہت سے اعتراض کئے ہیں مگر اسی کے ساتھ جا بجا دل کھول کے تعریف بھی کی ہے اور پوری شرح کو پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر نواب حیدر یار جنگ صاحب مرزا غالب کی اُستادی کے معترف ہیں۔

اس شرح کے متعلق ایک اور بات بھی بیان کرنی ضروری ہے وہ یہ کہ اگرچہ یہ ہر اعتبار سے دیوان غالب کی مکمل شرح ہے اور بعض دیگر شارحین کی طرح اس میں کسی دشوار و حل طلب شعر کو تا امکان شرح کئے بغیر چھوڑا نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ شرح میں جا بجا غیر متعلق مباحث نظر آتے ہیں جو بجائے خود کیسے ہی دلچسپ اور پُر مغز کیوں نہ ہوں اس کتاب کے موضوع سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ مثلاً صفحہ ۳۹، ۴۹ پر میرؔ و سوداؔ کی بعض غلطیاں دکھائی ہیں۔ صفحہ ۸۵ پر دہلی و لکھنؤ کی زبان پر محاکمہ فرمایا ہے اور زبانِ دہلی کی خرابیاں اور زبان لکھنؤ کی وجوہ ترجیح بیان کی ہیں اور صفحہ ۲۰۰ پر حضرت علیؓ کے وصی رسولؐ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہونے کی دلیلیں تحریر فرمائی ہیں! اسی طرح متعدد مقامات پر صفحے کے صفحے اُن مضامین سے بھرے ہوئے ہیں جن کا شعر کی شرح سے براہ راست کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ راقم الحروف کی رائے میں اگر اس شرحؔ کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئے تو جناب نواب صاحب کو چاہیئے کہ اس قسم کے تمام مباحث کو خارج کر دیں۔ بالخصوص ایک دیوان کی شرح میں مذہبی مناظرے کے مضامین کا شامل رہنا ہرگز جائز نہ رکھیں کہ یہ سراسر بے محل اور ناپسندیدہ بات ہے۔

نمونہ شرح

اب ہم نواب صاحب کی شرح کے چند عام نمونے نقل کرتے ہیں' اس کے بعد اُن کے اعتراضات پر ایک نظر ڈالیں گے۔ ے

(۱) مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

"یعنی میں وہ دہقاں ہوں جس کی سرگرمی خود اسی کے خرمن کے لئے برق کا کام کرتی ہے۔ یعنی خرمن کو جلائے ڈالتی ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حرارت غریزی جو کہ باعث حیات ہے خود وہی ہر وقت تحلیل و فنا بھی کر رہی ہے۔ ہیولیٰ بمعنی مادّہ۔ اور مصنف نے صورت کی لفظ ہیولیٰ کی مناسبت سے استعمال کی ہے اور تعمیر سے تعمیر جسم نا کی مقصود ہے۔ خونِ گرم بمعنی سرگرمی۔ اس شعر میں جو مسئلہ طب مصنف نے نظم کیا ہے اسے آگے بھی کئی جگہ باندھا ہے۔" ے

(۲) یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب ! مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

"(تو اور پاسخ مکتوب) یعنی تو اور جواب لکھے، ممکن نہیں۔ تقدیر اس کی یہ ہے (کہاں تو اور کہاں پاسخ مکتوب) کہاں کی لفظ محذوف ہے اور لفظِ پاسخ سے نوشتنِ پاسخ یا فرستادن و دادن پاسخ مُراد ہے اور قاعدہ یہ ہے (کہ) کبھی فعل و فاعل میں اظہارِ استبعاد کے لئے حرفِ عطف کو فاصل کیا کرتے ہیں۔ مثلاً آگ اور نہ جلائے۔ یعنی یہ بات مستبعد ہے۔ اور کبھی مبالغے کے لئے عطف کرتے ہیں جیسے آگ اور دہکتی ہوئی۔ اسی طرح اور متعلقاتِ فعل میں بھی فصل کر دیتے ہیں۔" ے

(۳) دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

"کہتے ہیں جسے ہم سانس سمجھے ہوئے تھے وہ ایک موجۂ خوں کی پر افشانی ہے یعنی غم نے دل و جگر کو لہو کر دیا ہے۔ طبیب کہیں گے کہ جگر میں سانس کہاں جاتی ہے دل و رِیَہ کہا ہوتا اور رِیَہ کو فارسی میں شُش اور اُردو میں پھیپڑا کہتے ہیں لیکن یہ تینوں لفظ کسی شاعر نے نہیں باندھے کہ غیر فصیح ہیں۔ یہ عجب سوءِ اتفاق ہے

ے یہ لفظ (نیز آگے سانس کو) راقم الحروف نے بجنسہ مؤنث نقل کر دیا ہے ورنہ اہلِ دہلی مذکر بولتے ہیں اور نواب صاحب نے بھی اسی شرح میں ایک مقام پر اسے مذکر لکھا ہے۔

کہ اُردو کا لفظ جب غیر فصیح معلوم ہوتا ہے تو شاعر فارسی یا عربی کا لفظ لے لیتا ہے۔ یہاں عربی و فارسی میں یہی لفظ شش در یہ لینے کے قابل نہیں ۔ ۔ ۔ اسی طرح دیکھو ع

یہ پھیپھڑے ہیں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے

شاعر کی زبان نہیں معلوم ہوتی ہے یہی اشکال واقع ہونے کے سبب سے مصنف نے پھیپھڑے کا نام بھی جگر رکھ لیا کہ محض اندرون شے کو بھی جگر کہتے ہیں۔"

(۴) بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا — شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

(کا) کے یہ معنی ہیں کہ کس کی چشمِ مست نے بزم مے کو وحشت کدہ بنا دیا ہے، اور موجِ شراب کو نبضِ پری سے تشبیہہ دی ہے تاکہ مطلب یہ نکلے کہ پری بزم سے وحشت کرکے نکل گئی۔"

(۵) ہجومِ نالہ، حیرت، عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے — خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

میدانِ جنگ میں جب کوئی گروہ مغلوب ہو جاتا ہے تو اپنا اظہارِ عجز کرنے کے لئے گھانس پھونس وغیرہ مُنہ میں دبا کر دکھاتے ہیں کہ لڑائی موقوف کرو۔ یہاں ہجومِ نالہ نے لشکر کشی ہے اور حیرت ایک نالہ کرنے میں بھی عاجز ہے اور اسی عجز کا اظہار کرنے کے لئے خموشی ریشۂ صد نیستاں سے ـــــ الخ لیکن خس بدنداں ہونے کے لئے ریشۂ نیستاں کی کیا تخصیص ہے؟ یہ کہ وہ نالہ و فریاد کی جڑ ہے کہ ریشہ سے نَے پیدا ہوتی ہے اور نَے سے نالہ اور حالتِ ضبط میں نالے چھپے ہوئے ہیں جس طرح ریشۂ نیستاں میں ۔ ۔ ۔ حرفِ ندا محذوف ہے یعنی "اے ہجومِ نالہ" مراد ہے۔ فقط ہجومِ نالہ کو مخاطب کرکے مصنف نے ریشہ صد نیستاں کہنے کا باعث بنا دیا۔"

تحسین و اصلاح

شرح کا اصلی مقصود تو یہ ہے کہ مشکل اور حل طلب مقامات کے صاف اور سادہ الفاظ میں معنی بیان کر دیئے جائیں۔ اسی کے ساتھ شعر کے خاص خاص محاسن و اسقام کی طرف اشارہ کرنا بھی شارح کے فرایض میں داخل کر سکتے ہیں لیکن اس بارے میں جہاں تک ہو سکے اختصار و احتیاط سے کام لینا چاہیئے خاص کر عیوب کے بیان کرنے میں مسلّمہ اصول و قواعد کی پابندی ضروری ہے۔ محض انفرادی ذوق اور ذاتی رائے کی بنا پر کسی شعر کی

بے تامّل مذمت نہ کرنی چاہیئے کیوں کہ شاعری ذوقی چیز ہے اور بہت ممکن ہی کہ ایک شعر ہمیں اچھا نہ معلوم ہو مگر دوسرا شخص اس کو سُن کر پھڑک جائے۔ تنقید اور تبصرے کا معاملہ دوسرا ہی اور اُن کے لکھنے سے نقاد کی غرض ہی یہ ہوتی ہی کہ جو رائیں اُس نے قایم کی ہیں ان کو مُدلّل اور واضح طریق پر ناظرین کے سامنے پیش کرے کہ وہ ان آرا میں اُس کے شریک اور ہمخیال ہو جائیں۔

شرح نویسی کی اس حد بندی کو اگر ہمارے خیال کے موافق درست مانا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ نواب حیدر یار جنگ نے اپنی شرح دیوان غالب میں کافی احتیاط سے کام نہیں لیا۔ ہم نے سرسری طور پر گن کر دیکھا تو کم و بیش ایک ہزار اشعار کی شرح لکھنے میں نواب صاحب موصوف نے چالیس پچاس جگہ تو شعر کی تعریف کی ہی لیکن تقریباً سوا سو مقامات پر طرح طرح کے اعتراضات وارد کئے ہیں اور جا بجا خود اصلاح دے کر گویا کلامِ غالب کی خامی ظاہر کی ہی۔ پہلے انھیں مجوزہ اصلاحات کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

(۱) ڈھونڈے ہے اُس مغنیِّ آتش نفس کو جی — جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

اس شعر کے معنی اور تشبیہہ کی خوبی بیان کرنے کے بعد نواب صاحب لکھتے ہیں "مگر شعر میں یہ کہنا کہ ایسا ہو اور ویسا ہو شعر کو سُست کر دیتا ہی۔ اس کے برخلاف اگر یوں کہتے کہ 'تیری صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے' تو زیادہ لطف دیتا" (صفحہ ۱۵)

لیکن اس "اصول" کی عجیب ہمہ گیری سے قطع نظر حیرت ہی کہ نواب صاحب کو پہلے مصرعے کا خیال نہ رہا کہ اگر اُن کے خیال کے مطابق دوسرے مصرعے کو بدلا جائے تو پہلے کا کیا حشر ہوگا؟

(۲) جلاّد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے — ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "جلاّد و واعظ میں چنداں مناسبت نہیں اگر واعظ کی جگہ قاضی کہتے تو اچھا تھا کہ وہی انا الحق کہنے والوں کے قتل کا فتویٰ دیا کرتا ہی"

نواب حیدر یار جنگ صاحب جیسے باریک بین نقاد کا یہ قول دیکھ کر ہمیں واقعی تعجب ہوا۔ کیوں کہ ہندوستان کا تو ذکر کیا ہی جہاں صدیوں سے قاضی صرف نکاح خوانی کی خدمت انجام دیتا ہی خود فارسی شعرا کے ہاں بھی غزل میں اس لفظ کا استعمال شاید مشکل سے کہیں ملے گا۔

(۳) اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق — جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے

اس شعر کی شرح کرنے کے بعد نواب صاحب لکھتے ہیں کہ "اس مضمون کو یوں کہنا تھا۔ ع

اُٹھا وفا سے ہاتھ تو اونچے علم ہوئے" (صفحہ ۱۸۶)

افسوس ہے کہ راقم الحروف نواب صاحب کے اس مصرعے کا مطلب ہی نہ پا سکا۔ یہ تو معلوم ہے کہ اس میں علم اُٹھنے اور اونچے ہونے کا ضلع باندھا گیا ہے لیکن باوجود کوشش کے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس مصرعے کو اختیار کرنے کے بعد شعر کا یا خود اس مصرعے کا مفہوم کیا ہوگا؟

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

نواب صاحب نے ایک طویل بحث کے دوران میں اس شعر کے پہلے مصرعے کے بجائے خود سترہ مصرعے تضمین کیے ہیں (صفحہ ۱۸۳) جن میں سے دو پہلے اور دو آخری (جو غالباً اوروں سے بہتر ہیں) یہ ہیں

چھوڑا نہ در کو یار کے کیا کیا ستم ہوئے — ہر چند اس میں ہاتھ ـــــ الخ

پردہ اُٹھا کے ہم نے تمھیں دیکھ تو لیا — " " " "

چوری سے بوسۂ خطِ رُخسار لے لیا — " " " "

کھانے دیا نہ ہم نے کسی نخل کو تبر — " " " "

راقم الحروف نے بعض اور صاحبانِ ذوق کو بھی نواب صاحب کے یہ سب مصرعے سنائے لیکن افسوس ہے ان سترہ مصرعوں میں سے ایک کو بھی کسی صاحب نے مرزا غالب کے اصلی مصرعے سے بہتر و قابل ترجیح نہیں بتایا۔

مرزا غالب کا کلام آسمانی یا الہامی تو ہے نہیں کہ اس میں لغزش و خطا کا احتمال ہی نہ ہو۔ لیکن اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ مرزا غالب کو شاعری سے غیر معمولی اور خداداد مناسبت تھی اور ابتدائی تعلیم و تربیت بھی ایسی ملی جو مشرقی شاعری کے حق میں نہایت مفید و مساعد سمجھی جاتی ہے۔ اُردو شاعری سر سے پاؤں تک فارسی شاعری کے قالب میں ڈھالی گئی تھی۔ مرزا غالب فارسی کے بھی نہایت عالی مرتبہ شاعر مانے گئے ہیں

اور مجموعی طور پر اہل الرائے آج کل انھیں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے بہترین شعرا میں شمار ہونے کا مستحق جانتے ہیں۔ غرض ایسے شخص کے اشعار پر بے دھڑک اعتراض کر دینا یا اس کو اصلاح دینے کا دعویٰ کرنا ہمارے خیال میں ایک ناروا جسارت ہے۔ لیکن نواب حیدر یار جنگ صاحب نے چند اشعار میں اصلاح دینے کے علاوہ ایک جگہ تو یہ ستم کیا ہے کہ مرزا غالب کو لکھنؤ کے نیم خواندہ کاپی نویس کے ہاتھ سے اصلاح دلوائی ہے۔ یعنی اس شعر کی شرح میں کہ "پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے" لکھتے ہیں کہ "خود دہلی میں پیچ کا لفظ مصنف کی زبان پر بتذکیر ہے مگر اس شعر میں یہ تانیث ہے۔ غالباً یہ سبب ہوا کہ پہلے یہ دیوان لکھنؤ میں چھپا وہاں کاتب نے تصرف کر دیا پھر مصنف نے بھی اسے یونہی رہنے دیا۔" (صفحہ ۲۰۵)

گویا خود مرزا غالب (نواب حیدر یار جنگ کی طرح) اپنی زباں دانی کو اس قدر کم رتبہ جانتے تھے کہ انھوں نے لکھنؤ کے ایک غیر معروف کاتب کی رائے کو اپنی رائے اور معلومات پر ترجیح دی اور اس خوش نصیب لکھنوی کے قول کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا۔ ! لیکن نواب حیدر یار جنگ صاحب کو غالباً معلوم ہوگا کہ پیچ کا لفظ دہلی میں بالاتفاق مونث بولتے ہیں اور اگر مرزا غالب پہلے اس کو مذکر سمجھتے بھی تھے تو ظاہر ہے کہ بعد میں انھوں نے اس شہر کی زبان اختیار کر لی ہوگی جو لڑکپن سے ان کا وطن بن گیا تھا۔

طرفہ تر یہ کہ نواب صاحب مرزا غالب کی اُستادی کے بھی معترف ہیں اور اس شعر کی نسبت کہ:
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
لکھا ہے کہ یہ مرزا صاحب کی "بلاغت کی سند اور اُستادی کی دستاویز ہے" (صفحہ ۲۲۱)
اسی طرح

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "اگر اس شعر پر مرزا غالب خدائے سخن ہونے کا دعویٰ کریں تو بالکل بجا ہے" (صفحہ ۱۱۹)
اور چند شعروں کے متعلق نواب صاحب نے لکھا ہے کہ ان کی "تعریف حدِ امکان سے باہر ہے" یہ ہیں:

(۱) کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے — مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا (صفحہ ۱۹)

(۲) اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا! (صفحہ ۴۳)

(۳) اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے — کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر (صفحہ ۶۶)

(۴) نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں (صفحہ ۱۱۰)

ان دو شعروں کی تشبیہہ کو بھی نواب صاحب نے بہت سراہا ہے اور لکھا ہے کہ "انصاف یہ ہے کہ متحرک کی تشبیہہ میں مصنّف کو ید طولی ہے":-

(۱) زخم کر ظالم کہ کیا بو دِ چراغِ کشتہ ہے — نبضِ بیمار وفا دُودِ چراغِ کشتہ ہے (صفحہ ۱۵۵)

(۲) اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصوّر — دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی (صفحہ ۲۰۰)

اس غزل کے متعلق کہ "نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے — الخ لکھا ہے کہ "ساری غزل مُرصّع کہی ہے اور یہی رنگ غزل خوانی کا ہے" (صفحہ ۲۱۱)

ایک قصیدے کی تشبیہہ کی تعریف میں جس کا مطلع ہے ؎

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

نواب صاحب لکھتے ہیں کہ "اُردو میں جب سے قصیدہ گوئی شروع ہوئی ہے اس طرح کی تشبیب کم کہی گئی" (صفحہ ۲۸۶)

اس طرح بعض اور مقامات پر بھی نواب صاحب نے مرزا غالبؔ کے حُسنِ بیان کی داد دی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے ابتدا میں بیان کیا اُن کے اعتراضات کی تعداد ان تعریفوں سے کہیں زیادہ ہے اور یوں بھی اس شرح کے متعلق بعض باتیں تفصیل و اطمینان سے بحث کے قابل ہیں جس کے لئے ناظرین رسالۂ اُردو آئندہ نمبر کا انتظار فرمائیں۔

خاکسار

سید ہاشمی فرید آبادی

حیدر آباد، دکن

۱۷ رجمادی الاول ۱۳۴۰ھ

کلکتہ یونیورسٹی کمیشن

اور

دیسی زبانوں کی تعلیم

از اڈیٹر

اس سے قبل کہ دیسی زبانوں کی تعلیم اور مادری زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کے متعلق کمیشن کی تحقیقات اور رائے کا ذکر کیا جائے۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی عہد کے ابتدا میں مشرقی تعلیم کے متعلق جو کوشش کی گئی اس کی مختصر تاریخ بیان کردی جائے، تاکہ بیان مسلسل ہو جائے اور اس کے سمجھنے میں آسانی ہو مشرقی و مغربی اور مادری زبان کی تعلیم کا تعلق ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہے کہ ایک کے بیان میں دوسرے کا ذکر ناگزیر ہے۔

مشرقی تعلیم کی مختصر تاریخ

جب انقلاب زمانہ سے ہندوستان کی قسمت "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے ہاتھ میں پہنچی تو کمپنی نے اپنے زیر انتظام علاقہ میں عدالتیں قائم کیں۔ لیکن انگریز جج ملک کے حالات، لوگوں کے خصائل و عادات اور قانون نافذ الوقت کی نزاکت سے بالکل نابلد تھے۔ اس لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ ہر عدالت میں ایک مولوی اور ایک پنڈت رکھا جائے جو معاملات کے سلجھانے اور قانون کی تعبیر میں مدد دے۔ لیکن اعلیٰ قابلیت کے مولوی اور پنڈت اس خدمت کے قبول کرنے سے ابا کرتے تھے۔ کچھ تو اس خیال سے اور کچھ مسلمانوں کے خوش کرنے کے لئے لارڈ وارن ہسٹنگز

گورنر جنرل نے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ مدرسہ قائم کیا جس میں مسلمان طلبہ کو فارسی عربی کی تعلیم دی جانے لگی۔ دس سال بعد (۱۷۹۱ء میں) انگریزی رزیڈنٹ مسٹر جاناتھن ڈنکن نے بنارس میں سنسکرت کالج کا ڈول ڈالا جس میں اب تک سنسکرت کی تعلیم ہوتی ہے۔

جب کمپنی نے حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو ملک میں ابتری اور پریشانی پھیلی ہوئی تھی اور بہت سے مدارس جو اس وقت تک قائم تھے اور جگہ جگہ اشاعتِ علم کا فرض ادا کر رہے تھے رفتہ رفتہ تنزل کرنے لگے۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے حامی و سرپرست یا تو دنیا سے اُٹھ گئے یا گردشِ زمانہ کے ہاتھوں ایسے مجبور اور پریشان خاطر ہو گئے کہ "آپ جوگے رہے اور نہ اورکے گوں کے"۔ اُن کی جگہ جو حاکم ہوئے وہ محض اجنبی تھے اور اُن کے آگے ہاتھ پھیلانا غیرت نے گوارا نہ کیا۔ اس زمانہ کے مشہور مستشرق ہنری ٹامس کول برک نے ایک یادداشت لکھی ہے جس میں اُس وقت کے علمی تنزل کا خاکہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان میں علم و ادب کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے۔ نہ صرف علما کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے بلکہ وہ جماعت بھی جس میں سے یہ جوہر قابل پیدا ہوتے تھے محدود ہوتی جاتی ہے۔ علوم نظری کا مطالعہ لوگ چھوڑتے جاتے ہیں۔ علم ادب کی طرف مطلق توجہ نہیں اور سوائے خاص خاص مذہبی معتقدات کے کسی علم کا ذوق باقی نہیں رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سی بیش بہا کتابیں ضائع ہو جائیں گی۔ اور اگر گورنمنٹ نے سرپرستی اور ہمدردی نہ کی تو اندیشہ ہے کہ صرف کتابیں ہی مفقود نہ ہو جائیں گی بلکہ اُن کے پڑھانے والے بھی مفقود ہو جائیں گے۔ اس انحطاط کا بڑا سبب یہ ہے کہ پہلے بادشاہ اور اُمرا علم اور اہلِ علم کے قدردان تھے اور طرح طرح سے اُن کے ساتھ رعایتیں کرتے اور مدد دیتے تھے۔ اور وہ اطمینان خاطر کے ساتھ درس و تدریس اور تحقیق و تدقیق کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ ان ذرائع کے مفقود ہونے سے یہ ہوا کہ اُن مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا اور جہاں دُور دُور سے طالب علم پڑھنے آتے تھے آج وہاں علم کی کساد بازاری ہے۔ اب بھی شاہزادے نواب اور زمیندار جنھیں اپنے باپ دادا سے علم کا شوق پہنچا ہے تھوڑی بہت مدد کرتے رہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ قوم جو سلطنت کے دوسرے حصوں میں علم کی محبت کے لئے مشہور ہے اس نے ہندوستان کے علم و ادب کی ترقی میں کوئی مدد نہ دی۔ قومی اور ملکی مدارس کے تباہ ہونے اور علمی انحطاط کی وجہ سے جہالت

بڑھتی جاتی ہی اور جہالت کے ساتھ ساتھ جرائم میں بھی ترقی ہو رہی ہے۔

۱۔ سنسکرت کی تعلیم

اس کے بعد اس یادداشت میں سنسکرت کالج بنارس اور کلکتہ مدرسہ کی اصلاح کی تجاویز پیش کی ہیں نیز ندیا اور ترہٹ میں دو اور سنسکرت کالج قایم کرنے کی بھی تجویز کی ہے۔ لیکن ان تجاویز کو عملی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

۱۸۱۳ء میں یہ قرار پایا کہ ایک لاکھ کی رقم ہندی علما کے زیر اثر علم ادب کے احیاء و ترقی اور سائنس کے آغاز و اشاعت کے لیے صرف کی جائے۔ مستشرقین اور مشنریوں کی سعی سے یہ رقم مشرقی تعلیم پر صرف ہوئی کیونکہ اُن کا منشا یہ تھا کہ مشرق کے علمی خزانے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائیں اور اہلِ مغرب کے سامنے پیش کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنارس کالج کا تمام خرچ گورنمنٹ کے ذمہ ہوگیا اور سنسکرت کے دوسرے مدارس کو بھی امداد ملنے لگی۔

۲۔ سنسکرت کالج کلکتہ

جب مشرقی تعلیم کی طرف توجہ ہوئی ہی تو ۱۸۲۴ء میں بعہد لارڈ امہرسٹ کلکتہ میں بھی سنسکرت کا ایک کالج قایم ہوا جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ اس ذریعہ سے ہندوؤں کا علم ادب، مذہب اور قانون محفوظ رکھا جائے۔ ابتدا اس کی پچاس طلبہ اور آٹھ پروفیسروں سے ہوئی اور منطق، فقہ، فلسفہ، صرف و نحو، نجوم (ہیئت) اور طب کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ ۱۸۲۵ء میں انگریزی جماعتیں بھی کھولی گئیں لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی اور آٹھ سال بعد ۱۸۳۵ء میں بند کرنی پڑیں۔ لیکن ۱۸۴۲ء میں جب تعلیمی مصلحتوں میں پھر تغیر ہوا تو انگریزی کی تعلیم دوبارہ شروع کی گئی ۱۸۵۱ء کا سنہ اس کالج کی تاریخ میں قابل یادگار ہے۔ کیوں کہ اس سنہ میں نامور پنڈت ایشور چند ودیا ساگر کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ فاضل پرنسپل نے طریقۂ تعلیم، کتب نصاب اور انتظامی امور میں بہت کچھ اصلاحیں کی خصوصاً مغربی طریقۂ تعلیم کو رایج کیا اور تمام ہندوؤں کو سنسکرت کی اجازت دی اس سے قبل صرف برہمن ہی تعلیم

پاسکتے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں پرنسپل پنڈت مہیش چندر نیا یارتن نے خالص سنسکرت کی جماعتیں قایم کیں جس میں طلبہ کو بعد امتحان ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ اس شعبہ میں قدیم طرز پر تعلیم دی جاتی ہے۔ پروفیسر قدیم طرز کے موروثی پنڈت ہیں اور وہ اسی قدیم طریقہ پر تعلیم دیتے ہیں۔ پہلے طب کی بھی تعلیم ہوتی تھی لیکن جب سے میڈیکل کالج قایم ہوا ہے پرانی طب کی تعلیم اس کالج سے موقوف کردی گئی۔ اب اس کالج میں تین شعبے ہیں (۱) اینگلو سنسکرت کالج (۲) اینگلو سنسکرت سکول (۳) خالص سنسکرت کا شعبہ۔

پہلا شعبہ بعض مضامین میں بی۔ اے تک کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ یہ انتظام انڈین یونیورسٹیز ایکٹ کے نافذ ہونے پر ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ اس سے قبل انٹرمیڈیٹ یا بی۔ اے کی جماعتیں نہ تھیں۔ جو طالب علم اس کالج میں داخل ہوتے وہ سنسکرت کو چھوڑ کر باقی مضامین کی تعلیم پریسیڈنسی کالج میں پاتے۔ اس زمانہ میں اس کالج سے طلبہ ایم۔ اے کے امتحان میں بھی شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ سنسکرت کے امتحان ایم۔ اے میں جس قدر طلبہ کامیاب ہوئے ہیں وہ سب اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

دوسرا شعبہ صرف میٹرکولیشن تک ہے جس میں دس جماعتیں ہیں ادنےٰ پانچ جماعتوں کی تعلیم دیسی مدارس کے اصول پر ہے اور اوپر کی پانچ جماعتوں کی تعلیم اینگلو سنسکرت اصول پر۔

تیسرا شعبہ خالص مشرقی ہے جس میں صرف ونحو، وید، ہیئت (نجوم) کی تعلیم ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کے جدید قواعد نافذ ہونے کے بعد سے اس کے طریقہ تعلیم میں تھوڑی سی تبدیلی واقع ہے۔ یعنی اب علاوہ قدیم طریقہ کے پنڈتوں کے انگریزی داں عالم بھی اساتذہ میں شریک کیے گئے ہیں۔ اور قدیم اور جدید طریقۂ تعلیم کے سمونے کی کوشش کی گئی ہے اور قدیم متن اور شرح کے ساتھ جدید تنقید اور تحقیق کو بھی شریک کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم السنہ وعلوم کی تعلیم کا یہی بہتر اور مناسب طریقہ ہے۔

۴۔ سنسکرت کے خانگی مدارس

سنسکرت کالج کے قایم کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ خانگی مدارس کے لئے نمونہ ہو اور یہ مدرسے اُسی کی تقلید کریں۔ قدیم طرز کی تعلیم میں امتحانات کی یہ صورت نہ تھی جو آج کل رائج ہے۔ بلکہ علما کے عام جلسوں میں زبانی بحث

مباحثے ہوتے تھے اور اسی پر سے طلبہ کی لیاقت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان بنگال میں بعض سبھائیں اس غرض سے قایم ہوئیں کہ خانگی مدارس کے طلبہ کا باقاعدہ امتحان لیا جائے۔ ان سبھاؤں نے اپنی اپنی سندیں (ڈگریاں) دینی شروع کیں۔

۱۸۷۸ء میں پنڈت مہیش چندر نیایا رتن پرنسپل سنسکرت کالج کی تحریک پر بنگال گورنمنٹ نے سنسکرت کے امتحانات کا طریقہ رائج کیا۔ ان امتحانات کے قایم ہونے اور سرکاری اسناد (ڈگریاں) ملنے پر قدیم طرز کی سنسکرت تعلیم کا بہت شوق بڑھا اور دُور دُور سے طلبہ ان امتحانات میں شریک ہونے کے لئے آتے تھے ان امتحانات کے تین درجے رکھے گئے ہیں۔ ابتدائی، وسطانیہ اور اعلیٰ (جو ڈگری کا امتحان ہوتا ہی) چوں کہ گورنمنٹ کو وقتاً فوقتاً ان مدارس کو امداد دینی پڑتی تھی۔ لہذا پنڈت مہیش چندر ان مدارس کی تحقیق حالات کے لئے مقرر کئے گئے۔ اور انھوں نے ایک بسیط اور عمدہ رپورٹ مرتب کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاص خاص مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کو امتحانات کے نتائج پر الاؤنس اور وظیفے دیئے جانے لگے۔ یہ امتحانات پہلے مسلمہ سبھاؤں کے زیر نگرانی ہوتے تھے لیکن بعد میں پرنسپل سنسکرت کو تفویض کر دیئے گئے۔ لیکن ۱۹۰۶ء میں بعض ذی اثر اصحاب نے ایک میموریل لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا اور یہ درخواست کی کہ ان امتحانات کے انتظام اور نصاب تعلیم کی ترتیب اور عطائے وظائف میں پرنسپل سنسکرت کالج کے ساتھ قدیم طرز کے پنڈت بھی شریک کئے جائیں۔ چنانچہ اس پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس سنسکرت دانوں کی بصدارت ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن) منعقد ہوئی جس میں مجلس شوریٰ امتحانات کے قیام کی سفارش کی گئی۔ یہ مجلس بورڈ آف سنسکرت ایگزامینیشن کے نام سے قایم ہوئی۔ اس میں گیارہ رکن تھے جن میں سے چھ قدیم طرز کے پنڈت تھے۔

۱۹۱۳ء میں بنگال گورنمنٹ نے اس غرض سے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا کہ بنگال احاطہ میں سنسکرت کی اشاعت و ترقی کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کانفرنس نے خاص خاص تجویزیں اس کے متعلق پیش کیں لیکن جو پنڈت اس کانفرنس میں شریک تھے اُن سب نے بالاتفاق اس پر اصرار کیا کہ جس طرح ڈھاکہ یونیورسٹی کمیٹی نے اسلامی علوم والسنہ کی تعلیم کے لئے خاص انتظام تجویز کیا ہی ویسا ہی انتظام سنسکرت کی تعلیم کا بھی کیا جائے

شرقی بنگال اور آسام کے پنڈتوں کی یہ خواہش تھی کہ سنکرت کا بھی ایک شعبہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں رکھا جائے مگر مغربی بنگال، بہار اور اڑیسہ کے پنڈت یہ کہتے تھے کہ کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ ایک سنکرت کالج بطور اُس کی شاخ کے قایم کیا جاے۔ پنڈتوں کی یہ قطعی رائے تھی کہ تمام صوبہ کے لئے قدیم طرز کی سنکرت کی تعلیم کے لئے ایک انتظام ہونا چاہیئے جو یونیورسٹی کی تعلیم سنکرت سے جُدا ہو۔ اور اُس کا نام "کلکتہ سنکرت ایسوسی ایشن" ہو۔

۱۹۱۸ء میں اس رپورٹ پر بنگال گورنمنٹ کا رزولیوشن شائع ہوا جس میں کانفرنس کی خاص خاص تجویزوں کو منظور کیا۔ منجملہ ان کے پانسو پنڈتوں کی ایک کانوکیشن قایم کی گئی اور علاوہ اس کے ایک انتظامی مجلس قایم ہوئی جس میں علاوہ پریزیڈنٹ اور سکرٹری کے بیس رکن تھے۔ ان میں میں قدیم طرز کے پنڈتوں کی تعداد پندرہ تھی۔ چنانچہ "کلکتہ سنکرت ایسوسی ایشن" قایم ہوگئی اور امتحانات اور طلبہ و مدرسین کو نتائج امتحانات پر وظائف و انعام دینے کا انتظام اس کو تفویض کردیا گیا۔ یہی مجلس گورنمنٹ کو سنکرت کے تعلیمی امور اور امداد عطا کرنے کے متعلق مشورہ دیتی ہے۔ بعد میں بہار اور اڑیسہ کے الگ ہونے پر وہاں بھی ایک ایسی ہی مجلس قایم کی گئی۔

اس قسم کی درسگاہیں بنگال میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ ہیں اور یہ سب اسی مجلس کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کے نگراں اور منتظم اور مدرس سب قدیم طرز کے پنڈت ہیں اور اسی قسم کی تعلیم ان میں دی جاتی ہے۔ افسوس کہ ابھی تک کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی کہ یہ لوگ مغربی علم سے بھی فیضیاب ہوسکیں۔ ایسی صورت پیدا ہونے سے ان کی نظر زیادہ وسیع ہوجائے گی اور اُن کا علم زیادہ کامیاب اور مفید ثابت ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم طرز پر تعلیم دینے سے ان کا علم عمیق ضرور ہوگا لیکن نقص یہ ہے کہ وسعت پیدا نہیں ہوتی۔

دیگر السنہ کی تعلیم

پیروان بدھ کی مذہبی کتب پالی زبان میں ہیں۔ اس زبان میں بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جس سے چھٹی صدی قبل مسیح سے لے کر بارھویں صدی مسیح تک کے ہندوستان کے مذہبی معاشرتی اور سیاسی حالات پر

روشنی پڑتی ہے۔ یوں تو یہ زبان یونیورسٹی کے امتحانی مضامین میں داخل تھی لیکن سب سے پہلے سنسکرت کالج کے پرنسپل نے امتیاز کے ساتھ اس زبان میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ یہ پہلا امتحان تھا اور ممتحن انگلستان اور جرمنی میں تلاش کرنے پڑے۔ اس کے بعد سے بعض ملحقہ کالجوں میں بی۔ اے تک کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اور یونیورسٹی نے اندر گریجوائوں اور گریجوائٹوں میں پالی زبان کی اشاعت کے لئے آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ گزشتہ چند سال سے یونیورسٹی نے خاص کر اُن طلبہ کے لئے جن کے کالج اس زبان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ کر سکتے تھے۔ پالی زبان کے لکچرار مقرر کئے ہیں۔ علاوہ سنسکرت کالج کے پرنسپل کے یونیورسٹی پروفیسروں میں چند ممتاز گریجوایٹ ہیں ان میں سے ہر ایک پالی میں ایم۔ اے کا امتحان بدرجۂ اعلیٰ کامیاب ہے۔ اور ایک کو لندن یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری عطا کی ہے اس نے فلسفۂ بدھ پر ایک بسیط مقالہ لکھا تھا۔ علاوہ اس کے پروفیسروں میں تین بدھ راہب ہیں جو بدھ کے فلسفہ، مذہب اور روایات سے کامل طور پر واقف ہیں۔

یونیورسٹی نے تبتی زبان پر توجہ کی ہے اور بعض منتخب کتب کو شائع کیا ہے اور انگریزی تبتی لغت بھی تیار کرائی ہے۔ ڈاکٹر و دیا بھوسن کو تبتی زبان کا معلم مقرر کیا ہے اور ایک وظیفہ بھی اُس گریجوایٹ کے لئے تجویز کیا ہے جو تبتی زبان کی تحصیل کرے گا۔ علاوہ اس کے اور کئی کتابیں تبتی زبان کے متعلق بڑے اہتمام سے تیار ہو رہی ہیں۔ تبتی زبان کی تعلیم و تحقیق سے بدھ کے زمانہ کے بہت سے حالات معلوم ہوں گے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی سے بارھویں صدی تک ہندی مشنری بدھ مذہب کی اشاعت کے لئے تبت میں پہنچتے رہے ہیں اور یہاں سے بہت سی کتابیں اپنے ساتھ لے گئے تھے جو ہندوستان میں مفقود ہیں مگر تبت میں اب تک موجود ہیں۔ غرض تبتی زبان میں بہت کچھ سرمایہ ہے جو ہندوستان کی تاریخ، زمانہ بدھ کی معاشرت اور بدھ کے فلسفہ و مذہب کے سمجھنے میں بہت مدد دے گا۔

کمیشن کی رائے ہے کہ چینی اور جاپانی زبانوں کی طرف بھی یونیورسٹی کو توجہ کرنی چاہیئے۔ کیوں کہ اربابِ تحقیق کے لئے قدیم ہندوستان کے تمدن و تاریخ کا بہت سا سرمایہ ان زبانوں میں موجود ہے۔ چند سال ہوئے یونیورسٹی نے مسٹر یاماکامی کو اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہ چینی ماخذات کو لے کر بدھ فلسفہ پر لکچر دیں۔ چنانچہ یہ لکچر بہت مشہور ہوئے

حال ہی میں یونیورسٹی نے چینی اور جاپانی کے تین معلّم مقرر کئے ہیں جن کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ چینی اور جاپانی ماخذات سے بدھ فلسفہ کی تحقیق کریں۔ان میں دو جاپانی عالم ہیں جو ہندوستان میں سنسکرت اور ہندی فلسفہ کی تحصیل و تحقیق کے لئے آئے تھے۔ یہ یونیورسٹی کی خوش قسمتی ہے کہ اُسے ایسے فاضل دستیاب ہوگئے۔ ژند کا تعلق بھی ہندوستان کی تہذیب و تمدن سے بہت کچھ ہے اور ایک پارسی عالم جو لسانیات کا پروفیسر ہے اس زبان کی تعلیم دیتا ہے اور بعض محققانہ کام کر رہا ہے۔

عربی مدارس

جب انگریزوں کے قدم بنگال میں جم گئے اور انہوں نے اس خطہ کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو انتظامی صیغوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم نے دیوانی ایسٹ انڈیا کے حوالہ کردی۔اس سے مسلمانوں کی سیاسی حالت میں بہت بڑا تغیر پیدا ہوا جب معاہدہ سرکاری زبان فارسی ہی رہی اور عدالتی اور مالی انتظام اسلامی شرع کے مطابق انجام پاتا رہا۔ اس کام کے لئے قابل مولویوں کی ضرورت رہتی تھی۔لیکن اعلیٰ پایہ کے علما سرکاری ملازمت قبول کرنے سے ابا کرتے تھے اس لئے وارن ہیٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ مدرسہ کی بنیاد ڈالی تاکہ اس کے تعلیم یافتہ اسلامی شرع کے مطابق عدالت اور دوسرے انتظامی صیغوں میں مدد دے سکیں۔ دوسری وجہ اس کے قیام کی وارن ہیٹنگز نے یہ بیان کیا ہے کہ مالگزاری کا انتظام جب سے ہمارے ہاتھ میں آیا ہے تو اس کام کو یا تو کمپنی کے انگریز ملازم انجام دیتے ہیں یا ہندو جو بوجہ کفایت شعاری اور محنت کے عادی ہونے کے حساب اور فنانس کا کام مسلمانوں سے بہتر کرتے ہیں۔اس تغیر سے مسلمان خاندانوں کی آمدنی کو بہت نقصان پہنچا ہے اور وہ اپنی اولاد کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں کر سکتے۔

۱۸۲۸ء میں گورنمنٹ نے اراضیات کے پٹوں اور انعامات کی تحقیق شروع کی۔ اٹھارہ سال کی تحقیق کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی اراضیات گورنمنٹ کے قبضے میں آگئیں اور اس سے مسلمانوں کے مدارس کو سخت نقصان پہنچا کیوں کہ ان کی آمدنی کا دارمدار اوقاف پر تھا جو اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تعلیمی مسئلہ پر مشرقیوں اور مغربیوں میں بڑے گرم مباحثے ہو رہے تھے۔کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اپنی تحریر مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۸۳۰ء

میں صاف طور پر اپنا رجحان انگریزی تعلیم کی ترقی کی طرف ظاہر کر دیا تھا۔ ۲ فروری ۱۸۳۵ء کو لارڈ میکالے نے اپنی مشہور یادداشت تحریر کی اور ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو لارڈ ولیم بنٹنک نے اُسی کی بنا پر اپنے فیصلے کا اعلان سرکاری رزولیوشن کے ذریعہ سے کیا۔ اس رزولیوشن میں علاوہ دوسرے امور کے ایک یہ بھی تھا کہ اس کے بعد کوئی وظیفہ کسی ایسے طالب علم کو نہیں دیا جائے گا جو دیسی علوم کی تحصیل کی غرض سے کسی مدرسہ میں داخل ہو گا۔ کلکتے کے مسلمانوں نے اس فیصلے کے خلاف ایک درخواست پیش کی جس پر آٹھ ہزار اشخاص کے دستخط ثبت تھے اور جس میں گورنمنٹ کو یہ الزام دیا گیا تھا کہ گورنمنٹ جو انگریزی تعلیم کی تائید کرتی ہے اور اسلامی اور ہندو علوم کی مخالف ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اہل ہند عیسائی ہو جائیں۔ ایک یہ درخواست تھی اور ایک وہ درخواست تھی جو راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۳ء میں لارڈ امہرسٹ گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کی تھی جس میں انھوں نے سنسکرت کالج کے قیام کی سخت مخالفت کی تھی اور اس پر اصرار کیا تھا کہ ہمیں مغربی علوم کے مدارس درکار ہیں۔ ۱۸۳۷ء میں فارسی بھی دربار سرکار سے خارج ہو گئی اور دفتری کاروبار یا تو انگریزی میں یا مقامی زبان میں انجام پانے لگا۔ بنگالی مسلمان بنگالی زبان کے استعمال سے اجتناب کرتے تھے۔ اور اُن کے مدارس میں بھی اس کا رواج نہ تھا۔ اس قانون کے نافذ ہونے سے مسلمانوں کے جذبات کو صدمہ پہنچا اور انھیں یہ خیال ہوا کہ ہمیں بدیسی حکمرانوں ہی کی زبان سیکھنی نہیں پڑے گی بلکہ ان لوگوں کی زبان بھی حاصل کرنی پڑے گی جو تھوڑے دنوں پہلے ہماری رعایا تھے۔ غرض پے در پے کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ جس سے مسلمانوں کی مالی حالت، معاشرت، تعلیم کو نقصان پہنچا اور اُن کے دلی جذبات کو ٹھیس لگی۔

۱۸۳۳ء میں تعلیم کا زمانہ سات سال تھا اور شرع اسلامی، صرف و نحو و عام ادب، حساب یا الجبرا۔ اقلیدس، منطق یا بلاغت یا فلسفہ ہیئت یا دینیات اور سرکاری قوانین و آئین کی تعلیم ہوتی تھی۔ مدرسہ کی کمیٹی نے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی اور اس کے لئے وظیفہ کی مقدار دو سے پانچ روپیہ ماہانہ کر دی نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ لڑکے تو بہت سے داخل ہو گئے مگر انگریزی زبان کے حاصل کرنے کا مطلق شوق نہ تھا چنانچہ جب ۱۸۳۵ء میں کلکتہ میڈیکل کالج قائم ہوا تو اس مدرسہ میں ایک طالب علم بھی ایسا نہ نکلا جو معمولی انگریزی جانتا ہو اور کالج میں داخل ہونے کے قابل ہو۔ اسی قسم کا مگر اس سے کم درجہ کا ایک مدرسہ مرشد آباد میں

قایم کیا گیا۔

مدرسہ کی حالت اس زمانہ میں کچھ ڈانواں ڈول سی رہی خصوصاً انگریزی جماعتیں جو قایم کی گئی تھیں وہ بہت ناکامیاب رہیں، عربی شعبہ کے طلبہ مطلق اس طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں اینگلو عربک جماعتیں خاص عربی شعبہ کے لئے قایم کی گئیں مگر اس میں بھی ناکامیابی ہوئی۔ ۱۸۵۰ء میں کونسل آف ایجوکیشن نے گورنمنٹ سے درخواست کی کہ کسی یورپین پرنسپل کا تقرر کیا جائے اور اس کے فرائض اور ذمہ داریاں وہی ہوں جو دوسرے کالجوں میں ہوتی ہیں بجز اس کے کہ اس کے لئے کسی جماعت کی تعلیم لازم نہ ہوگی۔ چنانچہ اس خدمت پر ڈاکٹر سپرنگر کا تقرر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے مدرسہ میں بعض ایسی تبدیلیاں کیں جس سے بڑی شورش پیدا ہوئی۔ اس پر کونسل نے ایک کمیٹی تحقیقات کے لئے مقرر کی۔ کمیٹی کی رپورٹ پر کونسل نے ۱۸۵۳ء میں یہ تجویز پیش کی کہ انگریزی اور اینگلو عربک جماعتیں بند کردی جائیں اور بجائے ان کے ایک اینگلو پرشین شعبہ قایم کیا جائے جس میں انگریزی اور فارسی ساتھ ساتھ پڑھائی جائیں۔ لارڈ ڈلہوزی (گورنر جنرل) نے ان تجاویز کو منظور کیا۔

۱۸۵۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ مسلمان یورپی علوم کی تحصیل کی طرف زیادہ توجہ کر رہے ہیں۔ مگر کلکتہ مدرسہ کی حالت کو ناقابل اطمینان بتایا اور اُسے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی تحریک کی اور یہ تجویز کی کہ اسے یونیورسٹی سے ملحق کردیا جائے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ مشرقی کالجوں میں انگریزی اور دیسی زبانوں کی تعلیم کا کافی انتظام کیا جائے تاکہ یورپی علم کی اشاعت میں زیادہ آسانی ہو۔

افسوس ہے کہ ان تجاویز پر عمل نہوا اور مدرسہ کی حالت بدستور رہی۔

۱۸۵۸ء میں لفٹننٹ گورنر بنگال نے مدرسہ کے متعلق ایک خاص رپوٹ طلب کی۔ پرنسپل وقت کپتان ولیم ناسولیس نے ایک رپوٹ پیش کی۔ اس پر غور کرنے کے بعد لفٹننٹ گورنر نے یہ تجویز کی کہ عربی شعبہ موقوف کردیا جائے اور اینگلو پرشین شعبہ بدستور قایم رہے اور عربی زبان کی پروفیسری کلکتہ یونیورسٹی یا پریسیڈنسی کالج میں قایم کردی جائے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کی رائے یہ تھی

کہ بجائے اس شعبہ کے موقوف کرنے کے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ کونسل آف ایجوکیشن نے ۱۸۵۳ء میں جو اصلاحیں تجویز کی تھیں اُن پر کامل طور سے عمل کیا جائے۔ سکرٹری آف اسٹیٹ نے بھی اس سے اتفاق کیا (۱۸۶۱ء) ۱۸۶۷ء میں اینگلو پرشین شعبہ کا الحاق بحیثیت سیکنڈ گریڈ کے کلکتہ یونیورسٹی سے ہوگیا لیکن جب جماعتوں کا افتتاح ہوا تو صرف چھ طالب علم اس میں شریک ہوئے۔ دوسرے سال ان کی تعداد چار ہی رہ گئی اور تیسرے سال صرف تین اور وہ بھی سال کے اندر چھوڑ کر چل دیئے۔

۱۸۶۹ء میں گورنمنٹ بنگال نے پھر ایک بار مدرسے کے دریافت حالات کے لئے ایک کمیٹی قایم کی۔ کمیٹی نے اپنی رپوٹ میں یہ رائے دی کہ مدرسہ کا اینگلو پرشین شعبہ بند کردیا جائے اور ایک تجویز یہ کی کہ ہر سال مسلمان طلبہ کی خاص تعداد پریسیڈنسی کالج میں کم شرح فیس پر داخل کی جائے یہ انتظام اب تک جاری ہے۔

۱۸۸۲ء کے انڈین ایجوکیشن کمیشن میں مسٹر امیر علی (رائٹ آنریبل سیّد امیر علی) نے جو شہادت دی ہے اس میں ان مدرسوں کی تعلیم کے متعلق بہت بے اطمینانی ظاہر کی ہے اور مسلمانوں کے لئے مضر بتایا ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ نہ دنیاوی معاش حاصل کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور نہ جدید علوم و تمدن سے واقف ہوتے ہیں انگریزی زبان لازم قرار نہ دینے سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا جس کی تلافی اب مشکل ہے۔

شمالی ہند بنگال کی نسبت زیادہ خوش قسمت رہا۔ وہاں سرسید احمد خاں مرحوم کی بے نفس مساعی کی بدولت انگریزی تعلیم کو زیادہ ترقی ہوئی حالاں کہ انگریزی تعلیم وہاں بہت بعد میں پہنچی ۱۸۸۶ء میں سرسید مرحوم نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قایم کی جس نے اُن کے مقاصد کی اشاعت میں بہت مدد دی۔ جب پنجاب میں اورینٹل کالج قایم ہونے والا تھا تو سرسید مرحوم نے اس کی سخت مخالفت کی۔ انھیں اندیشہ تھا کہ مسلمان طلبہ اُسے ستا کالج سمجھکر داخل ہوں گے اور انگریزی تعلیم سے بے بہرہ رہجائیں گے۔

۱۸۸۲ء سے کلکتہ مدرسہ کی انگریزی شاخ زیادہ مقبول ہونی شروع ہوئی۔ مگر باوجود اس کے مدرسہ کی تعلیم میں کوئی ترقی نہ ہوئی۔

ایک بار پھر کوشش کی گئی کہ کلکتہ مدرسہ اور دوسرے مدرسوں کو جو اس کے متعلق ہیں معمولی اسکولوں اور کالجوں کے اصول پر کردیا جائے تاکہ وہ جدید حالات اور ضروریات کے مطابق ہوسکیں۔ ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ

بنگال نے یہ تجویز کی کہ ایک خاص درجے کے بعد عربی شعبہ کے دو نصاب کردیئے جائیں۔ ایک میں کچھ انگریزی اور کچھ مشرقی تعلیم ہو اور دوسرے میں خالص مشرقی۔ یہ تجویز منظور نہیں ہوئی۔ کیوں کہ یہ خیال کیا گیا کہ مشرقی تعلیم کم کرکے انگریزی پڑھائی جائیگی اور اس پر بھی انگریزی کا علم ناقص رہیگا۔ بنگال گورنمنٹ کے رزولیوشن مورخہ ۲ فروری ۱۹۰۳ء میں یہ خیال کیا گیا کہ جو مسلمان طالب علم اچھی طرح انگریزی سیکھنی چاہتے ہیں انھیں کلکتہ مدرسے کے اینگلو پرشین شعبہ میں داخل ہونا چاہیئے جہاں فارسی اور عربی میٹرکولیشن کے امتحان کے لئے بطور اختیاری مضامین کے پڑھائی جاتی ہے۔

۱۹۰۶ء میں مسٹر ارل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن بنگال نے گورنمنٹ میں یہ تحریک پیش کی کہ مسلمان اصحاب کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے اور اس امر کا فیصلہ کیا جائے کہ آیا کلکتہ مدرسہ میں ایک ایسا امتحان قائم کیا جائے جس کی کامیابی پر سند (ڈگری) دی جائے۔ علاوہ اس کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق دیگر مسائل بھی پیش کئے جائیں اس کانفرنس کا پہلا جلسہ ۲۶ دسمبر ۱۹۰۷ء میں ہوا۔ اس میں پچاس ارکان تھے جن میں مشرقی بنگال اور آسام کے نائبین نیز بورڈ آف اگزامینرز کے سکرٹری اور کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل بھی شریک تھے۔

کانفرنس نے تین سب کمیٹیاں قائم کیں۔

(۱) مدرسوں میں ڈگری کا امتحان اور انگریزی تعلیم پر غور کرنے کے لئے۔

(۲) مکتبوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اُن کی اصلاح و ترقی کے لئے۔

(۳) اُردو زبان کی تعلیم کے متعلق۔

تمام تجاویز کمیٹی کے سامنے ۲۲ اپریل ۱۹۰۸ء کو پیش ہوئیں اور ناظم تعلیمات نے تمام کارروائی کا خلاصہ مقامی گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کیا۔ کانفرنس میں یہ امر طے پایا کہ مدرسوں کا نصاب تین حصّوں میں تقسیم کردیا جائے ادنیٰ جو چھ سال کا اور اسکول کی جماعتوں میں پڑھایا جائے گا۔ اعلیٰ جو کالج کے لئے ہوگا اور اس کی مدت پانچ سال ہوگی۔ ڈگری (سند) کے امتحان کے لئے جس کی مدت تین سال ہوگی۔ ڈگری کے امتحان کی جماعتیں کلکتہ مدرسہ میں قائم کی گئیں۔ ادنیٰ اور اعلیٰ کی تعلیم بنگلی اور دوسرے مدرسوں میں ہونے لگی جو اپنے طلبہ کو ڈگری کے امتحان

کے لئے بنگال کے مدرسوں میں بھیجنے کے مجاز کئے گئے۔

ادنیٰ نصاب میں اُردو، فارسی، عربی، حساب، جغرافیہ جہاں، تاریخ ہند اور ڈرل شریک کی گئی حالانکہ اُردو بعض مدرسوں میں اکثر طالب علموں کی مادری زبان نہ تھی تاہم ذریعۂ تعلیم عام طور پر اُردو ہی تھا۔ اس لئے معتد بہ وقت اس زبان کی باقاعدہ تعلیم کے لئے رکھا گیا۔ فارسی کی تعلیم کے لئے ڈائرکٹ میتھڈ (یعنی تعلیم بذریعہ گفتگو کا طریقہ) رائج کیا گیا۔ حساب کا نصاب موجودہ امتحان میٹرکولیشن کے حساب کے برابر رکھا گیا۔

اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں حساب کی نظرِ ثانی، اقلیدس کے پہلے چار مقالے، منطق، بلاغت، فلسفہ شرعِ اسلامی، عربی زبان و ادب، فارسی زبان و ادب تجویز کی گئی۔ جو انگریزی لیتے اُن کے لئے فارسی اختیاری مضمون قرار دیا گیا

ڈگری کے امتحان کے لئے ذیل کے مضامین میں سے کوئی ایک نصاب۔

(۱) حدیث، تفسیر، عقاید

(۲) فقہ، اصول فقہ، تاریخ اسلام

(۳) ادب، بلاغت، عروض و قافیہ، تاریخ اسلام

(۴) منطق، فلسفہ، تاریخ اسلام

اس پر بہت بحث رہی کہ انگریزی کو لازم قرار دیا جائے یا نہیں۔ آخر کو یہی قرار پایا کہ لازم نہونی چاہیئے۔ یہ خیال کیا گیا کہ جسے انگریزی پڑھنی ہو وہ کلکتہ مدرسے کے اینگلو پرشین شعبہ میں داخل ہو۔ البتہ یہ تجویز کی گئی کہ ادنیٰ مدرسے کے اوپر کی تین جماعتوں میں اور اعلیٰ مدرسہ کی پانچ جماعتوں میں انگریزی پڑھائی جائے۔ ڈگری کی جماعتوں میں انگریزی پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ انگریزی کا خاص دوسال کا نصاب اُن طلبہ کے لئے تجویز کیا گیا جو اعلیٰ پانچویں جماعت میں کامیاب ہیں یا جنھوں نے ڈگری کا نصاب لیا ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم کی ترغیب کے لئے دو دو روپیہ ماہانہ کے چھ وظیفے تجویز کئے گئے۔ ان وظائف کی مدت ایک سال قرار دی گئی۔ یہ اُن طلبہ کے لئے تھے جو انگریزی اختیاری مضمون کے طور پر لیتے۔

کانفرنس میں اس امر پر بہت بحث رہی کہ انگریزی کی تعلیم کس حد تک ہونی چاہیئے۔ اصل تجویز یہ تھی کہ

انگریزی کی تعلیم کلکتہ یونیورسٹی کے درجۂ بی۔ اے تک ہو۔ لیکن ڈاکٹر راس نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ یونیورسٹی کے کسی درجہ کا تعلق درست نہیں۔ اُن کا ذاتی تجربہ ہے کہ مدرسوں میں جو تعلیم اسلامی السنہ وعلوم کی اس وقت ہوتی ہے طلبہ میں اس سے کافی ذوقِ علم پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کم سے کم نصف درجن ایسے مسلمانوں کو جانتے ہیں کہ اگرچہ انھوں نے کسی ہائی اسکول میں یا میٹرکولیشن کے امتحان کے لئے مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی انگریزی میں اُن کی علمی واقفیت اوسط درجہ کے بی۔ اے سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ خیال کیا گیا تھا کہ اگر طالب علم دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ تین سال اسکول میں اور پانچ سال کالج میں انگریزی زبان کی تعلیم پائے گا تو اُسے انگریزی زبان کا کافی اور اچھا علم ہو جائے گا اور اس کے بعد انگریزی زبان میں دو سال کا خاص نصاب اس علم میں اور اضافہ کرے گا۔ مسٹر ارل نے یہ تجویز کی کہ اس مدت کی تعلیم کے بعد ایسا طالب علم یونیورسٹی کے بی۔ اے کے مساوی سمجھا جانا چاہیئے ان تجاویز کو لفٹنٹ گورنر نے منظور کر لیا لیکن خاص نصاب اب تک مقرر نہوا۔ اس کمیٹی میں یہ بھی تجویز ہوا کہ ان مدارس میں مدرسین بہتر قابلیت کے ہونے چاہئیں اسی ضمن میں یہ قرار پایا کہ کلکتہ مدرسہ کے لئے چھ سو روپیہ ماہوار پر مصر سے ایک عالم عربی زبان کا بلایا جائے۔

مسٹر ارل نے ایک یہ تجویز بھی پیش کی کہ یہ عام قاعدہ کہ پریسیڈنسی اور بردوان قسمت میں مسلمان طلبہ کا ذریعہ تعلیم اُردو نہ قایم رکھا جائے۔ لیکن خاص خاص مقامات میں جہاں مسلمان آبادی کثرت سے اُردو زبان بولتی ہے وہاں تعلیم کا ذریعہ اُردو ہی ہونا چاہیئے۔ اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ گیا یعنی جب اُردو کی تعلیم بحیثیت دوسری زبان کے ہوگی تو اُس کے لئے مدرسین کا تقرر کیا جائے۔ ۱۹۰۸ء میں بنگال گورنمنٹ نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ جہاں کہیں اُردو مدرس مہیا ہو سکے بنگال کے اسکولوں میں اُردو زبان کی تعلیم بحیثیت دوسری زبان کے دی جائے۔ بنگال گورنمنٹ نے اُس وقت اُردو کے لئے زائد مدرسین کے تقرر پہ زور دیا تھا۔

بنگال کے لفٹنٹ گورنر (سر انڈریو فریزر) نے کانفرنس کی تجاویز کو منظور فرمایا اور ناظم تعلیمات سے درخواست کی کہ حسب گنجائش رقم رفتہ رفتہ ان تجاویز کا نفاذ کیا جائے۔ لیکن مصر سے عربی عالم کے بلانے کے متعلق اس بنا پر اختلاف کیا کہ اس کے لئے گنجائش نہیں۔

تجویزِ اصلاحِ مدارس

مشرقی بنگال کے نائبین نے اس کانفرنس کے فیصلے سے اختلاف کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ نصاب میں جدید حالات کا لحاظ رکھا جائے اور انگریزی پر زیادہ توجہ کی جائے۔ مشرقی بنگال اور آسام کے لئے الگ کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت ظاہر کی گئی اور پراونشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے جس کا انعقاد ۱۹۰۹ء میں میمن سنگھ میں ہوا تھا، ایک مجلس اس غرض کے لئے تجویز کی۔

اس مجلس نے ۱۹۱۰ء میں یہ طے کیا کہ ادنیٰ مدارس میں بجائے چھ سال کے جیسا کہ بنگال میں ہی سات سال کا نصاب ہونا چاہیئے۔ اور اس کی تعلیم میں مفصلۂ ذیل امتیازی صورت ہو۔

۱۔ زیادہ تر دنیوی تعلیم ہو۔

۲۔ سوائے ڈھاکہ کے باقی مقامات میں ذریعۂ تعلیم بنگالی ہو۔

۳۔ فارسی خارج کردی جائے۔

۴۔ سوائے ادنیٰ دو جماعتوں کے انگریزی لازم قرار دی جائے۔

نصاب اس طرح کا تجویز کیا گیا کہ طالب علم ادنیٰ مدرسے کے امتحان میں کامیابی حاصل کرکے ہائی اسکول کی ساتویں جماعت (یعنی نیچے سے چوتھی) میں داخل ہوسکتا ہے یا اعلیٰ مدرسہ کی پہلی جماعت میں قرآن کی تعلیم نیز عربی کی تعلیم جدید اصول پر داخل نصاب کی گئی۔

مدرسہ کا اعلیٰ نصاب چار سال کا رکھا گیا اور کمیٹی نے تجویز کی کہ انگریزی لازم قرار دی جائے۔ اس نصاب میں ریاضی، ابتدائی طبعیات، فلسفہ، منطق، اصول فقہ وفقہ، عربی زبان وادب اور اصول اسلام داخل تھے۔

ناظم تعلیمات (مسٹر شارپ) نے گورنمنٹ میں ان تجاویز کو پیش کرتے وقت بعض مشکلات کا اظہار کیا جن میں سے خاص مشکلات اخراجات، اُستادوں کی قلت، کلکتہ مدرسے سے قطع تعلق اور مناسب درسی کتب کا نہ ہونا تھیں۔ مسٹر شارپ نے یہ بھی بیان کیا کہ اس نصاب میں بہت سے مختلف قسم کے مضامین داخل کردیئے گئے ہیں

اور اُسے بہت مشکل کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد مسٹر ناتھن نے اس پر کارروائی شروع کی۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ مجوزہ نصاب سادہ ہونا چاہئیے اور جہاں تک مالی حالت اجازت دے حتی الامکان بہت سے مدارس میں رائج کر دیا جائے۔ اس غرض کے لئے ۱۹۱۲ء میں ایک کانفرنس قائم کی گئی۔ ابھی یہ کانفرنس اس مسئلہ پر غور رہی کر رہی تھی کہ تقسیم بنگال منسوخ ہو گئی اور گورنمنٹ آف انڈیا نے ڈھاکہ میں یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ جدید ڈھاکہ یونیورسٹی میں اسلامی علوم والسنہ کا شعبہ قائم کیا جائے اور گورنمنٹ آف انڈیا نے اسے منظور کر لیا۔ ادنیٰ کے لئے سات سال کا اور اعلیٰ کے لئے پانچ سال کا نصاب تجویز ہوا۔ ان نصابوں میں قرآن، اردو، بنگالی، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، انگریزی، عربی ڈرائنگ (نقشہ کشی) دستکاری اور ڈرل کی تعلیم تجویز کی گئی۔

بنگال گورنمنٹ نے اپنے رزولیوشن مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۱۵ء میں اس اسکیم کے متعلق یہ تحریر کیا ہے۔

"گورنر باجلاس کونسل اُس نصاب تعلیم پر جو مسلمان بزرگوں کے مشورہ سے مرتب کیا گیا ہے اظہار اطمینان کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی قوم کے لئے بے انتہا مفید ہوگا۔ چنانچہ اس امر کا فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ سرکاری مدرسوں میں (باستثنائے کلکتہ مدرسہ) یہ نصاب رائج کیا جائے۔

ایک لحاظ سے اصلاحی مدرسوں کا یہ نصاب ڈھاکہ یونیورسٹی کے اسلامی علوم والسنہ کے شعبہ کا زینہ ہوگا۔ تاہم یہ بجائے خود مکمل ہے۔ اور جو طالب علم مدرسے سے فارغ ہو کر علاوہ اسلامی علوم والسنہ کی یونیورسٹی کے کسی اور نصاب میں شریک ہونا چاہیں گے تو انھیں کوئی خاص تکلیف نہ ہوگی۔

اس نصاب میں دو باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں۔

(۱) فارسی کا نصاب سے خارج ہونا۔

(۲) انگریزی کا بحیثیت لازمی مضمون کے شریک نصاب ہونا

امر اول کے متعلق گورنر باجلاس کونسل بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ پچاس برس قبل بنگالی مسلمان جو فارسی سے ناآشنا ہوتا، تعلیم یافتہ اور مہذب خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن اب مجھے یہ معلوم ہوا کہ فارسی کے

بڑے سے بڑے حامی بھی* یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اصول تعلیم کے بالکل خلاف ہی کہ لڑکے کو پانچ زبانیں پڑھنے پر مجبور کیا جائے یعنی بنگالی، اُردو، انگریزی، عربی اور فارسی۔ بنگالی کا جاننا ناگزیر ہے، اُردو بنگالی مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے درمیان ایک رشتہ ہی یہ بمنزلہ ایک کڑی کے ہی۔ عربی اسلامی زبان ہی۔ فارسی اور اُردو میں گہرا تعلق ہی، اور گزشتہ پچاس سال میں اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہی۔ گورنر باجلاس کونسل کو یقین ہی کہ اگر اردو مناسب طریقہ سے پڑھائی جائے تو اس سے مسلمانوں کے تہذیب ذوق میں وہی مدد ملے گی جو پچاس سال قبل فارسی کی تعلیم سے ملتی تھی۔ ان حالات میں گورنر باجلاس کونسل نے کسی قدر افسوس کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہی کہ فارسی کو اسکول کے نصاب سے خارج کر دیا جائے۔ میں دیکھتا ہوں کہ مسٹر ارل کی منعقدہ کانفرنس نے بھی فارسی کو انگریزی کے ساتھ اختیاری رکھا تھا۔"

کلکتہ مدرسہ کا نصاب بدستور قدیم ہی رہا

بنگال گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس احاطہ میں ایک سرکاری مدرسہ ایسا ضرور رہنا چاہیئے جس میں قدیم نصاب ہی کی تعلیم ہو، خواہ انگریزی اختیاری مضمون کے حیثیت سے ہو یا مطلق نہو۔ رائیں دریافت کی گئیں کہ کون مدرسہ قدیم نصاب کے لئے مخصوص کیا جائے تو کثرت رائے سے کلکتہ مدرسہ ہی کے لئے معین کیا گیا کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے بھی اس کے متعلق رائیں طلب کیں بائیں میں سے چودہ نے یہی رائے دی۔

مدرسوں کی موجودہ حالت

مدرسوں کا نصاب خواہ قدیم ہو یا جدید چار حصوں میں منقسم ہی۔

(۱) ابتدائی جماعتیں جو مکتب کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ مکتب مدرسوں سے الگ ہیں۔

(۲) تحتانیہ شعبہ جو مڈل کے مساوی ہی۔

(۳) فوقانیہ شعبہ جو ہائی اسکول کے مساوی ہی۔

(۴) اعلیٰ جماعتیں جو یونیورسٹی کی ڈگری کی جماعتوں کے مساوی ہیں۔

بنگال میں فوقانیہ مدارس تیرہ ہیں جن میں سے چار کا خرچ سرکار دیتی ہے سات امدادی ہیں اور باقی غیر امدادی۔ ہر فوقانیہ مدرسہ میں تحتانیہ شعبہ بھی ہے۔ تحتانیہ مدارس ۱۰۴۲ ہیں۔ جن میں سے ایک سرکاری، ۹۱۰ امدادی اور باقی غیر امدادی ہیں۔

بنگال کے فوقانیہ اور تحتانیہ مدارس میں (۲۱۲۲۲) طالب علم ہیں۔ مڈل اور ہائی اسکولوں میں مسلمان طلبہ کی تعداد ۳۰۳۰ ہے۔ گویا جملہ مسلمان طلبہ میں سے جو ثانوی تعلیم پا رہے ہیں ۱۷ فیصدی مدرسوں میں زیر تعلیم ہیں۔ وہ طالب علم جو مکتبوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس میں شریک نہیں ہیں۔ مکتبوں میں مسلمان طالب علموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

تحتانیہ اور فوقانیہ مدرسوں کے آخری امتحانات کا کام ایک مجلس کو تفویض کیا گیا ہے جو سررشتہ تعلیم کے ماتحت ہے۔

اصلاح یافتہ مدرسوں کے نصاب میں عربی زبان اور ادب، شرع اسلامی، بلاغت، منطق (عربی میں) ریاضی (حساب و علم ہندسہ) انگریزی، تاریخ اور دیسی زبان (بنگالی یا اردو) میٹرکولیشن کے درجہ تک شریک ہے۔ تاریخ ہند انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔

ہائی اسکولوں اور ان مدرسوں کے نصاب میں اتنا فرق ہے کہ بجائے الجبرے کے منطق، بلاغت اور اسلامی شرع رکھی گئی اور یہ مضامین عربی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔ مگر کتابیں جدید ہیں۔ عربی زبان و ادب کا معیار میٹرکولیشن کے مقابلہ میں بہت اعلیٰ ہے۔

کلکتہ مدرسہ کا نصاب ان مدرسوں کے نصاب سے مختلف ہے یہ اختلاف ان تین صورتوں میں پایا جاتا ہے

(۱) مدرسہ عالیہ کلکتہ میں انگریزی لازم نہیں۔ طالب علم کو اختیار ہے خواہ فارسی لے خواہ انگریزی۔

(۲) نصاب نظامیہ کی تعلیم ہوتی ہے اور گورنمنٹ نے یہ طے کر دیا ہے کہ وہ اس میں مداخلت نہ کرے گی۔

(۳) اس کا معیار اعلیٰ ہے اور یونیورسٹی کے درجہ کی تعلیم ہوتی ہے۔

یونیورسٹی میں اسلامی علوم کی تعلیم

کلکتہ کے انڈرگریجوائٹوں کو اس کی شکایت رہی ہے کہ فارسی عربی کی تعلیم کا کافی انتظام نہیں ہے اگرچہ مسلمان طلبہ کی تعداد محدود ہی مگر وہ تقریباً تمام کالجوں میں پائے جاتے ہیں. اور اکثر انھیں ایسے کالجوں میں داخل ہونا پڑتا ہی جہاں عربی فارسی کا مطلق انتظام نہیں. چند سال ہوئے منتظمین یونیورسٹی نے اسے محسوس کیا کہ مسلمان طلبہ درحقیقت نقصان میں ہیں اور وہ اسلامی تہذیب سے بے بہرہ رہجاتے ہیں. اس خیال سے انھوں نے مسلمان انڈرگریجویٹ طلبہ کی خاطر اُن کالجوں میں جہاں فارسی عربی کا انتظام نہ تھا فارسی اور عربی کے معلّم مقرر کئے. اس کے علاوہ یونیورسٹی نے پوسٹ گریجوایٹ طلبہ کے لئے عربی اور فارسی کی جماعتیں قایم کیں. فی الحال چھ لکچرار ہیں. دو مشترک. ایک خاص عربی کے لئے اور دو فارسی کے لئے ہیں مگر طلبہ کی تعداد بہت کم ہی. بعض اوقات فارسی یا عربی کے شعبہ میں ایک طالب علم بھی نہیں ہوتا. اس کے متعلق یہ کہکر ٹال دینا کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے ہیں کافی نہیں ہی. ایک وجہ یہ بھی ہی کہ ان مضامین کی تعلیم جیسی ہونی چاہیئے نہیں ہوتی. کمیشن کی رائے ہی کہ اس کمی کے اسباب کچھ بھی ہوں یہ جماعتیں ضرور قایم رہنی چاہیئں کیوں کہ قطع نظر مسلمانوں کی ضروریات کے اسلامی تہذیب کو بھی ہمیں مدنظر رکھنا چاہیئے. اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ایم. اے کے لئے جو نصاب عربی فارسی کا تجویز کیا گیا ہی وہ اس قدر وسیع اور جامع نہیں ہی جیسا سنسکرت اور پالی کا. اگر اسلامی علوم و تہذیب کی تحقیق و مطالعہ کے لئے کوئی نصاب تجویز کیا جائے تو اس میں مختلف قسم کے بہت سے مضامین شریک ہو سکتے ہیں اس لئے ایم. اے کے لئے جو فارسی عربی کا نصاب مقرر کیا گیا ہی وہ اصلاح و نظر ثانی کا محتاج ہی. تاریخ کی مجلس نے جو اسلامی تاریخ کے متعلق پوسٹ گریجوائٹ طلبہ کے لئے لکچروں کا انتظام کیا ہی اس کی دو قسمیں کی ہیں. ایک اسلامی تہذیب اندرون ہندوستان دوسرے بیرون ہندوستان. لیکن اس میں بھی مسلمان طلبہ کی تعداد بہت کم ہی.

آخر میں کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی ہی کہ بنگال کے مسلمانوں کی تعلیمی پستی رفع کرنے کا سوال اسلامی مدرسوں کے مسئلے کے ساتھ وابستہ ہی. ان مدرسوں کو نہ صرف ذہنی و دماغی تعلیم و تہذیب کے حقیقی مرکز بنانے کی

کوشش کرنی چاہیئے بلکہ اس کے ضمن میں زمانہ جدید کی ضروریات و حالات کو بھی مدِنظر رکھنا چاہیئے۔

اِن تمام حالات کے پڑھنے کے بعد ایک بات جو دل میں کھٹکتی ہے یہ ہے کہ باوجودیکہ اسلامی مدارس بنگال میں کچھ کم ڈیڑھ سو برس سے جاری ہیں لیکن اُن کے نتائج سنسکرت کالجوں کے مقابلہ میں بہت کم وقعت اور ہیچ ہیں۔ اسی طرح کلکتہ یونیورسٹی اور اس کے ملحقہ کالجوں میں جو عربی فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے وہ اس قدر معمولی اور گھٹیا ہے کہ اس سے بہت کم فائدہ بنگال کے مسلمانوں کو پہنچا ہے۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے سنسکرت کالجوں میں تعلیم حاصل کی ہے یا یونیورسٹی میں رہ کر سنسکرت اور قدیم علوم میں مساوات پیدا کی ہے ان میں بہت سے ایسے اصحاب نظر آتے ہیں جو علم وفضل میں خاص امتیاز رکھتے ہیں اور جنھوں نے علمی تحقیق میں نام پیدا کیا ہے۔ مگر اسلامی مدارس یا یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اس پایہ کے لوگ مفقود ہیں اس سے کہیں زیادہ شمالی ہند کے قدیم عربی مدارس نے کام کیا ہے جہاں جوق کے جوق بنگالی طلبہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں اور پھر اپنے وطن میں واپس آکر اسلامی خیالات اور تہذیب کو پھیلاتے ہیں۔ اس ناکامیابی کی ایک وجہ یہ تھی کہ جو روشن خیال انگریز یا مسلمان اسلامی مدارس کے حامی اور رہمدرد تھے اور جن کے ہاتھ میں ان کی ترقی و فلاح تھی وہ اس اہم کام کی پوری صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ کاش اسلامی مدارس کی باگ پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر یا پنڈت مہیش چندر نیا یا رتن جیسے بالغ نظر فضلا کے ہاتھ میں ہوتی جو زمانہ کی ضرورت اور علم کے صحیح اور وسیع معنوں سے آگاہ تھے اور جن کی مناسب تجویزوں اور اصلاحوں سے سنسکرت تعلیم کو بڑا انتہا فائدہ پہنچا۔

۲۔ اگرچہ بار بار انتظام اور نصابِ تعلیم کے متعلق مجلسیں منعقد ہوئیں اور گورنمنٹ نے قرار دادیں منظور کیں مگر نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں کوئی مفید اصلاح نہ ہوئی اور باوجود مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے تغیرات کے کے ان مدارس کی تعلیم کا ڈھنگ ویسا ہی رہا اور اس کے افادہ میں کوئی وسعت پیدا نہ ہوئی۔

۳۔ کچھ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی نظر تنگ اور خیالات محدود تھے۔ وہ کسی بڑے تغیر کو پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ جب مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں اس کے مشہور پرنسپل ڈاکٹر سپرنگر نے بعض ایسی اصلاحیں کرنی چاہیں جن سے مدرسہ کی حالت میں بہت کچھ تغیر پیدا ہو جاتا تو مسلمانوں نے بہت شور وغل مچایا اور اُس کی ایک نہ چلنے دی

یہی ڈاکٹر سپرنگر تھا کہ جب دہلی کالج کا انتظام اس کے ہاتھ میں آیا تو اُس نے اُسے ایک چیز بنا دیا ۔

۴۔ اگرچہ ابتدا میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی تعلیم قدیم طرز کی رکھی گئی تھی۔ کیوں کہ ضرورت اسی کی داعی تھی، لیکن بعد میں دوسرے مضامین بھی شریک کیے گئے اور انگریزی زبان کا بھی آغاز ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ مشرقی اور مغربی علوم اور ذوق کو یکجا کیا جائے اور دونوں کو سمو کر نئی کیفیت پیدا کی جائے تاکہ وہاں کے تعلیم یافتہ تحقیق و تنقیدِ علم کی داد دے سکیں اور ملک میں علم کا صحیح ذوق پیدا کریں۔ یہ خیال اعلیٰ درجہ کا ہے اور تعلیمی نقطۂ نظر سے اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں ہوسکتی۔ لیکن جس قدر اس کا کہدینا آسان ہے اُسی قدر اس کا عمل میں لانا دشوار ہے۔ اس کا تجربہ کئی بار مختلف مقامات میں کیا گیا۔ لیکن اب تک پوری کامیابی کہیں بھی نہیں ہوئی۔ علی گڑھ میں یہ ناکام ثابت ہوا۔ لاہور کا اورینٹل کالج اب تک ڈاکٹر لائٹنر کی لکیر پیٹ رہا ہے۔ مدرسہ ندوۃ العلما لکھنؤ اسی اصول پر اور اسی نیت سے قایم ہوا۔ ہردوار کا گروکل بھی غالباً اسی کوشش میں ہے مگر اب تک اس کے متعلق کوئی رائے قایم نہیں کی جاسکتی اور جس کامیابی کی توقع تھی وہ اب تک حاصل نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور نے شانتی نکیتن میں اسی اصول کو مدنظر رکھ جدید یونیورسٹی کا ڈول ڈالا ہے جس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ حیدرآباد دکن میں بھی اسی منشا کے ساتھ وسیع پیمانہ پر یونیورسٹی قایم کی گئی ہے جس کی کامیابی وناکامیابی اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اس کے منتظم ہیں۔ اس کا فیصلہ زمانہ آیندہ کرے گا۔ احمد آباد، علی گڑھ اور دوسرے مقامات میں قومی یونیورسٹیاں اور کالج حال میں قایم ہوئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ کہاں تک قومی تعلیم کے منشا کو سمجھے ہیں اور کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں اس قسم کی جتنی کوششیں کی گئیں ان میں صرف ایک جگہ کامیابی کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ مرحوم دہلی کالج ہے۔ ڈاکٹر سپرنگر اور اُن کے بعض مددگار اس منشا کے مفہوم کو خوب سمجھے تھے اور اُن کی سعی اور دوربینی سے تعلیم کا ڈھنگ ایسا پڑ گیا تھا جو اس ملک اور ہمارے طبائع کے مناسب تھا۔ اُس کے بعض تعلیم یافتہ مثلاً ماسٹر رام چندر، مولوی ذکاء اللہ، ڈاکٹر نذیر احمد، مولوی ضیاء الدین مولوی عبدالکریم وغیرہ ایسے ہیں جنھوں نے علمی لحاظ سے اپنے ملک اور زبان کی ایسی خدمت کی کہ ان کا نام ہماری زبان میں ہمیشہ یاد رہیگا۔ بدنصیبی سے یہی کالج توڑ دیا گیا۔ اس سے بڑھکر عمال کی ناعاقبت اندیشی

کی مثال اور کیا ہوسکتی ہی۔

اصول نہایت صحیح اور قابل قدر ہی مگر دشواری عمل میں ہی۔ ناکامی کی وجوہ زیادہ تر دو ہیں۔ اوّل جن حضرات نے اس اصول پر کاربند ہونا چاہا وہ یا تو اس اصول کے صحیح مفہوم کو پورے طور پر سمجھے نہیں یا اُن دشواریوں سے ناواقف تھے جو اِس پر عمل کرنے میں پیش آتی ہیں۔ دوسرے ایسے پروفیسر اور معلّم نہایت مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں جو خود اُن اوصاف سے متصف ہوں جنھیں وہ اپنے طالب علموں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی جو عالمانہ مزاج رکھتے ہوں۔ جن کی نگاہ میں اپنے علوم اور تہذیب کے ساتھ جدید علوم کی وسعت بھی ہو۔ جو قدیم علوم کی پختگی اور استقلال کے ساتھ نئے طرز تعلیم کے اسلوبوں سے واقف ہوں اور دونوں میں پیوند لگانے کا سلیقہ رکھتے ہوں۔ اور جن کی رواداری تحقیق حق کی راہ میں ایسی عالمگیر ہو کہ کسی قسم کا تعصب یا توہم یا وسوسہ اُن کے شوق اور جوش میں حائل نہ ہوسکے۔

فانوسِ حیات یا زندانِ موجودات

(نتیجۂ فکر مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لا۔ دہلی۔ از سنٹرل جیل دہلی)

مسٹر آصف علی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن کی انشاپردازی، اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مسلّم ہے۔ اُن کا ذوقِ ادب بہت پاکیزہ ہے اور وہ ایک نازک خیال شاعر ہیں۔ آج کل وہ سنٹرل جیل دہلی میں ہیں۔ اور وہیں سے انھوں نے "اُردو" کے لئے ایک نظم بھیجی ہے جو اُن کی دلی کیفیت کی شاہد ہے۔ (اڈیٹر)

فانوسِ حیات ہے وہ زنداں ہے شمعِ وجود جس میں عریاں

گُل میں ہے ازل سے رنگ محبوس ہے شعلۂ بُو کا غنچہ فانوس

پیکر میں بشر کے خوں ہے محصور ہو چنگ میں جیسے نغمہ مستور

پابندِ سلاسلِ روانی خود قطروں کی قید میں ہے پانی

صہبا کا قفس بنا ہے مینا ہیں تجلیاں رز کی صیدِ صہبا

ہے دُرج صدف میں قیدِ گوہر شعلہ ہے اسیرِ دامِ اخگر

کہسار ہے وہ ہیجلیں دوراں وادی میں کھڑے ہیں پا بجولاں

اک دام ہے خامشی سراسر ہے مرغ کا نام جس میں مضطر

ظلمات قفس ہے روشنی کا اور سایہ ہے صید چاندنی کا

ہو طیرِ سخن مزا رِ عنقا کب فکر کے دام سے ہے بچتا

ہے دَورِ حیات ایک زنداں

ہیں جس میں تمام پا بجولاں

اورینٹل کانفرنس کا دوسرا اجلاس

بمقام کلکتہ (سنہ ۱۹۲۲ء)

(از مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو)

علمی اور تعلیمی تحریکات میں ہم سراسر یورپ کے محتاج ہیں اور ابھی ایک زمانہ تک ہمیں اُس کی شاگردی کرنی پڑیگی۔ اُن کے علوم اور ایجادات ہی میں نہیں بلکہ اپنے علوم اور السنہ کی تحقیق میں بھی۔ چنانچہ اورینٹل کانفرنس جس کا دوسرا اجلاس کلکتہ میں ماہ فروری کے آخری ہفتے میں ہوا اسی شاگردی کا نتیجہ ہے۔

سب سے اوّل یورپ میں مستشرقین کی انٹرنیشنل کانگرس پیرس میں سنہ ۱۸۷۳ء میں منعقد ہوئی۔ دوسری سال اسی کانگرس کا اجلاس لندن میں ہوا۔ اس میں ہندوستان کی طرف سے مسٹر شنکر پانڈورنگ آنجہانی شریک تھے۔ اس کے بعد اس کانگرس کے مختلف مقامات میں کئی اجلاس ہوئے۔ لیکن کوپن ہیگن کے اجلاس میں پروفیسر میکڈانل (اکسفورڈ) نے یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ اس کانگرس کا اجلاس کلکتہ میں کیا جائے۔ لیکن بعض وجوہ سے یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ اس کے بعد پروفیسر میکڈانل نے یہ کوشش کی کہ کم سے کم ہندوستانی شعبہ کا اجلاس کلکتہ میں کیا جائے۔ لیکن ہندوستان کی طرف سے کچھ حوصلہ افزائی نہ ہوئی اور یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں فرانس کی زیر سرپرستی "پہلی اورینٹل انٹرنیشنل کانگرس" کا انعقاد ہنوئی (ٹونکن) میں ہوا اور اس میں ہندوستان، چین، جاپان اور ہندوستان بعیدہ کے شعبے بھی تھے ہندوستان کے ارکان کی تعداد اس میں بہت ہی کم تھی لیکن اس کانگرس کی کارروائی علم و تحقیق کی نظر سے بہت کامیاب خیال کی گئی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں سرہارکوٹ بٹلر نے ہندوستان کے مستشرقین کی ایک مجلس شملہ میں منعقد کی جس میں بہت سے دلچسپ مباحث پر گفت گو ہوئی۔ اسی مجلس میں پروفیسر ودگل نے ہندوستان میں "اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" اور اورینٹل کانگرس قائم کرنے کی مفصل اور مدلل تجویز پیش کی۔

ان مباحث کا نتیجہ سمجھئے یا اُن مستعد طالبانِ علم کی ہمت اور شوق کا ثمرہ جنہوں نے ہندوستان کے نامور محقق اور فاضل سر رام کرشن بھنڈارکر کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا کہ یہ تجویز جس کی ایک مدت سے کھچڑی پک رہی تھی عمل میں آئی۔ اور چند علم پرور قدر دان اصحاب کی امداد سے (جن میں سر داراب تاتا کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے) پونا میں "بھنڈارکر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کی بنیاد پڑی اور ۱۹۱۸ء میں اس انسٹی ٹیوٹ کی مجلس انتظامی نے اورنٹیل کانفرنس کا ڈول ڈالا۔ مختلف اہل علم مستشرقین سے صلاح و مشورہ کیا گیا سب نے اس خیال کو پسند کیا۔ آخر نومبر ۱۹۱۹ء میں اس کانفرنس کا پہلا اجلاس پونا میں منعقد ہوا مختلف صوبجات کی گورنمنٹوں اور بعض دیسی ریاستوں نے رقمی امداد کی یہ اجلاس تین روز تک رہا، اور کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اس کامیابی نے منتظمین کا حوصلہ بڑھایا اور اس سال کلکتہ یونیورسٹی کی دعوت پر اس کا اجلاس یونیورسٹی ہال میں منعقد ہوا۔

اس اجلاس کے صدر فرانس کے نامور سنسکرت کے عالم اور محقق پروفیسر لیوی تھے۔ افتتاح کی رسم بنگال کے گورنر نے ادا کی اور مجلس استقبالیہ کے صدر فخر بنگال سر آشوتوش مکرجی تھے۔

لارڈ رانلڈشے گورنر بنگال کا افتتاحی خطبہ موقع کے مناسب تھا اور اہل مجلس نے شوق سے سنا۔ لاٹ صاحب کے تیور دیکھ کر (بادشس بخیر) لارڈ کرزن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آپ نے کانفرنس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا گزشتہ مٹے ہوئے نقوش کے سراغ لگانے اور قدیم تہذیب و تمدن کے نشانات ڈھونڈھنے اور تحقیق کرنے سے صرف یہی غرض ہے کہ ہم اپنے شوق کو پورا کریں یا قومی تفاخر اور خود پسندی کے مزے لیں؟ نہیں، بلکہ اصل مقصد اس سے کچھ بڑھ کر ہے۔ وہ یہ ہے کہ اہل ہند کی دماغی نشو و نما طبعی رجحان و اصول پر ہو تاکہ وہ بنی نوع انسان کی ترقی و اصلاح میں ممتاز حصہ لے سکیں اسی تقریر میں انہوں نے اہل مشرق اور اہل مغرب کے فطرتی رجحانات کا بھی مقابلہ کیا اور کہا کہ مغرب کا خاص فطرتی رجحان نیچرل سائنس کی جانب ہے اور مشرق کا فلسفہ و ادب کی طرف۔ مشرقی دماغ سایہ کی اوجھل اصل سے اور ظاہر کے پردے پیچھے حقیقت کی تلاش میں رہتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ حالات و ضروریات نے مشرق و مغرب میں یہ امتیاز پیدا کر دیا تھا اور اب جغرافی و تمدنی حالات کی وجہ سے ایک حد تک یہ امتیاز باقی ہے لیکن موجودہ زمانہ کی عالمگیر دستبرد نے حالات او میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور اس لئے طبعی رجحانات بھی اسی کے ساتھ تھوڑے تھوڑے بدل رہے ہیں۔ نہ وہ مشرق

اور نہ وہ مغرب مغرب۔ دونوں کی حالت بدل رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف جھک رہے ہیں اور دونوں اپنی اپنی خصوصیات کی وجہ سے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ مشرق کے توہمات، تخیلات اور اعتقادات مغرب میں نشو ونما ہو رہے ہیں اور مغرب کی مادّی ایجادات واختراعات اور طریقۂ فکر مشرق میں گھر کر رہا ہے۔

کانفرنس اپنے صدر کے انتخاب میں قابل مبارکباد ہے۔ پروفیسر سلوین لیوی زندہ لوگوں میں سنسکرت کا سب سے بڑا عالم اور محقق ہے۔ لارڈ رانلڈشے اور پروفیسر لیوی کو یک جا بیٹھے دیکھ کر عجیب عجیب خیالات دل میں آتے تھے دو انسانی تصویریں تھیں مگر ایک دوسرے سے متضاد جس قدر ایک منکسر اور سراپا فروتنی تھا اُسی قدر دوسرا مغرور اور اینٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ جس قدر ایک کو علم نے جھکا رکھا تھا، اُسی قدر دوسرے کو حکومت نے گردن فراز بنا رکھا تھا۔ انسانی فطرت کا علم حاصل کرنے کے لئے دونوں قابل مطالعہ تھے۔ فاضل پروفیسر کا خطبۂ صدارت بلا شبہ عالمانہ اور محققانہ ہوگا۔ یہ رائے حسن ظن کی بنا پر ہے۔ کیونکہ جو کچھ انھوں نے پڑھا وہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ تھی تو انگریزی مگر فرانسیسی لہجہ میں۔ بس یہ سمجھ لیجئے جیسے کوئی ٹھیٹ انگریز اردو میں تقریر کرے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انگریزی کے کرخت اور کریہہ الفاظ ایک نازک زبان فرانسیسی سے کیوں کر ادا ہو سکتے تھے۔ منتظمین کانفرنس کا فرض تھا کہ پہلے دن کے تینوں خطبے اور خاص کر فاضل صدر کا خطبہ پہلے سے چھپوا کر اہل مجلس کو تقسیم کر دیتے۔ ایک ایسے بڑے مجمع میں اس سے بڑی سہولت ہوتی ہے۔

سر آشوتوش مکرجی جو مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، دھوتی باندھے، ننگے سر، سفید شال اوڑھے اسٹیج پر اس طرح آ کھڑے ہوئے جیسے اندر کی سبھا میں دیو۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت بنگال میں مسلم کا دیوتا (گنیش کا اوتار) سر آشوتوش ہی ہیں۔ ان کے احسانات سے بنگال کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ یہ سر آشوتوش ہی کا طفیل ہے کہ آج کلکتہ یونیورسٹی ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اعلیٰ اور افضل ہے۔ جہاں اُس نے علمی تحقیق وتنقید کی ایسی بنیاد ڈال دی ہے کہ آئندہ اُس کے گراں قدر نتائج سے اس یونیورسٹی کو علمی دنیا میں خاص امتیاز حاصل ہوگا۔ ان کا خطبہ بہت لمبا چوڑا تھا۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں اُن تمام علماء کے نام گنوائے جنھوں نے سنسکرت اور اس کے متعلقہ السنہ وعلوم میں قابل قدر کام کئے ہیں تا سوائے پروفیسر لیوی کے (جو اس وقت سنسکرت کا سب سے بڑا عالم ہے) چھوٹے سے چھوٹے عالم کا بھی ذکر آ گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب لوگ (اور پروفیسر لیوی بھی) قابل قدر ہیں اور ان کی کوششوں کا ذکر کرنا اور ان کا احسان ماننا فرض تھا لیکن حیرت ہے کہ سر آشوتوش جیسے وسیع النظر عالم سے ایک بہت بڑی فروگذاشت ہوئی کہ انھوں نے اُن علما و محققین

میں سے کسی ایک کا بھی ذکر نہیں کیا جنھوں نے اپنی تمام عمر سامی زبانوں کی تحقیق میں صرف کی ہے اور بنی نوع انسان کے علم بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ غالباً یا تو وہ یہ بھول گئے کہ یہ "اورینٹل" کانفرنس ہے اور اسے ہندو کانفرنس سمجھنے لگے یا وہ ایسے شدید محب وطن ہیں کہ ہندوستان کے کارناموں کے سوا کسی دوسری بات کا سننا گوارا نہیں کرتے۔ بہرحال اُن کے خطبے پر یہ جائز اعتراض ہے اور ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں۔

یہ پہلے دن کی کارروائی تھی۔ دوسرے روز سے ہر شعبے کی الگ الگ مجلسیں قرار پائیں اور جس کو جس شعبے سے دل چسپی تھی اس میں شریک ہوا۔ شعبے مفصلۂ ذیل تھے۔

۱۔ شعبۂ وید	۷۔ سیاسی تاریخ
۲۔ ایرانی	۸۔ معاشرتی و مذہبی تاریخ
۳۔ بدھ مذہب	۹۔ قدیم جغرافیہ
۴۔ لسانیات	۱۰۔ سنسکرت و پراکرت
۵۔ عربی و فارسی	۱۱۔ آثار قدیمہ
۶۔ فلسفہ و مذہب	۱۲۔ سائنس

۱۳۔ علم الاقوام

سب سے زیادہ مضامین شعبۂ آثار قدیمہ میں تھے اور اسی شعبہ میں سب سے زیادہ چہل پہل اور رونق تھی۔ اور اس کے قہقہوں کی آواز دُور دُور تک پہنچتی تھی۔ کم سے کم اس سے ہماری قدامت پرستی کا ثبوت ضرور ملتا ہے۔

سب سے کمتر اور کہتر شعبہ عربی فارسی کا تھا۔ اس کی بیکسی اور کس مپرسی کا پرسانِ حال سوائے حسرت کے کوئی نہ تھا اول تو مضامین ہی گنتی کی چار پانچ تھے اور وہ بھی ہیچ و پوچ۔ ایک صاحب (مسٹر آر۔ این۔ سہا) کو اُپج کی سوجھی اور انھوں نے قرآنِ پاک سے امریکہ کا وجود ثابت کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سوامی دیانند سرسوتی کی روح اُن میں حلول کر آئی ہے بہرحال اس سے حاضرین کی تفریح طبع کا سامان ہوگیا۔ ہمیں منتظمین و بانیان کانفرنس سے اُمید ہے کہ وہ آئندہ اجلاسوں میں اس شعبہ کی طرف خاص توجہ فرمائیں گے۔ اگرچہ اس شعبہ کی بے رونقی کا الزام ایک حد تک کارکنانِ کانفرنس پر ہے لیکن وہ حضرات بھی اس الزام سے بری نہیں ہو سکتے جو عربی و فارسی میں تجر رکھتے ہیں مگر اس طرف توجہ نہیں کرتے

ایک وجہ اور بھی ہے کہ اکثر عربی و فارسی کے علماء ایسے ہیں جو انگریزی زبان سے نابلد ہیں اور اگر جانتے بھی ہیں تو اپنے مطالب کو اس زبان میں بے تکلفی سے ادا نہیں کرسکتے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس شعبہ کے لئے (یا جہاں کوئی اور ضرورت ہو) انگریزی زبان کی قید اٹھا دی جائے۔ شائع کرنے کی غرض سے اُن کا ترجمہ ہوسکتا ہے۔

دوسری ایک فروگزاشت یہ نظر آتی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ اور زندہ زبانوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی۔ اس کا شعبہ بھی ضرور ہونا چاہیئے۔ اگرچہ یہ قدامت پرستی کی شان کے خلاف ہے لیکن یہ نہ بھول جانا چاہیئے کہ حال میں ماضی مضمر ہے۔

غرض اس کانفرنس کا اجلاس ۲۸ جنوری سے ۳ فروری تک مسلسل رہا ان ایام میں زندہ دل اہل کلکتہ نے اپنے مہمانوں کی تفریح کے لئے طرح طرح کے سامان بہم پہنچائے اور نہایت فیاضی اور سیر چشمی سے خاطر تواضع اور مدارات کی۔ اِن تفریحات میں سے چند قابل ذکر ہیں۔ ۲۸ جنوری کو نہرو خاندان کے بزرگ رائے منی لال صاحب بہادر نے اپنے اور اپنے بزرگوں کے جمع کی ہوئی قدیم قلمی تصاویر اور صناعیوں کی سیر کرائی۔ اور سب کی چاء پان وغیرہ سے تواضع کی۔ ان کے خاندان کا ایک ایک شخص مہمانوں کی خاطر تواضع میں بچھا جاتا تھا۔ ۲۹ جنوری کو ایک اسٹیمر دریا کی سیر کے لئے مہمانوں کے واسطے مخصوص کیا گیا۔ اور چاندپال گھاٹ سے رائل بوٹنیکل گارڈن تک لے گئے۔ باغ کی سیر کے بعد پھر اُسی اسٹیمر میں واپس ہوئے۔ آتے جاتے اسٹیمر پر چاء، پان انگریزی اور دیسی مٹھائی وغیرہ سے تواضع ہوئی۔ ۳۰ جنوری کو رات کے وقت لاٹ صاحب نے اپنے ہاں مہمانوں کو بُلایا۔ خاطر مدارات کے بعد ڈاکٹر رابندرانا تھ ٹیگور کا ڈراما (پوسٹ آفس) دکھایا۔ ۳۱ جنوری کو یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ ہال میں چاء وغیرہ کے بعد ہندوستانی گانا سنایا گیا۔ اس کے لئے نامور گویّے بلائے گئے تھے۔ یہ جلسہ بڑے تفریح کا تھا۔ پروفیسر لیوی نے جوش میں آکر پروفیسر فدا حسین خاں رامپوری سرود نواز کی داد دی اور کچھ نذر بھی کیا۔ اس کے بعد سنسکرت کے مشہور ڈراما مرچا کٹیکا (مٹی کی گاڑی یعنی کھلونے) کا ایکٹ ہوا۔

بہرحال یہ چند روز بہت لطف کے ساتھ بسر ہوئے اور ارکانِ کانفرنس بنگالیوں کی زندہ دلی اور مہمان نوازی کا نقش دلوں پر لے کر آئے۔

اُردو کی قومیت

(از مولوی ندیم الحسن صاحب (رضوی موہانی)

یہ امر محتاج تشریح نہیں کہ جتنی اور جس قسم کی کوششیں کسی مقصد میں کامیابی کے لئے سوچی جاتی ہیں خواہ ذہنی ہوں یا ادعائی تحقیقی ہوں یا خیالی، قولی ہوں یا عملی، اُن کے لئے ایک نہ ایک منتہیٰ اور مرکز ضرور ہونا چاہیئے اور یقیناً ہوتا ہے۔ بغیر تعین غایت کوئی کوشش کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی، یہ بھی لازمی ہے کہ ہر مرکز سعی کے اطراف میں ایک دائرہ تدابیر، اصول اور ضوابط کا ہوا کرتا ہے اور جب تک وہ کوششیں ایک سلیقہ کے ساتھ اپنے منتہائے سعی کی طرف راجع رہتی ہیں، مختلف پہلوؤں سے باعتبار معیار مرکز اُن میں کامیابی ہوا کرتی ہے۔

کسی تحریک کو عملاً بارآور کرنے کے قدیم طریقے عموماً قلیل، کمزور اور دیر اثر ہوا کرتے تھے اور مذہب و رُوحانیات سے دوش بدوش، تاہم اُن کے آخری اثر اور رجعت الی المقصود کے سلسلہ کی کڑیاں کسی نہ کسی طرح کامیابی مقصد سے دوچار کر دیتی تھیں مگر آج کل صرف قلت و کثرت اور کمزوری و قوت کے اصول پر عملی کامیابی یا ناکامی کا انحصار رہتا ہے، تحریریں، تقریریں، رسالے، اخبارات، جلسے، انجمنیں، مدرسے، کلبیں، کارخانے وغیرہ آج کل کے تعمیلی آلے ہیں جو کسی تحریک کو عملاً کثرت کے اصول پر کارآمد اور دیرپا بنانے کے لئے وجود میں آتے ہیں، اور ان میں جائز و ناجائز، حق و ناحق کا مطلق امتیاز نہیں رکھا جاتا۔ قبل اس کے کہ اس تمہید کو مضمون مابعد سے جو بہ لحاظ اپنے موضوع کے بہت مختصر ہے اور عنوان سے جو بہت وسیع ہے مربوط کیا جائے یہ امر ملاحظہ طلب ہے کہ وہ قوتیں اور مخفی اثرات جو اقوام کے عروج و زوال میں مسلّمہ طور پر دخل رکھتی ہیں عموماً تین ہوا کرتی ہیں اوّل تو قوت فوجی (یا عسکریت) دوسرے زبان کی طاقت اور عالمگیری، تیسرے مذہب، رُوحانیت کا تغیر و تخلیق، ان تینوں کے علاوہ مادی اعتبار سے کوئی چوتھی شئے ایسی قرار نہیں دی جا سکتی جو "انقلاب اُمم" کے نظریہ کی کلیتاً معیار ٹھہر سکے، رہ گئے دیگر احساسات مثلاً سیاست، حریت، انقلاب پسندی، قومی حمیت وغیرہ وغیرہ یہ سب

فرعین ہیں اور اصولاً انھیں اصول ثلاثہ کے تحت میں آتے ہیں تاوقتیکہ ذاتی حفاظت واطمنان کے لئے فوج اور اسلحہ کی قوت نہو کوئی قوم تنازع للبقا کے منازل نہیں طے کر سکتی اور اُس کی حیات ملی کے قیام وبقا کا کوئی تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ بغیر فوجی قوت اور حربی عصبیت کے ہر قسم کے قومی خیالات واحساسات ومظاہرات وغیرہ قطعاً فضول ہیں اور پرکاہ کی برابر بھی وقعت دوسری برسر قوت اقوام کی نگاہ میں نہیں رکھتے، ان کو مُردہ احساسات سمجھنا چاہیئے۔ البتہ جس طرح ایک دیوانہ سے ہوش میں آنے کے بعد انسانی حرکتوں کی توقع ہو سکتی ہی بعینہ اسی طرح فوجی حرارت پیدا ہو جانے کے بعد یہ خیالات خودبخود قوت سے فعل میں آنے لگتے ہیں اور شخصی وقومی خودداری کا جذبہ نہایت جوش کے ساتھ صورت پذیر ہونے لگتا ہی۔ اس قوت کی عدم موجودگی میں قومی احساسات کی نمائش بیکار ہونے کے علاوہ ان کی وقعت حقیقی کو زائل کرتا ہی۔

دوسری قوت جو نفس مبحث ہی اور جس کی نسبت حتماً کہا جا سکتا ہی کہ بنیاد قومیت وسیاست ہی، زبان ہے اس کے ضمن میں بہ لحاظ ترقی وتنزل اقوام قومی تاریخ اور ادب وشاعری وغیرہ رکھی جا سکتی ہی اور اب تو علم سیاست بھی خزانہ زبان کا ایک جزو ہو گیا ہی اور قدرتاً ہونا چاہیئے، مگر زبان کی قوت اور تاثیر کا اصلی محور تاریخ اور ادب ہی اور اس کے آگے سیاست اور دیگر علوم بھی اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں جن کی تفصیل آگے آتی ہی۔

تیسری قوت روحانیت ہی جس کے ذیل میں مذہب نیز انبیا علیہم السلام واولیا وغیرہ کا ارتقائے روحی شمار کئے جاتے ہیں مختصراً معجزہ اور کرامت اس قوت کے حاصل ہیں اور یہیں سے اس کی قوت آیندہ ایک قومی صورت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہی اگرچہ بدقسمتی سے بہت کم ایسا ہوا ہی کہ نظام روحانیت ایک اجتماعی حیثیت سے غلبہ قومیت کے لئے استعمال میں لایا گیا ہو بلکہ اس کے عام اور وسیع اثرات صرف انفرادی نفوذ وصفائی قلب تک محدود رہتے ہیں اور جہاں کہیں "زبان" اور "عسکریت" کو اس کی ضرورت ہوتی ہی صرف ضمناً ہوتی ہی خلاصہ یہ کہ روحانیت ہرچند کہ بہت قوی اور زود اثر ہوتی ہی مگر اپنے ابتدائی دوروں کو طے کرنے کے بعد اس کی مرکزیت بہت جلد اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہی اور اس کا نظام اجتماعی فوراً منتشر ہونے لگتا ہی کیوں کہ عام دسترس کو اُس تک رسائی نہیں۔

بہرکیف ان مذکورہ انقلابی عناصر ثلاثہ میں زبان کا مسئلہ اہم ترین ہی خصوصاً اُس وقت تو جب زمانہ جدیدہ

لحاظ سے اس پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی جائے تو اور بھی زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ اس کے پر اثر ہونے کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ تینوں قوتوں کے وسط میں باعتبار تدریج اثرات یہ اپنا وجود رکھتی ہے یعنی فوجی قوت تو نہایت شورشانہ ہے اور زود اثر انقلاب اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے مگر اس کے پرشور ہنگامے مدت تک خود اس قوت کو اپنے حواسوں میں نہیں رکھتے اور ایک عرصہ تک کشت و خون اور اتلاف جان کا دروازہ بند نہیں ہوتا بلکہ اکثر بصورت عدم اہلیت اس کا منشا ہی فوت ہو جاتا ہے کیوں کہ اس شہزور گھوڑے کی باگیں جہاں چھوٹیں پھر کسی کا قابو نہیں کہ اس کو اپنے حسب منشا رکام میں لاوے مگر زبان کی تاثیر نسبتاً معتدل ہے اور اپنے اقدام میں سست و دیر عمل اور اس کے خاموش اور داخلی ہنگامۂ انقلاب میں ایسی غیر محسوس مگر حقیقی قوت ہوتی ہے کہ بے اثر کئے رہتی ہی نہیں اور اس قوت و اثر کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار بالکل حسب منشا رہتی ہے اور جس رنگ میں چاہیں نمودار ہو سکتی ہے اور روحانیت کا درجہ اس کے بعد ہے کہ اس میں بے حد جد و جہد کرنا پڑتی ہے اور تاریخ میں اس کی انقلابی مثالیں بہت کم ملیں گی گو یہ ضرور ہے کہ کہ ان دونوں قوتوں کا دیر اثر ہونا ہی ان کے پائدار اور قوی الاثر ہونے کا بڑا زبردست ثبوت ہے غرض یہ کہ زبان کی قوت انقلاب کا جتنا تعلق عنصر اوّل سے ہے اُتنا ہی عنصر ثالث سے اور وہ قوم قطعاً ترقی سے نابلد ہے جس نے اپنی زبان کو مُردہ کر لیا اور مختلف اعتبارات سے کما حقہا اس سے پورا پورا فائدہ نہ اُٹھایا۔

زبان کی انقلابی اور ردیہ ترقی تاثیر سے اغماض کرنا بدیہیات کا منکر ہونا ہے۔ زبان اور قوم کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے اور زبان کا زوال و فنا یقینی مترادف ہے قوم اور اہلِ زبان کے ادبار و زوال کا۔ اور یہ بالکل ناممکن ہے کہ زبان اپنی قوم سے یا قوم اپنی زبان سے علٰحدہ ہو اور علٰحدہ ہو کر بھی اپنی ہستی قایم رکھ سکے۔ جو زبان کہ قومیت سے بے بہرہ ہے اور وہ قوم جس کی کوئی قومی زبان نہیں ہے یقیناً زوال پذیر ہے قوم اور زبان کا تعلق رُوح اور جسم کا ہے کہ ایک کے اعدام سے دوسرے کا وجود قایم ہی نہیں رہ سکتا کسی قوم کے لئے لسان القوم کا ہونا گویا قومی نطق کا ہونا ہے جس کے بغیر ایک قوم بالکل گونگی ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ اقوام میں نسل، رنگ، تمدن وطن وغیرہ بنیاد قومیت سمجھی جاتی ہیں اور ان امور کا زوال یا ان کی توہین بالکل قومی ادبار یا توہین کے برابر سمجھی جاتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ان تمام خصوصیات میں مشترک اور ناگزیر عنصر "زبان" بھی ہے جس نے ان تمام بولی

میں جان ڈال دی ہے اور کچھ ان اقوام ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اصولاً کسی فرقہ کی قومیت اُس وقت تک کبھی
متعین و مخصوص نہیں ہو سکتی جب تک اُس کی ذاتی کوئی زبان نہیں ہے جس میں قومی خصوصیات جھلکتے ہوں۔
زبان کی قوت کا بہت قوی سبب اور ثبوت بالعکس یہ بھی ہے کہ ابتدائی تاریخ سے فاتحین ہمیشہ مفتوحین
کی زبان یعنی ان کی قومیت و تمدن کو برباد کرنا فوجی استیلا سے دوسرے درجہ پر جانتے ہیں کیوں کہ اس سے
منجملہ دیگر فوائد کے دو بہت بڑے اور اصولی فائدے حاصل ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ فاتحین کی زبان مفتوحین کی
زبان کی جگہ لے لیتی ہے دوسرے یہ کہ مفتوحین کی زبان یا قومیت بالکل مُردہ ہو جاتی ہے اور اگر قدرت ان میں
کسی قسم کا بخل کرتی ہے تو جدید مصنوعی طریقوں سے اس تغیر زبان کو نہایت حاوی اور پُراثر بنا دیا جاتا ہے۔
یونانی اور رومی زبانوں نے غیر اقوام پر اپنا تسلط اور اپنی پائدار حکومت صرف اپنی قومیت کی بنا پر جمائی
اور پھر اہلِ عرب نے اپنی زبان کے ہاتھوں جو زبردست اور اسلامی اثر مدتوں تک تمام ایشیا و یورپ پر
بالواسطہ اور بلاواسطہ ڈالے رکھا وہ اظہر من الشمس ہے۔ اور جو اثر اس زبان نے دکھایا وہ ہرگز فوج سے
حاصل نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ زبان کے غیر محسوس اور خاموش اسلحہ فوج کے خاراشگاف اور ہنگامہ زا
اسلحہ سے کہیں زیادہ مار رکھتے ہیں۔

پس زبان کو نہایت بجا طور پر قومی تعین و تشخص کا مرکز کہا جا سکتا ہے جس کے اطراف میں مختلف قسم کی
ترقیوں کا دائرہ ہے اور جب تک ایک قوم کثرت سے اپنی زبان کو مرکز قرار دے کر اپنی تمام کوششوں کو اس
کے نقطہ پر جمع نہ کرے گی کبھی قومی رُوح اپنے میں پیدا نہیں کر سکتی اور نہ دیگر اقوام کے مقابلہ میں جہد
پیدا کرنے کی کامیابی سے اختتام تک پہونچا سکتی ہے۔ اور ہر قومی تحریک کے لئے ضروری ہے کہ پراثر ہونے کے
قومیت کے لیے اپنا پشت پناہ قرار دے لے اور یہی بیان تمہید مضمون میں ادا کیا گیا ہے۔ ہندوستان بھی اک ملک
محدود رہتے ہیں اور اور تہذیب اور تمدن تواریخ عالم میں بے نظیر تسلیم کئے جا چکے ہیں اور اس قدیم تہذیب و تمدن
روحانیت ہرچند کہ بہت۔ کوئی قومی زبان بھی ہوتی چنانچہ تھی اور نہ صرف تھی بلکہ اُس کا ادب بھی نہایت اعلیٰ
بہت جلد اپنی جگہ سے ہٹ جات کی ادبی لطافتیں اور باریکیاں اور پراکرت کی معاشرتی وسعت اور خوبیاں
رسائی نہیں۔ خین نے لکھا ہے قدیم تہذیبیں عموماً تمامتر مذہبی ہوتی تھیں مذہب ہی اُن کا
بہرکیف ان مذکورہ انقلابی عناصر

اوڑھنا بچھونا تھا زبان بھی اس مذہبی تمدن سے غیر متاثر نہ رہ سکی حتیٰ کہ سنسکرت علاوہ ادبی نزاکتوں کے تقدیس کا جوہر بھی رکھتی تھی اور یہ اسی تقدیس و قدامت کا نتیجہ ہے کہ باوجود نہایت شدید خارجی حملوں کے وہ آج تک اپنی حقیقی خصوصیات کے ساتھ باقی ہے۔

بہرحال ایک ایسے ملک کے لئے یہ نہایت شرمناک امر ہے کہ اس کی کوئی قومی زبان ہی نہ ہو۔ ہندوستان کے لئے اب تک کوئی قومی ہندوستانی زبان مخصوص نہیں کوئی ایسی عام زبان نہیں جس میں خاص ہندی قومیت جھلکتی ہو اور جس کو تمام قومی ترقیوں کا مرکز واحد قرار دیا جاسکے۔ بجز اس کے کہ یہ کہا جائے کہ اتنے وسیع ملک میں یہ غیر ممکن ہے کہ کوئی زبان ہی نہ ہو اور قدرت کا ہاتھ کسی ایک زبان کو عام قومی زبان تک پہونچا دینے میں قاصر رہا ہو البتہ یہ اک امر دیگر ہے کہ جب کوئی متحدہ قومیت اور متحدہ تاریخ ہی نہیں موجود ہے تو قومی زبان از خود کیوں کر وجود میں آسکتی ہے۔

مجبوراً موجودہ زبانوں ہی میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑے گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ علم اللسان کی رو سے ہندوستان کی موجودہ زبانوں میں سے کونسی زبان قومیت کے معیار پر ٹھیک اترتی ہے۔

کسی زبان کی قومیت کا معیار اُس کی وسعت و کثرت پر موقوف و منحصر ہے بحیثیت قوت اخذ و اتحاد کے بحیثیت جذب و انجذاب کے بحیثیت اشتقاق و مادہ کے بحیثیت رسم الخط کے وغیرہ۔

دوسرے زبان کی قومیت کا معیار اُس کی ادبیت اور قابلیت پر ہے جس قدر اُس میں ادبی ذائقہ اور علمی رنگ زیادہ نمایاں ہوگا، جتنی اُس میں اصطلاحات کی کثرت اور مضامین کا تنوع ہوگا اور جتنے زیادہ ذہنی استحالہ اور مادیت کے اثرات پائے جائیں گے اور ہر قسم کے خیال اور باریکی کو ادا کرنا بسہولت ممکن ہوسکے گا اُسی قدر اور اُسی لحاظ سے اُس زبان کی قومیت کا تعین بہ آسانی کیا جاسکے گا۔

ہندوستان میں کیا بلحاظ وسعت و کثرت اور کیا بہ اعتبار علمیت و ادبیت کون زبان قومی معیار پر ٹھیک اتر سکتی ہے اور کس زبان کے ذریعہ سے اس ملک کی قومی اور مادی ضرورتیں رفع ہوسکتی ہیں؟ اس سوال کا جواب اگر داخلی حیثیت سے دیا جائیگا اور ہندوستان کے اندر ہی تلاش کیا جائیگا تو فوراً وہی جھگڑے بکھیڑے

اُٹھ کھڑے ہوں گے جو ہندوستان کی غلامی اور فرقہ بندی کی پالیسی کے لحاظ سے ضروری ہیں اور ان سے بچنے کی کوشش کرنا بالکل فضول ہے۔ پس سب سے بہتر طریق کار یہ ہو گا کہ مذکورہ سوال کا جواب بجائے ہندوستان کے ایشیا میں تلاش کریں اور فی الحقیقت جو شخص اس سوال کا ایک معقول حل پیدا کرنا چاہے اُسے بغیر ہندوستان کے باہر نظر دوڑائے ہوئے کوئی صورت تصفیہ کی معلوم نہ ہو گی اُردو اور ہندی کے فساد کی اصلی بنا یہی معلوم ہوتی ہے۔ اُردو کے حامی ہندوستان کے باہر جانا نہیں چاہتے اور ہندی کے مقابلہ میں ترجیح کے جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ ہندی کے تموّل کے آگے اگرہیچ و پوچ نہیں تو کم از کم ایک مساویانہ حقوق کا معاملہ ضرور پیش کر دیتے ہیں حالاں کہ علم اللسان اور فلسفہ لسانیہ کے رو سے جو خصوصیتیں اُردو کو حاصل ہیں اور جتنی زرخیزی اور ترقی کی نشانیاں اور ایک قومیت کی علامتیں اس میں جھلکتی ہیں ہندی تو کیا ایشیا بلکہ یورپ کی بھی کسی زبان میں نہیں پائی جاتیں اور جیسا کہ ہم نے التر جمہ میں لکھا ہے اگر آج اُردو زبان بجائے معاشرتی زبان ہونے کے کوئی جنگی زبان ہوتی اور اس کو کوئی حربی سرپرستی نصیب ہوئی ہوتی تو جس جگہ پر آج انگریزی زبان ہے وہ مقام مع شئے زاید اُردو کا ہوتا۔ مگر بد قسمتی سے اُردو معاشرتی اور اخلاقی گودوں میں پلی بڑھی اور مجلسی دلچسپیوں تک محدود رہی اور اس وجہ سے ہنوز عالم طفلی میں ہے۔ پھر بھی ہم علوم جدیدہ کے میدان میں جیسے لمبے لمبے قدم اُس نے مارنا شروع کیے ہیں وہ ظاہر ہے اور وہ دن انشاءاللہ دُور نہیں کہ وہ اپنی قدیم تاریخی وسعت اور ہر دلعزیزی کے لحاظ سے اخلاقی حدود کو چھوڑ کر مادیات میں دخل دے اور رفتہ رفتہ اُن چیزوں کو اُردو میں ملبوس کر دے جن کو دوسری زبانیں پلچھ سمجھتی ہیں۔

بہ لحاظ تعداد حروف اور تکملہ اصوات کے اُردو کس قدر مکمل ہے کیا اس کے مقابلہ میں قطع نظر ہندوستانی زبانوں کے ایشیا یا یورپ کی کوئی زبان پیش کی جا سکتی ہے حالاں کہ یہ بہت معمولی بات ہے مگر تعمیر زبان کا بنیادی پتھر یہی ہے۔

بہ اعتبار تعداد الفاظ و تنوع اصطلاحات کے اُردو زبان کس قدر ہمہ رس اور ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ اُس کا دامن لغات کتنا وسیع ہے اُس کا اخلاق لسانی کیسا فراخ ہے۔ اس پہلو سے بجز چند مادی زبانوں کے اور کون زبان اُس کا مقابلہ کر سکتی ہے:-

رسم الخط اُردو کا ایسا جامع اور مانع ہے کہ فلسفۂ لسانیہ کی رو سے ہر زبان اور ہر قسم کے علوم بہ آسانی اس میں زینت بخش ہو سکتے ہیں اور در اصل رسم الخط ہی نے اس کو وہ عظیم الشان حیثیت دے رکھی ہی کہ بعض مخالفین اُردو اس کو ایک خالص اسلامی زبان سمجھ بیٹھے ہیں حالاں کہ واقعتاً ایسا نہیں ہی البتہ یہ ضرور ہی کہ رسم الخط نے اس کے دائرہ اثر کو بہت وسیع کر دیا ہی اور نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہی جس کو حضرت اُردو اپنے سے مانوس ہونے کا صلائے عام نہ دے سکیں زبانی برادری میں اُس کے ہر دلعزیز ہونے کا باعث کثرت حروف اور رسم خط ہی چنانچہ ہر زبان کے الفاظ بہ آسانی اُردو میں ڈھالے جا سکتے ہیں اور کسی زبان کو اُردو سے وحشت اور تعصب کی کوئی وجہ نہیں، کیا کوئی اور زبان بھی اس قدر زباں آفرین اور وسیع الاخلاق اُردو کے مقابلہ میں لائی جا سکتی ہی ؟ اس کا جواب زمانہ دے رہا ہی-

پس کثرت حروف تکملہ اصوات مختلفہ، تنوع اصطلاحات، رسم الخط وغیرہ اعلیٰ صفات لسانیہ نے نہ صرف اس امر کا فیصلہ کر دیا ہی کہ اردو قطعاً ایک نہایت پر اثر قومی زبان بننے کی اہمیت و قوت رکھتی ہی بلکہ ضمناً یہ بھی ثابت کر دیا کہ اگر اس نے مادی حیثیت سے ترقی کی تو نہایت آسانی سے تمام ایشیا پر چھا جائے گی. کیوں کہ یہ صرف عربی- فارسی اور ترکی و پشتو کا طفیل ہی کہ اُردو ہر قسم کی ادبی اور علمی زرخیزی سے بھری ہوئی ہی اور یہ فیض قدرت کی طرف سے شاید اُردو ہی کو عطا ہوا ہی کہ یہ زبان بھی بعینہٖ جس طرح ایک صحیح جسم انسانی اپنی نشو و نمو میں بتدریج ترقی کرتا ہوا اپنے تمام قوار کی تکمیل کر لیتا ہی اور اُس وقت فطرت کی تخلیق و ترتیب کا منشا پورا ہوتا ہی، بالکل اسی طرح کے تدریجی ارتقاء کے علامات یہ زبان ظاہر کر رہی ہے. اُس کی رگ رگ میں فارسی و عربی کا رنگ بھرا ہوا ہی مگر موجودہ دور مادیت میں اُس پر یہ الزام آ سکتا تھا کہ مشرقی ادب و فلسفہ ایک فرسودہ مبحث سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ہر چند یہ الزام کوتاہ بینی پر مبنی ہو، تاہم اُردو نے جس طرح آغوش شوق کھول کر انگریزی اور دیگر زبانوں کو لپٹا یا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہی کہ گویا مغربی ادب و فلسفہ اور مغربی خیالات اسی لئے یہاں آئے تھے کہ اُردو میں جذب ہو جائیں اگر چہ مشرقی اور مغربی زبانیں بجز چند مستثنیات کے ایک ہی ماں کی بیٹیاں اور بچھڑی ہوئی اولادیں ہیں پھر بھی ہندوستان کی دوسری

زبانیں جو بمقابلہ اُردو کے کہیں زیادہ قدیم، مضبوط، اور ادبی تھیں بسبب اپنی تنگ خیالی اور تعصب کے اپنی دُور اُفتادہ بن سے جو یورپ سے آئی ایسی بھڑکیں اور بدکیں کہ اُس نے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ دیکھا کہ اُردو کی اخلاقی وسعت سے فائدہ اُٹھائے اور اُردو بھی مغربی مادیت سے اس قدر مانوس ثابت ہوئی کہ گویا یہ مادیت ایک بھولا ہوا سبق تھا جو اُردو کو بغیر کسی قسم کی جدوجہد اور تنازع کے مغرب کی سب سے بڑی زبان نے اپنے ترقی یافتہ اور نئے انداز میں پھر یاد دلا دیا۔ اور اُردو نے انگریزی الفاظ، اصطلاحات، طرز ادا، آہنگ تخیل وغیرہ کو اس مستعدی سے قبول کر لیا کہ دونوں میں سے کسی کو ذرا بھی زحمت نہ ہوئی۔

یوروپ کے جدید فلسفہ توریث کے لحاظ سے اس اُردو انگریزی بلکہ مشرقی و مغربی آمیزش میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ السنہ سامیہ جن کی اُردو رہین وجود ہے ام لالسنۂ آریہ کے وسیع خاندان سے بالکل الگ ہیں اور ان کے تخیل اور ادب میں ایک دوسرا ہی خون دَوڑ رہا ہے بجا لیکہ فرانسیسی انگریزی پرتگیزی اور دوسری مغربی زبانیں آریہ خاندان سے ہیں پس جس طرح امرود میں سیب کا قلم اور مختلف پہلوؤں میں اسی قسم کے پیوند علاوہ ایک جدید ذائقہ کے پہلوؤں کے استحکام اور وسعت کا سبب ہوتے ہیں اور جس طرح دو مختلف صحیح الجسم خاندان آپس میں رشتہ کر کے علاوہ استحکام خدمت کے ایک قوی اور نئی نسل کے وجود میں لانے کا باعث ہوتے ہیں اسی طرح وسیع اور قوی سامی زبانیں جب بذریعہ اُردو کے آریہ زبانوں کے ساتھ شیر و شکر ہوئیں اور دونوں کے تخیل، ادب اور لسانیت وغیرہ نے باہم رد و اخذ اور تغیر و تبادلہ کا عمل جاری کیا تو اُس کا نتیجہ اس صورت میں نکلا ہے جو موجودہ اُردو ظاہر کر رہی ہے۔ اور جس قدر زمانہ گزرتا جائیگا۔ اُردو کے لسانی جوہر برابر کھلتے جائیں گے کیوں کہ اب تک اُردو میں جس قدر اور جس قسم کے تغیرات مختلف منازل میں ہوتے رہے اُن سے بجز اس کے کہ یہ نتیجہ نکالیں کہ اُردو ترقی کر رہی ہے اور پورے جوش استقلال اور حوصلہ کے ساتھ زمانہ کا ساتھ دے رہی ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اخبارات، رسالے، کانفرنسیں، انجمنیں، علوم جدیدہ کے ترجمے۔ جدید اختراعات کے نتائج وغیرہ یہی چند چیزیں ہیں جنھوں نے اُردو کو مادیات سے روشناس کرایا ہے اور ایک نہایت ہی قلیل عرصہ میں اُردو نے جس کا بمقابلہ معاصر السنہ کے ہنوز عالم طفلی ہے مادیات کو اس طرح اپنا کر لیا کہ گویا وہ بنی ہی اس لئے تھی

صرف دس برس پیشتر کی اُردو اور آج کی اُردو سے اگر بہ لحاظ اصطلاحات، مضامین، لسانیت، ترویج و وسعت وغیرہ کے مقابلہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ آج کی اُردو بدرجہا قوی وسیع آزاد اور فصیح و بلیغ ہے اور یہی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ ہندوستان میں اگر کوئی زبان ایسی موجود ہے جو قومی ضروریات کو پورا کر سکے اور قومی معیار پر ٹھیک اتر سکے تو وہ صرف اُردو ہو سکتی ہے۔

عصر موجودہ نہایت تیزی کے ساتھ شاید مادیت کی طرف رواں ہے اور وہ زبانیں جو مادیت سے بیزار ہیں یقیناً مجہول، کمزور اور "غیر قومی" ہیں اور زمانہ کے ضروریات کے لئے بالکل ناکافی اس لئے کہ عہد حاضرہ میں شدت مادیت کی وجہ سے مسابقت اس قدر سخت اور بقا و فوقیت کے واسطے تصادم ایسا شدید ہے کہ جو زبانیں علوم مادیہ سے بسبب اپنے افلاس اور تعصب کے منتفع نہیں ہو سکتیں وہ سوائے اس کے کہ اپنی قوم کو قومیت کے درجہ سے رفتہ رفتہ گرا دیں اور کس کام آ سکتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی بعض زبانیں خالص علمی ادبی یا مذہبی ہیں اور ان پہلوؤں سے ترقی کے ممکنہ مدارج طے کر کے پوری تکمیل کو پہونچی ہوئی ہیں مگر فی الحقیقت آج کل زبان کا مفہوم صرف اور صرف اُسی بولی میں پنہاں ہے جو مادی ہو یا مادی علوم کو اپنا بنا لینے کی اہلیت رکھتی ہو۔

موجودہ ایشیائی زبانوں میں صرف جاپانی زبان ایسی ہے کہ جس نے ایک قومی زبان کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھا اور اس پر عمل کیا ہے اس کے مقابلہ میں ایشیا کی کل زبانیں مُردہ ہیں کیوں کہ یہ یا تو مذہبی ہیں یا معاشرتی، حالاں کہ جاپان کی ترقی اور رفعت کا واحد سبب وہاں کی زبان کا قومی ہو جانا ہے گو اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جاپانی مذہب اور تمدن عملاً فنا ہو کر یورپ کی طرح دہریت و مادیت میں ضم ہو گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا تمدن اور اُس کی تہذیب اس قدر کہنہ اور بوسیدہ ہو چکے تھے کہ مادی تہذیب کی کشمکش کے مقابلہ میں قایم نہ رہ سکے اور ان پر بالکل مادی رنگ چڑھ گیا۔ اپنی تہذیب کو کھو کر اُس نے یہ فائدہ ضرور حاصل کیا کہ ایک نہایت ہی قلیل مدت میں حامیان مادیت کا مقابلہ کرنے لگا اور "مہذب" شمار ہونے لگا۔

مگر ہندوستان کی قومی زبان کو اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہے اس لئے کہ اس کی وسعت اور ایشیائی نوعیت نے اس کی بنیادیں ایسی مضبوط کر دی ہیں کہ داخلی حیثیت سے اس میں کوئی تغیر نہیں آ سکتا اُردو زبان اگر

ایک طرف عربی و فارسی کی وساطت سے بے اندازہ حرارت حربی، روایات جنگی اور انقلابات سیاسی کی ذخائر قدیمہ سے مالا مال ہی تو دوسری طرف ہندو سورماؤں کے لاثانی اور غیر فانی کارنامے اس کو قومی رُوح کے تمام منازل طے کرا چکے ہیں اب صرف اس پر ایک مادی رنگ چڑھنا باقی رہ گیا ہی مگر اس رنگ کے چڑھ جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی حقیقت بھی متغیر ہو جائے گی اور یہ واقعات و نتائج ایسے بدیہی ہیں کہ ان پر صرف خیال آرائی کا گمان ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اُردو کا ادب مستقل ہی رسم الخط ہر طرح سے مکمل ہی لسانیت کافی و وافی ہی دائرہ وسیع ہی مختصر یہ کہ ایک قومیت کے لئے جو عناصر ضروری ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں پس خواہ ہندوستان تسلیم کرے یا نہ کرے ایک دن یہ ضرور یہاں کی قومی زبان ہو کر رہیگی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اعداد بھی یہی ثابت کرتے ہیں کہ لکھنے، بولنے، سمجھنے کے اعتبار سے اُردو زبان ہر قطعہ ملک میں روز بروز وسیع اور زیادہ دخیل ہوتی جاتی ہی۔

پس اب یہ مسئلہ کہ ہندوستان کی قومی زبان کیا ہونا چاہیئے بہت کم حل طلب رہجاتا ہی اور اگر ایک مرتبہ ترکیبی اصول سے یہ فرض کرلیں کہ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہو گئی یا ہندوستانی قومیت اُردو کے قبضہ میں چلی گئی۔ تو تحلیلی حیثیات سے فوراً یہ نظر آجائے گا کہ واقعی بتدریج ایسا ہی ہو رہا ہی۔ اس لئے کہ ہر قوم اپنے شرف ملکی اور امتیاز قومی کی غرض سے بزدلی پر جوانمردی کو، حرص پر ایثار کو، بے غیرتی پر حمیت کو، بیحسی پر تاثر کو، جمود پر حرکت کو، جہالت پر علم کو، تاریکی پر روشنی کو، بدصورتی پر خوبصورتی کو، خلاصہ یہ کہ بُرائی پر اچھائی کو ہمیشہ ترجیح دیتی رہی اور دیتی رہیگی اور جس قوم نے حسد، تعصب اور تنگ خیالی کی بنا پر اس کے خلاف کیا اس نے گویا طبع سلیم پر ذوق بے بضاعت کو اور حیات پر موت کو ترجیح دی اور سراسر جنوں کا ارتکاب کیا۔ لیکن اس موقع پر یہ حقیقت فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ ملکی و قومی امتیاز و شرف یعنی جوانمردی ایثار، حمیت، اثر، حرکت، علم، روشنی، خوبصورتی، طبع سلیم، اقبال، بیداری حتیٰ کہ حیات وغیرہ کے تمام راز اور نکات اُس شے میں پنہاں ہیں جو ان تمام امور میں ایک مشترک حقیقت ہی اور جس کے بغیر ایک قوم کا نظام خودداری اور شیرازہ عصبیت یکسر منتشر و پریشان ہو جانا لازمی ہے کیوں کہ یہ قطعی ہی کہ کسی قومیت کے

قیام اور وقعت کی بنا اور اُس کے تنازع بقا کا انحصار تمامتر مذکورہ خصوصیات کے لحاظ سے متعین کیا جا سکتا ہی۔ لیکن سوال یہ ہی کہ وہ کون شے ہے جس میں اور جس کی وساطت سے بوقت واحد یہ تمام باتیں بروئے کار آسکتی اور جلوہ دیسکتی ہیں اس کے جواب میں بلا تامل اور بکمال اطمینان و یقین کہا جا سکتا ہے کہ زبان۔ زبان وہ شئے ہی جو اپنی ابتدائی منزل میں ایک قوم کو نطق اور قوت تکلم سے سرفراز کرتی ہی اور اپنے وسطی منزل میں اُس کے دل و دماغ کا لباس قرار پاتی ہی۔ اور آخر کار اُس کی حیات و اقبال کا واحد ذریعہ ثابت ہوتی ہی۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہی کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں سے کونسی زبان ایسی ہی جو مذکورہ خصوصیات کے معیار پر ٹھیک بیٹھتی ہی درانحالیکہ یہی خصوصیات ہیں جن کو فطرت نے قانون بقائے اصلح کی رو سے قومی حیات کے لئے لازمی کر دیا ہی اور ان کے فقدان سے قوم کا اپنے مرکز ثقل سے گر جانا یقینی ہی۔ کمزور اور نقص بمقابلہ قوت اور کمال کے ہمیشہ فنا ہوتے رہیں گے۔

ہم کو اس سوال کا جواب دینا ہی کہ ہندوستان میں کون سی زبان ایسی ہی جو مذکورہ لوازم حیات کی حامل ہی یا ہوتی رہی ہی درآنحالیکہ ہم نے ترکیبی قاعدہ سے پہلے ہی فرض کر لیا ہی کہ اُردو میں یہ تمام باتیں موجود ہیں۔

ہندوستان کے کسی خاص خطہ میں چلے جایئے۔ شمال میں خواہ جنوب میں۔ مشرق میں خواہ مغرب میں بجز چند مخصوص مقامات کے عجب عجب مرکب معجونیں نظر آئیں گی۔ بطور مثال کے مدراس کو لیجئے۔ آبادی کی تہذیب معاشریہ زیادہ تر اُس کے کثیر حصہ آبادی کے عادات و افعال وضع و لباس اور اخلاق وغیرہ کے لحاظ سے اندازہ کیجاتی ہی۔ اور اسی اعتبار سے اُس کی ترقی و تنزل کا خیال کیا جاتا ہی مگر مثال کے لئے جو مقام پیش کیا گیا ہی عجیب و غریب ہی۔

لباس کس قدر مضحکہ خیز ہی، وضع کیسی عمدہ ہی، عام عادات کیسے سنجیدہ و متین ہیں خوراک کیسی پاکیزہ ہی خشک مچھلی، زندہ کچھوے کا گوشت پسندیدہ غذائیں ہیں! انھیں اعتبارات سے تخیلات، انداز گفتگو اور باہمی برتاؤ وغیرہ کی شگفتگیاں اور لطف تبادلہ خیالات وغیرہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہی جن کے اعتذار میں نہ صرف یہ کہنا

بالکل ناکافی ہی کہ ہر ملکے و ہر رسمے، بلکہ یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان کے تاریک عہد میں اور اِس قسم کے عہد میں بہت تھوڑا ہی سا فاصلہ ہی۔ تقریباً تمام جنوبی ہند میں ایسی "ہی تو مانی" تہذیب پائی جاتی ہی۔

اس عیب کا واحد سبب یہی ہی کہ یہاں کی زبان یا زبانیں وہ ہیں جو ادبیت سے بالکل مُعرّا ہیں اور قومیت سے یکسر محروم، وسعت، لطافت، نزاکت، باریکی تخیل، علوم، وغیرہ کسی چیز کا پتہ نہیں۔ ان کی دنیا میں زبان کا کام صرف انسان کی اشد ضروریات کو پُورا کرنا ہی۔ حسن صورت، حسن خیال، حسن بیان یہ تمام چیزیں مہمل اور دُور از کار ہیں پس جس فرقہ کی زبان ان امور سے کوئی لگاؤ نہ رکھے گی اُس کے عجیب الہیئت ہونے میں شاید ہی کسی کو شک ہو اور اُس کا لازمی انجام یہ ہی کہ وہ فرقہ ذاتی قومیت و ترقی سے بالکل بے بہرہ ہی اور حکومت وقت صفاتی حیثیت سے جس طرف موڑ دے اُسی طرف چل نکلتا ہی۔

جہاں جہاں اُردو مادری زبان نہیں ہی یا کثرت سے نہیں بولی جاتی بلکہ اس کے بجائے کوئی اور بھونڈی مجہول القومیت، بھونڈی، غیر سنجیدہ غیر ملکی زبان بولی جاتی ہی سب جگہ نظام معاشرت میں بے شمار اعجوبہ باتیں محسوس ہوں گی کہ اک معمولی اور ادنیٰ ذوقِ سلیم رکھنے والا محب وطن بھی اپنے ادبی واخلاقی ضمیر کی رو سے اکراہ و تکدر کے بغیر نہ رہ سکے گا۔

بخلاف اس کے اُردو دان خطے کی قومیت مسلم ہی۔ کسی قسم کا ابہام یا اعجوبگی نہیں ہی معاشرت پاکیزہ ہی تخیل ستھرا ہی، اختیارات لسانی بہت وسیع ہیں اور بحیثیت مجموعی اس قسم کے مقامات کی تہذیب ایسی دل آویز ہے کہ ہر ہر قدم پر ترقی و اقبال کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی اور فی الحقیقت اصلی غایت فطرتِ زبان کی یہی ہی کہ وہ السنہ غیر پر بسبب اپنے پاکیزہ اور تاریخی صفات لسانی کے دخیل و قابض ہوجائے اور ساتھ ہی اس کے داخلی حیثیت سے برابر ترقی کرتی رہی۔ اور زبان کی ترقی بالکل ایک غیر مرئی شے ہی جس کا آسان سا معیار یہی ہی کہ اُس نے اپنے فرقہ کو ایک مستقل قوم بنا دینے میں کس درجہ کامیابی حاصل کی ہی ~~ہی~~ اور اس لحاظ سے اُردو بدرجۂ اتم کامیاب ہی اور یہ صرف اس وجہ سے کہ اُردو اُن زبانوں سے ماخوذ و مرکب ہے جو اپنے اپنے اقبال کے زمانہ میں نہایت ہی عظیم الشان اور مستقل ادب اور تمدن کی حامل رہ چکی ہیں اور جن کی تاریخ گویا تہذیب لسانی کے مختلف منازل اور ترقیوں کا نہایت مکمل مجموعہ ہی۔

پس بہ لحاظ امور مذکورۂ بالا اگر اُردو کو ہندوستان میں روز بروز قومی رنگ ملتا جا رہا ہی اُس کی وسعت اور ہر دلعزیزی بڑھتی جا رہی ہے تو یہ عین اقتضائے قانون قدرت ہی۔ ہر چند کہ اس کی رفتار بہت سُست ہی مزید براں طرح طرح کی مزاحمتوں سے اُس کو سامنا کرنا پڑا ہے بر ینہم صرف ایک قلیل مدت کے مابین مقابلہ سے صاف معلوم ہو سکتا ہی کہ کل وہ کہاں تھی، آج کہاں ہی اور کل کہاں جا پہونچے گی۔ جتنی کمزوریاں اور نقایص فی الحال اُس میں ہیں اُن کی محض ایک علت ہے وہ یہ کہ اُردو کوئی حربی زبان نہیں ہی وہ ایک "بزمی" زبان ہی اُس کو کبھی جنگی سرپرستی نہیں نصیب ہوئی اس لئے اس کو اُن کوششوں اور دشمنیوں کا مقابلہ کرنا ہے جو بصورت اُس کے حربی ہونے کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھیں۔ باجبروت شاہان اسلام کے زمانہ کی عربی و فارسی کا رواج جب کہ ہندوستانی عورتوں نے بھی فارسی پڑھنا موجب فخر سمجھا تھا حربی زبان کے فاتح ہونے اور مزاحمتوں کے نہایت ذلت سے ٹھکرانے کا کافی ثبوت ہی۔ تاہم چوں کہ اُردو کی عمارت خاص مضبوط علمی زبانوں کی بنیاد پر قایم کی گئی ہی لہذا اُس کی ترقی میں کوئی کلام نہیں ہی اور گو کہ اُس کی مخالف بہتیں نہایت کثرت سے خس و خاشاک کی طرح اس کے سیلاب ترقی میں حائل ہوتی رہتی ہیں مگر اُن کی ناقص تہذیب بہت تیزی سے فنا ہوتی جا رہی ہیں اور بہت قریب ہی وہ زمانہ جب کہ اُردو ہندوستان کے لئے اور ہندوستان اُردو کے لئے ناگزیر سمجھے جائیں گے۔ کیوں کہ جن اصحاب نے اس زبان کی تاریخ کو بغور دیکھا ہی وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کس قسم کے زبردست سیاسی، ملکی، خارجی، داخلی روڑے اس بیکس و بے بس زبان کی راہ میں اٹکائے گئے مگر زبان کا قانون بھی قدرت کے دیگر قوانین کی طرح اٹل ہی اُردو نے ہر دشمن کو نیچا دکھایا اور اپنی مستقل رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔ اور اب نتیجہ یہ ہی کہ اُردو اخبارات، اُردو رسائل، اُردو مجالس، اُردو اشتہارات، اُردو دفاتر، اُردو مدارس، اُردو تصانیف، اُردو تالیفات، اُردو تراجم، اُردو مشاعرے، اُردو خطبے، اُردو قصص و ناول، اُردو یونیورسٹی وغیرہ وغیرہ نے تمام ہندوستان میں طولاً اور عرضاً نہایت تابانی اور درخشانی کے ساتھ بانگ دُہل قدرت کے اس قانون کا اعلان کر دیا ہی کہ اُردو ہندوستان کی قومی زبان قرار پا چکی ہے اور یہ کہ اگر ہندوستان کو ایک قومی اور متحدہ ہندوستانی قومیت پیدا کرنا ہی، اگر ہندوستان کو موجودہ دَورِ مادی میں اپنی جہد

حیات کو باقی و قایم رکھنا ہی اگر ہندوستان کو اپنی آیندہ مستقل تہذیب و تمدن کو زندہ کرنا ہی اور اگر ہندوستان کو اپنی آنے والی نسلوں کے لئے اپنے بعد ایک ممتاز تاریخ چھوڑنا ہے تو یہ بغیر اُردو کے قطعاً محال اور ناممکن ہی۔ اور اس پیشین گوئی کے لئے ہم کو کہیں دُور نہیں جانا پڑے گا بلکہ اُردو کی مختصر تاریخ نہایت صفائی سے اس پر شاہد ہی۔

حیرت ہی کہ وہ محدود اور متفرق فرقہ جو غلطی سے قومیت ہند کو اپنا سمجھکر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی فرسودہ و بوسیدہ زبان کو اُردو کے مقابلہ پر ہمیشہ لانے کا عادی رہا کس فراخدلی سے اُردو کی رعنائی و زیبائی کے آگے سر تسلیم خم کر چکا ہی اور بسا حیرت ہی کہ وہ قوم جس کی قسمت میں تھا کہ چھ ہزار میل کی مسافت قاہرہ پر بیٹھکر حکومت ہند کی باگیں اپنے ہاتھ میں رکھے باوجود اس بُعد و اجنبیت کے اُردو پر اس قدر گرویدہ و فریفتہ ہوکر حامیان اُردو کی صف میں جگہ پانے کی اہل و مستحق ہو ؎

این سعادت نہ کسبی و عملی ست
از عنایات فیض لم یزلی ست

ان تمام حقایق و واقعات بصائر و عبر کے باوجود بھی اگر ہوا سے لڑکر اور زمانہ سے بھڑکر اُردو کی طاقت لسانی سے اغماض و انکار کیا جائے تو یہ سراسر جنون اور خبط ہی ؎

زبیدردی نگفتم سخت پیکان ترا ہرگز
بحمداللہ کہ آئین دل آزاری نمیدانم

تبصرے

رسائل عماد الملک
روحِ سیاست
خونابۂ عشق و حکایاتِ شرلک ہومز
کلماتِ طیبات
نیاز
ہمایوں
آوازۂ حق
دماغی تربیت
} از اڈیٹر

البیان الکامل فی تحقیق الدق والسل } از ڈاکٹر حاجی حیدر علی خاں صاحب ایف۔ آر۔ سی۔ ایس

رسائلِ عماد الملک

نواب عماد الملک بہادر۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ (مولوی سید حسین بلگرامی)

ملک میں اپنے تبحرِ علمی اور اعلیٰ ادبی ذوق کی وجہ سے خاص اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ وہ جیسے عربی فارسی کے فاضل ہیں ویسے ہی انگریزی زبان کے بھی مستند ادیب ہیں اور اسی مناسبت سے مشرق و مغرب کے پسندیدہ خصائل اور ذوق تہذیب کا عمدہ نمونہ ہیں۔ گو وہ مختلف عہدوں اور مختلف صحبتوں میں رہے مگر ان کی تمام عمر تعلیمی معاملات پر غور کرنے اور مطالعۂ کتب میں صرف ہوئی اور باوجودیکہ ان کی عمر اب اسی سال کی ہے مگر وہی ذوق اب تک باقی

ہی۔ اُن کی صحبت بہت پرلطف ہی۔ اکثر شعر وسخن اور علمی ادبی امور پر ذکر کرتے ہیں۔ عربی فارسی اُردو کے ہزارہا منتخب اور اعلیٰ درجے کے
اشعار یاد ہیں جن سے اُن کے ذوقِ سلیم کا اندازہ ہوتا ہی۔ اُن کی صحبت ایک ایسی تعلیم ہی جو آیندہ بہت کم نصیب ہوگی۔ اہلِ علم
اور طلبہ کے بہت قدرداں ہیں۔ ایک بچے حال طالب علم سے مل کر وہ جسقدر خوش ہوتے ہیں اسقدر انھیں کسی امیر سے مل کر خوشی
نہیں ہوتی۔ ان کا مزاج بہت سادہ اور بے تکلف ہی۔ نمود و نمایش اور تکلف سے کوسوں دور ہیں۔ صداقت شعاری
میں وہ مشہور بلکہ بدنام ہیں۔ اپنی رائے ظاہر کرنے اور سچ بات کہنے میں کبھی نہیں چوکتے خواہ ان کا مخاطب کوئی
ہو۔ وضعداری اُن میں ویسی ہی جیسی پرانے لوگوں میں سننے میں آتی تھی۔ اُن کا ذوق اِن تین چیزوں میں ہی
سادگی، صفائی اور حسن۔ اب اس میں مادی اشیا بھی آگئیں، ادب بھی آگیا۔ اور مذہب بھی۔ مذہب کا آج کل
بڑا خیال ہی۔ اکثر اس کا چرچا کرتے ہیں اور اسلام کو بہترین مذہب مانتے ہیں اور اُس کی خوبیاں بیان کرتے رہتے
ہیں۔ وہ ذی علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن سے جوانی تک علم ہی کا مشغلہ رہا۔ علمی جلسوں اور علمی صحبتوں
میں بسر ہوئی اور ملازمت بھی کی تو علم کی۔ گویا نسب بھی اُن کا علم ہی اور حسب بھی علم۔ اور اب بھی علم ہی اُن کا
اوڑھنا بچھونا ہی۔

اِن کا یہ علمی ذوق حظِ نفس اور لطفِ تخیل ہی تک نہیں رہا بلکہ علمی تحریکات میں بھی وقتاً فوقتاً شریک رہے۔
اور بعض کا وجود محض آپ کی تحریک سے عمل میں آیا۔ مثلاً انجمنِ ترقی اُردو کا ابتدائی فروغ محض آپ کی توجہ و
عنایت سے ہوا اور اب تک آپ اس کے صدر ہیں اور اس کے علمی اور ادبی معاملات میں برابر مشورہ دیتے
رہتے ہیں۔ اِسی طرح دار المصنفین بھی آپ کا زیرِ بارِ احسان ہی۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ان کے علمی مشوروں
اور مالی امداد کی ممنون ہی۔ حیدرآباد کے دار العلوم کو محض آپ کی ذات سے رونق اور ترقی ہوئی۔ کتب خانہ
آصفیہ، حیدرآباد دکن، آپ ہی کا قایم کیا ہوا ہی جس میں آپ نے عربی، فارسی، اُردو کے نایاب قلمی نسخے بڑی
تلاش سے جمع کیے۔ یہ ذخیرہ بہت قابلِ قدر ہی۔ دائرۃ المعارف آپ ہی کی تحریک پر قایم ہوا اور جو کچھ بہتر
کام ہوا وہ آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ ہی۔ آپ ہی کی تحریک اور تحریر پر امیر خسرو کے کلام کی ترتیب و تدوین شروع ہوئی
حیدرآباد میں ملکی حرفت و صنعت کی ترقی میں ساعی رہے اور اس کے لیے مدارس قایم ہوئے۔ تعلیم نسواں کے
آپ بہت بڑے حامی ہیں۔ حیدرآباد میں جو تعلیم نسواں کا چرچا ہی اور غالباً دوسرے مقامات سے یہاں جو

تعلیم نسواں کو زیادہ ترقی ہوئی وہ آپ ہی کے حُسن مساعی کا نتیجہ ہے۔ اب بھی تدوین و اشاعت کتب قدیمہ کا شعبہ آپ ہی کو تفویض ہے۔ نادار اور ہونہار طلبہ کو آپ ہمیشہ اپنی جیب سے وظیفے دیتے رہتے ہیں۔ یہ میں اپنے ذاتی تجربہ سے کہتا ہوں کہ کوئی علمی ادبی یا تعلیمی یا کوئی مفید تحریک ہو آپ اُن کے پاس لے جائیے وہ بڑی خوشی سے اِس میں شریک ہونگے اور اپنی بساط سے بڑھ کر مدد دینگے۔

اِس کے بعد ہمیں اُن کی تحریریں پڑھنی چاہئیں۔ جو رسائل عماد الملک کے عنوان سے ابھی طبع ہوئی ہیں۔ اس میں کل ۱۹ مضامین ہیں۔ اِن میں سے ۹ علمی مباحث پر ہیں ۲ اخلاقی ۳ زرعی ۴ تعلیمی اور ایک سیاسی موضوع پر ہے۔ ان سب میں قابل غور اور عالمانہ مضمون "دیسی زبانوں میں علمی اصطلاحات" پر ہے۔ یہ مضمون پچاس صفحہ پر ہے اور اُردو کے پہلے نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ اگرچہ یہ پچاس سال قبل کا لکھا ہوا ہے لیکن باوجود اس کے خیالات کی جدت و تازگی کی وجہ سے اِس وقت بھی غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اور اس سے نواب صاحب کی علمی قابلیت اور ادبی ذوق کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ اب بھی اُسی قدر اہم اور قابل بحث ہے جس قدر پچاس سال پہلے تھا۔ اس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد سے یہ مسئلہ زیادہ نمایاں طور سے بحث میں آیا ہے۔ میرے خیال میں نواب صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے جامع حیثیت سے اس پر بحث کی ہے اور اس کی مشکلات پر نظر ڈالنے کے بعد اسے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی زبان میں جدید علمی اصطلاحات کے ترجمہ کرنے کے اصول قائم کئے ہیں۔ یہ موقع اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کرنے کا نہیں ہے لیکن ہم اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ جو صاحب اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں اس مضمون کا پڑھنا لازم ہے۔

تعلیمی مضامین درحقیقت ان کی وہ تقریریں ہیں جو انھوں نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس یا حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں بحیثیت صدر فرمائی تھیں۔ نواب صاحب اُن بزرگوں میں ہیں جو تعلیم کے معاملہ میں سرسید احمد خاں مرحوم کے ہم نوا اور ہم خیال تھے اور جو مغربی السنہ و علوم کی تعلیم کو قوم کے تمام امراض کا علاج خیال کرتے تھے چنانچہ رام پور میں جو ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ۱۹۰۰ء میں ہوا تھا۔ اُس میں فرماتے ہیں:۔

"علوم جدیدہ کی نسبت بھی بعض پرانے فیشن کے لوگ جو کبھی اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے ہیں لاتسلّم کا کلمہ زبان پر لائینگے مگر ہم کو اُن سے بحث نہیں ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اکثر وہ حضرات جن کو اس کانفرنس کے

اغراض سے دلچسپی ہی اس امر کو بطور اصول موضوعہ و علوم متعارفہ مان لینگے کہ اگر ہم مسلمانوں کو اپنی قوم کی اصلاح اپنی دولت کی ترقی بلکہ اپنے نام و نشان کا بقا مدِنظر ہی اور ہم اپنے آپ کو صفحۂ ہستی سے مثل حرفِ غلط محو کر دینا پسند نہیں کرتے ہیں تو ہم کو ضروری ہی کہ ہم یورپ کی زبانیں سیکھیں اور یورپ کے علوم حاصل کریں۔ آج کل بغیر علم موجودات عالم کے کوئی کام دنیا کا پورا نہیں ہو سکتا۔ صنعت، حرفت، تجارت، نوکری، طبابت، وکالت، سپہ گری کسی فن میں بغیر جدید علوم کی مدد کے ہم ترقی نہیں کر سکتے اور یہ علوم ہم کو بغیر انگریزی کی میانجی گری کے سر دست حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس ہمارا فرض ہی کہ ہم انگریزی زبان کو اچھی طرح حاصل کریں تاکہ مغربی علوم کے خزانہ کی کنجی ہمارے ہاتھ آ جائے۔"

لیکن وہ موجودہ تعلیم کے نقائص سے بھی ناواقف نہیں ہیں چنانچہ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:-

"جو لوگ اس طریقۂ تعلیم کے بڑے طرفدار ہیں وہ معترف ہیں کہ یونی ورسٹیوں کی مجوّزہ تعلیم بہت کچھ اصلاح کے لائق ہی اور اس تعلیم سے اخلاق پر اور نفس انسانی کے اعلیٰ جذبات پر وہ اثر نہیں پڑتا جو عمدہ تعلیم کا جزو اعظم ہی اور نہ خود السنہ و علوم مغربی پر سوائے ایک سطحی اطلاع کے زیادہ عبور حاصل ہو سکتا ہی۔ الا ماشاء اللہ موجودہ تعلیم سے اس وقت تک نہ کوئی بڑا عالم یا مدبّر یا حکیم مسلمانوں میں پیدا ہوا اور نہ ہونے کی امید ہی نہ سر سالار جنگ مرحوم اور نہ سر سید احمد خاں مغفور اسکولوں کے تعلیم یافتہ تھے کیونکہ اس تعلیم کا دار و مدار امتحانوں پر ہی اور امتحانوں کی بھرمار سے بالاضطرار نہ کہ بالاختیار بہت سے منافذ علمی روشنی کے ہمارے لیئے مسدود ہو جایا کرتے ہیں۔ اور ایک بڑا ناقابل برداشت عیب اس تعلیم میں یہ ہی کہ اپنے مذہبی عقائد و مسائل اور اپنی ملت کی مقدس تاریخ سے ہمارے نوجوان گویا بالکل اجنبی رہ جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسری تعلیم اصلاحوں کی بھی کوئی قریب توقع نہیں ہی اور اگر بو فرضنا اصلاح کی بھی جائے تو کیا معلوم ہی کہ ہماری مرضی کے موافق ہی ہوگی۔ ہم اپنی قومی ضرورتیں خود بہتر جانتے ہیں۔"

اسی تقریر میں انھوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی کے قیام پر بھی بحث کی ہی اور یہ بتایا ہی کہ صرف ایک کالج ترقی کر کے یونی ورسٹی بن سکتا ہی۔ قرطبہ اور بغداد کے مشہور مدارس کو بھی ایک زمانہ میں یہی فخر حاصل تھا۔ ڈبلن یونی ورسٹی کی بنیاد بھی صرف ایک کالج پر ہی۔ اسی طرح علی گڑھ کالج کو یونی ورسٹی بنانے میں کوئی امر مانع نہیں ہے

کیونکہ اس قسم کا کوئی درس گاہ ترقی کرتا ہے تو ایک حد سے گزرنے کے بعد خود بخود یونی ورسٹی کی حیثیت پیدا کر لیتا ہے۔ اور اس قدر ترقی کے اسباب مہیا کرنا بالکل قوم کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی مختلف علوم کے درس کا سامان مہیا کرنا، ہر علم کے لیئے ایسے ماہر مدرسین کا مقرر کرنا جن کے نام ہی سے شائقین علم ان کے درس میں شریک ہونے کی آرزو کریں۔ اعلیٰ درجہ کے کتب خانہ اور تجربہ خانہ کا مہیا کرنا وغیرہ۔

اسی ضمن میں وہ فرماتے ہیں کہ :-

"اس تجویز پر یہ نکتہ چینی کی ہے کہ کسی خاص مذہب کی قید کے ساتھ کسی یونی ورسٹی کا قائم ہونا مفید نہ ہوگا۔ یونی ورسٹی کا دائرۂ افادہ وسیع ہونا چاہیئے، کسی ملت و مذہب کی خصوصیت نہ ہونی چاہیئے ورنہ خیالات محدود اور تعصبات غالب ہو جائینگے، جن سے بچنا ترقی علم کے لیئے لازمی اور لابُدی ہے۔ میں اس اعتراض کو ایک حد تک تسلیم کرتا ہوں۔ سید صاحب مرحوم نے اسی لیئے علی گڑھ کالج کا دروازہ ہر ملّت و مذہب کے لیئے کشادہ رکھا تھا اور اب بھی کشادہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آیندہ کشادہ نہ رہے۔ میری ذاتی رائے ہمیشہ سے یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ جو ایک ملک کے رہنے والے ایک بادشاہ کی رعیّت ایک قانون کے پابند ہیں، اُن میں اتحاد و اتفاق رہنا چاہیئے اور برادرانہ برتاؤ ہونا چاہیئے۔ گو ملّت و مذہب علحدہ ہو۔ نظرِ حقیقت بیں کے آگے ہندو، مسلمان، یہودی، عیسائی سب راہِ حق کے جویاں ہیں فقط عقائد اور طرق مختلف ہیں۔ دیکھئے قرطبہ کی یونی ورسٹی میں نصرانی طالب علم کس قدر موجود تھے۔ پس اگر ہماری یونی ورسٹی کا دروازہ بھی ہر ملت و مذہب کے واسطے کشادہ رہے تو میری رائے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ ایک نوع سے خود مسلمان طلبہ کے حق میں مفید ہوگا کیونکہ اتفاقاً ہمارے ہندو بھائی محنت و مشقت میں اور طالب علمی کی نفس کشی میں ہم سے بہت پیش قدم ہیں اور ہم کو اُن کی صحبت سے خبط کا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

اس یونی ورسٹی میں انھوں نے دینیات کی فیکلٹی قائم کرنے کی بھی رائے دی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ

"مختصر ہم یونی ورسٹی سے اپنی دو نہایت مہتم بالشان غرضیں پوری کرانا چاہتے ہیں۔ اوّل تو یہ ہے کہ کوئی مسلمان لڑکا اپنے مذہبی عقائد و مسائل سے ناواقف نہ رہے اور اپنے بزرگانِ دین کی تہذیب و اخلاق سے عاری نہ ہو اور اُس کے ساتھ ہی مغربی علوم پر جامعیت کے ساتھ عبور حاصل کرے اور مغربی خیالات سے پورے طور پر

متمتع ہو۔ دوسری غرض یہ ہے کہ ہماری یونی ورسٹی ایک ایسا مرکز علوم و فنون بن جائے کہ اس کا اثر صالح تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر پڑے اور اُن کے خیالات کی اُن کے طرزِ معاشرت کی اور سب سے زیادہ اُن کے لٹریچر کی اصلاح کرے۔ آپ بے خبر نہیں ہیں کہ علی گڑھ نے اور تہذیب الاخلاق نے تھوڑے ہی عرصہ میں ہمارے لٹریچر پر کیا اثر ڈالا تھا۔ میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ جتنی اردو زبان کی کتابیں اس بیس سال کے عرصہ میں تصنیف ہوئی ہیں وہی قابل اعتنا نکلیں گی جن پر علی گڑھ کے طائفہ تحریر کا اثر پڑا ہے ورنہ بہت سی ناولیں اور بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے اکثر تو مادہ سے خالی ہیں یا اس بیہودہ اور غیر مہذب رنگ میں رنگی ہوئی ہیں جس کی ہماری پبلک بعض خاص خاص سوسائٹیوں کے پلید اور چرک آلود اثر سے عادی ہو رہی تھی۔ عاقل کے لیے اشارہ کافی ہے۔ اگر فسانۂ عجائب سے لے کر اس وقت کی اُن ناولوں تک جو اپنے مصنفین کے نزدیک بہت مہذب طور پر لکھی گئی ہیں غور سے نظر ڈالی جائے اور خاص کر اس نکتہ کی طرف توجہ کی جائے کہ اُن میں عورتوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا گیا ہے تو آپ پر حقیقت کھل جائیگی اور معلوم ہو جائیگا کہ اُن میں یورپ کی بدترین اور ذلیل ترین ناولوں کی تقلید کی گئی ہے اور اُس کا نام تہذیب رکھا گیا ہے۔ باقی باتیں وہی قائم ہیں جو پچھلے وقتوں سے وراثتہً اُن کو ملی ہیں۔ ہم کو پورا یقین ہے کہ اگر یونی ورسٹی قائم ہو گئی تو بہت جلد یہ دھبہ ہمارے موجودہ لٹریچر سے مٹ جائے گا اور قابلِ قدر کتابوں کی تعداد بڑھتی جائیگی اور مصنفین کے تفکرات و تخیلات میں اصلاح ہو جائیگی۔"

یہ خیالات بیس برس پہلے کے ہیں مگر اب بھی اُن میں تازگی موجود ہے۔ اور ہمارے حالات پر صادق آتی ہیں۔ علی گڑھ یونی ورسٹی قائم ہو گئی ہے، دیکھیں وہ ان توقعات کو کہاں تک پورا کرتی ہے، اور خاص کر اُردو زبان کی اصلاح و ترقی میں کیا کیا کوششیں عمل میں لاتی ہے۔ یہ توقع ہمیں زیادہ تر عثمانیہ یونیورسٹی سے ہے جس کی طرف سب کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ ہم دوسری قومی اور نیم قومی یونی ورسٹیوں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب تک علوم و فنون اپنی زبان میں نہ آئیں گے، ملک میں علم کی عام اشاعت نہیں ہو سکتی۔ اور اس روشنی میں بھی یہ تاریکی یونہی رہے گی۔

افسوس ہے کہ اس مجموعہ میں نواب صاحب کا عالمانہ مضمون "مسلم یونی ورسٹی" پر داخل نہیں کیا گیا حالانکہ اسی زمانہ میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہو گیا تھا۔

علمی مضامین میں (علاوہ مضمون اصطلاحات کے) ابن رشد اور اُس کے ہمعصروں پر بہت بڑا مضمون ہی جو (۸۰) صفحوں پر ختم ہوا ہی۔ ایک اور مضمون ہَوا اور پانی پر تقریباً ۵۰ صفحہ پر ہی۔ اس کا تعلق سائنس سے ہی۔ اگرچہ یہ مضمون اس زمانہ میں بہت زیادہ قابل قدر نہ خیال کیا جائے گا لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہی کہ نواب صاحب کو اپنی زبان کی ترقی کا کس قدر خیال تھا کہ انھوں نے پچاس سال قبل اس قسم کے مضمون لکھ کر ملک میں شائع کئے۔ یہ مضمون اب بھی پڑھنے کے قابل ہی۔ ایک مضمون سقراط پر مسجّع اور مقفّٰی عربی میں لکھا ہی جو اس مجموعہ میں شریک ہی۔ تین مضمون زراعت پر ہیں جن کا پڑھنا اُن لوگوں کے لئے دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگا جو اس فنِ شریف سے تعلق رکھتے ہیں۔

کیا اچھا ہوتا اگر ہر مضمون کے ساتھ اِس کا سنہ تحریر بھی لکھ دیا جاتا۔

نواب صاحب کا سب سے قابلِ قدر کام قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ہی جو سولہ پارہ تک ہو چکا ہی۔ افسوس ہے کہ اب اِس کی تکمیل کی توقع نہیں معلوم ہوتی۔ انگریزی میں قرآن پاک کے متعدد ترجمے موجود ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے نواب صاحب کا انگریزی ترجمہ دیکھا ہی اور صاحبِ بصیرت ہیں اُن کا خیال ہی کہ ان ترجموں کو اِس سے کوئی نسبت نہیں۔

اِسی مجموعہ میں ایک خط سرسید احمد مرحوم کے نام نیشنل کانگریس کے متعلق ہی۔ نواب صاحب ہندوستان کی سیاسیات میں سرسید احمد مرحوم سے بالکل متفق تھے۔ لیکن اب حالات بدل چکے ہیں، زمانہ نے دوسری کروٹ لی ہی۔ معاملات کی نوعیت دگرگوں ہوگئی ہی۔ اب اُس زمانہ کے خیالات کا اس زمانہ میں اعادہ کرنا عبث ہی۔ نواب صاحب اُن بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے انگریزی حکومت کا ابتدائی زمانہ دیکھا تھا اور جو انگریزوں کی قوت ایجادات و اختراعات اور انصاف سے مرعوب ہوگئے تھے اور اُن کو دنیا کی بہترین قوم تصوّر کرتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے کبھی معاشی (اقتصادی) نقطۂ خیال سے اُن کے اُصولِ حکومت پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی تھی۔ یہ چیز بلحاظ تاریخی لحاظ سے یادگار رہیگی۔

روحِ سیاست[1]

ڈراما

(ترجمہ جناب محمد عمرو نور الٰہی صاحب)

ڈراما۔ اصناف ادب میں سب سے اعلیٰ اور افضل درجہ رکھتا ہے۔ عمدہ ڈراما ادبی کمال تخیّل کی رفعت اور انسانی فطرت کے مطالعہ کی بہترین مثال ہے۔ اور انسانی دل و دماغ اور اخلاق پر اثر ڈالنے کے لئے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارا علم ادب اعلیٰ درجہ کے ناٹکوں سے خالی اور ملک اس نعمت سے محروم ہے۔ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ دو قابل اور مستعد نوجوانوں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ دنیا کے بہترین ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ کر کے ملک میں شائع کریں گے۔ جن میں سے ایک جو زیرِ تبصرہ ہے شائع ہو چکا ہے اور دو ایک طبع کے لیے تیار ہیں۔ اِن صاحبوں کی یہ ادبی کوشش نہایت قابلِ قدر ہے اور ہم انھیں اس پر دل سے مُبارک باد دیتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ کو اسی مستعدی سے جاری رکھیں گے اور کسی رکاوٹ یا مزاحمت سے بددل یا پست ہمت نہ ہوں گے۔

روحِ سیاست۔ ایک انگریزی ڈراما کا ترجمہ ہے جس کی انگلستان میں بے حد قدر و منزلت ہوئی۔ ایک تاریخی اور سیاسی ڈراما ہے۔ جس میں بنی نوع انسان کے محسن اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شریف پریزیڈنٹ ابراہام لنکن کی حیات ابدی کی صحیح جھلک نظر آتی ہے۔ وہ نازک وقت تھا جب کہ جنوب اور شمال میں مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھی تھی اور اتحاد کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ بنائے مخاصمت غلامی تھی۔ اہل جنوب غلامی سی عزیز شے کو جس پر اُن کی دھن دولت اور تموّل کا انحصار تھا، چھوڑنا نہ چاہتے تھے اور اس لیے شمال سے آزاد رہ کر اس سے تمتّع حاصل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس باہمی جنگ اور مخالفت نے تمام امریکہ میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس نازک اور انقلاب خیز وقت میں ابراہام پریزیڈنٹ انتخاب کیا گیا۔ اور باوجود اختلاف رائے، مزاحمتوں اور سازشوں کے اس نے وہ کام کیا جس پر انسان و ملائکہ ہمیشہ رحمت بھیجتے رہیں گے۔ وہ بے حد مستقل مزاج، اُصول کا پکّا، سیدھا سادا اور صاف سچا

[1] یہ کتاب جناب محمد عمر صاحب مترجم ہائی کورٹ جموں و کشمیر سے مل سکتی ہے۔ قیمت نامعلوم تقطیع چھوٹی۔ ص ۱۴۵

آدمی تھا۔ وہ امریکہ کے اتحاد کے قیام اور غلامی کے مٹانے پر مُصر تھا۔ اگرچہ بہت سے مصائب و آلام نازل ہوئے کُشت و خوں ہوا، قتل و غارت گری کرنی پڑی (جس سے وہ سخت متنفر تھا مگر مجبور تھا) مگر وہ آخر کامیاب ہوا۔ اِس نے امریکہ میں اتحاد قائم رکھا اور غلامی کو دنیا سے مٹا کر چھوڑا۔ جس روز وہ فتح پاتا ہی اور اُسے اپنے پاک عزم میں کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ ایک مشہور تھیٹر میں جاتا ہی خلقت کا ہجوم ہی اور سب کی نظریں اسی نیک نفس انسان پر ہیں۔ اور ہر طرف سے اصرار ہی آوازیں بلند ہیں کہ پریزیڈنٹ تقریر کرے کہ دفعتہً اُس بھرے تھیٹر میں ایک بدبخت نادان نوجوان کے ہاتھ سے قتل ہوتا ہی۔ سارے تھیٹر میں کہرام مچ جاتا ہی اور وہ شرافت و نیکی کا پتلا وہیں جان دے دیتا ہی۔ مگر وہ زندۂ جاوید ہی، وہ محبِّ وطن ہی نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان کا محسن ہی۔

اِس قسم کے ڈراموں کی ہمارے ملک کو شدید ضرورت ہی۔ پند و موعظت اور لکچر، مجلسوں کی رودادیں اور پمفلٹ وہ کام نہیں کرسکتے جو ایک ڈراما کر دکھاتا ہی بشرطے کہ اس کا لکھنے والا صاحب نظر اور ادیب ہو اور اِس فن کو سمجھتا ہو۔

قابل مترجمین نے دیباچہ میں لکھا ہی کہ:۔

"گو یہ کتاب مطالعہ کے لیئے بھی خوب ہی مگر دراصل اس کا اسٹیج پر لانا مقصود ہی۔ اِس کا حُسن و قبح اسٹیج ہی پر معلوم ہوگا۔"

یہ صحیح ہی، لیکن اعلیٰ درجے کے ڈرامے مُطالعہ میں بھی بہت مؤثر ہوتے ہیں۔ رزمِ سیاست کا شمار اُن ڈراموں میں نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک سیدھا سادا ڈراما ہی جس میں نہ کوئی بڑی پلاٹ ہی اور نہ اشخاص ڈراما کی شخصیتوں کے اُبھارنے اور ممتاز طور پر دکھانے کی کوشش کی گئی ہی۔ البتہ ابراہام لنکن کی شخصیت تو ایسی ہی جس کا اثر خود بخود انسان پر پڑتا ہی مگر باقی اشخاص کم و بیش معمولی نظر آتے ہیں اور اُن میں کوئی بھی ایسا نہیں جو دل یا خاطر پر اپنا نقش قائم کرسکے۔ حالانکہ کئی جگہ اس کا موقع تھا۔ مثلاً غلامی کے حامیوں کی جانب سے کوئی شخص ایسا پیش نہیں کیا گیا جو اپنے گروہ کے خیالات و جذبات کا صحیح اظہار کرتا یا مثلاً ڈگلس حبشی کی ملاقات (لنکن سے) زیادہ مؤثر ہوسکتی تھی جس میں انسانی فطرت کے کرشمے زیادہ خوبی کے ساتھ نظر آسکتے تھے۔ بہرحال اُردو کے لیئے یہ ڈراما بھی بہت غنیمت ہی اور اگر ہمارے ہاں کا کوئی تھیٹر اس کے مناسب حال انتظام کرکے اسٹیج پر لائے اور اس کا

کو مدِ نظر رکھے جو مترجمین نے اپنے دیباچے میں لکھی ہیں تو اُمید ہی کہ ہمارے ناٹکوں میں بہت کچھ اصلاح ہو جائے اور دیکھنے والوں کے مذاق پر بھی اثر پڑے۔ مترجمین اپنے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"یہ کتاب دو جداگانہ ڈراموں پر مشتمل ہی جن کی پلاٹ کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں مگر یہ ہر دو ڈرامے ایک ہی وقت میں اسٹیج پر آئینگے اور اُن کے سین یکے بعد دیگرے یا جس طرح اسٹیج کی سہولت اجازت دے، دکھائی جائیں گے۔"

یہ دوسرا ڈراما جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہی **جانِ ظرافت** ہی جو فرانس کے مشہور ڈراما نویس مولیر کی تصنیف ہی۔ غالباً اسے ساتھ اس لیئے رکھا گیا ہی کہ تماشائیوں کی دلچسپی قائم رہے۔ افسوس ہی کہ وہ ہمارے پاس نہیں آیا لہذا ہم اُس کے ترجمے کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتے۔

مترجمین نے اِس ترجمہ میں اکثر مقفیٰ عبارت لکھی ہی۔ اُن کے خیال میں اِس کا استعمال بمجبوری اس لیئے جائز رکھا گیا ہی کہ ہماری زبان میں بلینک ورس (نظم غیر مقفیٰ) کا رواج نہیں۔ اور یہ مجبوری اس لیئے واقع ہوئی کہ ایکٹروں کو ربط عبارت کے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ اس پر وہی شخص رائے دے سکتا ہی جو ناٹکوں کے تفصیلی حالات سے واقف ہو۔ ہم اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتے لیکن یہ ضرور ہی کہ مقفیٰ گفتگو عام بول چال کے خلاف ہی۔ حالانکہ ڈراما اصل کی سچی نقل ہوتا ہی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا ہی کہ بعض اوقات گفتگو یا عبارت کے جملے بھدّے بھونڈے اور مہمل ہو گئے ہیں یا اصل خیال صحیح طور سے ادا نہیں ہوا اور اس کی قوت کم ہو گئی ہی مثلاً

"اور مجھ پر ذمہ داری کا یہ بار ڈالا جس سے واشنگٹن کو بھی نہ پڑا پالا۔"

سیورڈ "بندہ معافی کا خواستگار ہی۔"

لنکن - "یہی جوہرات نیت کا نندگار ہی۔"

"قانون کیا ہی؟ محض مختلف رایوں کا مجموعہ آپ جانتے ہیں اور اہلِ جنوب تو اسے بخوبی مانتے ہیں۔"

لنکن "سکاٹ کہتا ہی کہ بیس ہزار سے ایک بھی کم سپاہی درکار نہیں۔"

سیورڈ - "اور یہاں دس ہزار بھی تیار نہیں۔"

"کونسل کے ایک ہی ممبر پر اُن کی حکمت عملی کا مدار ہی اور یہ کھلا ہوا راز ہی کہ وہ ممبر سیورڈ نامدار ہی۔"

"یہ میرے صادق دوستوں کی رفاقت کا جام ہے جن کی محبت کا   یہ دشمن بردہ فروشی درم ناخریدہ
غلام ہے۔"

بعض مقامات پر زبان کی خامیاں بھی رہ گئی ہیں اور یہ ڈرامے کے لیے بہت نازیبا ہے۔ کیونکہ سننے والوں کے کانوں کو یہ ناگوار گزرتی ہیں اور ان سے ڈرامے کا اثر کم ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

کئی جگہ مسز لنکن کو "جنابہ" سے خطاب کیا گیا ہے حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔

ایک لیڈی مسز لنکن سے ملنے آئی ہے اور ملنے کے کمرے میں بیٹھی ہے۔ خادمہ آکر اطلاع دیتی کہ:-

"ایک لیڈی صاحبہ مدت سے منتظر ہیں" (مطلب یہ ہے کہ بہت دیر سے منتظر ہیں)

"یہ تو جنگ ہے، میں نے اسے خون کا مقدمہ نہیں بنایا"

"اس نے فردِ حساب تیار کر لیا ہے" (فرد مؤنث ہے)

"جب باغی فوج میرے لینڈ سے نکل جائے"

یہ بہت مکروہ لفظ ہے۔ اور جب ہماری زبان میں اس کے لیے متعدد لفظ موجود ہیں تو کیوں یہ انگریزی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

"انھیں سلام دو" - یہ اینگلو انڈین محاورہ ہے۔ فصیح اردو نہیں ہے۔

"حضرات! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ تشریف رکھیے" یہ انگریزی جملہ کا لفظی ترجمہ ہے۔ اردو میں اس طرح نہیں کہتے۔

ڈراما ادبی نقائص سے بری ہونا چاہیے۔ ہم نیک نیتی سے مترجمین کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس معاملہ میں بہت احتیاط کریں اور بہتر یہ ہوگا کہ وہ اپنے ترجمے کسی قابل ادیب کو دکھا لیا کریں۔

بہرحال ہم ان دونوں صاحبوں کے بہت ممنون ہیں اور ان کی کوششوں کو بہت وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اردو زبان کی بہت بڑی کمی کو پورا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور آیندہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اساتذہ اور اعلیٰ درجہ کے ڈراما نویسوں کی تصانیف کا ترجمہ کرنے والے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ملک کو اپنے حالات سے اپنے ڈراما خود لکھنے چاہئیں مگر ہمارے ملک کی حالت اس وقت ایسی ہے کہ اسے اعلیٰ تصانیف کے ترجمہ

کی شدید ضرورت ہو تاکہ اہلِ ملک کے سامنے بہترین نمونے موجود ہوں۔ اُن میں ذوقِ سلیم پیدا ہو اور عمدہ تصانیف کی ترغیب و تحریک ہو۔ ایک مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی تصنیف سے ایک اعلیٰ درجہ کی تصنیف کا ترجمہ بدرجہا بہتر ہے۔ جن اساتذہ کے نام اُنھوں نے ہمیں لکھ کر بھیجے ہیں اُن کی تصانیف تمام عالم میں مسلّم اور مقبول ہیں اور اُن کے ترجمے بالشبہ ہماری زبان میں بیش بہا اضافہ ہوگا اور اُردو دانی طبقہ کو بہت [illegible] فائدہ پہنچیگا۔ لیکن آخر میں ہم اتنی التجا کرتے ہیں کہ یہ ترجمے ادبی لحاظ سے بھی بے عیب ہونے [illegible]۔

۱۔ خونابۂ عشق [۱]

۲۔ حکایاتِ شرلک ہومز [۲]

مترجمہ

(پروفیسر فرزادالدین مراد صاحب ایم۔ ایس سی۔ پروفیسر علم الطبیعیات دارالعلوم علی گڑھ)

جب یہ دو کتابیں ہمارے پاس پہنچیں تو قابل مترجم کا نام دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ پروفیسر مراد صاحب اب تک علمی مضامین لکھتے رہے ہیں اور زیادہ تر شوق انھیں سائنس سے رہا ہے۔ چونکہ اس میدان کے مرد بہت کم ہیں اور ہمیں ایسے حضرات کی ضرورت ہے جو اُردو زبان میں علمی اور خاص کر سائنس کے مضامین شائع کر کے اہلِ ملک کی معلومات میں اضافہ کریں اس لیئے ہماری حیرت کچھ بے جا نہ تھی کہ فاضل پروفیسر سائنس پر لکھتے لکھتے ناولوں کے ترجموں پر اُتر آئے۔ یہ زیادہ مناسب ہوتا اگر وہ اپنے کسی شاگرد یا دوسرے لوگوں کو جن کی تعداد ہمارے ملک میں کچھ کم نہیں ہے اس کام پر مامور کر دیتے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے مبتذل ناولوں کے ترجموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ ایسے ناول یا حکایات کا ترجمہ کیا ہے جن میں علمی جھلک پائی جاتی ہے۔ کانن ڈائل

---

[۱] ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور۔ ۱۹۵۔ ریلوے روڈ۔ قیمت عصر [۲] ملنے کا پتہ:۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڈھ

کا نام دُنیا میں ضرب المثل ہوگیا ہی اور اِن کی کتابوں کا ترجمہ اکثر زبانوں میں ہوچکا ہی۔ اُن کی کتابیں اور کارنامے منطقی استدلال کا عجیب وغریب سلسلہ ہیں۔ اور سُراغ رسانی کو حدِ کمال تک پہونچا دیا ہی۔ اِن کی نظر، قوتِ مشاہدہ اور انتقالِ ذہن حیرت انگیز ہی۔ اگرچہ قصے فرضی ہیں لیکن اصل سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ اور پڑھنے والے پر کم سے کم اتنا ضرور اثر پڑتا ہی کہ ہمیں اپنی آنکھوں اور دماغ سے کیونکر کام لینا چاہیئے۔ اور یہ بڑی چیز ہی۔ اردو زبان میں ایسی بہت کم کتابیں ہیں جسے لڑکے لڑکیاں مرد عورت سب پڑھ سکیں، جو انتہا درجہ کی دلچسپ بھی ہوں اور مفید بھی۔ اس خیال سے ہمیں قابل پروفیسر صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس طرف توجہ فرمائی لیکن ساتھ ہی ہم یہ اُمید بھی کرتے ہیں کہ وہ علمی شوق کو ترک کرکے ہمہ تن اس میں مصروف نہو جائینگے۔

ترجمہ صاف اور ستھرا ہی۔ البتہ اس کے متعلق دو باتوں کی شکایت ہی ایک تو یہ کہ کہیں کہیں مشکل اور علمی اصطلاحات کا استعمال کیا ہی حالانکہ وہی مطلب زیادہ آسان الفاظ میں ادا ہو سکتا تھا۔ دوسری بعض بعض جگہ زبان اور محاورے کی خامیاں پائی جاتی ہیں جو دوسری طبع میں رفع کردینی چاہئیں۔

کلماتِ طیّبات[1]

(مرتبہ جناب شرف الدین احمد خاں صاحب)

یہ ایک چھوٹی تقطیع کی مختصر سی کتاب ہی جس میں قابل مرتب نے جناب امیر علیہ السّلام کے اقوال جمع کردیئے ہیں۔ اِن اقوال کی صحت کے متعلق کوئی رائے دینا مشکل ہی۔ کیونکہ بہت سے اقوال اور اشعار ایسے ہیں جو جناب امیرؑ کے نام سے منسوب کردیئے گئے ہیں۔ قابل مرتب دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ:۔

"سنہ ۱۹۶۶ء میں پیرس کے مسٹر ویٹیر نے جناب امیر علیہ السّلام کے اقوال منتخب کرکے شائع کیئے تھے جو حُسن اتفاق سے مجھے مل گئے۔ اِس خیال سے کہ لوگوں کو اُن اقوال کی صحت میں شبہ نہ ہو میں نے ترجمہ کے بعد بڑی محنت

[1] ملنے کا پتہ:۔ شرف الدین احمد خاں صاحب ہیڈ کلرک ہوم دیپارٹمنٹ، رام پور، ریاست (یو۔ پی) قیمت عہ

کے ساتھ اصل عربی کے اقوال کی جستجو کی۔ جو خدا کی مہربانی سے ہاتھ آگئے اور میں اُن کو لائق ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں"

کیا عجب بات ہے کہ حضرت علی علیہ السّلام کے اقوال کے لیئے بھی ہمیں یورپ جانے کی ضرورت پڑی عربی اقوال کے نیچے اُردو ترجمہ درج ہے اور مقابل صفحہ پر انگریزی ترجمہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقوال تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ اور حکمت و دانش کی جان ہیں۔

نیاز

یہ اُردو کا ایک ماہوار رسالہ ہے جو لُدھیانہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کے اڈیٹر جناب شیر احمد خاں صاحب اخوندی بی اے ہیں (جس میں اُن کے شریک محمد یحییٰ اشہر ہیں) اُردو زبان کی اشاعت و ترقی کے لیئے جو کوشش بھی کی جائے قابلِ قدر ہے۔ پنجاب اس معاملہ میں پیش پیش ہے اور ہر سال اس کا قدم اُردو کی خدمت میں آگے پڑتا ہے۔ شیر احمد خاں صاحب قابلِ مبارک باد ہیں۔ اگرچہ اس راہ میں بہت سی مشکلات ہیں مگر اُنھوں نے بڑی محنت اور شوق سے **نیاز** کو مرتّب کیا ہے اور ناظرین کی تفریح و معلومات کے اضافہ میں مقدور بھر کوشش کی ہے۔ سائنس کے مضامین کے ساتھ تاریخی معلومات بھی ہیں۔ نثر میں تخیل کی جولانیوں کے ساتھ شعر و سخن کا ذوق بھی ہے۔ چھوٹے چھوٹے دلچسپ فسانے بھی ہیں۔ لکھنے والوں میں بعض مشاق مضمون نگار اور ادیبوں کے نام نظر آتے ہیں۔ پہلا پرچہ لکھائی اور چھپائی کے اعتبار سے بہت گرا ہوا تھا مگر دوسرے پرچے نے ترقی کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ لائق اڈیٹر کی سرپرستی میں آئندہ وہ صورت و سیرت دونوں میں ترقی کریگا

ہُمایوں

یہ ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جو لاہور سے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین ہمایوں مرحوم کی یادگار

میں شائع ہوا ہے۔ اس کے اڈیٹر مرحوم کے قابل فرزند میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا اور جائنٹ اڈیٹر مولانا تاجور نجیب آبادی ہیں۔

لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ ہے۔ تقطیع اردو سے ملتی جلتی ہے۔

شروع میں "بزم ہمایوں" کے تحت میں اڈیٹر صاحب نے چند نوٹ لکھے ہیں جن کا تعلق صرف اس رسالے سے ہے۔ دوسرا عنوان "جہاں نما" ہے۔ جس کے تحت میں چند عجیب اور دلچسپ خبریں ہیں۔ تیسرا عنوان "علمی شعاعیں" ہے۔ جس میں علمی معلومات درج ہیں۔ آخری دو عنوان دو دو صفحے کے ہیں۔ اِس کے بعد صفحہ ۱۴ سے ۵۳ تک میاں شاہدین صاحب مرحوم کے حالات اور اُن کی شاعری پر ایک مختصر نظم اور دو مضمون ہیں۔ نظم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی ہے۔ باقی دو مضامین سے ایک مضمون مرحوم کے حالات پر اُن کے فرزند میاں بشیر احمد صاحب کا ہے اور اُن کے کلام پر مولانا تاجور کا۔ بقیہ حصّے میں مختلف قسم کے مضامین ہیں۔ آخر سات صفحوں میں نظم ہے۔ جس میں ملک کے بعض نامور شعرا کا کلام بھی ہے۔

رسالہ بہت سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے اور اہلِ ملک کے ذوق کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے اور اُسے دلچسپ اور مفید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پنجاب نے اردو زبان کی قابلِ قدر اور قابلِ شکر خدمت کی ہے اور یہ رسالہ اس کا تازہ ثبوت ہے۔ ہم فاضل اڈیٹروں کی خدمت میں مبارکباد عرض کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ملک میں اس رسالہ کی قدر کی جائے گی۔

آوازۂ حق[1]

(از جناب شبیر حسن خاں صاحب جوشؔ ملیح آبادی)

حضرت جوشؔ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اِن کی بعض کتابوں پر اس رسالہ میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ یہ اُن کی جدید نظم ہے۔ جس میں مرثیہ کی طرز پر واقعۂ شہادتِ کربلا کو نظم کیا ہے۔ کل ۹۲ بند ہیں۔ مضمون بھی ہے جو

[1] ملنے کا پتہ:- رئیس احمد خاں صاحب رئیس ملیح آباد، لکھنؤ۔ قیمت ۸؍ (تعداد صفحات ۴۸)

اکثر مرثیوں میں پایا جاتا ہے، طرز بھی وہی ہے، البتہ اتنی جدت کی ہے کہ آخر کے تین چار بندوں میں اس حادثۂ پُر الم کو حال کے مصیبت ناک معاملات سے مطابق کیا ہے اور ایک اخلاقی پہلو نکالا ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک کسی نے حادثۂ کربلا سے جو حق پرستی اور ایثار کی اعلیٰ اور بے نظیر مثال ہے، صحیح طور پر کام نہیں لیا۔ یہ واقعہ کسی خاص گروہ یا خطّے سے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام عالم کے لیے سبق آموز ہے۔ یہ واقعہ فسانے سے زیادہ درد انگیز اور دل گداز ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک ایسا شخص ہونا چاہیے جس میں انیس کی فصاحت اور شاعری، ایک کامل مؤرخ کی سی وسیع معلومات اور ایک اعلیٰ ڈراما نویس کا سا تخیل ہو اور جو فطرتِ انسانی کے اسرار کا ماہر ہو۔ آیندہ جب کوئی ایسا شخص اس واقعہ کو لکھیگا تو یہ دنیا کی بے نظیر ٹریجڈی ہو گی۔

دماغی تربیت

(مترجمہ جناب محمد ذکی صاحب)

یہ مسٹر جیمس ایلن کی انگریزی کتاب (How to Cultivate Mind) کا اردو ترجمہ ہے۔ مختصر دیباچہ کے بعد مصنّف کی تمہید ہے جس میں فرنیالوجی (علم کاسۂ سر) کی ضرورت اور اہمیت کو ثابت کیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ یہ کوئی وہمی اور خیالی علم نہیں ہے بلکہ حقیقی علم ہے اور اس کی بنیاد مشاہدہ اور تجربہ پر ہے۔ اُن کی رائے میں دنیاوی کامیابی کے لیئے ضرور ہے کہ کاسۂ سر کا معائنہ ماہرِ فن سے کرایا جائے تاکہ انسان میں جو جوہر مخفی ہیں اُن کا علم ہو سکے اور اُن سے فائدہ اٹھایا جائے اور جو نقائص ہوں اُن کی اِصلاح ہو سکے۔ خصوصًا بچوں کی تعلیم کی بنیاد اِسی پر ہونی چاہیئے اور اُن کو اسی قسم کی تعلیم دینی چاہیئے جس کے لیئے وہ فطرتًا موزوں ہیں۔ اس کے بعد تندرستی، پیشے، قاعدے، مطالعہ، سوچنے، انشا پردازی، تقریر و گفتگو، ذہن پر چھوٹے چھوٹے مضمون ہیں۔ جن میں بعض کارآمد باتیں بتائی ہیں۔ زبان کی غلطیاں جابجا پائی جاتی ہیں۔ اس میں کچھ کاتب اور مطبع کی عنایت بھی شامل ہے۔ کتاب چھوٹی تقطیع کی ہے۔ تعداد صفحات (۶۳)۔ مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ۔

۸ؔ قیمت ۸ رسلنے کا پتہ:۔ محمد ذکی صاحب۔ اوندرا۔ ڈاک خانہ بی بی پور۔ ضلع اعظم گڈھ

البیان الکامل فی تحقیق الدق والسل

کتاب البیان الکامل فی تحقیق الدق والسل میرے پیش نظر ہے اور مجھ سے اس پر تنقید کی خواہش کی گئی ہے۔ میں اجمالاً اپنے خیالات ظاہر کئے دیتا ہوں۔ کتاب عمدہ کاغذ اور خط نفیس ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اسکو نہایت شرح و بسط سے مرتب کیا گیا ہے حتیٰ کہ بہت سارے غیر متعلقہ امور مثلاً فلسفہ مذہب پر بھی بحث کی گئی ہے معلوم نہیں کہ کس مناسبت سے اس کی ضرورت ہوئی۔ اس کے برعکس بہت سے ضروری امور متروک ہیں جن کی بلحاظ فن سخت ضرورت تھی۔ مثلاً توضیحی تصاویر۔ ٹمپریچر چارٹ وغیرہ۔

ایک اور چیز جو نظر انداز ہوئی ہے وہ تفصیل ان کتابوں کی ہے جس سے اس کتاب کی تالیف عمل میں آئی۔

انگریزی الفاظ کا املا صحیح نہ ہونے کے علاوہ بعض الفاظ کا تلفظ جو اردو میں ادا ہوا ہے وہ بھی غیر صحیح ہے مثلاً الیومن نہیں بلکہ البیومن ہونا چاہیئے۔ اسی طرح بوٹے سیم نہیں بلکہ پٹاسیم یعنی بطاس (عربی)۔

جراثیم دق کے ترتیب کا بیان تفصیل طلب ہے بہتر ہوتا کہ مزید توضیح سے کام لیا جاتا اور تشبیہ کام میں لائی جاتی۔ اسی طرح بیان تشخیص بھی مزید تفصیل طلب ہے۔ ایسے فقرات کہ "گدھے اپنے آپ کو لائق خیال کرتے ہیں" ایک مؤلف کے قلم سے نہ نکلتے تو بہتر تھا کہ یہ خلاف تہذیب فن ہیں اور کتاب کی شان کو نظروں سے گرا دیتے ہیں۔

بیان معالجہ میں آرٹیفیشل نیوموتھوراکس کا بیان یعنی کاربن ڈائی اوکسائڈ (CO_2) اور نائٹروجن (N_2) اور آکسیجن (O_2) کے ذریعہ سے معقول نہیں کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں پلیورل ایفیوژن (Plural Effusion) کا علاج جو درج کیا گیا ہے وہ آج کل کے خیالات کے خلاف ہے۔

حاجی حیدر علی

ایف آر سی ایس آئی

ڈسٹرکٹ سول سرجن اورنگ آباد

مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۲۲ء

نوٹ۔ شائقین کی خدمت میں باادب التماس ہے کہ فرمائش بھیجتے وقت اس اشتہار کا حوالہ ضرور دیں اور ایک روپیہ سے کم کا مال بذریعہ ویلیو نہ منگائیں۔

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات ۲ جلد عہ
- صنم خانہ عشق قلمی ہیہ
- مراۃ الغیب ۸ر
- خیابان آفرینش ۲ر
- محامد خاتم النبیین ۸ر

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۱۰ر
- حاجی بغلول ۱۰ر
- نبی مچھری ۸ر
- پیاری دنیا ۱۰ر
- کایا پلٹ ۱۲ر
- طلسمی فانوس ۲ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانہ آزاد ۴ جلد سے عہ
- سیر کہسار ۷ر
- خدائی فوجدار ۲ر
- جام سرشار ۱۲ر
- کامنی ۲ر
- بچھڑی دولہن ۸ر

جلال لکھنوی مرحوم

- سرمایہ زبان (منتخب) عہ
- گلشن فیض عہ
- افادہ تاریخ ۸ر
- رسالہ تذکیر و تانیث ۸ر

مولانا عبدالحلیم شرر

- جنید بغدادی عہ
- ابوبکر شبلی عہ
- خواجہ معین الدین چشتی ۴
- عہد قدیم ۴
- دولت اسپانیہ عرب ۲ جلد سعہ
- سقلیہ میں اسلام ۱۴ر
- حروب صلیبیہ ۲ر
- تاریخ سندھ ۲ جلد ۲ر
- قیس و لبنیٰ ۱۲ر
- مقدس نازنین ۱۲ر
- ایام عرب ۲ جلد ۲ر
- یوسف و نجمہ ۱۲ر
- فتح اندلس ۲ر
- ماہ ملک ۲ر
- حسن کا ڈاکو ۲ جلد ۱۲ر
- دربار حرام پور ۲ جلد
- خوفناک محبت ۱۲ر
- فاتح مفتوح ۱۲ر
- جویائے حق ۲ جلد للعہ
- مالک جیپا ۲ جلد عہ
- لعبت چین ۱۲ر
- عزیزہ مصر ۱۲ر
- غیب دان دولہن عہ
- فردوس بریں عہ
- فلورا فلورنڈا ۲ر
- مدینۃ الکبریٰ ۱۲ر
- تذکرہ مشاہیر عالم ۱۲ر

حکیم محمد علیخان مرحوم

- جبر کامل ہے
- حسن سرور کامل ہے
- دیوان پوی ۸ر
- کوا ۲ر
- نیل کا سانپ ۹ر
- جعفر و عباسہ ۱۲ر
- انتخاب حسینہ کامل ۲ر

منشی جوالا پرشاد برق

- مرزالنگی ۱۲ر
- ماہ آتشیں ۱۲ر
- بنگالی دولہن ۱۲ر
- بدر تاب ۱۲ر
- معشوقہ فرنگ ۱۰ر

منشی احمد علی شوق قدوائی

- ترانہ شوق ۱۲ر
- عالم خیال ۱۲ر
- قاسم و زہرہ ۱۲ر
- گنجینہ ۸ر

خواجہ عشرت لکھنوی

- تذکرہ آب بقا ۱۲ر
- زبان دانی ۸ر
- اصلاح زبان اردو ۸ر
- شاعری کی پہلی کتاب ۸ر
- شاعری کی دوسری کتاب ۸ر

نواب مرزا داغ مرحوم

- آفتاب داغ عہ
- مہتاب داغ مع یادگار داغ ہے
- گلزار داغ (زیر طبع)
- انتخاب داغ ۱۲ر

مولوی سید احمد دہلوی مرحوم

- راحت زمانی ۱۲ر
- رسوم دہلی ۱۲ر
- تسخیر شوہر ۱۴ر
- مہر افروز بیگم ۱۰ر
- انشاء ہادی النساء سعہ تحریر عہ
- لغات النساء للعہ
- علم اللسان ۸ر
- کنز الفوائد ۸ر

مرزا حیرت دہلوی

- سیرۃ الرسول ۶ حصے سے
- کتاب شہادت ۵ حصے سے
- قصہ حاجی بابا اصفہانی ۱۲ر
- روز ابسپرٹ کامل ۷ر
- تزک امیری ۲ر
- مضامین حیرت ۲ر

مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی

- الصنان ۲ر
- الاستقلال عہ
- تمنائے دید ۱۰

مولانا اشہری مرحوم

- حیات انیس ۲ر
- ایشیائی شاعری عہ
- نور جہاں بیگم ۸ر
- ٹیپو سلطان عہ
- حیدر علی سلطان ۱۲ر
- درشہوار ۸ر

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

- واقعات دار الحکومت دہلی سہ عہ
- تاریخ بیجاپور ۷ر
- حرز اطفال ۸ر
- نشاط عمر ۱۲ر
- عصائے پیری عہ
- اصلاح معیشت ۱۲ر
- حسن معاشرت ۱۲ر
- اقبال دولہن ۱۲ر
- لخت جگر ۲ حصے ہے

مولانا اسلم جیراجپوری

- حیات حافظ ۱۲ر
- حیات جامی ۸ر
- علوم عرب ۱۲ر
- نور ایمن ۱۲ر

وجاہت جھنجھانوی

- حضرت بلال ۸ر
- قومی یادگار ۸ر

مولوی عبدالرزاق کانپوری

- البرامکہ ہے
- نظام الملک طوسی مجلد ہیہ

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- ترجمہ تاریخ ابن خلدون جلد اول ۱۲ر
- جلد دوم ۱۲ر
- جلد سوم ۱۲ر
- جلد چہارم ۲ر
- جلد ششم ۱۴ر
- جلد ہفتم ۲ر
- جلد ہشتم ۲ر
- جلد نہم ۲ر
- جلد دہم ۲ر
- جلد یازدہم ۲ر
- سلطان صلاح الدین ۱۲ر
- سلطان نور الدین محمود عہ

مولوی احسان اللہ عباسی

- ترجمہ قرآن مجید صہ
- تاریخ الاسلام للعہ
- الاسلام ۲ر
- زاہدہ ۱۲ر
- نشتر سخن ۷ر

مولوی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری ۷ر
- حیات خسرو عہ

(ملنے کا پتہ — الناظر بک ایجنسی لکھنو)

نوٹ۔ شائقین کی خدمت میں باادب التماس ہے کہ فرمائش بھیجتے وقت اس اشتہار کا حوالہ ضرور دیں اور ایک روپیہ سے کم کا مال بذریعہ ویلیو نہ منگائیں۔

جسٹس محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- شرح قانون شہادت
- لکچر

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- وکرم اروسی

خواجہ غلام الثقلین مرحوم
- روزنامہ سیاحت
- فلسفیانہ اسلام

مولوی سید عبدالغنی مرحوم
- مسلمانان اندلس
- تنقیح حقوق نسواں

پروفیسر نواب علی ایم اے
- تذکرۃ المصطفیٰ
- سوانح الدین
- صحیفہ سماوی
- شمع سخن

خواجہ عبداللہ اختر بی اے
- دمشق
- بغداد
- صدیق اکبر
- مجمع شرح دیوان حافظ

مرزا محمد ہادی رسوا بی اے
- امراؤ جان ادا
- شریف زادہ
- خونی عاشق
- خونی مصور
- خونی شہزادہ
- لیلیٰ مجنوں (ڈراما)
- مثنوی امید و بیم

مولوی ظفر علی خاں بی اے
- معرکہ مذہب و سائنس مجلد
- خیابان فارس جلد اول
- سیر ظلمات
- ڈراما جنگ روس و جاپان
- جنگل میں منگل

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفہ سائنس
- خونابہ عشق
- [illegible]

مسٹر وحید حسین بی اے
- [illegible]
- [illegible]

مسٹر محبوب الرحمن کلیم بی اے
- جہاں آرا
- [illegible]

ڈاکٹر اقبال ایم اے
- ملت بیضا
- مکمل ترانہ
- شکوہ
- جواب شکوہ
- نالہ یتیم
- [illegible]
- [illegible]
- اکبری اقبال
- [illegible]
- [illegible]

مسٹر سجاد حیدر یلدرم بی اے
- خیالستان
- [illegible]

پنڈت چکبست لکھنوی بی اے
- کملا
- گلدستہ پنج

منشی محمد لطیف مرحوم
- اکبر
- اورنگ زیب
- [illegible]

ڈپٹی لالہ [illegible] بی اے
- سوانح عمری حیدر علی
- سوانح عمری [illegible]

مفتی انوار الحق ایم اے
- تذکرۃ الحبیب
- حقائق اسلام
- اثبات واجب الوجود

مسٹر عنایت اللہ خاں بی اے
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

مسٹر ظفر عمر بی اے
- [illegible]
- [illegible]

مسٹر [illegible] ایم اے
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

پنڈت [illegible] کول بی اے
- [illegible]
- [illegible]

مسٹر [illegible] عباسی بی اے
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن جلد
- سیرۃ عائشہ
- حیات امام مالک
- مکاتیب شبلی ۲ جلد
- لغات جدیدہ
- اہل السنۃ والجماعۃ

مولوی عبدالسلام ندوی
- سیرۃ عمر بن عبدالعزیز
- [illegible]

پروفیسر عبدالباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ
- عقلیات اسلام

پروفیسر محمود علی
- [illegible]
- الایمان

مولوی محمد حلیم انصاری
- [illegible]
- الاسلام و النصرانیۃ
- [illegible]
- جواہر [illegible]
- خلافت [illegible]
- فتح اندلس

مولوی عبداللہ العمادی
- کتاب الکفار
- محاکمات
- تاریخ عرب قدیم
- علم الحدیث
- [illegible] العرب
- فلسفۃ القرآن
- فلسفہ ابن عربی
- محرم کی بدعتیں

نیاز فتحپوری
- گہوارۂ تمدن
- ترجمہ گیتانجلی
- جذبات بھاشا
- کیوپڈ اینڈ سائکی
- [illegible]

سیماب اکبرآبادی
- خدیجۃ الکبریٰ
- [illegible] الرسول
- سیرۃ الحسنین
- زیب النساء بیگم
- نورجہاں بیگم
- جام کوثر

ملک محمد الدین [illegible]
- قانون جنت
- سیرۃ عائشہ صدیقہ

(ملنے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ)

نوٹ ۔ شائقین کی خدمت میں با دب التماس ہے کہ فرمائش بھیجتے وقت اس اشتہار کا حوالہ ضرور دیں اور ایک روپیہ سے کم کا بذریعہ ویلیو نہ منگائیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی
- نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب
- تعلیم الدین ۸ر
- اکسیر فی اثبات التقدیر ۸ر
- الانتباہات المفیدہ ۱۲ر
- اصلاح الرسوم ۸ر
- کلید مثنوی جلد للعہ
- مناجات مقبول ۸ر
- بہشتی زیور ۱۱ حصے ے ر
- بہشتی گوہر ۸ر
- حقوق العلم ۸ر
- انقلاب امت ۳ر

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی
- خصائل شریعت ترجمہ عہ
- تذکرۃ الرشید ے ر

مولانا عبد الغنی
- جوار العرب
- ارمغان آصفی ے ر
- تذکرۃ الشعرا

مولوی فتح محمد جالندھری
- ترجمہ کلام مجید
- ارشادات القرآن ۱۰ر
- نفائس القصص ۶ر
- الاسلام ۸ر
- مصباح القواعد

جسٹس سید کرامت حسین مرحوم
- علم الاخلاق
- افراد کا سبب ۴ر

علامہ سید احمد لکھنوی
- حیات الاسلام ۲ حصے
- فن ہیئت ۱۲ر
- فن کیمسٹری ۱۰ر
- جنت فردوس مکاں ۶ر

مرزا سلطان احمد
- اساس الاخلاق
- ریاض الاخلاق ۱۰ر
- سراج الاخلاق ۱۰ر
- علوم القرآن
- مشیر باطن ۱۰ر
- نبوت ۱۲ر
- النساء فی الاسلام ۸ر
- خیالات ۸ر
- امثال

مہاشے پرکاش دیو
- حضرت محمد صلعم ۸ر
- مہاتما بدھ
- مارٹن لوتھر ۸ر
- خدا اور روح ۱۲ر
- سیرۃ المستورات
- بچوں کی کہانیاں ۶ر

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- اسلامی اخلاق ۸ر
- نقش وفا ۸ر

نواب علی حسن خاں
- فطرت الاسلام
- المدینۃ فی الاسلام
- اسرار حسن ۶ر
- نالۂ دل ۴ر

مولانا عبد الشکور کاکوروی
- ترجمہ اسد الغابہ جلد
- علم الفقہ ۶ حصے
- ترجمہ تاریخ طبری ے ر

مولوی نجم الغنی رامپوری
- تاریخ اودھ ۴ حصے
- بحر الفصاحت
- مختصر الاصول

حافظ عبد الرحمن امرتسری
- الصدیق
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ
- سیاحت ہند
- عربی بول چال ۲ حصے
- کتاب الصرف و کتاب النحو

نواب حاجی اسمٰعیل خاں
- فلاح دارین
- حالات زمین ۸ر
- غذا صفا
- اصحاب ائمہ کرام ۴ر
- ترکی کھانے ۴ر

مولوی رشید احمد انصاری
- تحریر المرأۃ
- المدینۃ والاسلام

مولوی ابو الحسن فرید آبادی
- علم السیاست
- تاریخ مصر جدید
- ترجمہ عوارف المعارف
- مکتوبات لارڈ کرزن

مولوی شیخ عبد الرؤف
- دلائل فضائل اسلام
- البرہان علی فلسفۃ القرآن
- صراط مستقیم ۹ر

سید رفیع رضوی موہانی
- مخزن الفوائد
- تاج و نشان
- گنج شایگاں
- دستار و کلاہ
- کنز الظفری

منشی محمد حسن خاں
- ہاجرہ
- ترکوں کی معاشرت

سید انتخاب عالم مارہروی
- حیات النذیر
- وکیل نسواں ۸ر

مولانا راشد الخیری دہلوی
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی ۱۲ر
- عروس کربلا
- جوہر قدامت
- ماہ عجم
- الزہرا ۱۲ر
- مودودہ ۸ر
- بنت الوقت ۸ر
- سراب مغرب ۸ر
- منازل السائرہ
- سات روحوں کے اعمال نامے ۶ر
- سنجوگ ۱۰ر

مولوی سید تصدق حسین
- قرار اللغات
- قرار الاصطلاحات ۸ر
- قرار المحاورات ۱۲ر

خواجہ حسن نظامی دہلوی
- سیپارۂ دل
- روزنامچہ ممالک اسلامیہ
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- یزید نامہ
- محفل نامہ گیارہویں ۱۲ر
- کرشن بیتی
- کم ٹوموت
- آپ بیتی
- بیوی کی تعلیم
- اتالیق خطوط نویسی ۱۲ر
- خطوط حسن نظامی ۱۲ر
- جگ بیتی ۶ر
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۰ر
- اردو دعائیں ۱۰ر

مسٹر سلطان حیدر جوش
- ابن مسلم
- نواب فرید

مولوی محمد حسین محوی
- ازواج الانبیا
- انسانی قربانیاں ۸ر

صفدر مرزاپوری
- مرقع ادب
- مشاطۂ سخن

(ملنے کا پتہ: — الناظر بک ایجنسی لکھنؤ)

فہرست کتب

(سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو)

البیرونی کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ
تعریف سے مستغنی ہو دسویں صدی کا فاضل ہو مگر تبحر علمی
اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا
ہو ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفہ، تاریخ
اور مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی البیرونی
اس کے حالاتِ زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہو عہ

فلسفۂ اجتماع تالیف ہو اور اس کا موضوع نفس اجتماعی
جماعت کے لئے اعمال و قوائے دماغی کے تحلیل و تشریح
ہو موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور
فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ اس پر انگلستان و ہند کے
علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔ عہ

قاعدہ و کلید قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد
اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہو۔ ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی
نے اپنے صوبہ کے گورنر سے تحریک کی ہو کہ اس قاعدہ
کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ جن اصول اور طریقہ پر
اس کی تعلیم ہونی چاہیئے اُن کی تشریح کے لئے ایک
کلید بھی تیار کی ہو۔ قاعدہ ۲ر کلید قاعدہ ۴ر

دریائے لطافت ہندوستان کے مشہور سخن سنج
میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہو اُردو صرف و نحو اور محاورات
و الفاظ کی پہلی کتاب ہو اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب
و غریب نکات درج ہیں۔ قیمت عہ

طبقات الارض۔ اس فن کی پہلی کتاب ہو تین سو
صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند ہیں انگریزی اور اُردو
داں دونوں کے لیئے یکساں طور پر مفید ہو۔ کتاب کے
آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست
بھی منسلک کر دی گئی ہو۔ قیمت عہ

مشاہیر یونان و روم۔ پلوٹارک لائوز کا ترجمہ ہو سیرت
نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے

آج تک مُسلّم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادبیاتِ عالم بلکہ فلسفیت کی نے
اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔ وطن پرستی و بےنفسی عزم
و جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ لبریز ہے۔
ہماری قوم کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں اس کا ایک نسخہ
ضرور ہونا چاہیئے دُنیا کی تمام مہذب زبانوں میں اس کا
ترجمہ ہو چکا ہے۔ جلد اوّل غیر مجلد ۱۲ جلد دوم مجلد ۱۲ر

اسباق نحو دو حصے ملک کے ادیب کامل مولانا
مولوی حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف سے
ہیں۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری
مسئلہ درج ہے عربی خواں طلبا کے لئے نادر تحفے ہیں
قیمت فی رسالہ ۴ر

علم المعیشت۔ اسرار تمدن کے سمجھنے کے لئے اس
کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس برنی
صاحب ام اے نے ملک پر بڑا احسان کیا ہے۔
حجم (۲۵۰) صفحے قیمت صرف للعہ ر

تاریخ اخلاق یورپ اصل مصنف لیکی کا نام علم
و تبحر تحقیق و صداقت کا مرادف ہے یہ کتاب کئی ہزار
برس کے تمدن معاشرت اُصول اخلاق مذہب و خیالات
کا مرقع ہے۔ ترجمہ مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے۔
حصہ اول مجلد ہے ر دوم مجلد ہے ر

مبادیِ سائنس فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی
سے اُردو میں ترجمہ کی گئی ہے اس کا بیان سلیس اور مقبول
عام ہے اُردو ترجمہ صرف ایک حصہ کا ہے اور آخر کتاب
میں فرہنگ مصطلحات بھی ہے قیمت ۱۲ ر

تاریخ یونانِ قدیم۔ یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند
کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ
اس کا نقطہ خیال خالصًا ہندی ہے۔ ایف اے کلاس کے
طلبا جو یونانِ قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب
کو انتہا درجے مفید پائینگے۔ مجلد قیمت ۱۲ ر

انتخاب کلام میر۔ میر تقی میر سرتاج شعرائے اُردو کے کلام
کا انتخاب ہے مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی
اُردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور
شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۴ صفحہ
کا ایک مقدمہ بھی ہے۔ قیمت عہ ر

رسالہ نباتات۔ اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے علمی
اصطلاحات سے معرّا۔ سلاست روانی مملو اور دلچسپ
و مفید ہے۔ طلبا رنباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھ
سکیں وہ اسی رسالہ میں مطالعہ کریں۔ قیمت مجلد ۱۲؍

دیباچہ صحت۔ اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً
ہوا، پانی، غذا، لباس وغیرہ پر مبسوط اور دلچسپ بحث
کی گئی ہے زبان عام فہم اور پیرایہ مؤثر و دل پذیر ہے۔
ملک کی بہترین تصنیف ہے۔ اس کا مطالعہ طبیبوں کے
کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔ حجم ۵۰۰ صفحے
مجلد قیمت للعہ؍

قواعد اردو ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان
میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھی گئی بسیط و شرح کے
علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع
نہیں کیا گیا ہے اس کو ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم بمبئی نے
نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہے قیمت ۱۲؍

القول الاظہر ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف
الفوز الاصغر کا اردو ترجمہ ہے۔ ابن مسکویہ آسمان علم و
فضل کا آفتاب تھا یہ کتاب فلسفہ انھیں کے اصول پر
لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھیں اصول کو منطبق کیا گیا
ہے اس کو بمبئی یونیورسٹی نے سرکاری کتب خانوں
کے لئے تجویز کیا ہے قیمت عہ؍

امرائے ہنود بالنو سے زیادہ ہند و امرا کے حالات
قلم بند ہیں۔ یہ امرا سلاطین مغلیہ کے زمانے میں بڑے
بڑے عہدوں پر سرفراز تھے کتاب گویا ان متعصب اور
ناواقف مورخوں کا جواب ہے جو اسلامی حکومت پر تعصب
کا الزام لگاتے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۱۲؍
حصہ دوم ۱۲؍

القمر۔ قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت
اور چاند کے متعلق جتنے جدید انکشافات ہوئے ہیں ان
سب کو جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک
نعمت ہے۔ قیمت ۸؍

تاریخ تمدن۔ سر ٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب
کا ترجمہ ہے الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال
جامعیت سے بحث کی گئی ہے۔ ہر بحث کے لئے ایک دلچسپ

مگر پر زور اصول اختیار کیا گیا ہے اور ہر اصول کی تائید
میں تاریخی انتقاد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعے
معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔
بمبئی میں سرکاری لائبریریوں کے لئے تجویز کی گئی ہے
قیمت حصہ اول غیر مجلد ۱۲/ حصہ دوم مجلد ۶/

مقدمات الطبیعات یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنس
داں حکیم ہکسلے کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس کا نام کتاب کی
کافی ضمانت ہے۔ اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہے
لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے متعلمان سائنس اور عام
شائقین کے لئے بہت مفید ہے۔ قیمت عہ/

فلسفۂ جذبات۔ کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور
نفسی ہے۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر
نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے قیمت ۱۲/

نکات الشعرا یہ اردو شعرا کا تذکرہ میر تقی میر کی تالیفات
سے ہے اس میں میر صاحب کی راے اور زبان کے بعض
بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں مولانا حبیب الرحمن خاں
صاحب شروانی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ
لکھا ہے۔ قیمت ۱۲/

نپولین اعظم ایبٹ کی مستند کتاب کا اردو ترجمہ ہے
کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری
جدوجہد کا آخری باب ہے واقعات کی داد تو سکندر
کی زبان ادا کرسکتی ہے یا تیمور کی زبان ترجمہ سلیس اور
عام فہم ہے مکمل پانچ جلد قیمت ۱۲؍

فلسفۂ تعلیم۔ ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ
تعلیم کی آخری کتاب ہے۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ اور
والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے ترجمے کی زبانی قوانین کو
اسقدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے قیمت ۱۲/

رہنمایان ہند مشہور کتاب پروفٹس آف انڈیا کا ترجمہ ہے شروع
میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش
پیرایہ میں لکھا ہے اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج کی
سوانح اور گوتم بدھ کے پر اثر حالات آتے ہیں آخری حصہ
میں شنکر اچارج رامانج اور رامانند کا ذکر ہے قیمت ۱۲/

آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

اُردو

۱۔ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری اپریل جولائی اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبانِ ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔ حجم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحہ ہوگا۔

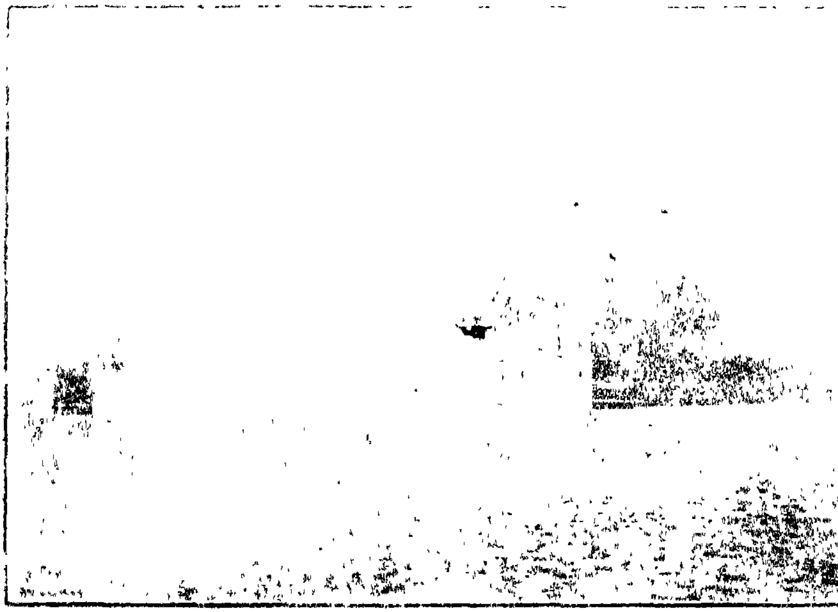
۳۔ قیمت نو روپیے بارہ آنے سالانہ معہ محصول ڈاک و ارکان انجمن ترقی اُردو سے آٹھ روپیے بارہ آنے۔

۴۔ تمام خط و کتابت: آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو ایڈیٹر اُردو اورنگ آباد دکن سے ہونی چاہیے۔

(باہتمام محمد مقتدی خان شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)

جلد دوم　　　　بابت جولائی سنہ ۱۹۲۲ء　　　　حصہ ہفتم

اُردو



انجمنِ ترقیِ اُردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

بنگالی زبان و ادب کا نشو و نما

از

جناب ڈاکٹر دنیش چندر سین صاحب رائے بہادر

(مترا)

ڈاکٹر دنیش چندر سین صاحب بنگال کے اُن نامور اہلِ قلم میں سے ہیں جن پر اہلِ بنگال کو بجا طور پر فخر ہے۔ اِن کی تصانیف کی شہرت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ یورپ اور امریکہ تک پہنچ چکی ہے اور نامور مستشرقین اور علما انھیں بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نومبر ۱۸۶۶ء میں ضلع ڈھاکہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں بگجوری میں پیدا ہوئے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بنگال کے اکثر نامور فرزندوں کا جنم بوم مشرقی بنگال ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شہرت و ناموری انھوں نے مغربی بنگال میں آکر حاصل کی۔ اِن کی ولادت ان کے نانا منشی گوکل کرشن سین وکیل عدالت ڈسٹرکٹ جج کے گھر میں ہوئی۔ منشی صاحب موصوف صاحبِ اثر اور صاحبِ دولت تھے اور اُس علاقہ میں اُن کی بڑی شہرت تھی۔ منشی کا لفظ بھی قابلِ لحاظ ہے۔ یہ بھی مسلمانوں کے تمدن کی یادگار ہے۔ جس طرح ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں لکھے پڑھے قابل اصحاب کے نام کے ساتھ (خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان) استعمال کیا جاتا تھا، اِسی طرح بنگال میں بھی اس کا رواج تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے بزرگ قنوج کے رہنے والے تھے اور ۹۴۲ء میں راجہ ادی سور کی دعوت پر بنگال میں آکر آباد ہوئے۔ آپ کے ایک بزرگ دھوی نام مشہور شاعر گزرے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے والد ایشور چندر سین برہمو سماجی تھے اور مدرسہ میں مدرس تھے۔ اور انگریزی سنسکرت، فارسی اور بنگالی زبان کے اچھے خاصے عالم تھے۔ یہ اپنے ماں باپ کے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کے گیارہ بیٹیاں ہوئیں مگر زندگی کا پھل بیٹا نصیب نہ ہوا۔ بیچاری ماں نے کیسی کیسی منتیں مانیں کیا کیا دعائیں کیں تب کہیں جا کر سوتے نصیب جاگے اور بیٹا پیدا ہوا۔ ایسے بیٹے کی پرورش میں جیسے کچھ لاڈ پیار اور چاؤ چوچلے ہوئے ہوں سو کم ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے والد بھی شعر کہتے تھے اور اُنھوں نے بنگالی زبان میں بعض دعائیں اور روحانی گیت لکھے ہیں۔ لیکن قدیم بنگالی شاعری کا ذوق اُن کے دل میں اُن کی بیوہ بڑی بہن نے پیدا کیا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ تین سال کا بچہ جسے اُس کی بہن پُرانے قصے اور گیت اور رامائن کی نظمیں اور وشنوی شعرا کے بھجن پڑھ پڑھ کر سنا رہی ہے، ایک دن بنگالی زبان کا نامور مورخ ہوگا۔ اور اپنی عزیز زبان کی از یاد رفتہ پرانی نظموں کو پھر زندہ کریگا۔ اِس کے بعد اُن کے مہربان اُستاد پورنا چندر سین نے اس ذوق کو اور پختہ کر دیا اور ان کی بدولت اس خوش نصیب لڑکے نے [illegible] قدیم بنگالی شعرا کا کلام پڑھا جن کا اثر عمر بھر رہا۔

۱۸۸۶ء میں جب کہ وہ ڈھاکہ کالج میں بی اے کی درجہ میں تعلیم پا رہے تھے ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ دو ہی مہینے بعد ان کی ماں بھی اس جہانِ ناپائدار سے رحلت کر گئیں۔ یہ سال ان کے لیے بہت ہی منحوس ثابت ہوا۔ اِن کی دو جوان بہنوں کا یکایک انتقال ہوگیا۔ خود اُن پر فالج گرا اور ان کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ رفتہ رفتہ وہ پھر تندرست ہوگئے اور سلہٹ کی ایک تحصیل ہبی گنج میں مدرسی کی خدمت پر تقرر ہوگیا۔ یہاں اُنھوں نے انگریزی شعرا کے کلام کا خوب مطالعہ کیا۔

۱۸۸۹ء میں اُنھوں نے بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور کومِلّا (ضلع ٹپرا) کے وکٹوریا اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوگئے جہاں وہ اسی خدمت پر ۱۸۹۶ء تک رہے۔ اِس زمانہ میں اُنھوں نے اپنی فرصت کا وقت بنگال کے قدیم شعرا کے بھولے بسرے کلام اور قلمی نسخوں کو جمع کرنے اور ترتیب دینے میں صرف کیا۔ اور بنگالی زبان و ادب کی تاریخ کا سامان اُنھوں نے ایک معتد

طالب علم اور پُرجوش اور سچے عالم کی طرح مہیا کرنا شروع کیا۔ اس کام میں انھیں اس قدر انہماک تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے میں دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعصاب کی کمزوری سے اُن کی صحت خراب ہو گئی۔ لیکن باوجود صحت کی خرابی کے اُنھوں نے بنگالی شعرا کے کلام کا سلسلہ مرتب کر ڈالا۔ لارڈ کرزن نے مسٹر سین کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا اور اُن کو لیے سرکار سے ایک وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ وظیفہ اگرچہ کم تھا مگر علم کے ایک ایسے خدمت گزار کے لیے جو محنت سے چور اور صحت سے مجبور ہو گیا تھا نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ لیکن اب زمانے نے پلٹا کھایا۔ ان کی کتابوں کی رفتہ رفتہ شہرت ہوئی اور اچھے اچھے لوگ مصنف کی قدر کرنے لگے۔ ان کی بعض بنگالی کتابیں مدارس کے نصابِ تعلیم میں بھی داخل ہو گئیں جس سے انھیں مالی فائدہ بھی ہوا۔ سر آسوتوش مکرجی وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی کی عنایت سے سنہ ۱۹۰۹ء میں انھیں یونیورسٹی میں ایک مناسب خدمت مل گئی یعنی وہ بنگالی ادب کے "ریڈر" ہو گئے۔ اس خدمت پر آکر اُنھوں نے لکچروں کا ایک سلسلہ دیا اور انھی لکچروں سے "بنگالی زبان و ادب کی تاریخ" مرتب کی۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں وہ اپنی یونیورسٹی کے فیلو منتخب ہوئے اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ایسوشی ایٹ ممبر انتخاب کئے گئے اسی سال کلکتہ یونیورسٹی نے ہز رائل ہائی نس پرنس آف ویلز کی تقریب تشریف آوری پر "ڈاکٹر آف لٹریچر" کا خطاب دیا۔ اور گورنمنٹ نے "رائے بہادر" کا خطاب عطا فرمایا (رائے صاحب یہ بہت پہلے سے تھے)۔ ندیا کی علمی انجمن بدھیا جنانی سبھا نے (ندیا سنسکرت علوم کا مرکز ہے) چند سال ہوئے "کوی شکھار" یعنی ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا اور حال میں "بھارت دھرم مہا منڈل" نے "پرتن تتوا بھوسن" کا خطاب دیا۔ ڈاکٹر صاحب درحقیقت ان تمام خطابات کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر دنیش چندر سین نے اپنی تصنیفات و تالیفات اور خاص کر "بنگالی زبان و ادب کی تاریخ" سے بنگالی زبان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ کارنامہ ان کا ایسے اعلیٰ درجہ کا ہے کہ ہندوستان کی کسی زبان میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کی تاریخ پر یورپ کے نامور مستشرقین اور علما و فضلا نے ایسی بیش قدر اور اعلیٰ درجہ کی رائیں لکھی ہیں کہ جو شخص اس کتاب کی قدر و قیمت اور مصنف کی

بے نظیر قابلیت اور حیرت انگیز تلاش وجستجو سے واقف ہو وہ ان رائوں کو انتہا درجہ کا مبالغہ خیال کریگا - ڈاکٹر سلون لیوی جیسا فاضل متبحر اور دوسرے فضلا جن کی علمیت وفضیلت کو دنیا تسلیم کر چکی ہے اس کتاب کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور انھوں نے جو رائیں لکھی ہیں وہ ان کے خیالات کا آئینہ ہیں - افسوس ہے کہ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ان کا مختصر سا اقتباس بھی درج کیا جا سکے - اس کے علاوہ یورپ و امریکہ کے سینکڑوں علمی رسالوں نے اس کتاب کی مدح وستایش میں مفصل تحریریں لکھی ہیں - اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو اچھی خاصی کتاب بن جائے -

اس تاریخ زبان کے علاوہ انھوں نے نہایت قابل قدر کام یہ کیا ہے کہ قدیم بنگالی ادب میں سے موزونیت کے لحاظ سے انتخابات جمع کیے ہیں - یہ کتاب خاصی بڑی تقطیع پر دو ہزار صفحہ کی ہے - اس پر انھوں نے سو صفحہ کا ایک بسیط مقدمہ لکھا ہے - اس کے سوا بنگالی رامائنوں پر دوسو پچاس صفحہ کی کتاب لکھی ہے جس پر سر جارج گریرسن نے جو ہندوستان کی زبانوں کے بہت بڑے محقق اور عالم ہیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ میں بہت بڑا ریویو لکھا ہے اور اس محققانہ کتاب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں - ساڑھے تین سو صفحے کی ایک اور کتاب بنگال کے ان گیتوں پر ہے جو عوام میں مشہور ہیں - اسی طرح تین سو صفحہ کی ایک کتاب وشنوی بنگالی ادب پر لکھی ہے - ان کتابوں کی بھی بے حد تعریف کی گئی ہے - غرض اس قسم کی دس کتابیں ان کی قلم سے انگریزی میں شائع ہوئی ہیں اور ہر کتاب اپنی نظیر آپ ہے - علاوہ ان کتابوں کے جو انگریزی میں ہیں تیس کتابیں بنگالی زبان میں تصنیف و تالیف کی ہیں - ان سے ڈاکٹر صاحب کی علمی قابلیت اور فضیلت اور ان کی محنت اور عالمانہ تحقیق اور ان کے علمی ذوق وشوق کا اندازہ ہو سکتا ہے -

یہ مضمون "بنگالی زبان وادب" پر جو اس کے بعد شائع کیا جاتا ہے اسی فاضل ڈاکٹر کا لکھا ہوا ہے - جو ہماری درخواست پر انھوں نے تحریر فرمایا ہے - مضمون وصول ہونے پر بعض دیگر امور کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی گئی کہ ان پر بھی وہ کچھ تحریر فرما کر مضمون میں شامل کر دیں -

چونکہ مضمون لکھا جا چکا تھا۔ اور اس میں دوسرے امور کے شامل کرنے سے مضمون کے تسلسل اور روانی میں فرق آتا تھا لہذا ان پر الگ اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تاکہ بطور حواشی کے اصل مضمون کے ساتھ شائع کر دیئے جائیں۔ اس مختصر مگر فاضلانہ مضمون کے پڑھنے سے اُردو داں طبقہ کو معلوم ہوگا کہ بنگالی زبان نے رفتہ رفتہ کیونکر ترقی کی۔ اور اب کس درجہ پر ہے۔ اور مُلک کی زبانوں میں اُس کی کیا حیثیت ہے۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کی ایک آدھ زبان بنگالی کی ہمسری کا دعویٰ کرے مگر بنگالی کو جو بات اس وقت نصیب ہے وہ کسی دوسری زبان کو نہیں۔ بنگال نے چند ایسے عالی دماغ اور عالی خیال فرزند پیدا کئے ہیں کہ اُن کے کلام کو قبول عام حاصل ہے اور اہل عالم اُن کے ترجمے سر آنکھوں پر رکھتے ہیں اور حرز جاں اور وردِ زباں کرتے ہیں۔ یہی لوگ زبان کے بنانے والے اور اُس کی وقعت بڑھانے والے ہیں۔ دوسری زبانیں پہلے ایسے سپوت پیدا کرلیں پھر ہمسری کا دعویٰ کریں۔

(اڈیٹر)

۱۔ قدیم بنگالی علم ادب نویں صدی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک

ہمارے پاس قدیم بنگالی شاعری کا ایک عجیب و غریب ذخیرہ موجود ہے جس کا نویں صدی عیسوی سے آغاز ہوتا ہے۔ ہماری ترقی پذیر تہذیب کی طرح اس علم ادب کے بھی مختلف دور ہیں اور ہر دور اُن قوتوں کا پتہ دیتا ہے جن سے ہماری قومی زندگی بنی اور اُس نے تدریجی نشو و نما حاصل کی۔ چنانچہ پہلا دور یا پہلی منزل یہ نشان دیتی ہے کہ ضبط نفس و ترک دنیا جو بُدھ مت کے اُصولِ متعارفہ ہیں اُس علم ادب کے وسیع حصے پر چھائے ہوئے تھے۔ جسے عام طور پر ناتھ کی پوجا کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ دوسری منزل میں یہ تماشا نظر آتا ہے کہ ایک طرف تو تبت و برما۔ آہم ٹیرا۔ اور دوسری قوموں اور دیسوں کے دیوتا اور دیبیاں جدّوجہد کر رہے ہیں کہ ہندو دیوتاؤں میں داخل ہو جائیں اور دوسری طرف وہ لوگ جو برہمنی مت کے احیا کے باعث ہوئے اس جد و جہد کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ پھر تیسرا

دَور آتا ہی جس میں اسلام کا اثر صاف صاف دکھائی دیتا ہی کہ کس طرح خدائے واحد (مجسم) کے عقیدہ کی ترقی ہوئی درآں حالے کہ یہ عقیدہ "ہمہ اوست" کے عام میلان کے بالکل خلاف تھا جس پر زمانۂ بعد میں اس عقیدہ کو عامۃ الناس ان نازک ذہنی تصوّرات کے ہم معنی اور مرادف سمجھنے لگے تھے جس سے عقیدہ میں وسواس پیدا ہونے لگتا ہی اور آدمی متشکک سا ہو جاتا ہی۔

ہمارے علم ادب کا سب سے ممتاز دَور جو تھا ہی جس کا آغاز وشنویوں سے ہوتا ہی جنھوں نے سولھویں صدی عیسوی میں اسلام کے اثر سے متاثر ہو کر سوسائٹی کے شیرازہ کو اتحاد و اُخوّت عامّہ کے اُصول پر دوبارہ درست کیا۔ وشنویوں[۱] کے ادب میں فطرتِ انسانی کی نزاکت، اِس کی حُسن کی لطافت اور نفاست کی تصویر اس خوبی سے کھینچی گئی ہی کہ معلوم ہوتا ہی کہ اس سے بلند تر پایہ کمال کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہی۔ یوُرپ کی ایک بڑی عالمہ اور مُصنفہ مس مارگریٹ نوبل کے قلم سے بھی ایک دفعہ یہ جملہ نکل گیا کہ "بنگال کے وشنویوں نے جذباتِ لطیف اور نازک خیالیوں کے سرچشموں کو خشک کر دیا ہی" اس زمانہ میں بھی سر رابندر ناتھ ٹگور نے اِسی وشنوی چمن سے گل چینی کی ہی۔ وشنویوں کے آخری متبعین کے ہم عصر شاکت[۲] تھے جنھوں نے اپنے مذہبی اُصولوں کی تفسیر و توضیح اور اپنی نظموں اور گیتوں کے ذریعہ سے ہماری زبان کی ترقی کے میدان میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

یہ تمام علم ادب جیسا کہ اس گزشتہ زمانے میں تمام عالم کا تقاضا تھا، کم و بیش مذہبی رنگ سے رنگا ہوُا تھا۔ بنگال میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ہندؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے بھی علم ادب کی ترقی میں ساتھ دیا۔ اس زمانہ میں ان دونوں قوموں میں باہمی مدارات اور رواداری کے خیالات اس قدر قوی تھے کہ آج کل کی سیاسی معاملات میں حصّہ لینے والوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ بہت سی بنگالی تصنیفیں موجود ہیں جن میں ایسے مُسلمان بزرگوں کے حالات درج ہیں جنھیں ہندو مُسلمان دونوں مقدّس سمجھتے تھے۔

ہمارے قدیم علم ادب میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو فنا نہیں ہوسکتیں اور زمانۂ حال کے معیار و تنقید کی کسوٹی پر بھی کھری اُتریں گی۔ مسٹر کا ول آں جہانی نے جب کہ وہ سولھویں صدی کے ایک مصنف کندرام کی چنڈی کو یا کا ترجمہ کر رہے تھے۔ اِس بنگالی شاعر کا چاسر سے مقابلہ کیا ہی اور اس کی قوتِ بیان کیرکٹر نویسی

---

[۱] وشنو کے پجاری (اڈیٹر) [۲] شکتی یعنی کالی۔ اِس کے پجاری شاکت کہلاتے ہیں (اڈیٹر)

اور باطنی حسنِ شاعری کی مدح سرائی کی ہے۔ مس مارگریٹ نوبل جنھوں نے اٹھارویں صدی عیسوی کے ایک بنگالی شاعر رام پرشاد سین کے کلام پر تنقید لکھی ہے اور اس کی بعض نظموں کا ترجمہ بھی کیا ہے اس شاعر کو ولیم بلیک اور ٹینی سن سے بھی اعلیٰ پایہ خیال کرتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جس زمانہ میں مغربی اقوام اپنی سخت محنت اور اولوالعزمیوں کی بدولت مادّی عروج حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں ہمارے اہلِ ملک ہندو اور مسلمان اپنی ریاضاتِ شاقہ صوم و صلوٰۃ اور شب بیداریوں کے ذریعہ روحانی عقدوں کے حل کرنے میں مصروف تھے۔ یہ دونوں قومیں تہذیب و تمدّن کے دو مختلف راستوں پر گامزن تھیں اور یہی بنیادی فرق ہے جو مشرق و مغرب کے علوم ادب میں بیّن طور پر نمایاں اور واضح نظر آتا ہے۔ اس ہزار برس کی مدّت میں ہماری زبان میں جو کتابیں تصنیف و تالیف ہوئی ہیں اُن میں سے سینکڑوں قدیم کتابیں اب ہمارے ہاتھ لگی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کیا بہ لحاظ تاریخ یا ادب کے اور کیا باغراضِ سائنس کے یہ تصنیفات نہایت وقیع اور بلند پایہ ہیں۔

۲۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے تحتِ اثر بنگالی زبان کی ترقی

۱۸۰۰ء سے جب کہ لارڈ ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی ہمارے علم ادب نے ایک دوسری ہی صورت اختیار کی علمائے یورپ، عہدہ داران سول سروس اور پادریوں نے کیری (Carey)، ہالھڈ (Halhed) اور ولکنس (Wilkins) جیسے اَن تھک لوگوں کی سرگردگی میں ہماری توجہ کو مادّی عالمِ اسباب کی طرف متوجہ کیا اور خود بنگالی زبان سیکھ کر اس میں ادبی تاریخی اور سائنٹیفک (علمی) مضامین پر کتابیں لکھنا شروع کیں۔ نصف صدی تک یہ سرگرمی قائم رہی اور اُن کے جوش اور مستعدی میں کمی نظر نہ آئی اگر آپ بنگالی کتابوں کی وہ فہرست اٹھا کر دیکھیں جو پادری آئی لینگ نے مرتب کی تھی اور جس کی اشاعت ۱۸۵۵ء میں ہوئی تو آپ کو حیرت ہوگی کہ ہمارے یورپین بھائیوں نے بنگالی نثر کے میدان میں مختلف علوم و فنون کے متعلق کس قدر سرگرمی ظاہر کی ہے۔ ان سب لوگوں میں ڈاکٹر کیری سب سے زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں کہ اُنھوں نے سب سے زیادہ اس کام میں دلچسپی ظاہر کی بلکہ درحقیقت اس عظیم الشان کام کے وہی پیشوا نظر آتے ہیں اُنھوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی کہ خود اپنے قلم سے بنگالی میں مستقل کتابیں لکھیں بلکہ اپنے اثر سے بہت سے مشہور بنگالی

اہل قلم کو اپنے نقش قدم پر چلنے کے لیے آمادہ کیا۔ مشہور مصنف مرتن جے، ترکالنکر، فورٹ ولیم کالج کے پروفیسروں میں سے تھے جن کے متعلق مسٹر مارشمین مورخ سری رامپور مشن اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ "مرتن جے علم ادب کا بحر ذخار ہے اور اپنے علمی تجربہ اور صحیح قوت تنقید نیز اپنے جثے اور بھدی ناک و نقشے کے اعتبار سے ہمارے مشہور لغت نویس (ڈاکٹر جانسن) سے بہت مشابہت رکھتا ہے" پھر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "یہ شخص اس زمانہ کے علمائے متبحرین سے ہے" مرتن جے پنڈت نے بنگالی زبان میں ہندو فلسفہ، منطق، تاریخ اور دینی اور ادبی مضامین پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہماری زبان نے فورٹ ولیم کالج کے زمانہ میں اہل یورپ کی سرپرستی میں کہاں تک ترقی کی تھی۔ صرف اجمالاً ان چند بنگالی کتابوں کے نام گنا دینا چاہتا ہوں جو اہل یورپ نے ۱۸۵۵ء تک لکھیں۔ اِس فہرست میں بنگالی مصنفوں کے نام نہ ہونگے۔

پہلی بنگالی گرامر۔ مصنفہ ہالہڈ عہدہ دار سول سروس مطبوعہ ۱۷۷۶ء

ترجمہ قواعد وضوابط سرکاری بزبان بنگالی از مسٹر فاسٹر مطبوعہ ۱۷۹۳ء

پہلی بنگالی لغت:۔ مرتبہ مسٹر فاسٹر عہدہ دار سول سروس مطبوعہ ۱۷۹۹ء

اِس لغت میں اٹھارہ ہزار الفاظ تھے اور قیمت ٭ تھی

بنگالی لغت۔ مؤلفہ ہلر مطبوعہ ۱۸۰۱ء قیمت ٭

بنگالی لغت۔ مؤلفہ ڈاکٹر کیری مطبوعہ ۲۵-۱۸۱۵ء چہار جلد

اِس لغت میں اسّی ہزار الفاظ تھے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی تیس برس کی لگاتار محنت کا یہ ثمرہ تھا۔

لغت۔ مرتبہ ہوٹن۔ یہ تمام ماقبل کی تالیفات سے بڑھ گئی ۱۸۲۵ء میں یہ طبع ہوئی اور ٭ قیمت قرار پائی۔

ریاضی۔ ۱۸۱۷ء مسٹر مے نے اس فن پر ایک رسالہ لکھا جس کا نام "مے گنیتا" رکھا۔ پھر ہاری صاحب نے گنی تنکا (یعنی اعداد ریاضی) لکھی جو ۱۸۱۹ء میں طبع ہوئی۔

اخلاقی افسانے۔ سدگن، برجر، اتہاس (یعنی بہادری اور نکوئی کی کہانیاں) جو سیرامپور کے

ایک یورپین مشنری نے لکھی تھی اور ۱۸۲۹ء میں طبع ہوئی۔ ایساپ فیبل (حکایاتِ لقمان) کا ترجمہ ۱۸۳۴ء میں مسٹر مارشمین نے بنگالی زبان میں کیا اور پادری آئی۔ رابنسن نے ۱۸۵۰ء میں رابنسن کروسو کا ترجمہ کیا۔

جغرافیہ۔ پیرسن صاحب کا بنگالی جغرافیہ مطبوعہ ۱۸۲۵ء۔ جی ہرکلوٹ صاحب کا مکالمہ جغرافیہ پر (بہ زبان بنگالی) مطبوعہ ۱۸۲۴ء۔ اس جغرافیہ میں دوسرے مضامین کے علاوہ کرۂ ارض، نظامِ شمسی، دمدار ستارے، خسوف وکسوف، مدّوجزر، برق، قوس قزح، قطب نما، اور شہابِ ثاقب کے حالات بھی لکھے گئے ہیں۔ پیرسن صاحب کی کتاب "بھوگل پردھنا" (مطبوعہ ۱۸۱۸ء) میں کرۂ ارض کا حال بطور ایک سیّارے کے درج ہے اور اس کی حرکت اور شکل وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے۔ سینڈھی صاحب کا جغرافیہ بزبان بنگالی، اس کتاب میں بہ شکل سوال وجواب فلسطین، ارض یہودا، بنگال کے ۲۳ ضلعے، ان کی مردم شماری۔ تجارت اور انگلستان کا عام جغرافیہ ہے۔ ۱۸۲۲ء میں یہ طبع ہوئی۔

تاریخ (اتی ہاس سمی چائی) مؤلفہ پیرسن صاحب اس کتاب میں آسان بنگالی زبان میں مصر، شام، بابل میڈیا، ایران، یونان، اور روم الکبریٰ کے حالات درج ہیں۔ ۱۸۳۰ء میں طبع ہوئی۔

مارشمین صاحب کی تاریخ بنگالہ (بنگا بھاسر ورابرتّا) کا ترجمہ جسے وینگر صاحب نے انگریزی سے بنگالی میں ترجمہ کیا۔ دانیال چرت (سوانح دانیال علیہ السلام) مؤلفہ مسٹر مارٹن ۱۸۳۶ء۔ محمد چرت (سوانح آں حضرت صلعم) مؤلفہ آئی لانگ صاحب۔

طب:۔ ہراملی (بنگالی علم تشریح) مؤلفہ کیری صاحب۔ صفحات ۹۳۰، مطبوعہ ۱۸۲۰ء

تاریخ طبعی۔ دھنی دہار (نظام صوتی بہ زبان بنگالہ) مؤلفہ بام ڈیس مطبوعہ ۱۸۵۳ء

بنگالی ہجے۔ مؤلفہ اسٹیوابرٹ

کشترا بھاگن بیبارن (نخل بندی بنگالہ) مؤلفہ آئی مارشمین۔ اس کتاب میں چوبیس پرگنہ آسام بہار اور کشمیر کی زراعت پر بحث کی ہے۔ اور ثمر دار درخت۔ نیشکر۔ یورپ کی زراعت، کپاس، نیل ساگو اراروٹ، ریشم، قہوہ، تمباکو، گانجا، آلو، شفتالو، دھان اور ہاتھی چوک وغیرہ کی کاشت کا ذکر دو جلدوں میں کیا گیا ہے۔ ۱۸۳۰-۳۱ء میں طبع ہوئی۔

میک صاحب کی کیمیا، ودّیا (بنگالی کیمسٹری)۔ اس کتاب میں کیمیائی قوتوں مانند حرارت (Calorie)

نور، برق، اشیاء کیمیائی آکسیجن، کلورین، برومین، فاسفورس، کاربن، بورن، سلینیم اور دخانی انجن سے بحث کی گئی ہے۔

۱۸۳۳ء میں ایک انجمن نے جس کا نام "انجمن ترجمۂ علوم یورپ" تھا پروفیسر ولسن، جے سدرلینڈ اور دیگر اہل علم کے نگرانی میں ایک بہت مفید سلسلہ تالیفات شائع کرنا شروع کیا۔ جس کا نام "بنگیا سبا دہی" تھا۔ اس سلسلہ میں ان علوم پر کتابیں تالیف و تصنیف یا ترجمہ کی جاتی تھیں۔ فلسفۂ طبعی، علم ہیئت، علم جرثقیل، میکانکز، علم مناظر و مرایا۔

مکتوب نویسی پر جے پرسن صاحب نے پتر اکومادی لکھی اور اسے ۱۸۵۲ء میں شائع کیا۔ اسی مضمون پر جے لانگ صاحب نے ۱۸۵۴ء میں ایک دوسری کتاب پتر ابلی شائع کی۔

جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا یہ ایک بالکل محدود فہرست ہے اور گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے صرف چند یورپین مصنفوں کی تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان مصنفین کے بعد خود بنگالی مصنفین کی ایک کثیر جماعت بلکہ کہنا چاہیئے کہ فوج کی فوج میدان میں اتر آئی۔ وہ اپنی زبان میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ اس نے اس میدان میں رفتہ رفتہ تمام بیشتر مصنفین کو مات کر دیا۔ ۱۸۰۰ء سے لے کر کچھ کم پچاس برس کی مدت میں ہر مضمون کی سینکڑوں کتابیں خود بنگالی اہل قلم کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ ان کتابوں کی ضخامت خاصی تھی اور حیاتِ نباتی و حیوانی، باغبانی، پیمائش و بند و بست اراضی، جثۂ انسانی (جیسا کہ فطرۃً اسے ہونا چاہیئے) اور دیگر طبعی اور تجربی علوم پر ضخیم ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس تنوع سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بنگالی زبان میں تعلیم، ادب اور سائنس کے تمام شعبوں کے اصطلاحی الفاظ نویں صدی کے ابتدائی پچاس برس کے اندر کافی مقدار میں آگئے تھے، پھر نصف صدی کے آخر سے کچھ کم مدت میں جو ترقی ظہور میں آئی اور جس قدر تیز رفتار رہی اسے دیکھ کر اچنبا ہوتا ہے۔

۱۸۵۰ء کے بعد راجہ راجندر لال مترا اور پادری کے ایم بنرجی نے ادبی، تاریخی اور سائنٹفک مضامین پر متعدد تصنیفات شائع کرکے زبان میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اور گویا اس تحریک کی سرکردگی انھیں کے ہاتھ رہی۔ پھر ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام راجہ رام موہن رائے تھا۔ جو بنگالی برہمو سماج کا بانی بھی ہے۔ یہ سب سے بڑا بنگالی ہی نہ تھا بلکہ اس زمانے میں دنیا کے سب سے بڑے آدمیوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ۱۸۱۵ء سے ۱۸۳۳ء تک اس کے

قلم کی مدد سے بنگالی علمِ ادب کو بڑی ترقی نصیب ہوئی - جو اثر کہ اُن کی تصنیفات کا ہندوستان اور یورپ پر پڑا یہ سمجھنا چاہیئے کہ گویا وہ ایک جذبہ روحِ شاعری تھا جس نے تمام عالم میں شگفتگی پیدا کر دی - جب یہ لندن تشریف لے گئے تو سر جان بورنگ جنھوں نے ان کی خدمت میں انجمن موحدین لندن کی طرف سے ایک استقبالی سپاس نامہ پیش کیا تھا، اِن الفاظ میں اُن کا ذکر کرتے ہیں "بعض اہلِ قلم نے خیال میں یہ تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے کہ اگر اچانک اُن کے درمیان افلاطون - سقراط - ملٹن - یا نیوٹن آ جائے تو ان پر کیا کیفیت طاری ہو گی - مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک شاعر نے جسے صوفی بھی کہا جا سکتا ہے اُن لوگوں کے جذبات کی ایک نہایت لطیف الفاظ میں تصویر کھینچی ہے جنھوں نے کرۂ جنوبی میں پہنچ کر پہلی مرتبہ ستاروں کے اُس دل فریب مجموعے کا نظارہ کیا تھا جو طلائی صلیب کے نام سے موسوم ہے - اور اس نظارے سے جو کیفیت اُن پر گزری قریب قریب اسی قسم کے جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے آپ لوگوں کی جانب سے ہاتھ بڑھایا کہ راجہ رام موہن رائے کو مرحبا کہوں" راجہ صاحب نے اپنشد و دیگر مسائل اصلاح معاشرت اور صرف و نحو پر اپنی سیدھی سادی بنگالی میں جس کی تقلید کرنی ممکن نہیں متعدد کتابیں لکھی ہیں -

اِس زمانہ میں ہمارے بنگالی علما نے جو کتابیں لکھیں اُن پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی - بنگالی قوم کو فیاضِ ازل نے بہت اچھی ادبی قابلیت عطا فرمائی ہے اور اُس زمانہ کے مصنفین میں سے پنڈت ترن چرن لوچن - پرماتھ سرما - اور رام رام باسو نے بعض ادبی جواہرات یادگار چھوڑے ہیں - آخر الذکر مصنف کے متعلق یورپ کا ایک نقادِ سخن بیان کرتا ہے کہ اس شخص کی تحریر گویا "ایک قسم کی پچے کاری ہے جس میں فارسی کو بنگالی کے ساتھ وصل دیا گیا ہے" دوسرے دس سال میں پیارے چند متر نے جو ٹیک چند ٹھاکر کے فرضی نام سے مشہور ہے اپنی شہرۂ آفاق کتاب لالر گھرٹر دلال (لاڈ پیار کا بگاڑا لڑکا) تصنیف کی - ۱۸۵۶ء میں یہ طبع ہوئی - مسٹر جی - ڈی - آسول (Oswell) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جن کی رائے میں اس مصنف کو وہی رتبہ حاصل ہے جو انگریزی علم ادب میں تھیکرے (Thackery) کا تھا - ایک اور انگریز کہتا ہے کہ یہ شخص بنگالہ کا مولیر (Moliere) ہے اور ایک تیسرا بیان کرتا ہے کہ اس مصنف کو فیلڈنگ سے تشبیہ دی جائے تو بجا ہے -

دورِ جدید

بنگالی علمِ ادب کی قلمرو پر ربع صدی تک بنکم چندر کی فرماں روائی رہی۔ اور جب اُن کی وفات ۱۸۹۳ء میں واقع ہوئی تو پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر اور بابو اکشی کمار دت کا دور دورہ آیا۔ بنگالی ادب کے یہ دونوں آفتاب ماہتاب تھے۔ لیکن مملکتِ سخن کے بادشاہ یعنی سر رابندرا ناتھ کی منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہونے کے قبل تک ہمارے ملک میں مادھو سدن دت، ہیم چندر بنرجی اور نوبن چندر سین سرآمدِ شعرائے زمانہ سمجھے جاتے تھے۔

بنکم چندر کے تقریباً تمام ناولوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں مشہور انگریزوں کے قلم سے ہو چکا ہے ان انگریزوں میں سب سے زیادہ مشہور فلپس (Phillips) اور ڈاکٹر اینڈرسن (Anderson) ہیں جو دونوں عہدہ دار سول سروس تھے۔ مسٹر آر سی دت آنجہانی نے بھی جو خود عہدہ دار سول سروس تھے علمِ ادب کے شعبہ افسانہ نیز علوم ویدک پر بنگالی زبان میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

ہماری زبان کا علمِ ادب اب اس درجہ تک پہنچ گیا ہے اور قدیم و جدید علوم پر اس قدر کافی مواد موجود ہے کہ ہمارے پاس کالج کی تعلیم اور اس کے بعد علمی تحقیقات کے لئے پورا سامان مہیا ہو سکتا ہے۔ ہماری زبان میں بہت سی ایسی تاریخی کتب لکھی جا چکی ہیں جو یہی نہیں کہ زمانہ حال کی جدید ترین اُصول پر لکھی گئی ہیں بلکہ جہاں تک تاریخ ہندوستان سے تعلق ہے بعض ایسے مضامین کے لحاظ سے جن پر ابھی تک کسی نے قلم نہیں اُٹھایا ہے یہ تصنیفات اہل یورپ کی لکھی ہوئی تاریخوں سے بھی فائق نظر آتی ہیں۔

ناگندرا ناتھ باسو کی لغت علوم (یعنی انسائی کلوپیڈیا) جس کا نام "وشوا کوش" ہے ایسے مضامین سے معمور ہے جو نوعیت کے لحاظ سے جدید اور قدر و منزلت کے لحاظ سے نہایت بیش بہا سمجھے جاتے ہیں۔ یہ کتاب ضخامت میں ویبسٹر ڈکشنری کی آٹھ جلدوں کے برابر ہے (قیمت ۳۰۰) - اب اس کتاب کا ترجمہ ہندی زبان میں کیا جا رہا ہے۔ بابو رکشے کمار متر سی آئی ای - بابو نکھل ناتھ رائے - رام پرشاد چند - راکھل داس بنرجی اور رام پرتاب گپتا نے بھی بنگالی تاریخ کے میدان میں بہت کچھ نئی تحقیقات کی ہے اور چاٹگاؤں کے مولوی عبدالکریم صاحب نے قدیم بنگالی کے قلمی نسخوں کی تحقیق و تدقیق میں قابلِ تعریف خدمات انجام دی ہیں۔ مسٹر جے ایم سین گپتا کی حال کی تصنیف "ارت ابم اہی تا گی"

فنونِ لطیفہ کے متعلق ایک نہایت قابل قدر کتاب ہے جس میں علم ادب و فنونِ لطیفہ کے اعلیٰ مفہوم پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب اپنی خوبیوں کے لحاظ سے ہر بنگالی کے لیئے مایۂ ناز ہے۔ (قیمت ۵؎)

اِس سے قبل بابو اکشئے کمار دت علمی (سائنٹیفک) تصنیفات میں درجۂ کمال رکھتے تھے۔ ایک رسالہ کے وہ اڈیٹر تھے جس کا نام تالتوابودھنی پتریکا تھا جس میں سر رابندر ناتھ ٹگور کے والد ماجد مہارشی دیوندر ناتھ ٹگور بھی اکثر سائنٹفک (علمی) مضامین لکھا کرتے تھے۔ دیگر خصوصیات کے لحاظ سے یہ رسالہ بہت کچھ اڈیسن (Addison) کے اسپکٹیٹر (Spectator) اور جانسن (Jhonson) کے ریمبلر (Rambler) کے نقشِ قدم پر تھا۔

سر جے سی بوس اور سر پی سی رائے اب اپنی نئی تحقیقاتوں سے بنگالی زبان کے علم ادب کو ترقی دے رہے ہیں جو بنگالہ کے سائنٹیفک لٹریچر کے لیئے آئندہ کے واسطے بہت اُمید افزا ہے۔ مطبع میٹرا پولیٹین (Metro-politon) سے سائنس کے پرائمرز (ابتدائی کتابیں) ہر روز ایک تعداد کثیر میں طبع ہوکر شائع ہوتی رہتی ہیں رامندر اسندر تریویدی آنجہانی اور بابو جگدانند رائے نے متعدد مشہور سائنس کے رسالے تصنیف کیئے ہیں جو صفائی بیان اور جدید ترین معلومات کے لحاظ سے بہت مقبول ہوئی ہیں۔ جب کسی مصنف نے واقعی طور پر بنگالی زبان میں کوئی سائنس کی کتاب لکھنے کے لیئے قلم اُٹھایا تو مجھے خیال نہیں کہ کبھی اصطلاحی الفاظ کی کمی کی شکایت اِس کی زبان پر آئی ہو۔

لیکن جس چیز کی سب سے زیادہ دقّت ہم اہلِ بنگالہ محسوس کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں سائنٹیفک (علمی) ماحول کا فقدان ہے۔ سر پی سی رائے اور بعض دیگر اصحاب اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن جب تک خود ہمارے لوگ بچشمِ خود تمام کلوں کو نہیں دیکھینگے اور اُن کے عمل کے متعلق براہِ راست علم حاصل نہ کرینگے اس وقت تک ہماری معلومات میں وسعت نہیں ہو سکتی۔ ہمارا علم صرف کتابوں کے دائرہ کے اندر محدود رہیگا۔ لیکن سر آشتوش مکرجی کی مخلصانہ مساعی کا بے حد شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنھوں نے بعض مشہور ابنائے وطن کی فیاضی سے ایک سائنس کالج کی بنیاد ڈالی ہے جو کلکتہ یونی ورسٹی سے متعلق رکھا گیا ہے۔ اس کالج میں گریجوئیٹ

۱؎ فاضل مصنف نے یہاں سائنس کی تعلیم اور مشینوں کے علم کو خلط ملط کر دیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ مشینوں کا تعلق حرفت و صنعت سے ہے۔ اڈیٹر

ہونے کے بعد جو لوگ آگے علمی تحقیقات کرنا چاہیں اُن کے لیے بہت سا سامان مہیا کر دیا گیا ہے اور جو کام یہاں ہو رہا ہے وہ بہت قابلِ ستایش ہے۔ اُس کی نگرانی اور انتظام بالکلیہ سر پی سی رائے کے ہاتھ میں ہے جن کے بعض شاگردوں نے یورپ میں بھی شہرت حاصل کی ہے اور جہاں تک علوم کیمیا کا تعلق ہے اُن کی تحقیقات کے نتائج کا اکثر بنگالی زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔

میرے امکان سے خارج ہے کہ اس موقع پر ان عظیم الشان ادبی سرگرمیوں کا عشرِ عشیر بھی بیان کر سکوں جو ہماری زبان کی ترقی میں نظر آتی ہیں۔ کتابیں مطبعوں سے اس کثرت سے نکلتی چلی آ رہی ہیں جیسے برسات میں حشرات الارض اور جو سیاسی ریولیشن ہماری ہمارے ملک میں تقریباً دس سال سے رونما ہے اس نے علم ادب کے ایک ایسے شعبہ کو ترقی دی ہے جو علاوہ اپنی اندرونی خوبیوں کے مختلف النوع بھی ہے اور زبان جو اظہارِ خیالات کے لیے آلہ کا کام دیتی ہے درجۂ کمال کی طرف اس قدر تیزی سے قدم بڑھا رہی ہے کہ بعض ایسی کتابیں جو چند سال پیشتر اپنی لطافتِ بیان سے اہتزازِ روح کا باعث ہوا کرتی تھیں اب سکۂ رائج الوقت نہیں سمجھی جاتیں۔ بابو سرت چندر بنرجی کے بعض ناول اس قدر اعلیٰ پایہ کے ہیں کہ دنیا کے موجودہ افسانہ نگاروں کے بہتر سے بہتر تصنیف سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ضمناً یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بابو صاحب موصوف کو گزشتہ سال اپنی تصانیف کی فروخت سے اُنیس ہزار روپیہ کی آمدنی ہوئی حالانکہ اُن کی کتابیں مدرسوں اور کالجوں میں نہیں پڑھائی جاتیں۔ اُن سے ادنیٰ درجہ پر اور بے شمار مصنف ہیں جنہیں وہّابِ ازل کی بارگاہ سے بہت کچھ صحیح مذاق نظم و نثر کا عطا ہوا ہے۔ غرض کہ ہمارے علم ادب کے ہر شعبہ میں ایک ایسی زندگی اور سرگرمی کے آثار نظر آتے ہیں کہ معمولی چند روزہ مسافر بھی اُن سے متعجب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۳۔ ترقیاتِ زمانۂ حال

سر آشوتوش مکرجی نے حال ہی میں اس طرف توجہ کی ہے اور ہندوستانی زبانوں کو ایم۔ اے کے امتحانوں میں داخل کیا ہے۔ ذیل میں اس نصابِ تعلیم کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے جو ہماری یونیورسٹی نے بی اے کے بعد والے درجہ کے لیے مقرر کیا ہے۔ ہر اُمیدوار کو ایک زبان بطور مضمون خاص کے لینی لازمی ہے۔ اِس کے علاوہ اور زبانیں ذیلی

ہیں جن میں سے ایک لینی ضروری ہے۔ ان زبانوں کے نام یہ ہیں۔ بنگلہ، ہندی، اُردو، اوڑیا، گجراتی، میتھلی، ملایالم، مرہٹی، تلنگی، کنڑی، تامل، سنہالی، آسامی اور کنٹری۔ علاوہ بریں ہر طالب علم کو پالی، فارسی اور پراکرت میں سے جو نئی زبانوں کے ماخذ ہیں دو زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ نیز اُس پر لازم ہوگا کہ اُصول السنہ کے مطابق ہند کی آریائی زبانوں پر ایک مضمون تیار کرے نیز اس کے مطالعہ کا ایک موضوع یہ بھی قرار دے کہ وہ اُن اثرات پر بحث کرے جو مغربی علم ادب سے اُس کی خاص زبان پر پڑے ہیں۔

اِس خاص زبان کے متعلق ایم اے کے طالب علم کو تاریخ ادب اور کتبہائے نصاب قدیم و جدید مع اُصولِ صرف و نحو و عروض، المختصر ہر شے کا جو اس سے متعلق ہو اچھی طرح مطالعہ کرنا ہوگا۔ دوسری زبانیں جو بطور ذیلی یا اُصولی زبان کے مطالعہ کی جائینگی ان کا صرف ابتدائی علم کافی سمجھا جائیگا۔ دو سال ہوئے کہ حسب ذیل انتظامات تمام صوبہ جات مختلفہ کی زبانوں کے علم ادب سے نصابی انتخابات تیار کرنے کے لئے کئے گئے تھے۔

مرہٹی۔ پروفیسر ڈی۔ آر۔ بھنڈارکر ایم۔ اے (جنھیں عنقریب پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملنے والی ہے) جو قدیم ہندوستانی تاریخ و تمدن کے کارمائیکل پروفیسر ہیں۔

پراکرت:۔ ڈاکٹر پی ڈی گون۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی زیر ہدایت سر رام کرشن بھنڈارکر ایم اے کی سی آئی ای۔

آسامی:۔ جناب ہیم چندر گوسوامی مصنف "ہیما کوش" لغت زبان آسامی۔

اُردو:۔ آنریبل ڈاکٹر عبداللہ سہروردی ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔

پالی:۔ مہا مہو پدھیا ڈاکٹر ستیش چندر ودیا بھوشن ایم اے پی ایچ ڈی اور ڈاکٹر بنی مادہب برنا ایم اے ڈاکٹر آف لٹریچر (لندن)۔

اوڑیا:۔ مسٹر پی سی موجمدار بی اے۔

گجراتی:۔ پروفیسر آئی جے ایس تاراپور والا بی اے۔ پی ایچ ڈی (لندن) اور پروفیسر ڈھروا ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔

ہندی:۔ لالہ سیتا رام بی اے۔

چونکہ مذکورہ بالا زبانوں میں سے بعض کے انتخابات ہمارے پاس موجود ہیں اور نیز علمی پروفیسریاں قایم کرنے کے لیئے باہر سے سرمایہ بھی وافی آگیا ہے اس لیئے اب ہم نے علاوہ بنگلہ کے "خاص زبانوں" کی فہرست میں تین زبانیں اور داخل کر دی ہیں یعنی میتھلی - ہندی اور اوڑیا - تیرہ ذیلی زبانوں میں سے ہر ایک کے لیئے سو روپے ماہانہ کا ایک وظیفہ مقرر ہے جو دو سال تک ملیگا - یہ ایک ایسی کوشش ہے کہ شاید ہر ایک زبان کے لیئے کوئی نہ کوئی طالب علم ہر سال مل ہی جائیگا -

سر آشوتوش کا خیال ہے کہ دس برس کی مدت میں کم سے کم دو سو بنگالی ایسے تیار ہو سکینگے جنھیں ہندوستان کی مختلف زبانوں کا خاصا علم حاصل ہو جائیگا - تحقیقات تاریخی کے نقطۂ نظر سے یہ بہت بڑا کام ہوگا اس لیئے کہ اہل ہند کی تاریخ کا جس قدر سرمایہ ہے وہ سب ہندوستانی زبانوں کے خزانہ میں مدفون پڑا ہے اور مستشرقین نے ابھی تک اسے کھود کر باہر نکالنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی - جیسے جیسے ہندوستانی زبانوں سے ہمیں واقفیت زیادہ ہوتی جائیگی ہمیں اس قسم کے موقعے ملتے جائینگے کہ تاریخ ہند کے ایسے واقعات جو ابھی تک کسی کے علم میں نہیں ہیں صفحہ قرطاس پر لائیں اور تاریخ ہندوستان کی عمارت کو جدید بنیادوں پر قائم کریں - سر آشوتوش نے اس وقت تک چار عالموں کو اِس تحقیقات کے کام پر مقرر کیا ہے یہ سب ہندی زبانوں کے ایم اے ہیں مقصود یہ ہے کہ وہ دیسی زبان کے علم ادب کا کامل مطالعہ کرکے تاریخ ہندوستان کے غیر معلوم واقعات کو معلوم کریں اِن میں سے بعض نے اپنی تحقیقات کے جو نتایج پیش کیئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ جو توقع اُن کی ذات سے وابستہ تھی اس سے زیادہ اُنھوں نے کام کر دکھلایا ہے - اس کام کا جو نتیجہ ہوگا وہ گویا ہمارے سامنے تمام اقوامِ ہند کے اتحاد کی مجسّم تصویر ہوگا - اِس تصویر میں ہندو مسلمانوں کا اتحاد سب سے زیادہ نظر آئیگا اس لیئے کہ قدیم ملکی علم ادب کے مُطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں قوموں میں یگانگتِ خیال - اتحادِ مقاصد و اشتراک تمنا اس حد تک موجود ہے کہ بلا خیالِ تردید یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک متحدہ ہندوستان کی ہَوا میں زندگی بسر کر رہے ہیں -

کلکتہ یونیورسٹی کے سینٹ نے یہ رزولیوشن بھی منظور کر لیا ہے کہ مدارس میں میٹرکولیشن تک کی تعلیم ملکی زبان کی وساطت سے دی جایا کرے - مگر انگریزی بھی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے برابر پڑھائی جایا کریگی -

اُمید ہے کہ ہز اکسلنسی گورنر جو چانسلر ہیں اس رزولیوشن کو منظور فرمائینگے جس وقت کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی تمام سفارشوں پر عمل ہو جائیگا اور اُمید ہے کہ بہت جلد ایسا ہونے والا ہے تو کالج کی تعلیم بھی ہماری زبان ہی میں دی جایا کریگی - ہم نے اتنا تو کر دیا ہے کہ منطق کا ایک رسالہ جو بنگلہ میں لکھا گیا ہے ایف اے نصاب میں داخل ہو گیا ہے اور تاریخ کی حد تک بھی یہ رعایت رکھی گئی ہے اگر طالب علم چاہے تو بنگلہ میں تاریخ کی کتابیں موجود ہیں انھیں پڑھ کر امتحان کی تیاری کرسکتا ہے اپنی زبان میں انشاپردازی یہ ایک ایسا مضمون ہے جو ۱۹۱۹ء سے یونیورسٹی کے امتحانات بی اے - ایف اے اور میٹرک میں برابر لازمی چلا آرہا ہے - اب ہمارے لیئے جو کوشش کرنے کی چیز ہے وہ یہ ہے کہ تمام مضامین کی تعلیم ملکی زبان ہی کے واسطے سے دی جائے - اِس جدید روش کو اختیار کرنے کے لیئے راستہ اب بالکل صاف نظر آتا ہے -

بنگال میں لوگ خواہ مرد ہوں یا عورت تعلیم میں اس قدر ترقی کر چکے ہیں اور کم سے کم متوسط طبقے میں یہاں وہ حالت کہیں نہیں جیسی کہ میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اپنی کنوکیشن Convocation کی تقریر میں اہل ہند کی نسبت بیان کی تھی کہ اس ملک میں ایک ہی گھر کے لوگوں میں ایک شخص تو اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ ہے اور دوسرا شخص جاہل اور کندۂ ناتراش - بنگالے میں اس قسم کا تباین کہیں نظر نہیں آتا - یہاں صحیح معلومات کی اشاعت پُرمغز کتابوں اور پریڈوں کی مدد سے نہیں ہو رہی بلکہ بنگالی ماہواری رسالے جن کے مطالعہ کی سب سے زیادہ شوقین عورتیں ہوتی ہیں اشاعتِ علوم کا نہایت عمدہ ذریعہ بن گئے ہیں - ہمارے یہاں کے گریجوئٹوں کی تعداد کم وبیش تیس ہزار مندرجہ فہرست ہے ان میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے گزشتہ بیس سال میں سندیں حاصل کی ہیں - گریجوائیٹ عورتوں کی تعداد بھی ہمارے یہاں اچھی خاصی ہے - تمام دیگر ہندوستانی صوبجات کے مقابلہ میں اس صوبہ میں اعلیٰ تعلیم بہت زیادہ پھیل گئی ہے - یہ گریجوایٹ عام طور پر بنگالی زبان کی بہترین انشاپرداز ہیں - بنگالی عورتوں نے بھی بہت سی کتابیں اپنی زبان میں لکھی ہیں اور آج کل بھی چار پانچ ایسی گریجوائیٹ عورتیں موجود ہیں جن کے نام بنگالی مصنفین میں بلند پایہ رکھتے ہیں -

علمی تحقیقات کا کام اور قدیم قلمی نسخوں کی قدر و قیمت

جو کامیابی کہ تعلیمی معاملات میں ہم نے حاصل کرلی ہے اور جس کا یہ مختصر حریہ تھا، اس سے ناظرین پر واضح ہوگا کہ ہماری ادبیات میں ایک ایسا زمانہ بھی گزرا ہے جب کہ ادبی اور علمی کتابوں کے ترجمے انگریزی زبان سے بنگالی زبان میں باقاعدہ طور پر کیے جاتے تھے۔ اور اس فصل میں ہم نے بہت کچھ خرمن جمع کیا تھا۔ لیکن اب جاکر کہیں ہماری آنکھیں اپنی طریقۂ تعلیم کے ایک عیب پر کھلی ہیں۔ ہم نے سارا زمانہ یورپ کے علم ادب اور یورپ کی تاریخ کے پڑھانے میں کاٹا اور خود اپنے ادب و تاریخ پر بہت ہی کم وقت و توجہ صرف کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی ہم کو خود اپنی قومی تہذیب و تمدن کی معرفت حاصل نہیں ہونے پائی تھی جو بنیاد کو پختہ کرتی کہ ہم مغربی قوموں کے وضع و انداز کی نقل کرنے لگے۔ ہم انقلاب فرانس کی تاریخ سے تو واقفیت رکھتے ہیں لیکن فتوحاتِ اسلامی کی قبل و بعد کی تاریخ ہند کا کافی علم نہیں ہے ہمیں برطانوی پارلیمنٹ کے عروج و ترقی کا علم تو حاصل ہے لیکن ہم میں سے کتنے ایسے ہونگے جنھیں یہ خبر ہوگی کہ ہمارے ملک کی دیہاتی جماعتیں اور پنچایتیں کیونکر پیدا ہوئیں کیسے بڑھیں اور مخلوط قوم کے مابین ان دیہی جماعتوں نے کیا رشتہ قائم کیا؟ ہمیں کویکروں (Quakers)[1] کی تحریکوں اور کیتھولک مذہبی پیشواؤں حتیٰ کہ آرتھر دگلیا کی کہانیاں تک اچھی طرح یاد ہیں۔ لیکن ہم میں سے کتنے لوگوں نے پیروں فقیروں اور سادھوؤں کے مختلف طریقوں اور سلسلوں کے حالات معلوم کرنے کی پرواکی ہے جو درحقیقت مخلوق پر مغل بادشاہوں سے کہیں زیادہ حقیقی معنی میں حکمرانی کرتے تھے۔ ہمارے گریجوائیٹ جب تعلیم کے میدان میں آگے قدم بڑھاتے ہیں تو اُن کے نصاب میں ان مذہبی اور معاشرتی تحریکات کا کہیں پتہ نہیں چلتا جنھوں نے ہندو مسلمانوں کے خیالات کو باہم سمو دیا۔ اور دونوں کو شیر و شکر کرکے اتحاد و اتفاق کے ڈگر پر ڈال دیا تھا۔ ایسے تمام معلومات کے نظارے زمانہ قدیم کے ملکی علم ادب کے خزانوں میں جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں موجود ہیں کہیں کہیں ادھر ادھر منتشر سے دکھائی دیتے ہیں۔ جو گیت اور ترانے کہ آج تک قصبات و مواضع میں گائے جاتے ہیں باوجود اپنے ظاہری بھدے لباس کے بیش بہا تاریخی حقائق سے معمور ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ دنیائے حال کی ترقی کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے رہیں اور اپنی آئندہ تاریخی عمارت کی تعمیر میں سبق لیتے رہیں۔ لیکن

[1] عیسائی مذہب کا ایک فرقہ

یہ ایک مہمل سی بات ہوگی کہ ہم ممالک غیر کی سیماکی سی نمود سے چکا چوندھ میں آجائیں اور اندھوں کی طرح اس کی ہوبہو تقلید شروع کردیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قوم پر جس نے ہزاروں سال اپنی جداگانہ تہذیب کی ترتیب و تعمیر میں صرف کردیئے ہیں یہ غیر ملکی نمائش تہذیب مسلط نہیں کی جاسکتی۔

بنگال میں آج کل بہت کوشش ہورہی ہے کہ اپنی سعی و تلاش سے خود اپنے گھروں سے ایسا تاریخی مواد پیدا کریں جو بلا واسطہ ہو۔ چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی نے اس وقت تک سات ہزار پرانی بنگالی قلمی کتابیں جمع کرلی ہیں۔ ستھیا پرسات کلکتہ کے قبضے میں پانچ ہزار ایسے قلمی نسخے موجود ہیں۔ نج کے طور پر بھی بہت سے لوگ اسی کام میں مصروف ہیں اور نیز ستھیا پرسات کی شاخیں جوڈہاکہ راج شاہی۔ چاٹ گاؤں و میمن سنگھ میں ہیں انھوں نے بھی ایسے نسخوں کی ایک کثیر تعداد جمع کرلی ہے۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ دیش بندھو چتیا رنجن داس نے کلکتہ کی ستھیا پرسات کو اپنا ذخیرہ کتب دے دیا ہے جس میں پندرہ سو بنگالی قلمی کتابوں کے نسخے ہیں۔ نیز یہ خبر ملی ہے کہ مولوی عبدالکریم چاٹ گامی بابو شب رتن مترا بیر بھومی اور مسٹر ناگندر ناتھ کلکتوی کے کتب خانوں میں بھی ایسی قلمی کتابوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے۔ غالباً یہ نسخے چودھویں صدی اور اٹھارویں صدی عیسوی کے مابین نقل کیئے گئے ہیں ان میں ہر قسم کے مضمون پر ایک نہ ایک کتاب موجود ہے۔ مثلاً ڈاک اور کھانہ کی بنگالی کہاوتیں جو تقریباً ایک ہزار برس پہلے لکھی گئی ہیں بنگالہ کے کسانوں کے تجربات کاشتکاری کو خوب تفصیل سے بیان کرتی ہیں جو وہاں کی زمین کے لیئے موزوں ہیں اس کے علاوہ برجستہ اور مشہور عوام کہاوتوں میں حسابات اور علم ہیئت کے نہایت صحیح اعداد بھی بیان کیئے گئے ہیں۔ بنگال کے مشہور ریاضی داں شوبھنکر نے جسے تین سو برس سے زیادہ زمانہ گزرا علم ہندسہ کے قواعد پر ایک ایسی ہی نظم چھوڑی ہے جس کی سادگی بیان پر اس وقت تک کوئی فوقیت نہیں لے جاسکا اور جس کے قاعدوں کی حسن و خوبی کے متعلق ریورنڈ ای لانگ صاحب فرماتے ہیں کہ "اس طرح ہندؤں نے ایک ایسے طریقۂ عمل میں ہماری رہنمائی کی ہے جو اب کہیں جاکر انگلستان میں بچوں کے مدرسوں میں رائج ہوچلا ہے" اس سلسلہ میں میں یہ بیان کردینا چاہتا ہوں کہ میرا روئے سخن اس وقت صرف ان کتابوں کے متعلق ہے جو بنگالی زبان میں لکھی گئی ہیں نہ کہ سنسکرت کے قلمی کتب کی طرف جنھیں جمع کرنے کا ذمہ بنگالے کی ایشیاٹک سوسائٹی نے اپنے سر لیا ہے۔

قدیم بنگالی قلمی کتابوں کی تلاش اور دھن میں میری نظر سے اکثر اردو اور فارسی قلمی کتب بھی گزری ہیں۔ لیکن

چونکہ میرے پاس زائد سرمایہ نہ تھا اور نہ میں ان زبانوں کی ناواقفیت کی وجہ سے اُن کی قدر وقیمت سے آگاہ ہو سکتا تھا اس لیئے میں نے انھیں جمع نہیں کیا۔ نہیں معلوم ان میں کیا کیا خزانے پوشیدہ ہونگے۔ لیکن چوں کہ مسلمان خود ایسے ہیں جنھیں اپنے ہندو بھائیوں کے مقابلے میں علوم تاریخ کا بہتر شعور حاصل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ان قلمی کتابوں میں ایسا بہت کم تاریخی مواد چھپا ہوا پائینگے جو اس وقت تک ہماری نظر سے نہیں گزرا ہے اور اس سے دنیا ناواقف ہے۔ ہر سال بکثرت ایسی قلمی کتب آگ کیڑوں اور سیلابوں کے نذر ہوتی رہتی ہیں اور کوئی باضابطہ کوشش ایسی نہیں کی جاسکتی کہ انھیں محفوظ رکھا جاسکے۔ ہماری یونیورسٹی کے پاس ان کتابوں کو جمع کرنے کے لیئے کوئی سرمایہ نہیں ہے اور بنگال کے مسلمانوں نے بھی خود اپنی تاریخ میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی ہے۔ کچھ بنگال ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ تمام ہندوستان میں ہم لوگوں کی غفلت کی وجہ سے اسی طور پر بہ کثرت قلمی کتابیں ضائع ہوتی چلی جارہی ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ کیڑے سیلاب آگ اور بچّوں کی طفلانہ دست بردہی ان بیش قیمت اشیاء کے دشمن ہوں بلکہ جرمنی اور امریکہ کے سیّاح بھی قدیم ہندوستانی قلمی کتب کی تلاش میں تمام ملک میں چکّر لگاتے رہتے ہیں اور میں حتمی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ابھی حال ہی میں اُڑیسہ کے کسی مندر کے پانڈوں سے بہت سستے داموں خرید کر اُن کتابوں کے انبار اپنے ملکوں کو لے گئے ہیں۔ پوری کے چیتن کی ایک سوانح عمری تھی جو کسی اوڑیا شاعر نے چھ جلدوں میں ساڑھے تین سو برس ہوئے کہ تاڑ کے پتوں پر لکھی تھی میرے ایک دوست کے پاس سے ایک امریکن مسافر نے حال ہی میں بارہ سو روپیہ کو خریدلی مجھے افسوس ہے کہ ہمارے کانوں میں اس سودے کی بھنک تک نہ پڑی اور اب یہ کتاب بحر الکاہل کے پرے ایسے دور دراز ملک میں پہنچ گئی ہے کہ واپسی کی کوئی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ لیکن ان باتوں پر اب آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر ہم خود اپنے بزرگوں کی میراث کی پوری قدر نہیں کرسکتے تو خواہ مخواہ دوسرے لوگ اُن کتابوں کو جن کی کوئی یہاں پروا کرنی والا نہیں ہے لے جائینگے اور انھیں پڑھ پڑھ کر ہندوستان کے ایسے حالات لکھینگے جو ان ہی کتابوں سے ماخوذ ہونگی اور جن پر نظر ڈالنے میں ان مصنفین نے اپنے نقطۂ خیال سے کام لیا ہوگا۔

موجودہ زمانے میں صرف اسی کی شدید ضرورت نہیں ہے کہ ایک غیر ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کا جو مصنوعی طریقہ جاری ہے اسے منسوخ کیا جائے۔ بلکہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے کہ جس قدر قلمی کتابیں ہماری زبانوں میں ہیں

وہ سب برباد ہونے سے بچائی جائیں اور مختلف پہلوؤں سے بہ احتیاط تمام اُن کا مُطالعہ کیا جائے۔ بہت سی ایسی کتابیں ملینگی جو ادبی حیثیت سے ادنی اور حقیر ہونگی۔ لیکن ممکن ہو کہ فلسفہ وتاریخ کی نظر سے قابلِ قدر ہوں جن سے قطع نظر کرنا ظلم ہوگا۔

حواشی

(متعلقہ مضمون ۱۱)

ایک زمانہ میں یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ بنگالی زبان کی اصل سنسکرت سے ہو۔ مگر بالآخر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ زمانہ حال کے علمائے تاریخ السنہ کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہو کہ بنگالی زبان پراکرت سے پیدا ہوئی۔ سر جارج گریرسن جو اس زمانہ میں تاریخ السنۂ ہند کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں اُن کی یہ رائے ہو کہ بنگالی زبان اردھ مگدھی پراکرت سے پیدا ہوئی ہو۔ بعض علما یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی اصل دراوڑی ہو۔ بابو بجے چند موزمدار نے ابھی حال میں ایک قابل تعریف کتاب تاریخ زبان بنگالی پر لکھی ہو اور اس میں یہی خیال ظاہر فرمایا ہو۔ اُنھوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں بہت سی مثالیں دی ہیں۔ جن میں دونوں زبانوں کے قدیم لاحقوں (suffixes) اور تصریف کو دکھایا ہو اس میں شک نہیں کہ بنگالی زبان کی لغت میں بہت سے سنسکرت الفاظ شامل ہوگئے ہیں جو احیائے علوم کے زمانہ میں برہمنوں نے پندرھویں اور سولھویں صدی کے مابین داخل کردیئے تھے لیکن محض الفاظ و لغت پر قیاس کرکے کسی زبان کی اصل کا پتہ لگانا محققانہ اُصول نہیں کہا جائیگا۔ اس سے زیادہ صحیح اندازہ نحو اور زبان کی ساخت کی بنا پر کیا جاسکتا ہو۔

پس اگر یہ معیار صحیح سمجھا جائے تو یہ دعویٰ کہ سنسکرت سے بنگالی زبان کا آغاز ہوا ہے باطل ہوجاتا ہو۔

ڈاکٹر ای۔ ڈی۔ اینڈرسن (آئی۔ سی۔ ایس) آنجہانی پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی نے یہ بیان کیا ہے کہ بنگالی زبان تبتی و برمی زبان سے پیدا ہوئی ہو اور مسٹر راکھل راج رائے۔ ایم۔ اے۔ جنھیں کلکتہ یونیورسٹی نے

بنگالی زبان کی تاریخی تحقیقات کے لیے مقرر فرمایا ہے اُن کی تحقیق یہ ہے کہ یہ زبان تبتی زبان سے ماخوذ ہے۔
غرضے کہ یہ مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا ہے۔ پراکرت بولنے والی آریا قوموں کی اتنی مختلف شاخیں بُدھ مت کے عروج کے زمانے مگدھ دیش میں آباد ہو گئی تھیں کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ بنگالی زبان کی ابتدا اردھ مگدھی پراکرت سے ہوئی تب بھی یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ صرف یہی آخر الذکر زبان اُسے وجود میں لانے کا باعث ہوئی۔ پیشاچی پراکرت کا بھی اس میں حصّہ معلوم ہوتا ہے۔ ہماری زبان کے منہ میں بعض ایسے اجزا بھی ہیں جو ڈالہ پراکرت کے مماثل نظر آتے ہیں۔ جو زبان دربار میں اور شرفا کی سوسائٹی میں بولی جاتی تھی۔ اس میں مسلمانوں کے آ جانے سے ایک تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ جو تحریریں انتظام مملکت کے متعلق ہوتی تھیں ان میں فارسی اور عربی الاصل الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔

جو الفاظ سنسکرت سے ماخوذ تھے اور مسلمانوں سے پہلے معاملاتِ سلطنت میں رائج تھے اُس کی جگہ فارسی اور عربی الاصل الفاظ آ گئے۔ مثلاً راجسو یا کر سنسکرت کے الفاظ مالگزاری یا لگان کے واسطے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس کی جگہ لفظ کھجانا[1] آ گیا۔ لفظ بھومی جس کے معنی زمین کے تھے اس کی جگہ جمی[2] ہو گیا۔ اور اسی طرح پرجا یعنی اسامی کی جگہ رعیت کا استعمال ہونے لگا۔ قانونی اور درباری زبان میں اسی طرح سیکڑوں فارسی کے الفاظ داخل ہو گئے۔ صرف انھیں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ ملک اب مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا ہے طبقہ اعلیٰ اور اُمرا کی سوسائٹی میں تکلف کی چیزوں کے اسلامی نام رائج ہو گئے مثلاً عطر یا جھاڑ اور دیوالگیر وغیرہ وغیرہ جن کے معنی مختلف قسم کے چراغ دان ہیں۔ مکتب، علم وغیرہ الفاظ جن سے تعلیمی مدارس و تہذیب کا مفہوم لیا جاتا تھا بنگالی زبان میں عموماً بولے جانے لگے۔ اب ہزاروں فارسی کے الفاظ بنگالی زبان میں رائج ہیں اور [illegible] دیگر الفاظ کے ساتھ جو سنسکرت سے ماخوذ ہیں روزمرہ بات چیت میں استعمال ہوتے ہیں۔ ملک کے علم ادب میں بھی ان کا بہت کچھ دخل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری زبان اور علم ادب در اصل ملک کی ملی جلی آبادی اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔

(۲) مسلمانوں کے آنے سے پہلے بنگالی زبان کے علم ادب میں گیت اور دوہے تھے مثلاً مینا ماتر گان۔ گورکش بجے۔ سورج گان

[1] غالباً خزانہ کا بگاڑ ہے۔ (اڈیٹر)
[2] یہ "زمین" کی خرابی ہے (اڈیٹر)

مناشا رہبانن ۔ چنڈی منگل ۔ دہرم منگل اسی قسم نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ چند کتابیں مذہبی ریت اور رسموں پر تھیں مثلاً سونیا پوران اور دہرم پدہاتی مصنفہ رامائی پنڈت ۔ اُن کے علاوہ گیت ۔ بچن ۔ اور کہاوتیں بھی تھیں جیسے کہ داکرا ور کھنا رکچن ۔ ان میں سے اکثر تصنیفیں اور بالخصوص منگل گان کو برہمنوں نے زمانۂ مابعد میں نئے سرے سے لکھا تھا ۔ چونکہ ان شعرا نے جنھیں اعلیٰ ذکاوت وعلم وفضل سے بہرہ وافی حاصل تھا دوبارہ ان نظموں کو لکھا تھا، اس لئے قدیم شعرا رفتہ رفتہ زاویۂ گمنامی میں آتے گئے ۔ مثلاً مانک رام کے دہرم منگل اور اس کے بعد گنا رام کی تصنیف نے زمانہ قدیم کی نظموں کو جو ماپور بھٹ نے لکھی تھیں گرد کردیا اور کانا ہری دت کے مناشا رہبانن پر نظموں کے ضمیمے بجوی گپتا اور نارائن دیو نے پندرھویں صدی عیسوی میں اضافہ کئے ۔ نیز قدیم زمانے کے چنڈی کا بیا کی شہرت میں مکند رام کی نظم چنڈی منگل سے جو سولھویں صدی میں لکھی گئی ہے گہن سا لگ گیا ۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ قدیم کی یہ تصنیفات خام نظر آتی ہیں اور اُن کی زبان اور بعد کی سنسکرت آمیز زبان میں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے ۔ اُن کی طرز ادا بمقابلہ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کی تصنیفات کے زیادہ سادہ اور بے ساختہ معلوم ہوتی ہے ۔ زمانہ مابعد کی عالمانہ نظموں نے شعرا کو اس پر مجبور کیا کہ عروض سنسکرت کے قواعد وضوابط کی پابندی ملحوظ رکھی جائے ۔ آنکھوں کو کنول سے مشابہت دینا لبوں کو بمبا کے پھلوں سے ناک کو خوبصورت تل کے پھولوں سے تشبیہ دینی لازمی قرار پائی ۔ عورت کی چال کو نزاکت اور شان کے لحاظ سے ہاتھی کی رفتار سے تشبیہ دینی پڑی ۔ احیاے علوم بنگالہ (یعنی چودھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی عیسوی تک) کے زمانہ میں یہ استعارے اور تشبیہات عموماً استعمال ہونے لگے ۔ لیکن زمانۂ قدیم کی نظمیں دہقانی زندگی کی سادی دل فریبیوں سے مملو نظر آتی ہیں ۔ اور سنسکرت کی نظموں سے کوئی شے ماخوذ نہیں پائی جاتی ۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے کی جو کہانیاں ہیں ان میں ایک خوبصورت عورت کی تصویر جو پڑی سو رہی ہے، اس طرح کھینچی گئی ہے کہ "وہ اپنے پلنگ پر سو رہی ہے، اس کا لباس ڈھیلا ڈھالا ہے، اس کے کالے کالے بال تمام بستر پر بھرپور کھلے پڑے ہیں۔" اس میں کوئی تشبیہ نہیں ہے مگر جو تصویر کہ کھینچی گئی ہے وہ باوجود استعارات سے عاری ہونے کے کامل نظر آتی ہے ۔ مسلمانوں کے آجانے کے بعد برہمن اور دیوتا سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں ۔ درحقیقت زمانہ مابعد کی جس قدر نظمیں ہیں سب انھیں دو کی تعریفوں سے مملو نظر آتی ہیں ۔

لیکن مسلمانوں کے آنے سے قبل جب کہ بدھ مت کا دور دورہ تھا اس زمانے کی نظموں کے طرز بیان میں بہت سادگی پائی جاتی تھی۔ کنچن مالا کی کہانی میں ایک عاشق اس سادہ طریقہ پر قسمیں کھاتا ہے "میں دھرتی کی قسم کھاتا ہوں کیونکہ یہ متبرک شے ہے اور اس میں پھول اُگا کرتے ہیں" پھول لطافت و شرافت کی علامت ہیں اور زمین جس میں پیدا ہوتے ہیں متبرک سمجھی جاتی ہے۔ زمانہ مابعد میں اگر وہ قسم کھاتا تو ضرور برہمنوں اور دیوتاؤں کی قسم کھاتا۔ گورکشا و جے جو قبل زمانہ احیائے علوم کی ایک نظم ہے گو اس کی زبان کچی ہے لیکن اس کے سننے یا پڑھنے سے بزرگ [illegible] دنیا کی تقدیر کا اثر ہٹتا ہے۔ آپ کو اپنے ہی سیرت ور زوال ہندوستان کا پان مال میں تلاش کرنے پر بھی گورکشا کی مانند شریف و بزرگ شخصیت کہیں نظر نہ آئیگی۔ زمانہ مابعد میں اخلاقی برتری اور شریفانہ افعال کے جذبات و نازک خیالی کو ہمیشہ ترجیح دی گئی ہے۔

(۳) اسلام کا اثر اس میں صاف نظر آتا ہے کہ بجائے براہمہ قدیم کے نیتھ کے جس میں سرشٹی رکائنات) کو برہم مانتے ہیں صرف ایک خدا کی پرستش میں ترقی ہونے لگی۔ منسا کی پوجا نیز چنڈی اور کرشن کی پوجا میں اسلامی توحید کی طرف میلان صاف نظر آتا ہے۔ شیو کی پوجا کی وجہ سے جو قدما میں رائج تھی طریقہ ہمہ اوست کی شکل پیدا ہو گئی تھی۔ شیو دیوتا صفات سے معرا، بے پروا، اپنی ہی عظمت پر قانع اور تمام دنیاوی رنج و راحت سے بالاتر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب مسلمان ہاتھ میں قرآن پاک لے کر آئے اور ایک زندہ مذہب کی قوت کو ظاہر کیا اور جب کبھی انھیں مدد کی ضرورت ہوتی اپنے خدا سے دعا کرتے اور یقین رکھتے کہ اُن کا خدا ہمیشہ اُن کے ساتھ ہے اور ان تمام جنگوں اور لڑائیوں میں اُن کا شریک ہے جو حق کے لیئے لڑی جاتی ہیں تو شیو کی موہوم عظمت اپنی جگہ قایم نہ رہ سکی۔ شیو پنتھیوں کا خیالی مذہب اس وقت تک اپنی خیالی عظمت کے تصور میں کہ "میں وہ ہوں" مگن رہا۔ لیکن عوام کو ایسے خدا کی ضرورت تھی جس کی شخصیت معلوم ہو موہوم نہ ہو اور جس سے وہ اپنی دنیاوی کشمکش پریشانیوں اور خطرات میں مدد طلب کر سکیں۔ سب سے زیادہ اس ضرورت کا احساس اس وقت ہوا جب کہ مسلمان فاتحوں نے یہ بتایا کہ وہ اپنے خدا سے دعا کرتے ہیں اور خدائے بزرگ و برتر اپنے بندوں کی حاجتوں کے وقت ہمیشہ اپنا فضل و کرم نازل فرمانے کے لیئے آمادہ رہتا ہے۔

غرض کہ ان اسباب کی وجہ سے شیو پنتھ کو زوال شروع ہوا اور اُس کی جگہ کرشن دیوتا۔ منسا دیبی۔ چنڈی

اور دیگر معبودوں کی عبادت شروع ہوئی، جو اپنی عبادت کرنے والوں کی فلاح وبہبود میں بہت تردد اور ذاتی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ اگر شیوپنتھ اپنی تمام صفات کے ساتھ اب بھی باقی رہتا تو یقیناً بنگالہ کے تمام ہندو مسلمان ہوگئے ہوتے۔ لیکن بعد کے مذہبوں نے مذہب اسلام سے کچھ کچھ عقائد لے کر اپنے میں ملائے اور اُس ضرورت کو پورا کردیا جو اہلِ اسلام کے جوش وخروش کی تقلید میں ملک میں پیدا ہوگئی تھی۔ ان نوواردوں کا اثر قدیم بنگالی علم ادب پر ایسا وسیع ہوا کہ تمام رنگ ہی بدل گیا۔

(۴) ہندو راجہ اور ان کے درباری برہمن بنگالی سے جسے وہ گنواری زبان کہتے تھے نفرت کرتے تھے۔ ایک سنسکرت کا اشلوک ہے کہ اگر شاستروں کا ترجمہ بنگلہ میں ہوجائے تو جو کوئی اس ترجمہ کو پڑھیگا وہ سیدھا جہنم کے درجۂ اسفل میں داخل ہوگا۔ اگر بنگال میں ہندو راجہ حکمراں رہتے تو بنگالی زبان کو سلطنت کی طرف سے سرپرستی کی مطلق کوئی اُمید نہیں ہوسکتی تھی۔ اس ترقی کے زمانے میں بھی جب کہ تمام یورپ رابندرانا تھ کی نظموں کی تعریفوں سے گونج رہا ہے۔ ایسے برہمن موجود ہیں (یعنی مذکورۂ بالا اشلوک کے لکھنے والے ہزار سالہ قدیم برہمنوں کی اولاد) جو اب بھی بنگالی زبان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

جب کہ مسلمانوں نے اس ملک پر قبضہ کیا اور اپنی حکومت قائم کی تو مسلمان نوابوں نے ملک کے درمیان دہقانیوں کے ساتھ سکونت اختیار کی۔ قدرتی طور پر ان کی یہ خواہش ہوئی کہ ہندوؤں کے مذہب اور شاعری کے متعلق واقفیت حاصل کرنا چاہیئے۔ لیکن سنسکرت کی صرف ونحو کی تحصیل بارہ برس سے کم میں نہیں ہوسکتی تھی۔ جس کے بغیر سنسکرت کی کتب مقدس کو سمجھنا ناممکن تھا۔ اس لئے ان مسلمان اُمرا نے جو ملک میں بس گئے تھے اور وہاں کی زبان بولتے تھے۔ ہندو پنڈتوں کو مقرر کیا کہ سنسکرت کی نظموں قدیم رزم بزم کی داستانوں اور کتب مقدس کے ترجمے بنگالی زبان میں کریں۔ چنانچہ ناصر شاہ نے چودھویں صدی عیسوی میں حکم دیا کہ قدیم داستان مہابھارت کا ترجمہ بنگالی زبان میں کیا جائے حسین شاہ کے مشہور سپہ سالار فرغل خاں نے بھی ایک شاعر کبندرا پرمیشور کو حکم دیا کہ مذکورۂ بالا داستان کا ترجمہ بنگلہ میں کرے۔ یہ ترجمہ بہت جامع اور بہتر ہے اور اب تک مسودہ کی شکل میں موجود ہے اور سرمایہ نہ ہونے کی

وجہ سے چھپ نہ سکا۔ یہ ترجمہ پندرھویں صدی کے شروع میں کیا گیا تھا۔ شری کرن نندی ایک دوسرا شاعر تھا جو اس کے چند سال بعد مشرقی بنگالہ میں نواکھلی کے ایک مسلمان امیر چھوٹے خاں کی طرف سے اس کام پر مقرر ہوا تھا کہ جیمن کے اسوامیدہ پروا کا ترجمہ بنگالی زبان میں کرے۔ پندرھویں صدی کے اوائل میں بھاگبت[1] کا ترجمہ مالادھر باسو نے کیا جسے اپنے سرپرست مسلمان بادشاہ سلطانِ گور کی طرف سے گن راج خاں کا خطاب ملا۔ صرف یہی چند مثالیں نہیں بلکہ اس قسم کی بیشمار مثالیں موجود ہیں۔ علاال شاعر نے ہندی نظم پدمات کا ترجمہ بنگالی نظم میں روسنگ (برما) کے ایک مسلمان سردار مگن ٹھاکر کے حکم سے سترھویں صدی عیسوی میں کیا۔ جب کہ مسلمان شاہنشاہوں نے ابتدا کی اور اپنی مثال سے علمی سرپرستی اور قدر دانی کا اظہار کیا تو دیگر والیان ملک اور ماتحت راجاؤں نے بھی باوجود متعصب برہمنوں کی مخالفت کے ایسی مثالوں کی تقلید کے بغیر چارہ نہ دیکھا۔ غرض کہ اس طرح قدیم بنگالی علم ادب کو خوب ترقی ہوئی اور مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں اُسے بیحد عروج حاصل ہوا۔

(۵) جو تعلیمی ترقی بنگالی زبان نے انگریزوں کے آنے سے پہلے ادبی اور مذہبی شعبوں میں کی تھی وہ ایسی عظیم الشان تھی کہ اس گزشتہ سو سال میں کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی گئی جو باوجود اس تمام تحسین و آفرین کے جو زمانہ جدید کی تصنیفات کے متعلق ہو رہی ہے حقیقی شاعری اور دقیق جذبات روحانی کے اظہار میں وشنوی نظموں اور ہماری گھریلو کہانیوں کے ہم پلّہ تصوّر کی جا سکے۔ گزشتہ زمانے میں واقعی ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے دنیاوی منافع کو جذبات رُوحانی پر تصدق کر دیا کرتے تھے اور شعرا اُن کی فیض صحبت سے مستفید ہوتے تھے۔ گویا وہ لوگ اپنے گرد و پیش کے ایسے حالات میں زندگی بسر کرتے تھے جسے حقیقی شاعری اور جذبات سے بھرے ہوئے سکھ اور چین کی زندگی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ زمانۂ حال کا علم ادب زیادہ تر تقلیدی ہے اور اکثر و بیشتر بدیسی رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ علاوہ بریں بیان کے لحاظ سے پُرازالفاظ اور نوعیت کے لحاظ سے جدّت سے عاری ہے۔ ایسے شعرا جیسے کہ ترتیواس اور چندی داس تھے جنھیں پانسو سال ہوتے آتے ہیں اور مکندرام اور گوبند داس جو سولھویں صدی میں گزری ہیں اب بھی

---

[1] یعنی بھاگبت پران جس میں سری کرشن جی کے حالات و سوانح درج ہیں (اڈیٹر)

ان کا کلام بکثرت پڑھا جاتا ہے اور باوجود اس کے کہ اتنی صدیاں گزر گئی ہیں پھر بھی عوام کے مذاق میں اُن کے ساتھ وہی دلچسپی اور لذت باقی ہے۔ یہی صفت اگر ہم اپنے زمانہ حال کے شعرا کی طرف منسوب کرنا چاہیں تو ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ایشور گپتا اُنیسویں صدی کے شروع میں سب میں افضل تھا مگر اب اس کی نظمیں بہت کم پڑھی جاتی ہیں۔ نثر لکھنے والوں کو لیجئے تو پچاس برس پہلے اکشے دت اور ودیا ساگر کی تصانیف ہر کوئی پڑھتا تھا لیکن اب وہ فرسودہ نظر آتی ہیں۔ حتیٰ کہ بنکم چندر کا سا نامور انشا پرداز جو ابھی بیس پچیس سال ہوئے ہمارے علم ادب کا سب سے زیادہ تاباں ستارہ نظر آتا تھا بہت کچھ دھندھلے میں آگیا ہے۔ اور اس زمانہ کے پڑھنے والے کو اس میں وہ گرمی اور فراوانی جذبات نہیں ملتی۔ جو ہم اپنے کالج کے زمانہ میں اس کی تصنیفات میں پایا کرتے تھے۔ وجہ یہ ہے جس نور کے ساتھ ان کی چمک تھی وہ اپنا نہیں تھا بلکہ دوسروں سے عاریتاً لیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے اُن کا عروج گو کتنا ہی شاندار نظر آتا تھا مگر جلد غروب ہوجانے کا پیش خیمہ تھا۔ لیکن یہ میری رائے تذبذب سے خالی نہیں ہے۔ اصل فیصلہ زمانہ کے ہاتھ میں ہے اور میں یا مجھ سے بڑھ کر نقادانِ سخن اس وقت کوئی قطعی رائے قایم نہیں کرسکتے۔ زمانہ جس قدر گزرتا جائیگا اُسی قدر زیادہ ان شعرا کے کمال کے متعلق صحیح رائے قایم کرنے کا موقع ملے گا۔

(۶) بنگالی علم ادب پر انگریزی زبان کا بیحد اثر ہوا ہے۔ شروع زمانہ میں جب کہ تتوا بودھنی پتریکا بنگالہ کی تعلیم یافتہ جماعت کے مذاق کی رہنمونی کرتا تھا اس کے بہت سے مقالات میں اُن خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے جو کبھی ریمبلر Rembler[1] اور اسپکٹیٹر (Spectator) میں شائع ہوتے تھے۔ مائیکل مادھو سودھن کا اخیر باب جس میں پتال (Pluto) دیش کو بیان کیا ہے ورجل[2] کی اینڈ کا لفظی ترجمہ ہے جس میں ڈانٹے[3] کے ادبی خزانہ سے بھی کہیں کہیں مستعار لیا گیا ہے۔ سر والٹر اسکاٹ[4] کے ناولوں نے بنکم چندر کے افسانوں پر بہت اثر ڈالا ہے اور گو یا بنگالی ناول نگار آئیوہو (Ivanho) کے مطالعہ کا انکار کرتا ہے تاہم اس کا ناول اُنیشا بظاہر اس کی نقل

---

[1] انگریزی کے دو مشہور ادبی رسالے جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں لندن سے شائع ہوتے تھے (اڈیٹر)
[2] رُوما کا مشہور شاعر جو ۷۰ سال قبل مسیح پیدا ہوا اور ۱۹ء میں انتقال کرگیا (اڈیٹر)
[3] اٹلی کا مشہور آفاق شاعر جو تیرھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے (اڈیٹر)
[4] انگلستان کا مشہور شاعر اور ناول نویس۔ اس کے فسانے عموماً تاریخی ہوتے ہیں (اٹھارھویں صدی عیسوی) (اڈیٹر)

معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے درگیش نندنی سے پہلے تصنیف کیا تھا۔ مسٹر رومیش چندر دت آنجہانی کے تقریباً تمام ناول سر والٹر اسکاٹ کے طرز پر لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نوبین چندر ”جنگ پلاس“ کے شاعر نے اپنی کتاب ”سراج الدّولہ کے خواب“ میں شکسپیر کے جملے کے جملے تقریباً بہ لفظہ ترجمہ کر دیئے ہیں۔ بنکم چندر نے اپنے ناول بشابرکشور (معاشرت ملک کا ایک افسانہ) کا پلاٹ اور نفس مضمون ایک مشہور فرانسیسی ناول سے اخذ کیا ہے۔ ہیم چندر اور نوبین چندر جو قدیم طریقہ کے دو بہت بڑے شاعر گزرے ہیں ان کی بہت سی نظمیں بائرن اور شیلی کی نظموں کو یاد دلاتی ہیں۔ ایسی خاص خاص مثالیں درج کرکے اس بحث پر ایک مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن اس مضمون کا میدان اتنا کشادہ نہیں ہے کہ زیادہ لکھا جائے۔ غرض کہ ہمارا جس قدر زمانہ حال کا علم ادب ہے سب میں انگریزی سرایت کیے ہوئے ہے۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور کا جدید ترین ناول ”گھاری بیری“ Ghare Baire میں حریّت نسوان کے مسائل پر بحث کی گئی ہے جن پر برنارڈ شا ابسن اور ماٹرلینگ قلم اُٹھا چکے ہیں۔ ایک بات بہت دلچسپ ہے۔ وہ یہ کہ احیاء علوم کے ماقبل زمانہ میں بھی مسلمانوں کو بنگالی علم ادب سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ گورکشا وجے اور میناماتی گان انھیں کی توجہ کی بدولت محفوظ رہی ہیں۔ گورکشا وجے کا سب سے عمدہ نسخہ جو بنگال میں موجود ہے فیض اللہ چودھویں صدی کے ایک مسلمان شاعر کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور میناماتی میں بہت سے گیت دو تین صدی پہلے کے مسلمان مصنفین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ دیہاتوں اور گاؤں میں اگر آپ جائیں تو مسلمانوں ہی کو خاص کر یہ گیت گاتے ہوئے پائیگا۔ میری نظر سے مناشار بھاشن کے بعض بہت قدیم نسخے گزرے ہیں جو مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ بہت سے مسلمان شاعروں نے سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں رادھا کرشن کے گیت لکھے ہیں۔ تین سو برس کا زمانہ ہوتا ہے کہ علاول (Allaol) نے جو ایک مسلمان شاعر تھا پدماوت لکھی جو ہماری قدیم بیش بہا عالمانہ نظموں میں شمار کی جاتی ہے زمانۂ حال کے علم ادب میں بھی جو مستعدی مسلمانوں کی طرف ظاہر ہو رہی ہے وہ کچھ کم نہیں ہے۔ ہمارے مطابع میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابیں طبع ہو رہی ہیں جو قابل ستایش دلچسپی اور جوش کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور اکثر ایسی ہیں جو ادبی دنیا میں بلند مقام پر جگہ پانے کے قابل ہیں۔

مرزا غالبؔ کا نسب نامہ

ایک مستند تحریر نوشتہ خواجہ قمرالدین خاں راقمؔ

(از جناب مرزا رفیق بیگ صاحب نبیرۂ خواجہ قمرالدین خاں راقمؔ مرحوم)

ذیل میں خواجہ قمرالدین خاں راقمؔ دہلوی مرحوم کے کچھ حالات اور مرزا غالب مرحوم کے نسب کے متعلق اُن کی ایک تحریر شائع کی جاتی ہے۔ یہ تحریر غالباً ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں راقمؔ مرحوم نے لکھی تھی اور اپنی تصنیف کردہ شرح دیوان غالب (اُردو) کے ساتھ اُسے طبع کرنے کا قصد تھا۔ لیکن وہ شرح طبع نہ ہوئی اور اِس تحریر کے چھپنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ شرح کے متعلق جس کا ایک بوسیدہ مسودہ دستیاب ہوگیا ہے۔ اُمید ہے کہ رسالہ اُردو میں آیندہ ہم تفصیل سے کچھ لکھ سکیں گے سردست راقمؔ مرحوم کے حالات کو جو اُن کے ایک عزیز نے ہمیں عنایت کئے ہیں اور اُن کی مذکورۂ بالا تحریر کو جو ادبی اور تاریخی دلچسپی سے خالی نہیں، طبع کرتے ہیں۔

(اڈیٹر)

خواجہ مرزا قمرالدین خاں المتخلص بہ راقمؔ دہلوی ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اکثر لوگ آپ کو صرف خواجہ مرزا ہی کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کے والد خواجہ مرزا بدرالدین خاں المخاطب بہ خواجہ امانؔ مترجم "بوستان خیال" تھے۔ راقمؔ اور مرزا اسداللہ خاں صاحب غالبؔ ایک ہی نسل سے تھے۔ یعنی غالبؔ کے دادا اور راقمؔ کے پردادا کے والد دونوں سگے چچازاد بھائی تھے جیسا کہ خود راقمؔ نے مفصل بیان کیا ہے۔

راقمؔ لمبے قد کے۔ خوش رو اور ہنس مکھ تھے۔ رنگ گندمی تھا آخر عمر میں اعضا میں قدرے رعشہ ہوگیا تھا جس سے

لکھنے پڑھنے میں سخت دقت ہوتی تھی۔ چارکے بہت شوقین تھے۔ طبیعت میں نفاست تھی۔ اپنی عمر کے اختتام تک اپنی پرانی وضع کے پابند تھے۔ جیسا کہ ان کی تصویر سے جو ان کے دیوان کے ساتھ ہے معلوم ہوگا۔ عرصہ سے ثقل سماعت کی شکایت ہوگئی تھی اور سخت تھی (راقم کے دوست اُستاذ ظہیر دہلوی سے بحد دوستانہ تھا۔ ان دونوں اصحاب کی ملاقات بھی عجیب پر لطف ہوتی تھی۔ دونوں کو ثقل سماعت کی شکایت تھی۔ جب یہ دونوں حضرات ملتے تھے تو دونوں صاحب ایک قسم کا آلہ جسے آلہ سماعت کہنا چاہیئے ضرور ساتھ رکھتے تھے ایک صاحب ایک طرف سے اپنے کان میں لگاتے تھے۔ اور دوسرے صاحب کے ہاتھ میں اُس کا دُوسرا حصّہ دیدیتے تھے تاکہ وہ کچھ کہیں اور اُس میں کہیں۔ اسی طرح دوسرے صاحب بھی۔ اور پھر ان کی شاعری اور اس پر واہ واہ کا ہنگامہ دیکھنے اور سُننے کے قابل ہوتا تھا)

ابتدائی حالات اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد سولہ سال کی عمر میں راقم نے بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی ملازمت اختیار کی اور تیر اندازی میں بادشاہ کے شاگرد بھی تھے۔ اُس کے بعد ولیعہد بہادر مرزا فتح الملک کی ملازمت میں رہے بعد وفات ولیعہد بہادر راقم اپنے والد کے پاس ریاست الور میں چلے گئے۔ وہاں راجہ کے فرزند شیودان سنگھ کی تعلیم پر مقرر ہوگئے۔ عرصہ تک ان کی ملازمت میں رہے۔ راجہ صاحب اور ان کے فرزند ان سے اس قدر مانوس تھے کہ کسی وقت جدا نہ ہونے دیتے تھے۔ مہاراجہ الور اہلِ علم کے بہت قدرداں تھے۔ خواجہ امان نے جو ترجمہ بوستانِ خیال کا کیا تھا۔ وہ غالباً مہاراجہ ہی کے واسطے تھا۔ کیوں کہ اوّل تو کہیں دیباچہ میں ذکر بھی کیا ہے۔ دوسرے ایک تصویر سے جو بوستانِ خیال کی ایک جلد کے سرورق پر ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ امان بوستانِ خیال مہاراجہ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ غدر کے بعد راقم الور سے جے پور گئے پھر دہلی چلے آئے۔ دہلی آن کر اپنے والد کے ساتھ بوستانِ خیال کے ترجمے اور اُس کی چھپائی وغیرہ کے اہتمام میں مصروف ہوگئے۔

جب ان کے والد کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوگیا اور کچھ عرصہ بعد بوستانِ خیال کے ترجمے سے فرصت پائی تو آپ حیدرآباد چلے گئے۔ اور نواب سر سالار جنگ بہادر کے ہاں دو سال تک اُمیدواری کرتے رہے بعد میں اتفاق سے پھر جے پور چلے گئے اور آخر تک وہیں قیام پذیر رہے۔

تلمذ راقم اپنے دادا غالب کی شاگردی کا فخر رکھتے تھے۔ اکثر ان کی زبانی یہ معلوم ہوا ہے کہ راقم علاوہ

شاعری کے غالب سے اور چیزوں میں بھی سبق لیا کرتے تھے۔ لیکن ابتدائی تعلیم زیادہ تر اپنے والد سے پائی تھی۔ فارسی اُردو کے کامل تھے۔ راقمؔ کو اپنی زبان (اُردو) پر بہت ناز تھا چنانچہ وہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہر زباں پر فسانہ ہیں ہم لوگ　　　ہم زباں سے زبان ہم سے ہے

تصانیف | راقمؔ کی جملہ تصانیف چھ ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

بوستانِ خیال ۔ راقمؔ کے والد خواجہ امان بوستان خیال کا ترجمہ کر رہے تھے چھ جلدیں تمام ہو چکی تھیں کہ عمر نے وفا نہ کی اور اس دارِ فانی سے اس بحرِ زخار کو اَدھورا چھوڑ کر چلے گئے۔ بقیہ دو جلدوں کا ترجمہ خود راقمؔ صاحب نے پُورا کر کے شائع کیا ہے۔

کلیاتِ راقمؔ ۔ یہ تقریباً دو سو صفحہ کا راقمؔ کا دیوان ہے اور طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ کلام معمولی ہے اور جس اُستاد کی شاگردی پر انھیں فخر ہے اس سے کچھ نسبت نہیں رکھتا۔

سبعہ سیّارہ ۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے یہ سیّاروں کے حالات کے متعلق لکھی ہے۔ طبع ہو چکی ہے آخر میں کچھ شعبدے اور مختلف نسخے وغیرہ بھی درج کر دیئے ہیں۔

عقدِ ثریا ۔ یہ عورتوں کی زبان میں ایک قصّہ کے پیرایہ میں مقفّیٰ عبارت میں لکھی ہے۔ اس کی پہلی جلد طبع ہو چکی ہے دوسرے حصّہ کا مسودہ راقمؔ کی وفات کے بعد ملا تھا۔ لیکن اب پتہ نہیں چلتا۔ اس لے اب تک طبع نہ ہو سکا۔

مرقعِ نعت ۔ نعت اور تصوّف کا بہترین ذخیرہ ہے۔ اس سے راقمؔ کے حسنِ اعتقاد کی حالت خوب معلوم ہو سکتی ہے۔ خصوصاً اس میں معراج نامہ ایک عمدہ چیز ہے۔ آپ مذہب کے عامل باعمل تھے۔

شرح دیوانِ غالب ۔ راقمؔ نے غالب کے دیوان کی شرح لکھی تھی اور مسودہ صاف کر کے حیدرآباد اپنے ساتھ لائے تھے۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر (جو رشتے میں راقمؔ کے بھتیجے ہوتے ہیں) اتفاقاً ذکر آیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور راقمؔ سے کہا کہ وہ مسودہ مجھے دیدیجئے میں اس کو چھپواتا ہوں۔ راقمؔ نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا۔ اور واپس جے پور چلے گئے۔ اُس کے بعد کئی سال تک اپنی زندگی میں نواب صاحب پر تقاضے کئے اور راقمؔ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند خواجہ امیرالدین خاں صاحب آثمؔ نے جو اوصاف میں اپنے والد کے قدم بقدم تھے (افسوس کہ انھوں نے بھی ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا) بہت کوشش کی لیکن وہ شرح نواب صاحب

کے پاس سے غالباً کہیں گم ہو گئی۔ اس شرح کا سب سے پہلا مسودہ جو بہت کٹا پھٹا ہی اب نکلا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ بالکل کرم خوردہ ہی اور اس قابل نہیں ہی کہ شائع کیا جا سکے۔ البتہ راقم کا تحریر کردہ نسب نامۂ اسداللہ خاں غالب دستیاب ہوا ہی جو اسی شرح کا دیباچہ ہی اور اب رسالۂ اُردو میں طبع ہوتا ہی۔

شاگرد | راقم کے شاگرد بہت تھے۔ سب سے زیادہ اس وقت جے پور میں ہیں۔ علاوہ شاگردوں کے بہت لوگ ان کے پاس جمع رہتے تھے اور اصلاحیں لیا کرتے تھے۔ ان کے ہاں ہر وقت ایک علمی مجلس جمع رہا کرتی تھی اور اس طرح وہ اپنے علم سے دوسروں کو مستفید کرتے رہتے تھے۔

خوش مزاجی | راقم بہت خوش مزاج اور لطیفہ گو تھے اور اکثر مذاق کی باتیں کیا کرتے تھے ایک مرتبہ راقم دہلی آئے ہوئے تھے اور اپنی ہمشیرہ کے ہاں مقیم تھے۔ اتفاق سے رات میں چوری ہو گئی اور بہت کچھ اسباب جاتا رہا۔ صبح میں جب خبر ہوئی تو راقم نے اپنی ہمشیرہ سے کہا کہ میں ہمیشہ تم کو تاکید کیا کرتا ہوں کہ تم گھر میں کُتّا پالو تاکہ گھر کی حفاظت ہو۔ ہمشیرہ نے اُن کو جواب دیا "بھائی جس گھر میں کُتّا ہوتا ہی وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے اس سبب سے میں نہیں پالتی"۔ اس پر راقم صاحب نے جواب دیا کیوں بہن یہ جو شہر کی گلی کوچوں میں کُتّے رہتے ہیں۔ تو رحمت کے فرشتے فصیل کے باہر ہی رہتے ہوں گے۔ غرض یہ کہ ہمیشہ اس قسم کے اُن کے سینکڑوں لطیفے ہیں جو یہاں درج نہیں ہو سکتے۔

ہمت اور مستقل مزاجی | راقم بہت باوضع بزرگ تھے۔ کیسی ہی مصائب و مشکلات کا سامنا ہوتا وہ نہایت استقلال سے اُن کو اس طرح جھیل لیتے تھے کہ دوسروں کو اس کا احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ اُن پر کیا گزری۔ اپنی بات اور ارادے کے پورے تھے۔ جے پور میں اکتیس سال رہی وہاں جو کوٹھا انھوں نے اوّل سے کرایہ پر لیا تھا۔ اکتیس برس اُسی میں گزار دیئے اور آخر وہیں انتقال ہوا۔ اپنے ارادہ کے اس قدر مضبوط تھے کہ انتقال سے آٹھ روز پہلے دہلی گئے۔ چلنا پھرنا تو بڑی بات تھی ہل جل بھی نہ سکتے تھے۔ ایسی حالت میں سب نے روکا۔ لیکن کسی کی نہ مانی چار روز دہلی میں رہ کر پھر واپس اُسی حالت میں جے پور چلے گئے اور صرف تین دن کے بعد انتقال کیا۔ آخر وقت تک ہوش حواس بالکل درست تھے اور دل و دماغ اُس وقت تک برابر کام دیتے تھے۔

عام اخلاق | راقم نہایت مہمان نواز، ہمدرد، رحم دل اور مجسّم اخلاق تھے۔ ان کے اخلاق کی وجہ سے لوگ

اب تک جے پور میں یاد کرکے روتے ہیں۔ اپنے اوقات اور اتباع سنت نبوی کے اس قدر پابند تھے کہ اُس میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔ غربا کے ساتھ ہمیشہ سلوک اور ان کی سعی سفارش وغیرہ کرتے رہتے تھے۔ اس لئے نہایت ہردلعزیز ہوگئے تھے۔

وفات | راقم نے مارچ ۱۹۱۰ء میں اٹھتّر سال کی عمر پاکر اس دُنیا سے کوچ کیا اور جے پور میں ہی مدفون ہوئے راقم صاحب کو آخر عمر میں اگر کوئی صدمہ تھا تو وہ صرف اپنی آیندہ نسل کے چلنے کے متعلق تھا۔ کیوں کہ کئی پوتے ہوئے اور وہ سب ان کے سامنے ہی رخصت ہوگئے۔ البتہ ان کی پوتیاں موجود ہیں حال ہی میں ان کے صاحبزادے کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور اس طرح خاندان غالب یہاں آن کر بالکل ختم ہوگیا۔ نہ تو غالب ہی کی اولاد میں کوئی مرد باقی رہا اور نہ اس سلسلے ہی میں اور کوئی رہا کہ آیندہ سلسلہ چلنے کی اُمید رہتی۔ فقط

مرزا رفیق بیگ

نبیرۂ خواجہ قمرالدین خاں راقم مرحوم

نسب نامۂ مرزا اسداللہ خاں غالب مغفور دہلی

(بقلم خواجہ مرزا قمرالدین خاں راقم مرحوم)

اس بندۂ خاکسار بے بضاعت خواجہ قمرالدین راقم نے جب شرح دیوان غالب ختم کرلی اور ہر شعر کے معنی بخوبی و خوش اسلوبی حل کرلئے اس وقت خیال آیا کہ مرزا غالب کا اور اپنے بزرگوں کا نسب بھی خاندانی ظاہر کرنا ضروری ہے تاکہ خاص وعام پر روشن و مبرہن ہو کہ غالب کون تھے اور کیا تھے اور ان کے خاندانی بزرگ کس مرتبے کے تھے اور راقم سے غالب کا خاندانی سلسلہ کیا ہے۔ اس سبب سے اس فقیر بے مایہ نے بزرگوں کا حق خدمت اپنا فرض منصبی سمجھکر ادا کیا کہ تا دَورِ عالم ان کی یادگار میں قایم رہے۔ اگرچہ مولوی الطاف حسین حالی نے اپنی تصنیف یادگار غالب میں اُستاد کا نسب بہ اختصار لکھا ہے مگر وہ بھی اَدھورا اُستاد کی زبانی سُنا سُنایا لکھا ہے۔ کس لئے کہ نسب کا پُورا حال غالب کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اُن کے اب وعم اُن کی

طفلی میں مرگئے تھے اورخاندانی شجرہ راقم کے دادا خواجہ مرزا حاجی خاں کے پاس تھا جو رشتہ میں غالب کے بھائی ہوتے تھے۔ اور غالب کی پرورش وہی کرتے رہی۔ غالب نے جس قدر بھائی کی زبانی سُنا تھا جابجا اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہی اور اپنی نسل فریدوں کی نسل میں بیان کی ہی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ غالب کے اور ہمارے بزرگ سلاطین توران میں تھے۔ غالب کی اور ہماری یک جدی نسل ہونے سے یہ بیان ہرگز غلط نہیں ہی کس لئے کہ وہ شجرہ راقم کی نظر سے عہد طفلی میں گزرا ہی اور راقم نے اکثر اپنے عم بزرگوار کی زبان سے بھی خاندانی نسب کا حال سُنا ہی لہٰذا وہ احوال جس قدر کہ میرے لوحِ سینہ پر نقش ہی نوک ریزِ قلم کیا جاتا ہی:۔

واضح ہو کہ ہماری اور غالب کی اصل نژاد سلاطین توران میں ہی۔ جس زمانہ میں تورانی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا بیخ بنیاد بھی نہ رہی تو ہمارے خاندان کے لوگ اس طائف الملوکی میں جابجا منتشر ہوگئے اور جس نے جہاں امن پائی جا بسا۔ چنانچہ کوئی سو پچاس پشت کے بعد اس خاندان میں دو برادرانِ حقیقی جن کا نام راقم کو یاد نہیں ان کی اولاد میں دو فرزند تولد ہوئے بڑے بھائی کا بیٹا ترسم خاں اور چھوٹے بھائی کا بیٹا رستم خاں تھا۔ ہنوز یہ دونوں بھائی عمرِ شباب کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین فوت ہوگئے۔ یہ دونوں کسی حالت میں اضلاع سمرقند میں آکر آباد ہوئے۔ پھر ایک مدّت کے بعد بدخشاں میں آکر رہے۔ یہ وہ زمانہ ہی کہ سرزمین ترکستان میں نورِ اسلام مثل پرتو خورشید منوّر ہو رہا ہی۔ یہ دونوں بھائی بھی شرفِ اسلام سے فیضیاب ہوئے اور ترسم خاں نے بدخشاں کے کسی شریف خاندان میں اپنا نکاح بیاہ کرلیا۔ ترسم خاں کی اولاد میں تین دختر اور دو فرزند پیدا ہوئے یعنی ایک فرزند کا نام نصر اللہ بیگ خاں دوسرے کا عبد اللہ بیگ خاں تھا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد ترسم خاں نے وفات پائی ان کی اولاد مدت تک بدخشاں میں رہی مگر رستم خاں بھائی کے رنج میں بدخشاں میں نہ رہے بخارا میں آگئے۔ یہاں آکر تھوڑے عرصہ کے بعد رستم خاں بھی ایک دولت مند گھر خواجگانِ چشت میں خواجہ عبید اللہ احراری کے نسل میں تاہل یا ہی گئے۔ اُن کے ہاں قطب الدین خاں فرزند پیدا ہوئے۔ ہنوز قطب الدین خاں سن بلوغ کو نہ پہونچے تھے کہ اُن کے والدین گزر گئے۔ اب قطب الدین خاں لفظ خواجگی سے ممتاز ہوئے۔ یہاں سے سلسلۂ ذات ہمارا اور غالب کا جُدا ہوگیا۔ رستم خاں کے بعد خواجہ قطب الدین کا اُسی خاندان میں عقد ہوا۔ ان کے ہاں ایک فرزند خواجہ حاجی خاں تولد ہوئے اُن کی عمر قریب بلوغ کے پہونچی تھی کہ والدین کا انتقال ہوگیا۔

یہ خبر سُن کر نصراللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں معہ اپنی بہنوں کے بھتیجے کے پاس بُخارا میں آئے۔ کچھ دن بھتیجے کے شریک حال رہے پھر بھتیجے سے رازِ دل بیان کیا اور مشورہ لیا کہ ہمارا قصد ہے کہ ہم ہندوستان جائیں اور سرکار شاہی میں ملازمت کریں تم کیا صلاح دیتے ہو۔ خواجہ حاجی خاں جو کہ نوجوان سپاہی پیشہ تھے ہندوستان کے شوق میں چچا کی رائے کے شریک ہوگئے کہ اچھا میں آپ کے ہمراہ چلوں گا۔ غرض کہ یہ چچا بھتیجے معہ متعلقین کسی قدر جمعیت ذاتی ہمراہ لے کر بخارا سے روانہ ہوئے اوّل سمرقند میں آئے وہاں ایک امیرزادہ شریف قوم مرزا جیون بیگ خاں چغتا سے ملاقات ہوئی اثنائے گفتگو میں سفر کا ذکر آگیا۔ مرزا جیون بیگ خاں بھی چلنے کو تیار ہوگئے اور معہ اپنی زوجہ امیرالنسا خانم کے ہمراہ ہولئے غرض یہ ولایتی قافلہ زن و مرد ہندوستان میں آیا اور شہر شاہجہاں آباد میں مقیم ہوا۔ یہ زمانہ شاہ عالم کی سلطنت کا تھا۔ اور ملک کی حالت نہایت ابتر تھی بنگالہ کا ملک انگریزوں کے قبضہ میں تھا اور اودھ کا ملک صوبہ دار اودھ نے دبا لیا تھا اُدھر قوم مرہٹہ ہر طرف ملک کو تاراج کر رہی تھی۔ نواب نجف خاں ذوالفقارالدولہ وزیر سلطنت تھے مگر بدنظمی رفع نہ ہوتی تھی۔ یہ تازہ وارد ولایتی قافلہ وزیراعظم سے ملا۔ وزیر ان سے مل کر بہت خوش ہوا اور ان سب کو نوکر رکھ لیا اور ان کی بسراوقات کے لئے ایک پرگنہ پہاسو جو علی گڑھ کے ضلع میں ہے جاگیر میں دیا اور کسی قدر شاہی فوج بھی مقرر کر دی کہ مرہٹوں کی روک تھام کرتے رہو۔ کئی برس یہ قافلہ شاہی ملازم رہا ہنوز کوئی کارنمایاں ان سے ظہور میں نہ آیا تھا کہ نواب نجف خاں وزیراعظم سے کسی بات پر بگاڑ ہوگیا یہ سب مغل زادے نوکری چھوڑ کر اکبرآباد چلے آئے وہاں رہنے لگے۔ اتفاق سے بھاؤ راؤ سندھیا نے ان کا حال سن کر اپنے پاس بلا لیا اور نوکر رکھ لیا نصراللہ بیگ خاں کو پورے کمپو کا افسر کیا اور خواجہ حاجی خاں کو ایک رسالہ کا رسالدار کیا اور ایک پوری پلٹن کی کمیدانی میرزا جیون بیگ خاں کو ملی۔ نصراللہ بیگ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا عبداللہ بیگ کو گھر پر چھوڑا تھا کہ متعلقوں کی نگرانی کریں۔ دوسرے مرزا عبداللہ بیگ نہایت متقی عبادت گزار تھے۔ خود بھی گھر پر رہ گئے۔ اس اثنا میں مرہٹوں کی شورش زیادہ ہوئی۔ نواب نجف خاں نے انگریزوں سے مدد چاہی کہ مرہٹوں کی سرکوبی کرو۔ انگریز یہ وقت ہی دیکھتے تھے فوراً رضامند ہوگئے اور فوج لے کر گوالیار پر یورش کردی خوب جنگ ہوئی مگر کچھ کام نہ نکلا آخر انگریز اپنی حکمت عملی کو کام میں لائے۔ بخشی بھوانی شنکر فوج مرہٹہ کی

بخشی کو جو اضلاع دہلی کا رہنے والا تھا لالچ دے کر توڑ لیا۔ فوج کو بیدل کر دیا۔ فوج حملے سے باز رہی مگر
ان مغلوں کی فوج مقابلہ میں ڈٹی رہی۔ انگریزی فوج کو بڑھنے نہ دیا۔ مجبور ہو کر جنرل مٹکاف لیک
کمانڈر انچیف نے مغلوں سے بھی پیام سلام جاری کیے۔ اُدھر بخشی نے بھی اُن کو روکا۔ جب مغل زادوں
نے یہ صورت دیکھی کہ کل فوج بیدل ہو گئی کام نہیں دیتی۔ ہماری قلیل فوج کہاں تک مقابلہ کرے گی۔
ناحق جان دینے سے کیا فائدہ۔ یہ سب بخشی کے پاس گئے اور گفتگو کی۔ بخشی نے کچھ توجہ نہ کی۔ پھر یہ سب راجہ
کے پاس گئے۔ بمشکل وہاں تک رسائی ہوئی۔ راجہ کو نشیب و فراز سمجھائے راجہ شراب میں بدمست پڑا تھا۔
جواب دیا کہ جاؤ بخشی سے کہو وہ جو حکم دے اُس کی تعمیل کرو۔ یہ مغل جواب سُن کر ناراض ہوئے اور استعفا دے کر
چلے آئے اور فوج سے علیحدہ ہو کر اکبر آباد آ گئے۔ انگریزی افسر کو اطلاع کر دی لو ہم تو جاتے ہیں ملک خالی
ہے قبضہ کر لو۔ اب کیا تھا انگریزوں نے ملک پر قبضہ کر لیا راجہ کا نشہ ہرن ہو گیا۔ چار و ناچار اطاعت قبول
کر لی۔ کمانڈر انچیف تاج بخشی کر کے چلا آیا۔ ان مغلوں نے اکبر آباد میں سکونت اختیار کی تھی۔ ایک عرصہ کے
بعد نصر اللہ بیگ خاں نے دہلی میں آکر اپنا عقد نواب احمد بخش خاں کی بہن سے کیا اور پھر اکبر آباد میں آ گئے
مگر اُن کی زوجہ تھوڑی مدت جی کر مر گئیں۔ پھر نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی کا عقد مرزا غلام حسین بیگ
اکبر آبادی کی بیٹی سے کیا اُس کے شکم سے دو فرزند ایک اسد اللہ خاں دوسرے یوسف بیگ خاں پیدا
ہوئے۔ یہ دونوں اُس وقت اپنے نانا کے گھر میں پرورش پاتے تھے اس اثنا میں مرزا عبداللہ بیگ پر ایک
ناگہانی واقعہ گزرا اور وہ فوت ہو گئے جس کا ذکر باعث طول ہی لہٰذا قلم انداز کیا۔ اُسی زمانہ میں سرکار
انگریزی کو پھر فراہمی فوج کی ضرورت ہوئی کہ جاٹ کی قوم نے بغاوت شروع کر دی تھی۔ کمانڈر انچیف نے
مرزا نصر اللہ بیگ خاں کو بلا کر کہا کہ تمہاری شجاعت اور بہادری ہم پر خوب روشن ہے ہم تم کو فوج دیتے
ہیں تم ہمارے ساتھ بھرت پور پر یورش کرو اور فیروز پور میوات کی طرف جا کر مورچہ قایم کرو اور رسد کا
انتظام کرتے رہو۔ ہم نے سرکار الور کو بھی اطلاع دی ہے وہاں سے احمد بخش خاں وکیل راج رسد کا بندوبست
کریں گے۔ چنانچہ کمانڈر انچیف نے ایک بڑے کمپو کا افسر نصر اللہ بیگ خاں کو کیا اور عہدہ رسالداری خواجہ
حاجی کو دیا اور ایک پلٹن کا کمیدان میرزا جیون بیگ خاں کو کیا۔ یہ مغل حسب الحکم فیروز پور میوات پر آئے اور مو

قایم کر دیا اُدھر بختاور سنگھ راجہ الور نے معرفت احمد بخش خاں اپنے وکیل کے رسد کا بندوبست کر دیا اور فوج سے بھی مدد دی۔ آخر انگریزی فوج نے اکبرآباد سے بھرت پور پر یورش شروع کی۔ ادھر نصراللہ بیگ خاں بھرت پور کے شمالی سمت سے حملہ کرتے تھے اُدھر احمد بخش خاں مغربی علاقہ کو تاراج کر رہے تھے غرض سب سے پہلے شمالی سمت بھرتپور کی نصراللہ بیگ خاں نے فتح کر لی پھر انگریزی فوج نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ راجہ نے اطاعت قبول کی۔ بعد فتح ہونے بھرت پور کے انگریزی فوج اکبرآباد واپس آگئی اب انگریزوں نے دیکھا کہ راجپوتانہ بالکل فتنہ و فساد سے پاک ہے اُس وقت جدید فوج کو موقوف کر دیا اور نصراللہ بیگ خاں کو اس فتح کی خیر خواہی کے صلہ میں دو پرگنہ سونک سونسا اور پونہ ہانہ ہوڈل۔ پلول کے علاقہ میں پانچہزار روپے سالانہ آمدنی کے ۱۸۰۶ء میں نسلاً بعد نسلٍ جاگیر میں عطا کئے اور مرزا جیون بیگ خاں کے سو روپے ماہانہ نقد پنشن مقرر کی اور اسی زمانہ یعنی ۱۸۰۶ء میں احمد بخش خاں کو بصلہ خیر خواہی پانچ لاکھ کا ملک فیروزپور جھرکہ علاقہ میوات دے کر رئیس خود مختار کیا اور الور کی سرکار سے بھی ایک پرگنہ لوہارو ایک لاکھ کی آمدنی کا اسی خیر خواہی میں احمد بخش خاں کو ملا تھا۔ نصراللہ بیگ خاں چند سال زندہ رہی مگر چھوٹے بھائی کے غم میں تحلیل ہو گئے تھے۔ آخر عمر نے وفا نہ کی انتقال ہو گیا۔ اُن کے بعد خواجہ حاجی خاں اُن کے بھتیجے یعنی راقم کے حقیقی دادا نصراللہ بیگ خاں اپنے چچا کی اولاد اور متعلقین کی سرپرستی کرتے رہے اُس وقت مرزا اسداللہ خاں کی عمر نو برس کی تھی اور یوسف بیگ خاں پانچ برس کے تھے ایک ایرانی اہلِ فضل و کمال ان کو تعلیم دیتا تھا۔ بعد وفات نصراللہ بیگ خاں کے مرزا خواجہ حاجی خاں نے اپنے چچا کی جاگیر کا استغاثہ کیا۔ احمد بخش خاں نے بھی سفارش کی۔ سرکار نے وہ جاگیر بدستور خواجہ حاجی خاں کے نام نسلاً بعد نسلٍ مقرر کر دی اور عہد نامہ میں لکھ دیا کہ یہ جاگیر بعد نصراللہ خاں کے سرکار سے تم کو عطا ہوئی ہے تم متعلقان نصراللہ بیگ خاں کی بھی پرورش اور دستگیری کرتے رہو چنانچہ خواجہ حاجی خاں بطور اپنے فرزندوں کے ان بچوں کی پرورش کرتے رہے۔ بعد ایک مدت کے خواجہ حاجی خاں معہ متعلقان نصراللہ بیگ خاں دہلی میں اکبرآباد سے آئے اور مرزا جیون بیگ خاں بھی دہلی میں آ گئے اُس عرصہ میں مرزا جیون بیگ کے ہاں تین اولاد ہوئی تھیں ایک دختر مہرالنسا خانم اور دو فرزند اکبر بیگ و افضل بیگ۔ دختر کی عمر چودہ سال کی تھی اور اکبر بیگ بہن سے

چھوٹے بیٹے اور اُن سے چھوٹے افضل بیگ تھے۔ خواجہ حاجی خاں نے تھوڑے دن ٹھہر کر عقد کرنے کا ارادہ کیا
چنانچہ مرزا جیوان بیگ خاں کی دختر سے عقد کر لیا۔ اُن کے شکم سے دو فرزند ایک دختر تولد ہوئے۔ دختر کا خورد
سالی میں انتقال ہو گیا۔ دونوں فرزند یعنی خواجہ شمس الدین خاں و خواجہ بدرالدین خلف باپ کی یادگار رہے
اس اثنا میں ایک دن نواب احمد بخش خاں دہلی میں آئے ہوئے تھے۔ خواجہ حاجی خاں سے ملنے کو آئے اور
ہنگام گفتگو یہ بیان کیا کہ بھائی تم اپنی جاگیر کے انتظام میں تکلیف پاتے ہو گے۔ بہتر اور مناسب یہ ہے کہ اپنی
جاگیر میری ریاست کے شامل کر دو۔ جاگیر کی آمدنی بہ آسایش پہونچا کرے گی۔ خواجہ حاجی خاں رضامند ہو گئے
اور سرکار انگریزی میں درخواست دیدی نواب احمد بخش خاں نے بھی سفارش کر دی۔ وہ جاگیر فیروزپور کی
ریاست کے شامل ہو گئی اور نواب احمد بخش خاں کو سرکار نے خط لکھدیا کہ خواجہ حاجی خاں کی جاگیر تمہاری
ریاست کے شامل کی جاتی ہے کس لئے کہ تمہاری سرحد سے ملی ہوئی ہے۔ تم کو لازم ہے کہ تم اس جاگیر کی پوری
آمدنی خواجہ حاجی خاں اور متعلقان نصراللہ بیگ خاں کے لئے دوام کو جاری رکھو۔ اور دیتے رہو۔ چنانچہ یہ
گورنمنٹ انگریزی کا خط عہد نامجات میں بنام احمد بخش خاں چھپا ہوا ہے اور یہ معاملہ ۱۸۰۵ء کا ہے اس کارروائی
کے بعد خواجہ مرزا اعلائی خاں نے مرزا اسداللہ خاں کا عقد الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی اُمراؤ بیگم
سے کر دیا۔ کس لئے کہ دونوں بھائی جوان ہو گئے تھے۔ اسداللہ خاں کے ہاں ایک لڑکا ہوا تھا مگر زندہ نہیں
رہا لاولد رہے۔ دوسرے بھائی یوسف بیگ خاں کا عقد خواجہ حاجی خاں نے اپنے سیدات کی رشتہ کی
بہن سے کر دیا۔ جن کے بطن سے ایک دختر تولد ہوئی اور وہ صاحب اولاد ہوئی جس کی نسل اب تک حیدرآباد
میں موجود ہے اور بہ اقبال مندی بسر کرتی ہے۔ اب زمانہ وہ ہے کہ خواجہ حاجی خاں کا بعارضہ فالج بعمر چونسٹھ
برس انتقال ہو گیا۔ اور نواب احمد بخش خاں رئیس فیروزپور بھی راہی ملک بقا ہوئے۔ ان کے بعد نواب
شمس الدین احمد خاں بڑے صاحبزادہ مسند نشین ریاست ہوئے۔ مدت تک حکمراں رہے۔ اتفاق سے شمس الدین
خاں پر ایک مقدمہ قتل رزیڈنٹ دہلی کا قایم ہوا اور مقدمہ کو بڑا طول کھنچا۔ آخر بعد تحقیقات کامل سرکار
انگریزی نے شمس الدین خاں کو پھانسی دیدی۔ ملک ضبط کر لیا۔ ہماری جاگیر بھی ملک کے ساتھ ضبطی میں آگئی
کیوں کہ اُسی ریاست کے شامل ہو چکی تھی۔ میرزا اسداللہ خاں کو اُن کے ہم چشموں اور احباب وغیرہ نے اغوا

کرنا شروع کیا کہ یہ وقت اچھا ہی۔ جاگیر تمہارے چچا کی ہی تم وارث ہو۔ دعویٰ کرو اور قابض ہو جاؤ۔ اسد اللہ خاں کے چھوٹے بھائی دیوانگی کی حالت میں تھے۔ کسی قابل نہیں تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں لوگوں کے بہکانے سے برخلاف ہو گئے اور جاگیر کا استغاثہ کر دیا۔ بھتیجوں نے چچا کو سمجھایا کہ آپ ایسا نہ کریں۔ جاگیر ہاتھ سے جاتی رہیگی پھر کیا ہوگا۔ مگر مرزا اسد اللہ خاں نے نہ مانا اور دعویٰ کر دیا۔ مجبور ہو کر بھتیجوں نے بھی دعویٰ پیش کیا کہ جاگیر ہمارے باپ کو ملی ہی۔ ہم وارث ہیں ہم کو ملنی چاہیئے۔ غرض یہ مقدمہ کئی برس دائر رہا۔ جملہ دعویدار معاش سے پریشان رہے۔ انجام کار سرکار کی حکمت عملی کام آگئی۔ عدالت نے یہ تجویز کی کہ آئندہ سے جاگیر کی آمدنی نصف متعلقان نصر اللہ بیگ خاں کو اور نصف متعلقان خواجہ حاجی خاں کو ملتی رہیگی۔ جاگیر نہیں ملے گی فریقین کو حکم سُنا دیا گیا۔ مرزا اسد اللہ خاں نے بہت کوشش کی۔ کلکتہ گئے اور ولایت میں استغاثہ کیا۔ مگر ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ جو سرکار نے تجویز کر دی اُس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جاگیر کی تعدی حسب الحکم سرکار سے اجرا ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا اسد اللہ خاں کی دونوں پھوپیاں مرگئیں اُن کا حصہ ضبط ہو گیا اُن کے بعد یوسف بیگ خاں مر گئے اُن کا حصہ ضبط ہو گیا مگر سرکار نے اُن کی زوجہ کے نام گزارہ کے لئے تیس روپیہ مہینہ مقرر کر دیا اس کے بعد مرزا اسد اللہ خاں بعد ایام مفسدہ ۱۸۵۷ء ۱۲۸۳ھ میں جاں بحق ہوئے اُن کا حصہ ضبط ہوا۔ اسد اللہ خاں کے اوصاف و کمالات عالم پر ظاہر ہیں۔ اُن کی تصنیف خود کہتی ہے اُن کے بعد خواجہ شمس الدین خاں غالب کے بھتیجے راقم کے چچا ۱۲۸۵ھ چونسٹھ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے اُن کی والدہ اُن سے قبل مر گئی تھیں۔ خواجہ شمس الدین نے فن موسیقی میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ اس فن کے کامین داد دیتے تھے اور اُن کی دن رات عبادت گزاری میں بسر ہوتی تھی اُن کے بعد خواجہ بدر الدین خاں راقم کے والد ماجد نے بھی بعمر چونسٹھ سال ماہ اگست ۱۸۷۹ء میں وفات پائی اور اُن کی اولاد میں ایک فرزند اور ایک دختر رہی ایک دختر صاحب اولاد اور ایک فرزند اکبر خواجہ قمر الدین خاں راقم باقی رہے۔

خواجہ بدر الدین خاں اپنے وقت کے مجمع کمالات تھے خوشنویسی میں ایسے ہی تھے مصوری اور ستار نوازی میں کامل فن رعنائی اور خوش تقریری میں لاجواب تھے۔ جیسا کہ اُن کے چچا مرزا اسد اللہ خاں غالب نے جلد اوّل بوستانِ خیال کے دیباچہ میں لکھا ہی کہ میرا بھتیجا وصف کمالات میں یکتا ہی ستار بجایا تو ایسا بجایا کہ تان سین کو

انگلیوں پر نچایا۔ مصوری میں مانی کو پرے بٹھایا۔ الیٰ آخرہ۔ حق یہ ہی کہ خواجہ بدرالدین خاں ہمہ صفت موصوف تھے اُن کی تصنیف افسانہ بوستانِ خیال گواہی دیتا ہی اور عالم جانتا ہی۔ غرض جب خاندان میں سوائے اس ناشاد ننگ خاندان خواجہ قمرالدین خان راقم کے کوئی نہ رہا۔ جاگیر کی آمدنی بند ہوگئی۔ پھر اس بے بضاعت خواجہ قمرالدین خاں راقم نے اپنی موروثی جاگیر کا استغاثہ کیا۔ حکام ضلع نے بعد تحقیقات کامل پچاس روپیہ ماہوار میرے گزارے کے لئے تجویز کئے۔ کل محکموں سے وہ رقم منظور ہوگئی۔ جس وقت حکام ماتحت کی رپورٹ گورنمنٹ کے ملاحظہ میں پیش ہوئی مجھ بدنصیب کی تقدیر اُلٹ گئی۔ گورنمنٹ نے پچیس روپیہ ماہوار بطور پنشن منظور فرمائے۔ قہر درویش بجان درویش سمجھکر خاموش رہا۔ مگر اللہ کا شکر ہی کہ مہاراج رام سنگھ والیِ جے پور نے اپنی سرکار سے اس قدر وظیفہ فقیر کا مقرر کر دیا جو آج تک اُس سرکار سے ملتا ہی اور خاکسار بدعائے دولت و اقبال سری حضور مہاراجہ صاحب فرماں روائے حال جے پور میں بسر کرتا ہی۔ خواجہ قمرالدین خاں کی اولاد میں دو دختر نیک اختر صاحب اولاد اور ایک فرزند ارجمند خلف الرشید خواجہ مرزا امیرالدین خاں صاحب اولاد نمک خوار سرکار آصفی بخوش اقبالی عہدہ جلیل پر ممتاز ہے۔ اپنی سوانح عمری گزارش کرتا ہی کہ ابتدائی عمر میں اوّل بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی ملازمت سے ممتاز ہوا فن تیراندازی میں بادشاہ کا شاگرد ہوگیا۔ پندرہ روپے ماہانہ سرکار شاہی سے دو برس تک ملتا رہا بعد اس کے بادشاہ نے اپنے ولیعہد مرزا فتح الملک کے مجھے سپرد کر دیا۔ دو برس اُن کی ملازمت میں رہا۔ اتفاق سے مرزا فتح الملک کا وبائے ہیضہ میں انتقال ہوگیا۔ پھر میں ریاست الور میں اپنے والد کے پاس چلا گیا راجہ بنے سنگھ والی الور نے مجھے رکھ لیا اور اپنے فرزند شیودان سنگھ کی تعلیم میں سپرد کر دیا۔ چالیس روپے ماہوار میرے مقرر کئے۔ شیودان سنگھ کی نو برس کی عمر تھی۔ مجھسے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ مجھے نوکر ہوئے چار برس گزرے تھے کہ دہلی میں بغاوت ہوگئی اور عالم پر آشوب ہوگیا۔ انھیں ایّام میں راجہ بنے سنگھ مرض فالج میں مبتلا ہوئے اور اُسی مرض میں مرگئے۔ شیودان سنگھ کی والدہ نے مجھے تاکید کی کہ شیودان سنگھ کو ایک لمحہ تنہا نہ چھوڑو رات دن اُن کے پاس رہو اس کے علاوہ شیودان سنگھ خود مجھسے اس قدر مانوس تھے کہ مجھے جُدا نہونے دیتے تھے۔ اس عرصہ میں دہلی فتح ہوگئی۔ بعد ایک سال کے الور کے بعض ؟ اُسی آشوب عالم میں باغی ہوگئے

شہر میں فساد برپا کر دیا۔ جتنے اہلکار دہلی والے الور میں تھے سب کو اخراج کر دیا۔ اب الور جائے امن نہ رہا۔ اب بہ مصلحت والد نے وہاں سے علیحدہ ہونا چاہا مگر وہ باغی راجپوت ہماری علیحدگی پر راضی نہ ہوئے اس اثنا میں دہلی سے پنشن کی تحقیقات کے لئے حکام کا حکم آیا۔ اُس وقت بمشکل الور سے میں بھی اور والد بھی علیحدہ ہوئے۔ والد دہلی کو روانہ ہوئے اور میں جے پور آ گیا۔ مہاراج شیودان سنگھ اپنی جیب خاص سے مجھے خرچ بھیجتے رہے۔ ایک سال تک میں جے پور میں رہا۔ اس عرصہ میں والد کی پنشن کھل گئی اور میں بھی دہلی چلا گیا۔ وہاں میں نے چھاپہ خانہ جاری کر لیا۔ والد بوستانِ خیال کا ترجمہ کرتے تھے۔ میں بھی ترجمہ میں شریک رہتا تھا اور چھپواتا تھا۔ میرے والد نے چھ جلدوں کا ترجمہ کیا۔ پانچ جلدیں چھپوا کر شائع کر چکے تھے کہ اُن کی عمر نے وفا نہ کی۔ بعد ان کے اس بے مایہ نے جلد ششم ترجمہ شدہ چھپوا دی اور دو جلدوں کا ترجمہ خود کر کے شائع کر دیا جو اُن کی یادگار میں باقی ہے۔ اس اثنا میں میرے ایک دوست کرم فرما مولوی سید حسین صاحب بلگرامی سکریٹری نواب میر تراب علی خاں سر سالار جنگ نے مجھے نامہ لکھ کر اپنے پاس حیدر آباد دکن میں بلا لیا۔ میں حسب الطلب اپنے مخدوم کے روانہ ہو گیا۔ میرے مخدوم سراپا کرم نے مجھے سر سالار جنگ سے ملا دیا۔ سالار جنگ نے مجھے روک لیا۔ دو برس اُمید واری میں رہا بعد اُس کے میں نے عرض کیا کہ اب اس اُمیدوار کو کیا حکم ہے۔ نواب نے (فرمایا) کہ ہم نے تیرے لئے تجویز کر لیا ہے فی الحال ہم شاہزادہ ولیعہد کے استقبال کو بمبئی جاتے ہیں وہاں سے آتے ہی بندوبست کر دیں گے مگر میری تقدیر میں اُس سرکار (کا) آب و دانہ نہ تھا جب نواب بمبئی روانہ ہو گئے خیال آیا کہ تو بھی یہ جلسہ نادر دیکھ آ۔ بس یہ خیال آتے ہی میں بھی بمبئی میں آگیا ایک سوداگر اہلِ دہلی کی دوکان میں مقیم ہوا۔ بارہ دن ٹھیرا۔ جلسہ وغیرہ جب ختم ہو گیا قصد ہوا کہ نصف دُور تو آ گیا ہے کہ وطن چل کر ایک ہفتہ کے لئے بال بچوں سے مل آ۔ آخر یہی کیا۔ کُل مال اسباب جو پانچسو روپے کی مالیت تھا۔ سوداگر کی دوکان میں رکھکر وطن میں آ گیا۔ یہاں آکر سُنا کہ جے پور کی ریل کھل گئی ہے۔ ارادہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے لئے جے پور چل کر عزیزوں سے مل آؤ۔ اور کچھ ہتیار وقتِ روانگی جے پور سے وہاں چھوڑ آیا تھا۔ اگر بچ رہی ہوں وہ بھی لے کر فروخت کر دو تاکہ زادِ راہ ہو جائے یہ قصد کر کے جے پور روانہ ہو گیا

بس جو وہ پہونچا تھا کہ اُس سرزمین نے پاؤں پکڑ لیے۔ مہاراج رام سنگھ کو خبر ہوئی مہاراج
نے مجھے بلا کر روک لیا۔ جانے نہ دیا اور کسی قدر وظیفہ دوامی میری مدد خرچ کو مقرر فرمایا اور یہ
اقرار کیا کہ ہم جلد تیری ترقی کریں گے اس کے بعد مہاراج سنگھ مرگئے میری تقدیر وہاں پست ہوگئی
بس وہی جزو قلیل تقدیر کا رہ گیا۔ اس بے مایہ کی زندگی اسی قلیل بضاعت میں بسر ہوتی ہے اس
فقیر کی عمر قریب بچھتر کے ہوگئی ہے۔ زندگی مثل چراغ سحری کے ہے۔ اللہ بس ما سوا ہوس۔ فقط

سنسکرت کے عربی اور فارسی تراجم

یعنی

مسلمانوں کے ذوقِ علمی کی ایک دلچسپ تاریخ

از

جناب شیخ محمد اسمٰعیل سکرٹری اورینٹل پبلک لائبریری پانی پت

تمہید

مسلمانوں کا قدیم تمدن

گزشتہ اقوامِ عالم میں تہذیب و شائستگی اور اشاعتِ علوم و فنون کے لئے جیسا عہد مسلمانوں کا رہا ہے اُس کی مثال تاریخ قدیم میں کم ملتی ہے۔

ا۔ سیاسی ترقی

حکومت کے لحاظ سے جو ترقی اُنہوں نے دنوں میں کی دوسری اقوام کو برسوں کیا صدیوں میں بھی نصیب نہیں ہوئی۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۱ھ / ۶۳۲ء) سے پہلے پہلے تمام عرب پر اسلامی قبضہ ہوچکا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۱۱ھ / ۶۳۲ء تا ۱۳ھ / ۶۳۴ء) کے عہد میں تمام عراق عرب۔ بصریٰ اور دمشق کے علاقے فتح ہوگئے۔ حضرت عمرؓ کے عہد (۱۳ھ / ۶۳۴ء تا ۲۳ھ / ۶۴۴ء) میں طبریہ۔ فلسطین۔ عسقلان۔ بعلبک۔ حمص۔ حلب قیصریہ۔ قنسرین۔ انطاکیہ اور بیت المقدس پر اسلامی جھنڈا لہرانے لگا۔ ملک شام جس میں رومی سات سو برس سے حکمراں تھے سات برس کے اندر مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ حضرت عمرؓ کی افواج قاہرہ نے بہت جلد ایران کو فتح کرلیا اور ایران کی شاہنشاہیت جس نے قدامت کی قسم کھا رکھی تھی صرف دو مہینے میں عربوں کی ہاتھ آگئی۔ مغرب میں مصر کا علاقہ اور نوبہ کا ملک دونوں فتح ہوگئے۔ حضرت عثمانؓ (۲۳ھ / ۶۴۴ء تا ۳۵ھ / ۶۵۶ء) کے عہد میں شمالی افریقہ کے بہت سے

علاقے خلیفۂ اسلام کے زیرنگین ہوگئے۔ گنجہ۔ بروعہ۔ شروان۔ خراسان۔ طوس۔ ہرات۔ نیشاپور۔ کرمان۔ سیستان۔ بیلقان۔ طالقان۔ فاریاب اور سرخس کے علاقے فتح ہوئے۔ اسلامی سپہ سالار ایران کا پورا ملک فتح کرکے قفقاز تک فوج لے گئے اور پھر ہندوستان تک جا پہنچے۔ سنہ ۴۴ھ/۶۶۴ء میں کابل فتح ہوا۔ مغرب کی جانب ساحلِ بربر سے گزر کر ٹیونس فتح کیا اور آگے بڑھکر شہر کا ریجج پر اپنا جھنڈا اگاڑ دیا۔ حضرت معاویہؓ (۴۱ھ/۶۶۱ء تا ۶۰ھ/۶۸۰ء) کے زمانہ میں شمالی افریقہ کے تمام علاقے فتح ہوگئے۔ بارہ سو جہازوں نے بحیرہ روم کا دورہ کرکے تمام سمندری جزائر پر قبضہ کرنے کے بعد صقلیہ (جزیرہ سسلی) کو فتح کیا۔ قسطنطنیہ پر متواتر حملے کئے اور دریائے جیحوں کے پار ہوکر سمرقند پر جا ڈیرا جمایا۔ حضرت معاویہؓ کے بعد خلفائے بنو اُمیہ نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا اور ایشیا میں سرحدِ چین تک اور یورپ میں بحرِ اوقیانوس تک پہنچے۔ سنہ ۹۳ھ/۷۱۲ء میں آبنائے جبل طارق کو عبور کیا اور عیسائی قوم گاتھ سے سپین کا تمام علاقہ چھین لیا۔

غرض حضور رسول کریم صلعم کی وفات سے سَو ہی برس بعد اسلامی سلطنت نے وہ وسعت حاصل کر لی جو تاریخ عالم میں نہایت حیرت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ یہ حکومت اُس وقت کوہ پرنیز (حدفاصل سپین و فرانس) و جبل طارق سے ہندوستان (دریائے سندھ) تک اور سواحل بحیرہ روم سے افریقہ کے ریگستانِ اعظم تک پہنچی تھی۔ ایشیا کا بہت بڑا حصہ۔ عربستان سے ترکستان تک اور کشمیر سے خلیج فارس تک خلفائے اسلام کے ماتحت تھا۔ ایران فتح ہوچکا تھا بادشاہ کابل اور سندھ کے کل رئیس اسلام کے خراج گزار تھے۔ یورپ میں سپین کا علاقہ۔ جزائر بحیرہ روم اور سسلی پر اسلامی قبضہ تھا۔ افریقہ میں مصر۔ بربر۔ مراکش۔ ٹیونس۔ طرابلس اور نوبہ کے تمام ممالک مسلمانوں کی حکومت میں داخل ہوچکے تھے اور ان تمام ممالک پر اسلامی پھریرا اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ لہرا رہا تھا۔ غرض اُس وقت کی معلومہ دنیا کے اکثر حصے اور تمام مشہور ممالک پر مسلمانوں ہی کا قبضہ تھا۔ یقیناً تاریخ مشکل سے کوئی ایک قوم مسلمانوں کے مقابلہ میں ایسی پیش نہیں کرسکیگی جس نے اتنے قلیل عرصہ اور صرف ایک صدی میں اتنے کثیر اور بے شمار بلاد و ممالک کو فتح کرلیا ہو۔

ب۔ علمی ترقی | علوم و فنون کی طرف جس شوق اور انہماک کے ساتھ اُنہوں نے توجہ کی اور علم کے اس میدان میں جس بے تعصبی اور عالی حوصلگی کے ساتھ اُنہوں نے قدم رکھا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ جہاں سے جو بھلی اور کام کی بات ملی اُنْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ کے ماتحت وہ اُن کی ملکیت تھی۔ چنانچہ مختلف بلادِ اسلامیہ میں ہر قسم کے علوم کے سیکڑوں

ماہر اور مشاہیر موجود تھے۔

علمی ترقی کی تقسیم

علوم و فنون کی اشاعت کے طریقے مندرجۂ ذیل تھے۔

(۱) سلطنت کی جانب سے ترویج علوم کے مختلف محکمے قائم تھے۔ صیغۂ تراجم باقاعدہ طور سے موجود تھا جس میں لائق مترجمین اور ماہر زبان علماء سے لاطینی۔ عبرانی۔ سریانی۔ کلدانی۔ نبطی۔ قبطی۔ یونانی۔ فارسی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں کی چیدہ اور نایاب کتابوں کا ترجمہ کرایا جاتا تھا جس کے معاوضہ میں اُن کو بیش قرار تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

(۲) سلطنت کی سرپرستی کے علاوہ اکثر شائقِ علم اُمراء معقول تنخواہوں پر مترجمین کو ملازم رکھتے اور اُن سے اپنے شوق کی کتابیں ترجمہ کراتے تھے۔

(۳) علمائے مصر خود اپنے شوق سے بھی اکثر ہر قسم کی کتابوں کے ترجمے کرتے رہتے تھے۔

غرض سلطنت کی حمایت۔ امراء کے شوق اور علماء کے ذوق نے مل کر ہر قسم کے علوم و فنون کا ایک بہت بڑا ذخیرہ عربی میں منتقل کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ممالک اسلامیہ کے ہر ایک شہر میں علوم کے سمندر لہریں مار رہے تھے۔

یورپ کی موجودہ ترقی کی اصل

بلاشائبۂ شک یورپ کی موجودہ ترقی کے اصل اصول یہی ترجمے تھے۔ مولانا حالی مرحوم اپنے مسدس میں کتنی سچی بات کہتے ہیں ؎

وہ قومیں جو ہیں آج سرتاج سب کی
کنوڈی رہیں گی ہمیشہ عرب کی

یہی ترجمے تھے جن کی وجہ سے آج دنیا میں افلاطون۔ بقراط۔ سقراط اور بطلیموس وغیرہ یونانی حکماء کی تصنیعات موجود ہیں ورنہ اُن کے ناموں کا جاننے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ چہ جائیکہ اُن کی تصانیف سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے ان حکماء کے ناموں کو زندہ کیا اور زندہ رکھا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

وہ لقمان و سقراط کے دُرِّ مکنوں | وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطوں
ارسطو کی تعلیم۔ سولن کے قانوں | پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں
یہیں آکے مہرِ سکوت اُن کی ٹوٹی | اسی باغِ رعنا سے بو اُن کی پھوٹی

یہ تھا علم پرواں توجہ کا عالم — کہ ہو جیسے مجروح جویائے مرہم
کسی طرح پیاس اُن کی ہوتی نہ تھی کم — بجھاتا تھا آگ اُن کی باراں نہ شبنم
حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا — فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا — مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا
کیا برطرف پردہ چشمِ جہاں سے
جگایا زمانہ کو خوابِ گراں سے

سنسکرت تراجم اور مسلمان

ترقیاتِ علمی کی یہ دلچسپ تاریخ بہت سے حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے۔ لیکن فی الحال ہم قارئین کرام کو صرف یہ بتائیں گے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد علمی میں ہندوستان کے علمی خزائن سے کس قدر فائدہ اُٹھایا۔ سنسکرت لٹریچر سے کس قدر اعتنا کیا اور اس کی کون کون سی کتابوں کو عربی اور فارسی کا جامہ پہنایا۔ یہ ایک نیا اور دلچسپ مضمون ہے جو مفصل طور سے پہلی مرتبہ اُردو میں آیا ہے۔

سنسکرت تراجم پر مولانا شبلی کا مضمون

اس سے پہلے چند سال ہوئے صرف مولانا شبلی مرحوم نے اپنی کتاب "تراجم" میں دوسری زبانوں کی ذیل میں سنسکرت کے تراجم کی مختصر اور سرسری سی تاریخ بیان کی ہے۔

شبلی مضمون کو مکمل کیوں نہ لکھ سکے

شاید مولانا مرحوم اسے کچھ مفصل بیان کر سکتے مگر سنسکرت کتب کے ناموں کی صحت اور تلفظ الفاظ سے گھبرا کر اس فقرہ پر اپنے مضمون کو ختم کر دیا کہ "مبہم اور غیر صحیح التلفظ نام لکھتے لکھتے میں عاجز آگیا ہوں"

اس موضوع پر ہمارا مضمون

شاید مذکورۂ بالا دقت ہی کے باعث اس موضوع پر اب تک کوئی مستقل و مفصل مضمون نہیں لکھا گیا مگر الحمد للہ عرصہ کی تلاش و جستجو اور بہت سی کتب و رسائل کے انتخاب و اقتباس کے بعد آج ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ سنسکرت کے عربی اور فارسی تراجم پر ایک مبسوط مضمون ہدیہ ناظرین کر سکیں۔ غالباً

اُردو میں اس موضوع پر یہ سب سے پہلا مفصل مضمون ہی۔ جس کی ایک ایک سطر بہت سے مطالعہ اور ایک ایک فقرہ بڑی تلاش کا نتیجہ ہی۔

قبل اس کے کہ اصل مضمون کو شروع کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اُن کتب اور رسائل کی یہاں ایک فہرست لکھدی جائے جن کی مدد سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مضمون ہذا ترتیب دیا گیا ہی۔ اس فہرست سے ناظرین اُس محنت کا کچھ اندازہ لگا سکیں گے جو مضمون کو اتنی کتابوں سے انتخاب و اقتباس کر کے مرتب کرنے میں پیش آئی ہوگی

فہرست کتب جن سے اس مضمون میں امداد لی گئی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		ا۔ کتب اُردو	
۱	رسائل شبلی	شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم	مولانا کے ۱۱ تاریخی اسلامی مضامین کا مجموعہ ہی جو نہایت تحقیق سے مرتب کئے گئے ہیں
۲	مقالاتِ شبلی	ایضاً	اس میں بعد کے تیرہ مضامین جمع کئے گئے ہیں
۳	بیانِ خسرو	ایضاً	حضرت امیر خسرو دہلویؒ کی مختصر سوانح عمری ہی جس میں اُن کے کلام پر تنقید کی گئی ہی
۴	شعر العجم	ایضاً	فارسی شاعری کی تاریخ۔ شعرائے عجم کا مفصل تذکرہ اور اُن کے کلام پر ریویو پانچ جلدوں میں
۵	تذکرہ ابو ریحان بیرونی	منشی محمد عنایت اللہ بی۔ اے	بیرونی کی مختصر سوانح عمری ہی
۶	تاریخ ہند حصہ اول	ای مارسڈن و لالہ جیارام	ہندوستان کی مختصر با تصویر تاریخ دو حصوں میں ہی
۷	البرامکہ	منشی محمد عبدالرزاق کانپوری	خاندان برامکہ کی مفصل اور مشرح تاریخ تین یکجائی حصوں میں ہے۔ نہایت تحقیق اور تلاش کے ساتھ مرتب کی گئی ہی طرز بیان شستگیِ زبان اور ترتیب مضامین کے لحاظ سے قابل قدر ہی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۸	مختصر تاریخ ہند	تھبرج صاحب	
۹	تاریخ التمدن الاسلامی جلد سوم	جرجی زیدان اڈیٹر الہلال مصر	مسلمانوں کی علمی ترقیات کی مفصل تاریخ ہے۔ مولانا محمد اسلم جیراجپوری نے علوم عرب کے نام سے اس کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا
۱۰	طوطا کہانی	سید حیدر بخش حیدری	معمولی کہانیوں کی کتاب ہے
۱۱	نوشیرواں نامہ	منشی دیبی پرشاد مورخ راجپوتانہ	نوشیروانِ عادل کی مفصل سوانح عمری ہے
۱۲-۱۳	بستانِ حکمت	مترجمہ فقیر محمد خاں گویا	مشہور کتاب انوار سہیلی کا ترجمہ ہے۔ اس کے دو نسخوں سے مدد لی گئی ہے ایک ۱۸۹۱ء کا مطبوعہ ہے دوسرا ۱۹۱۴ء کا
۱۴	مشرح سسشرت حصہ اول	مترجمہ پنڈت ٹھاکر دت شرما	سنسکرت کی مشہور کتاب سشرت سنگھتا کے چار حصوں میں سے پہلے حصے کا ترجمہ مع تشریح ہے
۱۵	چرک	شائع کردہ آیوروید فارمیسیوٹیکل کمپنی لمیٹڈ لاہور	انہیں ناموں کی سنسکرت کتابوں کا ترجمہ ہیں
۱۶	سسشرت	شائع کردہ آیوروید فارمیسیوٹیکل کمپنی لمیٹڈ لاہور	انہیں ناموں کی سنسکرت کتابوں کا ترجمہ ہیں
۱۷	سنسکرت علم ادب	محمد شفیع الدین خاں مرادآبادی	اس میں سنسکرت کی مختلف تصانیف کی مختصر کیفیت بیان کی گئی ہے
۱۸	مختصر تاریخ اسلام جلد اول	ماسٹر ذاکر حسین	شروع سے اب تک کے تمام شاہانِ اسلام اور ممالک اسلامیہ کی نہایت جامع لیکن مختصر تاریخ ہے
۱۹	تاریخ کلیلہ و دمنہ	شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی	کتاب کے دوسرے ملکوں میں جانے اور اس کے مختلف تراجم کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۰	ہندو انسائیکلوپیڈیا	پادری پی کیول سنگھ	بے نظیر اور جامع کتاب ہے افسوس ہے کہ پانچ حصوں تک چھپ کر رہ گئی
۲۱	ہندوؤں کی تاریخ	وشنو	اس میں سنسکرت کی قدیم تصانیف کا تذکرہ اور ہندو تہذیب و شائستگی کا بیان بہت محنت سے مرتب کرکے لکھا ہے
۲۲	دربار اکبری	مولوی محمد حسین آزاد	اس میں عہد اکبری کی تصویر دلنشیں پیرایہ اور دلچسپ عبارت میں کھینچی گئی ہے دربار کے تمام باکمالوں کی سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں
۲۳	تاریخ الاطباء	شمس الاطباء ڈاکٹر غلام جیلانی	ہر مذہب و ملت کے ۴۶۶ قدیم اطبا۔ وید اور ڈاکٹروں کا تذکرہ نہایت خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ شروع میں علم طب کی مختصر تاریخ بیان کی ہے
۲۴	البیرونی	مسٹر سید حسن برنی بی۔اے	اس میں بیرونی کی مفصل سوانح عمری اور اس کی کتابوں پر مکمل تنقید درج ہے۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی ہے
۲۵	گلشن ہند	میرزا علی لطف	شعرا کا قدیم تذکرہ ہے۔ مولانا شبلی نے تصحیح اور ترمیم و تنسیخ کی اور مولوی عبدالحق بی اے نے زبان اردو کی تاریخ کے متعلق ایک زبردست مقدمہ کا اس پر اضافہ کیا
۲۶	مختصر تاریخ آرین علم طب	مترجمہ لالہ رام کرشن	سر بھگونت سنگھ کی انگریزی تصنیف کا ترجمہ ہے
۲۷	فرہنگ آصفیہ جلد اول	منشی سید احمد دہلوی مرحوم	اردو زبان کی مکمل۔ مفصل اور ضخیم لغت چار جلدوں میں ہے

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۸	تاریخ ہندوستان جلد ہفتم	شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ	ہندوستان کے عہد اسلامیہ کی مبسوط تاریخ دس جلدوں میں ہے
۲۹	سنگھاسن بتیسی	مترجمہ سری لالوجی	مہاراجہ بکرماجیت کے حال میں ۳۲ کہانیوں کا مجموعہ ہے
۳۰	اُردو انوار سہیلی	مترجمہ عمر علی خاں وحشتی	انوار سہیلی فارسی کا ترجمہ ہے
۳۱	شرح انوار سہیلی	مولوی مرزا جان دہلوی	مختصر کتاب ہے

ب۔ کتب عربی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۳۲	کتاب الفہرست	ابن الندیم	ہر علم و فن کے متعلق عربی کتب کی ایک مکمل فہرست اور بڑی مشہور و معروف اور مفید کتاب ہے۔ اس کو اسلامی تصنیفات کی انسائیکلوپیڈیا کہیں تو بجا ہے ۳۷۷ھ میں تالیف کی گئی اور بہت سے حواشی اور ایک کامل انڈکس کے ساتھ گسٹو فلوگل نے اس کو لیپزک میں سنہ ۱۸۷۱ء میں شائع کیا
۳۳	عیون الانباء فی طبقات الاطباءؑ	ابن ابی اصیبعہ	اطبائے قدیم کے حالات میں ایک نہایت بے نظیر اور جامع تصنیف ہے جو سنہ ۶۴۳ھ میں مرتب کی گئی
۳۴	مروج الذہب	مسعودی	ایک قدیم اسلامی تاریخ ہے جس میں بہت سا حصہ جغرافیہ کا بھی شامل ہے
۳۵	زہر الالباب	ابراہیم بن علی الحصری	

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		ج - کتب فارسی	
۳۶	تاریخ فرشتہ	ابوالقاسم فرشتہ	کل ہندوستان کی تاریخ ہے جس میں ۹۷۵ء سے ۱۶۰۵ء تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔
۳۷	غزلان الہند	مولوی غلام علی آزاد بلگرامی	ہندوستان کے علوم و فنون کا تذکرہ ہے۔
۳۸	تاریخ سیر المتاخرین	غلام حسین	
۳۹	مثنوی نہ سپہر	حضرت امیر خسرو	۱۳۱۸ء کی تصنیف ہے۔ نو باب ہیں اور ہر باب ایک جداگانہ بحر میں ہے۔ اسی مناسبت سے نہ سپہر نام رکھا اور شاہ قطب الدین خلجی کے نام پر معنون کیا
۴۰	مآثر الامراء	نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں	مغلیہ عہد کے امرا کے حالات ہیں۔ بے مثل کتاب ہے
۴۱	خزینۃ المعارف جلد دوم	مفتی غلام سرور لاہوری	صوفیا اور صحابہ کے حالات کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے
۴۲	بہار دانش	منشی محمد عنایت اللہ لاہوری	عہد شاہجہاں میں انوار سہیلی کی طرز پر لکھی گئی۔
۴۳	تذکرۃ الشعراء	میر حسن مصنف بدر منیر	نایاب اور قدیم تذکرہ ہے۔
		د - کتب انگریزی	
۴۴	ہسٹری آف اردو لٹریچر	پروفیسر گارسن ڈی ٹاسی	اردو علم ادب کی مفصل تاریخ ہے۔
۴۵	انسائیکلوپیڈیا (بریٹینکا)	×	نہایت مشہور و معروف کتاب ہے
۴۶	فہرست کتب خانہ انڈیا آفس لندن	×	
۴۷	″ ″ برٹش میوزم لندن	×	

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		۵ - رسائل	
۴۸	مخزن لاہور	زیر اڈیٹری شیخ محمد عبدالقادر	ایک علمی ادبی پرچہ ہے۔ ۱۹۰۱ء سے جاری ہے اس کے متعدد مختلف نمبروں سے مدد لی گئی ہے
۴۹	ادیب الہ آباد	میر حسین عظیم آبادی	ادب اُردو کا بے نظیر مصور رسالہ تھا۔ افسوس جولائی ۱۹۱۳ء سے بند ہو گیا
۵۰	محمدن انیگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ	×	اس میں کالج کی متعلقہ خبروں کے علاوہ علمی مضامین بھی ہوتے تھے اب بند ہے
۵۱	علی گڑھ منتھلی	×	〃 〃 〃 〃 اب اس کا نام علیگڑھ میگزین ہے
۵۲	آریہ مسافر میگزین جالندھر	لالہ منشی رام	اسلام کے خلاف مضامین لکھنے کے لئے وقف تھا اب بند ہے
۵۳	الندوہ لکھنؤ	مولانا شبلی مرحوم	ندوۃ العلماء کا رسالہ ہے۔ علمی۔ اسلامی اور تاریخی مضامین شائع کرتا ہے۔ اس کے متعدد نمبروں سے مدد لی گئی
۵۴	زمانہ کانپور	لالہ دیا نرائن نگم بی اے	ایک علمی۔ تاریخی اور ادبی پرچہ ہے

تمہید بیان کرنے اور فہرست کتب درج کرنے کے بعد اب ہم اصل مضمون کو شروع کرتے ہیں۔ اس میں عہد کی تاریخ علیحدہ علیحدہ اور ہر کتاب کی کیفیت جدا جدا تحریر کی جائیگی۔ اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی

(سلسلۂ مضمون صفحہ سابق)

مسلمانوں میں ترویج و تراجم علوم کا دَورِ اول

خلفائے عباسیہ کی کوششیں

غیر زبانوں کے تراجم اور مختلف علوم و فنون کی اشاعت کے لحاظ سے اسلام میں خلفائے عباسیہ (۱۳۲ھ تا ۶۵۶ھ / ۷۵۰ء تا ۱۲۵۸ء) کا زمانہ خاص طور سے مشہور اور قابل ذکر ہے۔

منصور [illegible]

ابو جعفر منصور (۱۳۶ھ / ۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ / ۷۷۵ء) خاندان عباسیہ میں پہلا بادشاہ ہے جس نے ترویج فنون اور اشاعت علوم پر خاص توجہ کی۔ اس نے ۱۴۳ھ / ۷۶۰ء میں محکمۂ تراجم باقاعدہ طور سے قائم کیا جس کے ذریعے مختلف علوم و فنون اور متعدد زبانوں کی کتابیں عربی کے سانچے میں ڈھلنی شروع ہوئیں۔ منصور خود بھی بہت بڑا عالم اور صاحب فضل و کمال تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی نے علوم کا دریا بہا دیا اور غیر زبانوں کی سیکڑوں کتابوں کا اس کے زمانہ میں ترجمہ ہوا۔

ترقی علمی سے پیشتر کا زمانہ

اس وقت تک تمامی علوم و فنون۔ مذہبی مسائل۔ علمی خیالات اور تاریخی واقعات غرض سب کچھ زبانی بیان کیا جاتا تھا۔ مسائلِ مختلفہ کے محفوظ رکھنے اور باقاعدہ درس و تدریس کا کوئی انتظام نہ تھا۔

تدوینِ کتب

منصور عباسی ہی کے عہد کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسی کے وقت میں سب سے پہلے عربی علوم کی تدوین شروع ہوئی۔ چنانچہ حدیث۔ تفسیر۔ تاریخ۔ ہیئت۔ فلسفہ۔ طب اور ریاضی وغیرہ علوم کی کتابیں مُدوّن کی گئیں اور لائق ترین اشخاص ترجمے کے کام پر مامور کئے گئے۔

ہندوستان کا علمی خزانہ آنا شروع ہوا

منصور کے ذوقِ علمی کا یہاں تک چرچا پھیلا کہ دور دراز ممالک سے مختلف اقوام کے

اہل کمال نے اُس کے دربار کا رخ کیا۔ چنانچہ ۱۵۶ھ؍۷۷۲ء میں ہندوستان کا ایک بڑا ریاضی داں ہندو عالم منصور کی علم پروری کا شہرہ سُن کر ہندوستان سے بغداد آیا اور سنسکرت کی ایک نہایت عمدہ زیچ "سدہانتا" نامی خلیفہ کے حضور میں پیش کی۔

ا۔ سدہانتا — اس کتاب کا مصنف ہندوستان کا ایک زبردست عالم برہم گپت نامی پنڈت تھا۔ مشرقی تاریخ علمی میں اس کتاب کا پایہ نہایت اعلیٰ ہے اور اس کتاب کو اس نے تیس سال کی محنت میں تیار کیا تھا[1]۔ منصور نے اس کتاب کو شوق کے ہاتھوں سے لیا اور دربار کے مترجم اور مشہور مہندس محمد ابن ابراہیم فزاری کے سپرد کیا۔ تاکہ اس ہندو پنڈت کی مدد سے اس کا عربی میں ترجمہ کردے[2]۔

علم حساب میں اعداد کی علامات ہندوؤں کی ایجاد ہیں — یونانی ولاطینی میں اعداد وارقام کی علامتیں درست نہ تھیں اور ٹھیک طور پر اُن کا کوئی قاعدہ منضبط تھا۔ ذرا سا حساب کرتے تو اعداد کے لکھنے میں بہت سا وقت ضائع ہوجاتا۔ برہم گپت نے اس کتاب میں وہ علامتیں درج کیں جو ہندوستان میں مروج تھیں۔ مسلمانوں نے بھی عربی کتابوں میں یہی صورت اختیار کی اور پھر تقلیداً یورپ نے بھی یہی روش پسند کی اور کثرت مزاولت کی وجہ سے ساری دنیا میں "رقم عربی" کے نام سے یہ طریقہ مشہور ہوگیا۔ اہل یورپ اس کو اب تک عربوں کی ایجاد سمجھتے ہیں لیکن عربی کتابوں میں صاف طور پر ان علامات کا نام "ارقام ہندیہ" بتایا گیا ہے[3]۔

سدہانتا کی عظمت — بطلیموس[4] اور فیثاغورث[5] کی کتابوں کی اشاعت سے پہلے تک اہل عرب میں یہی کتاب ہئیت کے درس میں داخل تھی۔ اب مفقود ہے۔

---

[1] البیرونی ص ۱۳۲ [2] البرامکہ ص ۶۶ اور رسائل شبلی ص ۲۶۴ [3] الندوہ جلد ۲ نمبر ۵ ص ۱۵ [4] بطلیموس یونان کا پہلا شخص ہے جس نے اصطرلاب بنایا اور آلات نجوم تیار کئے۔ اس کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہارون الرشید کے عہد میں یحییٰ بن خالد برمکی کے زیر اہتمام بڑی شان سے ہوا تھا (رسائل شبلی ص ۳۱) [5] فیثاغورث۔ یہ مشہور حکیم ۵۸۰ء اور ۵۶۲ء قبل مسیح کے درمیان گزرا ہے۔ شاعری۔ موسیقی۔ حکمت۔ فلسفہ۔ ہندسہ۔ طبیعیات۔ ہئیت۔ جغرافیہ اور بہت سے علوم و فنون کا بے نظیر ماہر تھا۔ علوم طبیعہ کے متعلق اس نے بہت سی نئی باتیں دریافت کیں۔ دنیا میں چل پھر کر جغرافیائی معلومات حاصل کیں۔ زمین کے متحرک ہونے کا مسئلہ سب سے پہلے اسی نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور علم الارض کے متعلق بہت اُمور دریافت کئے اور ان علوم و فنون پر ۲۸۰ کے قریب کتابیں تصنیف کیں (تاریخ الاطباء ص ۶۴)

سدھانتا کا خلاصہ | اس کتاب کے عربی ترجمے سے اخذ کر کے محمد بن ابراہیم فزاری نے کواکب میں ایک رسالہ مرتب کیا۔ ریاضی دانوں میں یہ رسالہ "سند ہند" کے نام سے مشہور ہے[1]۔

۲۔کرن کھنڈ کھانڈیک | اس کے علاوہ برہم گپت کی کتاب "کرن کھنڈ کھانڈیک" کا بھی ترجمہ ہوا۔ جو عربی علم ادب میں "الارکند" کے نام سے شہرت رکھتی ہے[2]

۳۔ ہتوپدیش یا کلیلہ و دمنہ

اب ہم اس معرکۃ الآرا اور شہرۂ آفاق کتاب کا تذکرہ کرتے ہیں جس سے ہندوستان اور یورپین دنیا کا بچہ بچہ واقف ہے یعنی "ہتوپدیش یا کلیلہ و دمنہ" دنیا کی مشہور ترین کتابوں میں سے یہ ایک کتاب ہے اور یورپ اور ایشیا کی بہت سی زبانوں میں اس کے بیسیوں ترجمے ہو چکے ہیں۔ ہم نے نہایت تحقیق و تلاش کے بعد اس عدیم النظیر اور بے مثل کتاب کی مفصل تاریخ اور اس کے متعدد مختلف تراجم کی مکمل کیفیت فراہم کی ہے۔ نہایت محنت اور جانکاہی سے اس کے مختلف تراجم کا ایک بے نظیر شجرہ مرتب کیا ہے اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس لاثانی کتاب کے متعلق اتنی تحقیق کم از کم اردو زبان میں تو آج تک کی نہیں گئی۔ صرف یہی ایک بیان تمام مضمون کی جان اور میری بہترین کوشش کا پھل ہے جسے میں ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

کلیلہ و دمنہ کی تاریخ | کتاب کلیلہ و دمنہ منصور کے حکم سے دربار کے میر منشی اور مشہور مترجم "عبداللہ بن المقفع" نے پہلوی زبان سے عربی میں ترجمہ کی۔ پہلوی میں یہ کتاب دربار نوشیروانی کے مشہور حکیم "برزویہ"[3] نے سنسکرت سے ترجمہ کر کے اپنے آقا کے حضور میں پیش کی تھی۔ اب ہم شروع سے اس کی مسلسل تاریخ بیان کرتے ہیں۔

---

[1] تاریخ التمدن الاسلامی جلد ۳ ص ۱۶۳ مصنفہ جرجی زیدان اڈیٹر رسالہ الہلال مصر [2] البیرونی ص ۱۳۲ [3] برزویہ اپنے زمانہ کا سربرآوردہ طبیب اور اس علم کا بڑا فاضل تھا۔ طب کے علاوہ حکمائے ایران و عقلائے ہند کے قدیم علوم پر بھی کامل عبور رکھتا تھا۔ اس نے ملک ہند کا سفر کیا اور وہاں کی مقدس علمی زبان حاصل کی۔ فیلسوفان ہند کی تصانیف کا غور سے مطالعہ کیا اور ان سے فائدہ اٹھایا

(تاریخ الاطبا ص ۳۳۹)

کلیلہ و دمنہ کی اصل کے متعلق مختلف روایات سنسکرت میں یہ کتاب کس ہئیت اور کس نام کے ساتھ موجود تھی۔ اس کے متعلق مختلف روایات مشہور ہیں۔

۱۔ پہلی روایت مشہور ترین قول یہ ہے کہ "ہتوپدیش" کے نام سے ایک مکمل کتاب سنسکرت میں موجود تھی جو مہاراجہ بکرماجیت اعظم (۵۰۰ء تا ۵۳۱ء) کے زمانہ میں تصنیف ہوئی تھی اور اسی کا "برزویہ" نے پہلوی میں ترجمہ کیا تھا۔

۲۔ دوسری روایت ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب سکندر یونانی نے ۳۲۷ء قبل مسیح میں ہندوستان کے راجہ پورس کو شکست دی تو تخت پر ایک اپنے سپہ سالار کو بٹھایا۔ اور واپس چلا گیا لیکن تھوڑے دنوں کے بعد رعایا نے بغاوت کی اور اس کو نکال باہر کیا۔ اور اس کی جگہ ایک شخص رائے دابشلیم کو بادشاہ بنایا۔ رائے دابشلیم نے کچھ دن تو عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی لیکن پھر رعایا پر سخت ظلم و تعدی کرنے لگا اور خلقت اس کی بیداد سے چلا اٹھی آخر کار ایک برہمن "بیدپا" نے راجہ کو نصیحت کرنے کا ارادہ کیا اور حضور میں حاضر ہو کر ملک کی تباہی کی کیفیت۔ رعایا کی بے چینی اور خود راجہ کی بدکرداریاں نہایت صفائی کے ساتھ اس کے منہ پر بیان کر دیں۔ راجہ پہلے تو بہت ہی برافروختہ ہوا اور بیدپا کے قتل کا حکم دیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس کے خون سے درگزرا اور قصور معاف کر کے حکم دیا کہ ایک کتاب فن ملک داری و سیاسیات میں ایسی تصنیف کریں جس میں حکایات اور قصص کے ذریعہ اخلاق و سیاست اور نظم و نسق سلطنت کی تعلیم دل نشین پیرایہ میں دی جائے۔ ایک سال کی مدت بیدپا کو اس تصنیف کے لئے دی گئی اور اس نے اس عرصہ میں کتاب "حکایات بیدپا و پل پا" ترتیب دے کر راجہ کے حضور میں پیش کی راجہ نے بہت پسند کی اور اس خوف سے کہ ایرانی اس کو اڑا نہ لے جائیں (کیونکہ مختلف اسباب کے باعث ان کی آمد و رفت ہندوستان میں زیادہ تھی) نہایت حفاظت کے ساتھ اسے کتب خانہ شاہی میں رکھوا دیا۔ بعد کے زمانہ میں اسی کو بدقت حاصل کر کے برزویہ نے پہلوی میں ترجمہ کر لیا۔"

مگر یہ محض ایک قصہ ہے جو اصلیت سے بالکل معرا ہے[1]

۳۔ تیسری روایت بعض کہتے ہیں کہ حکیم برزویہ جب ہندوستان میں آیا تو جو حکایات نصیحت آمیز و اخلاق آموز

---

[1] بستان حکمت مطبوعہ جوہر ہند پریس ۱۸۹۱ء ص ۳ تاریخ کلیلہ و دمنہ مصنفہ شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی

یہاں زبان زد خاص و عام تھیں اُن کو جمع کرکے اور پہلوی میں لکھکر نوشیرواں کے حضور میں پیش کردیا۔

۴- چوتھی روایت | ایک رائے یہ ہے کہ وہ کتاب جس کا برزویہ نے پہلوی میں ترجمہ کیا تھا ایک ضخیم کتاب "پنچ تنتر" نامی کا خلاصہ تھی۔ اس کو بشن شرما ایک پنڈت نے تصنیف کیا تھا جو راجہ امرشکتی عرف شودرشن کے عہد حکومت میں جو مہلاپور نگرہان کا فرمان روا تھا پیدا ہوا تھا[1]

اس روایت کی غلطی | یہ روایت قطعاً بے سروپا۔ بلا ثبوت اور سراسر غلط ہے ایک سے زیادہ محققین نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ مولوی سید علی بلگرامی اپنی تصنیف تاریخ کلیلہ و دمنہ میں متذکرہ بالا روایت سے انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس میں شک نہیں کہ جو کتاب ایران میں گئی اور جس کا ترجمہ ابن المقفع نے پہلوی سے عربی میں کیا وہ پنچ تنتر نہ تھی بلکہ وہ بڑا مجموعہ حکایات کا تھا جس کا بقیہ یہ پنچ تنتر ہے۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"سنسکرت میں اس وقت کوئی کتاب موجود نہیں جس کو کلیلہ و دمنہ کی اصل کہا جاسکے لیکن ایک کتاب پنچ تنتر البتہ ہے جس کے پانچ باب ہیں اور یہ پانچ باب کلیلہ و دمنہ کے پانچویں ساتویں۔ آٹھویں۔ نویں اور دسویں بابوں سے کم و بیش مطابقت رکھتے ہیں۔"

یعنی موصوف کے نزدیک اُس بڑی کتاب کا خلاصہ پنچ تنتر ہے[2]۔ نہ کہ پنچ تنتر کا خلاصہ کلیلہ و دمنہ ہے جیسا کہ

---

[1] ہندوؤں کی تاریخ مصنفہ وشنو ص ۶۴

[2] پنچ تنتر کی کیفیت | جہاں تک مختلف کتب جہان بین سے پتہ لگ سکا وہ یہی ہے کہ پنچ تنتر بڑے مجموعہ حکایات ہتوپدیش کا خلاصہ ہے۔
وجہ تصنیف | اس کی تصنیف کا باعث لیتھبرج صاحب نے اپنی تاریخ ہند کے ص ۴۴۹ پر یہ بیان کیا ہے کہ "ایک راجہ کے تین بیٹے تھے مگر تینوں حد درجہ کاہل۔ نادان اور بڑے احمق واقع ہوئے تھے۔ راجہ نے ایک روز اُن کے متعلق مشیروں سے مشورہ کیا تو ان میں سے بشن شرما نامی ایک عالم و فاضل برہمن نے راجہ سے کہا آپ خاطر جمع رکھیں میں اُن کا علاج کردونگا اور تینوں راج کنوروں کو اپنے گھر لے آیا۔ اُن کو نہایت عمدہ تعلیم دی اور تربیت کی غرض سے یہ کتاب پنچ تنتر اُن کے لئے تصنیف کی۔"
کتاب کے ابواب کی تقسیم | اس کتاب کے پانچ حصوں کے نام حسب ذیل ہیں :-
۱- متر بھید- یعنی دوستوں کا نفاق
۲- متر پراپتی۔ یعنی دوستوں کا پیدا کرنا

"ہندوؤں کی تاریخ" کے مصنف نے ظاہر کیا ہی۔

۵۔ پانچویں روایت | ماہر زبان سنسکرت شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی کی اس کتاب کے متعلق یہ رائے ہی کہ جس کتاب کا پہلوی میں ترجمہ ہوا اور عربی کے ذریعہ سے وہ تمام دنیا میں پھیلی وہ بدھ (۵۵۰ تا ۴۷۷ قبل مسیح) کی کتاب جاتک نامی ہی اور اس میں وہ حکایات درج ہیں جو بدھ نے اپنی گزشتہ زندگیوں کے متعلق وقتاً فوقتاً اپنے شاگردوں کو سنائیں شمس العلماء فرماتے ہیں "یہ کتاب مع شرح کے ۲۵۰ قبل مسیح میں پالی میں (جو بدھوں کی مذہبی زبان ہی) مدون ہو چکی تھی اور اُس وقت وہ جزیرہ سیلون میں (جو اس وقت تک ایک بہت بڑا مستقر بدھ مذہب کا ہی) گئی اور وہاں شرح کا ترجمہ سنگالی زبان میں ہوا۔ یہ سنگالی ترجمہ پانچویں صدی عیسوی میں دوبارہ پالی زبان میں منتقل کیا گیا"۔

خلاصۂ روایات | ان تمام روایات اور بیانات سے جو تحریر کئے گئے ہمارے لئے کم از کم یہ مان لینا ضروری ہی کہ سنسکرت میں آئین ملکداری واصول اخلاق پر بے مثل کتاب ضرور موجود تھی اب خواہ اُس کا نام کتاب جاتک رکھ لو یا ہتوپدیش۔ پنج تنتر کہہ لو یا حکایات بیدپا و پیل یا مگر جہاں تک ہم تحقیق کر سکے ہتوپدیش ہی وہ مشہور نام ہے جس کا پہلوی ترجمہ ہونا بیان کیا جاتا ہی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

۳۔ کاک اُلوکیہ ۔ یعنی کوا اور اُلو جو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوتے ہیں

۴۔ سبدھ نشٹ ۔ یعنی منفعت کا ضائع ہونا۔

۵۔ اَسَم پریکشا کرتو ۔ یعنی بے دیکھے بھالے کام کرنا

موجودہ کتاب کے متعلق پروفیسر بن فائی کی رائے | پروفیسر بن فائی کی رائے ہی کہ "موجودہ کتاب پنج تنتر پانچ بابوں میں نہ تھی بلکہ اس کے اصل میں کوئی تیرہ باب تھے اور اصل حکومت سے غرض اصول حکومت اور قواعد اخلاق کا تعلیم کرنا تھا اور نام بھی شاید اُس کا "مرآۃ الملوک" تھا جس سے یہ غرض صاف پیدا تھی آٹھ باب مفقود ہو جانے کے بعد اُس کا نام پنج تنتر (یعنی رشتۂ پنجگانہ) رکھا گیا یہ باب کس زمانہ میں مفقود ہو گئے پتہ نہیں چلتا لیکن اس میں شک نہیں کہ جو کتاب ایران میں گئی اور جس کا عربی ترجمہ ابن المقفع نے کیا وہ پنج تنتر نہ تھی بلکہ وہ بڑا مجموعہ حکایات کا تھا جس کا بقیہ یہ پنج تنتر ہے"۔ فقط

ہتوپدیش کے تراجم کی تاریخ

۱- اصل سنسکرت کے تراجم

۱- اصل سنسکرت کتاب کا سب سے پہلا ترجمہ

سنسکرت کی کتاب "ہتوپدیش" کا جس زبان میں سب سے پہلے ترجمہ ہوا وہ ملک ایران کی پہلوی زبان تھی۔ کیونکہ بہ نسبت دوسرے ممالک کے ایران اور ہندوستان کے درمیان تاجرانہ اور ملکی تعلقات زیادہ قائم تھے اور اس طرح سلسلۂ آمدورفت جاری رہنے کے باعث ایرانی ہندوستان اور یہاں کے لٹریچر سے ایک حد تک بخوبی واقف تھے اور یہی واقفیت کتاب کے پہلوی ترجمہ کا باعث ہوئی۔

پہلوی ترجمہ کی کیفیت

پہلوی ترجمہ کس طرح ہوا؟ اس کی حکایت بڑی دلچسپ اور مزہ دار ہے:-
ایران کے مشہور شہنشاہ نوشیروان عادل[۱] کے دربار کے فاضل حکیم اور ماہر السنۂ مختلفہ برزویہ نے ایک روز نوشیرواں کی خدمت میں عرض کی کہ "میں نے ہندوستان کی بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ اس ملک میں پہاڑوں پر ایک قسم کی چمکدار گھانس پیدا ہوتی ہے اس کا خاصہ ہے کہ مردہ کے جسم سے مس کرنے سے وہ فوراً زندہ ہو جاتا ہے اگر حکم ہو تو ہندوستان جا کر اس اکسیر صفت گھانس کی تلاش کروں"۔ نوشیرواں نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور قنوج کے راجہ[۲] کے نام ایک خط اور تین سو اونٹ بطور تحفہ حوالے کر کے برزویہ کو رخصت کیا۔

برزویہ ایران سے قنوج پہنچا اور راجہ کی خدمت میں تحائف نذر گزرانے۔ خط پیش کیا اور اپنا مطلب بعنوان شائستہ بیان کر دیا۔ راجہ نے جواب دیا "مجھے کسی اس قسم کی گھانس کا پتا نہیں اور نہ آج تک اس کے متعلق میں نے

---

[۱] نوشیروان ایران کے شاہی خاندان ساسان کا بیسواں تاجدار اور نہایت عادل منصف رحیم اور زبردست بادشاہ تھا۔ اس کے وقت میں سلطنت کو بہت وسعت حاصل ہوئی اور ایران کی ہیبت دور دور بیٹھ گئی ۵۰۲ء میں پیدا ہوا اور ۵۳۱ء میں تخت نشین ہو کر ۵۷۹ء میں وفات پائی ۱۲

[۲] راجہ کا نام اکثر کتب فارسیہ میں پرتاپ چند لکھا ہے مگر قنوج کے قدیم راجوں کے کتبہ جات سے راجہ پربھاکر نوشیرواں کا ہمعصر معلوم ہوتا ہے جس کا زمانہ کرنل کننگ ہام ۵۷۵ء سے ۶۰۰ء تک قائم کرتے ہیں۔
(ایشیاٹک سوسائٹی جنرل نمبر ۳ ۱۸۸۴ء۔ نوشیروان نامہ ص ۳۰-۳۱)

کچھ سُنا۔ البتہ آدمی تمھارے ساتھ کئے دیتا ہوں۔ کوہستان میں تلاش کرو۔ شاید گوہرِ مقصود پا جاؤ۔"

برزویہ نے پہاڑوں پر جاکر نباتات کا پتہ پتہ چھان مارا مگر مدعا حاصل نہ ہوا۔ مایوس ہوکر کہنے لگا کہ:۔

"ہندوستان کے لوگ عجب مکار ہوتے ہیں۔ ایک محض غلط اور بے بنیاد بات لکھکر خواہ مخواہ مجھے اتنا پریشان اور دق کیا۔" ہمراہیوں نے کہا "آپ اتنے ناامید نہ ہوں۔ یہاں قریب ہی ایک نہایت معمر پنڈت اور عالم علوم قدیمہ رہتا ہے۔ اُس کے پاس چلئے اور اپنا مطلب بیان کیجئے۔ اغلب ہے کہ آپ کی مشکل آسان ہو۔" برزویہ اُس کے پاس گیا اور اپنی رام کہانی سُنائی بوڑھے پنڈت نے تبسم آمیز متانت کے ساتھ جواب دیا "تم نے ناحق جگہ جگہ کی خاک چھانی اتنا نہ سوچا کہ جس کا دم نکل چکا اُس کی روح واپس لانی انسانی طاقت سے باہر ہے۔ خدا مارے اور بندہ زندہ کردے تو خالق اور مخلوق میں امتیاز اور فرق کیا باقی رہا۔ دانایانِ ہند کا مطلب یہ نہیں تھا جو تم نے سمجھا۔ دراصل زبان میں لطیف استعارات فصاحت و بلاغت کی جان ہوا کرتے ہیں۔ ان کو بالکل ظاہر پر محمول کرلینا زبان کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ وہ عبارت جو کسی کتاب میں تمھاری نظر سے گزری اس میں پہاڑ سے مراد عقل ہے اور گھانس سے مراد عقل و دانش کی باتیں ہیں اور مردہ سے مقصود نادان کم عقل اور جہلا ہیں جن کے حق میں عقل مثل جان اور روح کے ہے۔ اور جاہل کو عقل اور نادان کو دانشمندی ایک کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا نام "ہتوپدیش" ہے اور جو شاہی خزانہ میں حفاظت کے ساتھ رکھی ہوئی ہے۔

برزویہ کے سامنے اب تمام مسئلہ حل شدہ تھا وہ راجہ کے دربار میں واپس آیا اور اس نایاب کتاب کے دیکھنے کی آرزو ظاہر کی۔ راجہ نے کچھ تامل کے بعد شاہی خزانہ سے کتاب منگوائی اور برزویہ کے حوالے کی۔ برزویہ نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک ماہرِ زبان پنڈت کی مدد سے اُس کا پہلوی میں ترجمہ کرلیا۔ کتاب واپس کی۔ راجہ کا شکریہ ادا کیا اور ایران کو روانہ ہوگیا۔

دربارِ نوشیروانی میں پہنچ کر واقعہ بیان کیا اور کتاب حضور میں پیش کردی۔ نوشیرواں نے کتاب کے مطالب کو سُنا۔ بہت پسند آئی۔ برزویہ کو خاطر خواہ انعام دیا اور کتاب کو فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے وزیر السلطنت بزرجمہر کے حوالے کردیا۔ برزویہ نے درخواست کی میرا حسب نسب اور سوانح عمری بھی کتاب کے شروع میں درج کردیا جائے تو میرے نام کے بقائے دوام کی ایک صورت نکل آئیگی۔ درخواست

منظور ہوئی اور بزرجمہر نے پہلے باب میں اپنی طرف سے کچھ پند و نصائح اور دوسرے باب میں برزویہ کی سوانح عمری لکھ کر کتاب کے شروع میں لگادی اور اس طرح یہ پہلوی ترجمہ ۵۳۱ء میں اختتام کو پہنچا۔

قبل اس کے کہ پہلوی کے مشہور و معروف عربی ترجمہ کی کیفیت بیان کی جائے۔ یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ اصل سنسکرت سے پہلوی کے علاوہ دو ترجمے اور بھی ہوئے ہیں :۔

۲۔ اصل کتاب کا دوسرا ترجمہ | ایک ترجمہ تبت کی زبان میں ہوا۔ جس وقت بدھ مذہب کی کتابیں تبت میں گئیں اُن میں یہ کتاب بھی تھی۔ یہ مذہبی کتب ملکی زبان میں ترجمہ ہوئیں تو ساتھ ہی اس کا بھی ترجمہ ہوا۔ پروفیسر شیفنر نے اس کو شائع کیا ہے[۱]۔

۳۔ تیسرا ترجمہ | یہ تیسرا ترجمہ پروفیسر بن فائی المتوفی ۱۸۸۱ء نے جو ایک مشہور عالم تھے ۱۸۵۹ء میں بزبان جرمن دو جلدوں میں شائع کیا۔ پہلی جلد میں جو چھ سو صفحہ کی کتاب ہے۔ انہوں نے ہر ایک حکایت کے متعلق نہایت تفصیل سے تحقیقات کی ہے کہ وہ کہاں سے آئی؟ اور مختلف مجموعوں اور ترجموں میں اُس نے کونسی صورت پیدا کی؟ غرض ہر ایک مسئلہ پر جو ان حکایات سے متعلق ہے نہایت شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی ہے اور ہر ایک نتیجہ کو بہ براہین و ادلہ ثابت کیا ہے[۲]۔

ب۔ پہلوی ترجمہ کے تراجم

۱۔ عربی ترجمے

پہلوی سے پہلا عربی ترجمہ | فارسی علم ادب کا جو خزانہ دارالخلافت بغداد میں آیا اس میں ہتوپدیش کا پہلوی ترجمہ بھی تھا کتاب کا شہرہ پہلے ہی سے بہت زیادہ تھا۔ خلیفۂ وقت ابوجعفر منصور عباسی نے حکم دیا کہ اس

---

[۱] تاریخ کلیلہ و دمنہ مصنفہ سید علی بلگرامی

[۲] 〃 〃 〃 〃

بے مثل کتاب کا پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا جائے۔ دربار کا میرمنشی اور عربی و فارسی کا بے بدل ماہر عبداللہ بن المقفع[1] اس کے ترجمہ پر مامور ہوا۔ جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ کتاب کا ترجمہ کیا اور خلیفہ کے حضور میں پیش کر دیا۔

اس ترجمے کی عظمت

یہی ترجمہ کتاب کے بقا و قیام کا موجب ہوا ہے ورنہ آج اصل سنسکرت اور ترجمہ پہلوی دونوں مفقود ہیں اور ان حکایات کے متعدد ترجمے یورپ کی مختلف زبانوں میں اور ان کی اشاعت تقریباً تمام عالم میں اسی عربی ترجمے کے ذریعہ سے ہوئی ہے[2]۔ یہ عربی ترجمہ نہ کیا گیا ہوتا تو یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ آج دنیا کو اس بے مثل کتاب کے نام کا بھی علم نہ ہوتا۔ آئندہ چل کر ہم بتائیں گے کہ اس عربی سے کن کن زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے ہوئے اور پھر کس طرح ان کی دنیا میں اشاعت ہوئی۔

ابن المقفع کے عربی ترجمہ کے مطبوعہ اڈیشن

ابن المقفع کی عربی تصنیف کو ڈی ساسی[3] نامی فرانس کے مشہور و معروف مستشرق نے ۱۸۱۶ء میں شاہی کتب خانہ پیرس کے چند نسخوں سے مقابلہ کر کے شائع کیا اور اس کے اول میں ایک طول طویل تقریظ اس کتاب کی اصل اور اس کے مختلف تراجم کی بابت فرانسیسی میں لکھی

---

[1] عبداللہ بن المقفع ۱۰۶ھ میں پیدا ہوا اور ۱۳۹ھ میں مرگیا۔ اس کا باپ "دادویہ" نامی آتش پرست اور ولایت فارس کا عامل تھا۔ تغلب کی وجہ سے اس کا ہاتھ شکنجہ میں کسے جانے کی وجہ سے خشک ہوگیا جس کی وجہ سے اس کا نام المقفع پڑگیا تھا۔ عبداللہ نے اپنے آبائی مذہب میں تعلیم پائی لیکن بچپن ہی میں مسلمان ہوگیا۔ عربی اور فارسی کا بے نظیر ماہر اور مسلم الثبوت استاد تھا۔ علمائے زبان عرب نے تسلیم کیا ہے کہ شروع اسلام سے آج تک عربی زبان کا ایسا فصیح و بلیغ مقرر اور زبردست صاحب قلم کوئی نہیں گزرا۔ اس کے ترجمے خاص طور سے عمدہ ہوا کرتے تھے۔ کلیلہ و دمنہ کے علاوہ یونانی اور فارسی زبان سے اس نے بہت سی کتابوں کے ترجمے کئے ہیں (رسائل شبلی ص ۲۳۶ - تاریخ کلیلہ و دمنہ)

[2] تاریخ کلیلہ و دمنہ

[3] بیرن ڈی ساسی ۱۷۵۸ء میں پیرس میں پیدا ہوا اور وہیں ۱۸۳۸ء میں وفات پائی۔ اکثر یورپین زبانوں کے علاوہ عبرانی۔ سریانی۔ کلدانی۔ سامری۔ عربی اور فارسی زبانوں کا ماہر تھا۔ مشرقیات میں یورپ میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی کوشش سے دو سو سے زیادہ مشرقی تصنیفات زیور طبع سے آراستہ ہوئیں

(الندوہ ج ۸ نمبر ۷ بابت اگست ۱۹۱۱ء ص ۲۰-۲۱)

ڈی سالسی کا یہ نسخہ اُن کل نسخوں کا ماخذ ہے جو اس کے بعد شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے تین مصر میں چھپے۔ ایک دہلی میں شائع ہوا۔ ایک موصل میں چھپا اور ایک بیروت میں طبع ہوا۔

۱۸۷۳ء میں گیڈی ایک اٹالین عالم نے تین قدیم نسخوں سے ڈی سالسی کے نسخہ کا تکملہ چھاپا جس میں تین باب بڑھائے اور بعض موجودہ حکایات میں عبارت زیادہ کی۔

۲۔ پہلوی سے دوسرا عربی ترجمہ | یحییٰ برمکی کی فرمائش سے خلیفہ مہدی کے عہد میں عبداللہ بن ہلال اہوازی نے ۱۶۵ھ ۷۸۱ء میں پہلوی سے عربی میں ایک ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کو اسی عہد میں وزیر مذکور کی فرمائش سے سہل نوبخت حکیم نے نظم کا جامہ پہنایا جس کے صلہ میں اُسے ایک ہزار دینار ملے۔

۳۔ تیسرا ترجمہ | تیسرا عربی ترجمہ جو پہلوی سے کیا گیا وہ خلیفہ مامون الرشید کے حکم سے سہل بن ہارون[۱] نے کیا تھا یہ بھی منظوم تھا۔

۴۔ چوتھا ترجمہ | چوتھا ترجمہ مرید اسود نے کیا جس کو خلیفہ متوکل نے خاص اسی کام کے لئے ایران سے بُلوایا تھا۔

۵۔ پانچواں ترجمہ | اسلم نامی بیت الحکمت کے ایک افسر نے بھی اس کا ترجمہ کیا۔

۲۔ سریانی ترجمہ

عربی تراجم کے علاوہ پہلوی سے ایک ترجمہ سریانی زبان میں بھی ہوا تھا جس کا نام "ترجمہ قدیم سریانی"[۲] رکھا گیا ہے۔ اس ترجمہ کا زمانہ تصنیف ۵۷۰ء کہا جاتا ہے۔ بود نامی ایک نسطوری پادری اس کا مترجم تھا۔ بعد کے زمانہ میں یہ کتاب ناپید ہو گئی مگر ۱۸۷۱ء میں اس کا ایک نسخہ نہایت عجیب و غریب طریقہ پر ماردین کی خانقاہ میں مل گیا۔ پروفیسر

---

[۱] سہل بن ہارون مجوسی المذہب عربی کا زبردست انشا پرداز۔ دربار مامونی کا مشہور مترجم اور بیت الحکمت کے لائق مہتمموں میں سے تھا۔ کلیلہ و دمنہ کی طرز پر اس نے ایک نئی کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام "ثعلہ وعفراء" تھا اس کے ہر باب و فصل میں کلیلہ و دمنہ کے ہر باب و فصل کا مقابلہ و معارضہ کیا گیا تھا (رسائل شبلی ص ۲۵ و علی گڑھ منتھلی جلد ۳ نمبر ۹ ص ۳۶)

[۲] اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ کلیلہ و دمنہ بار دیگر بھی سریانی میں ترجمہ ہوئی ہے جس کی کیفیت آئندہ بیان ہوگی

بن فائی نے ایک بہت بڑی تقریظ دو سو صفحے کی اس کے ساتھ شامل کی جو نہایت دلچسپ اور پُرمغز ہے اور جس میں پختہ دلائل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ یہ سریانی ترجمہ عربی سے نہیں ہوا (ہم وہ دلائل لکھتے لیکن مضمون کی بے حد طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں) اس کو ۱۸۷۶ء میں پروفیسر بکل نے مع جرمن ترجمے کے شائع کیا۔

فی الواقع قدیم سریانی ترجمہ اور ترجمہ عربی آپس میں بھائی بھائی ہیں یعنی دونوں کی ماں پہلوی ہے لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ سریانی بھائی بالکل لاولد اور عرصہ دراز تک گمنام رہا۔ برخلاف اس کے عربی بھائی کے بکثرت اولاد ہوئی اور اس کے بیٹے۔ پوتے اور پڑپوتے اس وقت تک نام آور تمام یورپ اور بہت بڑے حصہ ایشیا اور اُن کل قطاع عالم پر جہاں ان ملکوں کی زبانیں گئی ہیں قابض ہیں۔

ج۔ عربی ترجمہ کے تراجم

اب اُن تمام تراجم کی کیفیت تفصیل کے ساتھ بیان کی جاتی ہے جو ابن المقفع کے عربی ترجمے سے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوئے :-

۱۔ عربی منظوم تراجم

بعض اشخاص نے اسی عہد میں ابن المقفع کے نثر ترجمہ کو نظم کے قالب میں بھی ڈھالا اُن کی تفصیل یہ ہے[۵۱] :-

۱۔ پہلا منظوم عربی ترجمہ	ایک ترجمہ ابان بن عبد الحمید رقاشی نے کیا۔
۲۔ دوسرا منظوم ترجمہ	دوسرا ترجمہ علی بن داؤد نے کیا۔
۳۔ تیسرا منظوم ترجمہ	تیسرا منظوم ترجمہ بشیر بن معتمد نے کیا[۵۲]

---

۵۱ کتاب الفہرست ابن الندیم ص۳۰۶ ۵۲ تاریخ التمدن الاسلامی ج۳ ص۱۹۱

۲- فارسی تراجم

عربی سے فارسی کے ترجمے مندرجہ ذیل ہوئے ہیں :-

۱- پہلا فارسی ترجمہ | پہلے پہل سلطان ابوالحسن نصر بن احمد سامانی (۳۰۱ھ / ۹۱۳ء تا ۳۳۱ھ / ۹۴۲ء) کے حکم سے ابن المقفع کی عربی تصنیف نے فارسی کا لباس پہنا[1]۔ یہ ترجمہ نثر میں تھا۔

۲- دوسرا ترجمہ | پہلا ترجمہ نثر میں ہونے کی وجہ سے سلطان کو کچھ زیادہ مرغوب نہیں ہوا۔ دربار کے ملک الشعراء رودکی المتوفی سنہ ۳۰۴ھ سے فرمایا کہ عربی سے فارسی میں ایک منظوم ترجمہ کرو[2]۔ ترجمہ نظم ہو کر حضور میں پیش ہوا تو اس کے صلہ میں رودکی کو چالیس ہزار دینار مرحمت ہوئے[3]۔ چنانچہ عنصری ایک قصیدہ میں کہتا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش
عطا گرفت بہ نظم کلیلہ درکشور

کلیلہ و دمنہ مترجمہ رودکی غالباً مثنوی ہوگی کیونکہ مسلسل واقعات مثنوی کے سوا کسی اور طرح ادا نہیں ہو سکتے[4]۔

۳- تیسرا ترجمہ | ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء میں ابوالمعالی نصر اللہ بن عبدالحمید مستوفی نے بہرام شاہ ابن سلطان مسعود غزنوی (۵۱۲ھ / ۱۱۱۸ء تا ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء) کے حکم سے ایک ترجمہ عربی سے فارسی میں کیا۔ جو فارسی نسخہ کلیلہ و دمنہ کے نام سے مشہور ہے یہ وہی کتاب ہے۔

انوار سہیلی کی تصنیف

چونکہ کلیلہ و دمنہ میں عربی کے بہت سے اشعار اور بڑے بڑے دقیق و مغلق لغت بھرے ہوئے تھے لہذا سلطان حسین مرزا والی خراسان کے سپہ سالار امیر شیخ احمد سہیلی کی فرمائش سے مولانا کمال الدین حسین بن علی واعظ

---

۱ بستان حکمت ص ۵ ۲ شعر العجم ج ۱ ص ۲۶ ۳ شعر العجم ج ۱ ص ۲۹ ۴ شعر العجم ج ۱ ص ۳۳

کاشفی سہروردی[1] نے اس کو فصاحت و بلاغت کے ساتھ آسان زبان میں اپنے طور پر ترتیب دیا اور امیر سہیلی کے نام پر معنون کرکے اس کا نام انوارِ سہیلی رکھا۔

اگرچہ مولانا موصوف نے انوار سہیلی میں غیر مانوس الفاظ، مشکل محاورات، پیچیدہ ترکیبات سے حتی الامکان احتراز کیا ہے تاہم پندرھویں صدی کے اواخر کے عام رواج اور طرزِ تحریر کے موافق مرادف لفظوں مقفیٰ جملوں اور طویل ہم معنی فقرات کے میدان کو قلم کی جولانگاہ ضرور بنایا ہے۔ بایں ہمہ کلام کی رنگینی اور معنی آفرینی کے ساتھ سلاست زبان اور فصاحت بیان ہر طرح قابلِ تحسین ہے۔

نہ معلوم کس نیک ساعت میں انوار سہیلی تصنیف ہوئی تھی کہ اس کی شہرت اور مقبولیت روز بروز بڑھتی ہی رہی۔ ہم تک جو کلیلہ و دمنہ پہنچی ہے یہ اسی انوار سہیلی کا طفیل ہے۔ فارسی لٹریچر میں اس کا پایہ بہت اعلیٰ ہے اور یہ فارسی علم ادب میں ایک مشہور ترین کتاب ہے۔ اس کے ترجمے حسب ذیل زبانوں میں ہوئے ہیں:-

۱- ترکی ترجمہ | اوائل سولھویں صدی عیسوی میں علی چلپی نے ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس ترکی ترجمہ سے ایک ترجمہ فرانسیسی[2] میں ہوا اور ایک ہسپانیہ کی زبان میں[3]۔

۲- فارسی تصنیف عیار دانش | ۹۹۶ھ میں علامی ابو الفضل المتوفی ۱۶۰۳ء نے شہنشاہ جلال الدین اکبر (۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء) کی فرمائش سے انوار سہیلی کی عبارت کو رائج الوقت فارسی کے لحاظ سے بہت آسان عبارت اور سلیس زبان میں ترتیب دے کر عیار دانش کے نام سے موسوم کیا[4]۔

عیار دانش کا اردو ترجمہ | اس عیار دانش کا مولوی حفیظ الدین احمد پروفیسر فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے ۱۸۰۳ء میں اردو ترجمہ کیا اور خرد افروز نام رکھا[5]۔ کتاب کلیلہ و دمنہ کا اردو زبان میں غالباً یہ سب سے پہلا ترجمہ ہے[6]۔

---

[1] مولانا کمال الدین علم و فضل میں فرد اور فصاحت و بلاغت میں یکتائے زمانہ تھے۔ تفسیر حسینی کی تصنیف نے آپ کو تمام اسلامی دنیا میں مشہور کردیا اور انوار سہیلی کی وجہ سے تمام علمی اور ادبی دنیا میں آپ کا شہرہ ہوگیا۔ اخلاق محسنی کے بھی آپ ہی مصنف ہیں۔ ۳۰ ذی الحجہ ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۵ء میں وفات پائی (شرح انوار سہیلی ص ۳۲۵-۳۳۶ مشرحہ مولوی مرزا جان دہلوی)

[2] تاریخ کلیلہ و دمنہ [3] علی گڑھ منتھلی ج نمبر ۹ بابت ستمبر ۱۹۰۵ء ص ۳۶۹ و دربار اکبری ص ۵۰۵ ۱۲

[4] تذکرہ گلشن ہند مصنفہ مرزا علی لطف ص ۵

[5] یہ صحیح نہیں ہے اس سے بہت پہلے دکنی زبان (قدیم اردو) میں اس کا ترجمہ ہوچکا تھا (اڈیٹر)

۲- انوارِ سہیلی کے اُردو تراجم

انوارِ سہیلی سے براہ راست تین مختلف اُردو ترجمے کئے گئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱- پہلا ترجمہ سنہ ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۶ء میں فقیر محمد خاں گویا نے ایک ترجمہ بستانِ حکمت کے نام سے کیا اور خوب کیا۔ یہ ترجمہ ۱۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۵۱ھ مطابق ۳ مارچ سنہ ۱۸۳۶ء بروز پنجشنبہ صبح کے وقت اختتام کو پہنچا۔[1]

بستانِ حکمت کے اڈیشن دو اڈیشن اس ترجمہ کے مطبع جوہر ہند دہلی میں چھپے۔ آخری اڈیشن ۳۲۰ صفحات پر شائع ہوا اور گیارہ اڈیشن منشی نول کشور کے مطبع سے نکلے جن میں سے آخری اڈیشن سنہ ۱۹۱۴ء کا ہے اس کے ۵۱۶ صفحات ہیں۔ اس سے اس کتاب کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ثبوت ملتا ہے۔

۲- دوسرا ترجمہ میر بہادر علی حسینی نے اوائل انیسویں صدی میں ایک ترجمہ کیا۔ اس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

۳- تیسرا ترجمہ اُردو انوارِ سہیلی کے نام سے ایک ترجمہ نواب عمر علی خاں وحشتی ابن نواب محمد اسد علی خاں مرحوم والیٔ ریاست محمد گڈھ باسودہ شاگرد حکیم مومن خاں دہلوی نے سنہ ۱۹۰۹ء/۱۳۲۷ھ میں کیا۔ ضیائے حکمت اس کا تاریخی نام ہے اور انوارِ سہیلی کی رعایت سے اس کا نام ستارۂ ہند ہے۔ یہ اسلامیہ سٹیم پریس لاہور میں ۱۸۴ صفحات پر شائع ہوا ہے۔[2]

۳- عربی کے عبرانی تراجم

ابن المقفع کی عربی تصنیف سے دو عبرانی ترجمے کئے گئے۔ جن کی کیفیت حسب ذیل ہے:-

۱- پہلا عبرانی ترجمہ ایک عبرانی ترجمہ سنہ ۱۲۵۰ء کے قریب کیا گیا۔ اس ترجمہ کا نہ مترجم معلوم ہے اور نہ اس کی ٹھیک تاریخ تحریر۔ اس کا ایک نسخہ نہایت ابتر حالت میں پیرس کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہے۔ ڈی سالی نے اس کے ایک حصے کو چھاپا تھا لیکن سنہ ۱۸۸۱ء میں ڈیرن برگ نے یہ پوری کتاب اور اس کے ساتھ جدید ترجمہ

---

[1] تذکرہ گلشن ہند مصنفہ مرزا علی لطف ص ۵

[2] ایک ترجمہ دکنی زبان میں دکنی انوارِ سہیلی کے نام سے بحکم بورڈ آف سپرنٹنس کالج فورٹ جارج مدراس برائے تعلیم عہدہ داران فوج محمد ابراہیم منشی نے کیا اور کالج پریس مدراس سے سنہ ۱۸۲۴ء میں شائع ہوا اور اس سے بہت قبل ایک دکنی شاعر نے منظوم ترجمہ کیا۔ دکنی ترجموں کے متعلق ہم کبھی علیحدہ لکھیں گے (اڈیٹر)

عبرانی دونوں شائع کئے ہیں۔

عبرانی سے لاطینی | اس عبرانی کا لاطینی ترجمہ سنہ ۱۲۶۹ء میں جان آف کیپوا نے کیا۔ یہ لاطینی ترجمہ یورپ میں کتاب کلیلہ ودمنہ کی اشاعت کا بہت بڑا ذریعہ ہوا ہے اور اس نے صدہا سال یورپ پر حکومت کی ہے کیونکہ اس ترجمہ سے یورپ کی بہت سی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔

لاطینی ترجمہ اور اُس کے تراجم

لاطینی ترجمہ سے مندرجہ ذیل چھ ترجمے ہوئے:۔

۱۔ پہلا ترجمہ انگریزی مین ہوا۔ اس کی تاریخ تصنیف معلوم نہ ہو سکی۔

۲۔ دوسرا ترجمہ فرنچ زبان میں ہوا۔ اس کے متعلق بھی پتا نہ چلا کہ کونسے سنہ میں ہوا تھا۔

۳۔ تیسرا ترجمہ اسپانش جدید میں سنہ ۱۴۹۳ء میں کیا گیا۔ اس کا ایک اڈیشن سنہ ۱۶۱۸ء میں شائع ہوا۔

۴۔ چوتھا ترجمہ بزبان جرمن سنہ ۱۴۸۰ء میں ہوا۔

۵۔ پانچواں ترجمہ ڈچ زبان میں سنہ ۱۴۸۳ء میں کیا گیا۔

۶۔ چھٹا ترجمہ ڈینش میں سنہ ۱۶۱۸ء میں ہوا۔

۲۔ دوسرا عبرانی ترجمہ | ایک عبرانی ترجمہ عربی سے پندرہویں صدی میں ہوا جو غیر معروف اور کم مشہور رہے۔

۴۔ عربی کا سریانی ترجمہ

ترجمہ سریانی جدید ایک عیسائی پادری نے عربی سے دسویں یا گیارہویں صدی عیسوی میں کیا۔ اس ترجمہ کا ایک نسخہ حال میں ملا ہے جو کتب خانہ ڈبلن یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ اغلاط سے پر تھا مگر اس کو نہایت محنت اور بہت کچھ تصیح کے بعد مرحوم پروفیسر رائٹ نے سنہ ۱۸۸۴ء میں چھپوایا ہے۔

۵۔ عربی کا یونانی ترجمہ

عربی سے ایک یونانی ترجمہ سنہ ۱۰۸۰ء میں ہوا۔ اس کا مصنف ایک شخص سائمن سیٹ نامی تھا۔

جس کی اور تصنیفات بھی موجود ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۶۶۶ء میں چھپا۔

یونانی ترجمہ کے تراجم | عربی سے جو یونانی ترجمہ کیا گیا تو اس یونانی ترجمہ سے بھی تین مختلف ترجمے ہوئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱- پہلا ترجمہ | ۱۶۹۷ء میں اس یونانی کا ایک لاطینی ترجمہ شائع ہوا۔ اور وہ اصل یونانی ترجمہ بھی اس کے ساتھ شامل کر لیا گیا۔ اس لاطینی ترجمہ کا ایک اڈیشن ۱۸۵۱ء میں دوبارہ چھاپا گیا۔

۲- دوسرا ترجمہ | ۱۵۸۳ء میں پھر ایک ترجمہ اصل یونانی سے لاطینی میں کیا گیا اور یہ دوبارہ ۱۸۷۲ء میں چھاپا گیا۔

۳- تیسرا ترجمہ | سلاوانک زبان میں ایک ترجمہ ہوا جس کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔

۶- عربی کا لاطینی ترجمہ

عربی سے ایک ترجمہ لاطینی زبان میں بھی ہوا ہے۔ یہ منظوم تھا۔

۷- عربی کے اسپانش تراجم

عربی سے اسپانش زبان میں بہ تفصیل ذیل دو مختلف ترجمے ہوئے :۔

۱- پہلا ترجمہ | ۱۲۶۱ء میں ایک ترجمہ اسپانش زبان میں کیا گیا۔ یہ ترجمہ منظوم تھا۔ اس اسپانش سے ایک لاطینی ترجمہ ۱۳۱۳ء میں ہوا جس کے دو قلمی نسخے پیرس کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہیں۔

۲- دوسرا ترجمہ | اسپانش زبان میں ایک ترجمہ ۱۸۵۵ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان مشہور مستشرق کانگوس نے کیا۔

یہ تھی کتاب کلیلہ و دمنہ کی جامع تاریخ اور اس کے مختلف تراجم کی مفصل کیفیت جو بیان کی گئی۔

کلیلہ و دمنہ کا شجرۂ تراجم | اب ہم ایک مفصل اور مکمل شجرہ درج کرتے ہیں جس سے ایک نظر میں معلوم ہو سکے گا کہ کلیلہ و دمنہ نے ہندوستان سے نکل کر کہاں کہاں کی سیاحت کی ہے یہ شجرہ نہایت ہی محنت و جانکاہی اور بے انتہا تلاش اقتباس کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور امید ہے کہ شائقین تاریخ اس کو نہایت دلچسپی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے

پروفیسر مکس ملر نے بھی کلیلہ و دمنہ کا ایک شجرہ مرتب کیا ہے جس کو شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی نے اپنی تاریخ کلیلہ و دمنہ میں نقل کر کے اپنی تحقیقات کا اُس پر اضافہ کیا ہے مگر ہمارے مرتب کردہ اس شجرہ کو جس وقت ناظرین اُس شجرہ سے ملائیں گے تو زمین و آسمان کا فرق پائیں گے۔[1]

---

[1] اُردو ترجموں کے ذیل میں دکنی ترجموں کے اضافہ کی ضرورت ہے۔ (اڈیٹر)

فسوں زارِ بہزاد

یعنی

مُرقّعِ فریاد

(از جناب آصف علی صاحب بیرسٹرایٹ لا از زنداں دہلی)

مسٹر آصف علی کی یہ نظم اُردو شاعری میں بالکل ایک نئی چیز ہوگی۔ تخیّل کی بلندی، مضمون کی جدّت، طرزِ ادا کی قوّت اور لطافت قابلِ داد ہی۔ شاعرِ نازک خیال مبارک باد کے لایق ہیں۔ لیکن وہ قید بھی کیسی مبارک ہی، جس نے تخیّل کو وہ بلند پروازی بخشی ہی جو آزادی میں نصیب نہ تھی۔

اُردو میں ایسی نظمیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ سخن فہم حضرات اس نظم کی نازک خیالیوں کی قدر کریں گے اور حُسنِ بیاں اور مضامین کی جدّت کا لطف اُٹھائیں گے۔

(اڈیٹر)

(۱)

زخمۂ فکر مزیّن تھی بہ انگشتِ خیال — تارِ قانونِ[۱] جفا سے تھا طرب ریز ملال

ریشمِ ساز میں آسودہ کہ گل میں شبنم — بلبلِ نغمۂ لحن جس کی ہی دل کو برہم

میری مضراب نے چھیڑا جو نہیں تارِ بے جاں — آشیانوں سے اُڑے زیر و بم اُفتاں خیزاں

---

[۱] قانون یعنی ساز

سحر آواز ہوا اُن کے پَروں سے پیدا　　ابرِ پرواز نے مینہ راگ کا اِک برسایا
بنے ہر قطرہ جب آئینۂ مہرِ نغمہ　　پرتو آگیں نہ ہو کیوں سمع کا کونہ کونہ
دامنِ محویت اِس کیف نے جو پھیلایا　　نشۂ ذوق لگا کہنے کہ میں ہمسر پایا

بزمِ مخمور میں مَے خواب کی اب چلنے لگی
ساغرِ چشم میں صہبائے ارم ڈھلنے لگی

دیکھتا کیا ہوں کہ میں عالمِ بالا پر ہوں　　گویا فردوس میں فرشِ گل و لالہ پر ہوں
گلِ صد رنگ ہر اِک شاخ پہ ہیں عطر فروش　　چار سو نہریں ہیں لبریز بہ صد نغمۂ و نوش
نہروں کے میل پہ پاکیزہ ہی اک بارہ دری　　بام سے لے کے زمیں تک ہی جو موتی کی بنی
مشکبوئے سرا بریق سے رقصاں ہی وہاں　　یعنی ہر حوض میں صہبا کے ہیں فوّارے رواں
بوئے گل اُڑتی ہے مرغانِ چمن بن بن کر　　صبا بھی آتی ہی تو سایہ میں سے چھن چھن کر
پھول برساتا ہے یہاں نغمۂ مرغانِ چمن　　گویا بلبل کا ہی آغوش گلوں کا دامن

شاد بلبل ہی یہاں وصل سے گل کے ہر دم
اور قمری کی صدا سرو سے آئے پیہم

اتنے میں ایک روش پر نظر آیا اک اور　　جس کی رفتار حسینوں کی حسینوں کے سے طور
حسنِ قدرت کا مرقع تھا مجسّم وہ حسیں　　شاہدِ گل کو بھی شرماتی تھی اس کی تزئین
شعلہ رُو شمع کو شرمائے اگر بزم میں آئے　　تیغ کا کاٹ کرے آنکھ اگر رزم میں آئے
چال چلتا تھا قیامت کی عجب فتنہ فروش　　لوٹتا تھا وہ ہر انداز سے سرمایۂ ہوش
پیشِ بہزاد اسی رنگ سے پہونچا آخر　　دیر تک پوچھی نہ استاد نے کچھ اُس کی خبر

محو بیٹھے رہی دیکھا کئے لہروں میں عکس
دل میں کھینچا کئے جو کھینچتے پہروں میں عکس

(۲)

غنچہ ساں اُس نے دہن کھولا بہ عرضِ مطلب
اور شکر ریز ہوئے کشتِ تمنّا میں لب

بولا ہی "آرزو ایک عقدِ حبابِ دل میں
نقش رہ جائے مرا آئینۂ ساحل میں

قطرہ ہوں ڈرتا ہوں مٹ جاؤں گا موجِ یم میں
جان گھلتی ہی مری رات دن اس ہی غم میں

آج سوچا ہی کہ قرطاس ہی وہ آئینہ
نقش آبادِ ازل گویا ہے جس کا سینہ

خامہ بہزاد کا قرطاسِ ازل ڈھونڈوں گا
یعنی اِس قطرہ کو منقوشِ ازل کردوں گا

چشمِ اُستاد ہوئی وقفِ تبسّم اک بار
زیرِ لب خندہ کے آثار ہوئے وقفِ خمار

کہا "اے قطرۂ شبنم یمِ ذخّار ہے تو
ایک جاں ہو کے جدائی کا طلبگار ہی تو

چشمِ نرگس کے ذرا آئینہ میں آپ کو دیکھ
یا دلِ لالہ کے آئینہ میں ایک آنکھ تو دیکھ

شفقِ شام کے طوطے سے ثنا سُن اپنی
بلبلِ صبح کے نغمہ میں صدا سُن اپنی

ہی نسیمِ سحری میں تری پرواز کا ڈھنگ
صبح صادق میں ہی کچھ تیرے رُخِ صاف کا رنگ

رُخِ گل رہنِ طراوت ہے نمی سے تیری
کاہ خاشاک ہی، خس شعلہ، کمی سے تیری

چشمہ کی چشم میں تو نورِ بصارت ہے اگر
جوئے صد موج میں رفتار کی صورت ہی اُدھر

ابر میں سُرمئی دُنبالہ خموشی ہے تری
برق میں شعلہ فشاں عشوہ فروشی ہی تیری

برسرِ کوہ یخ بستہ تری عصمت ہی
دور رہنا ہوس مس سے تری فطرت ہی

بادہ حسن سے ساحل ہی ترے خمیازہ
پرتوِ مہر کے رُخ پر ہے تو مثلِ غازہ

نقش بر آب ہی تصویر جو قرطاس پہ ہے
خامہ کی نشو و نما حیف ہی کہ یاس پہ ہی

پُرزافشاں ہی جبیں موج کے قطروں سی مدام
لم یزل ہی یہی تصویر اِسی کو ہے دوام

وہ حسیں بولا "کہاں قطرہ کہاں بحرِ عمیق
بحر چاہی تو سواحل کو کرے پل میں غریق

ہی حباب اک نفسِ بادسے مرہونِ قیام ورنہ ہر موج، قضا کا اُسے دیتی ہی پیام
چشمِ گل میں ہو کہ قطرہ مژۂ خار پہ ہو دامنِ دشت میں ہو یا سرِ کہسار پہ ہو
رگِ سبزہ میں ہو یا بطنِ جوئبار میں ہو تہِ دریا میں ہو یا ابرِ گہربار میں ہو
رنگ آمیزِ فلک قوسِ قزح میں ہو کر چشمِ مہجور میں ہر اشک اثر تارِ نظر
یا تو ہو جائے گا وہ صیدِ شعاعِ خورشید یا ہی پھر بحر کا اس کے لئے ایک دامِ شدید
گر اسیرِ قفسِ پرتوِ خورشید ہو تو تربتِ موج میں گر ہستی سے نومید ہو تو

خوابِ ہستی کی ہی قطرہ کے لئے اک تعبیر
یعنی تصویر ہی ہی اُس کی بقا کی تدبیر

ہوئیں بہزاد کی مژگاں نم آلود یہ سُن چہرہ سے اُس کے تبسّم ہوا مفقود یہ سُن
لہریں ٹکرانے لگیں آ کے لبِ ساحل سے دامنِ مژہ ملا جا کے محیطِ دل سے
قطرۂ اشک ہر ایک آئینۂ عکس[1] بنا جس میں ہر لمحہ نئے سے نیا ایک عکس کھنچا
جو بھی تھا پیشِ نظر نقش بر آب ہوا یعنی اس رمز سے خود زہرۂ ابر آب ہوا
کہا بہزاد نے اے وقفِ ہوس! سُن یہ کلام بُلبلے کا نفسِ بادِ فنا سے ہے قیام
عمقِ بحر سے آتا ہے ہوا سر میں لئے اور پروازِ فنا خفتہ ہر ایک پر میں لئے

عقدۂ باد کھلے بلبلہ قطرہ بن جائے
قطرۂ آب ملے موج میں دریا بن جائے

(۳)

چشمِ تحقیق نے ایک اور اُٹھایا پردہ دوسری سمت سے ایک اور پریزاد آیا
چشمِ مخمور میں ایک شعلۂ بارد رقصاں جامِ گفتار میں صہبائے نغم جلوہ کناں
بادۂ رنگ سے مینائے تن اُس کا گلگوں پائے سیمیں پہ سرِ برگِ گلِ عیش نگوں

---

[1] یعنی فوٹوگرافی کی پلیٹ۔

بُلبُلِ بُو، گُلِ عارض میں نشیمن جویاں — مُرغِ شبنم سرِ گلہائے ازل پر افشاں
لبِ نازک ہوسِ زیست سے مستی آلود — سنگِ دل میں شررِ آرزوئے رنگِ وجود

پُوچھا بہزاد نے "اے حرصِ ازل ہستیِ رنگ
تو بھی تصویر کے پردے میں ہی کیا طالبِ ننگ

آشیاں برق کا تو، قوسِ قزح کا ہے وطن — سایۂ غربت ہی پئے مہرِ صد الواں افگن
کون سا گل ہی کہ مرہونِ وفا تیرا نہیں — از سمک تا بسما کیا ہی کہ جو تیرا نہیں
بطنِ جوہر میں ہے تو عرضِ وجودِ عالم — زخمِ ہستی ہے کوئی جس کا نہیں تو مرہم
ہی گریبانِ صبح چاک تری فطرت سے — گلِ انجم میں ضیا ہی تو تری نکہت سے
تجھ ہی سے باقی ہے عریانیِ ہستی کی حیا — چرخِ نیلی کی بجز تیرے کہاں ہوتی قبا
لہریں نیلم کی تری، موجیں زمرد کی تری — کرنیں الماس میں، یاقوت کی لالی ہی تری
خونِ عشاق ترے دم سے، حنا تجھ سے ہی — اور حسینوں کی یہ رنگین ادا تجھ سے ہی
گیسوئے دہر میں تو شانۂ آرائش ہی — عارضِ کون کا آئینۂ زیبائش ہی

کاروانِ نظرِ ہستی کی منزل تو ہی
کشتیِ چشمِ بشر کے لئے ساحل تو ہی

سُن کے یہ رنگ ہنا مثلِ شفق اور بولا — آپ نے خوب درِ پند و نصائح کھولا
ہم سفرِ موجِ فنا رہتی ہی ہستی میری — نکلی گردابِ عدم سے نہ یہ کشتی میری
بسملِ شوق ہیں سیمابِ دلِ جوہر ہوں — یعنی ایک عکس ہوں آئینہ میں، خود باہر ہوں
مُرغِ ہستی کا شکستہ پرِ پرواز ہوں میں — یعنی کہ سازِ خموشی کی ایک آواز ہوں میں
نارسا آہ ہوں، اور بے سرو پا اشک ہوں میں — دلِ پُر درد ہوں، نومیدِ ازل رشک ہوں میں

ٹوکا بہزاد نے "اے ہرزہ سرا بن خاموش
اپنی ہستی سے تو بے بہرہ ہی گُم کردۂ ہوش

پردۂ حرص نے خود تجھکو چھپایا تجھ سے   کیا خود بینی نے خود تجھکو پرایا تجھ سے
دُوربیں دُور کی چیزوں کو دکھا دیتی ہے   خوردبیں پاس کی چیزیں بھی چھپالیتی ہے
تو ہر ایک چیز میں ہے اور کسی میں بھی نہیں   عکس سے تیرے ہے آئینۂ گیتی رنگیں
رازِ صد زیر و بم بربطِ ایجاد ہے تو   یعنی ہر تار میں ہے اور پھر آزاد ہے تو

دامِ نقاش کہاں، بلبلِ تغنیہ کہاں
شعلۂ شمع کہاں، شعلۂ تصویر کہاں

. . . .

کاٹ کے بات زباں کھولی وہیں سوسن نے   نائب جس کو مقرر تھا کیا گلشن نے
رنگ کے ہاتھ میں ہر پھول کا ساغر ہے یہاں   موجۂ سبزۂ رنگ ہے اُفتاں خیزاں
ہاں مگر نرگسِ شہلا کا اشارہ یہ ہے   کشتیِ بُو کا کوئی ہے تو کنارہ[1] یہ ہے
رنگ کی موج ہے ہمدوشِ محیطِ عالم   نکہتِ گل کا سفینہ ہے بہ گردابِ عدم
چہرۂ یاس میں ہے زرد تو اس رنج سے ہے   دلِ لالہ ہے پُردرد تو اس رنج سے ہے
بزمِ گلشن میں ہے بُو عارضی مہمان بہار   کوئی دن جاتا ہے دیکھا ئیگی ہر گُل کو یہ خار
یہ حیا کیش زبان کھولنے سے قاصر ہے   اس کی خاموشی سے ہر پھول گراں خاطر ہے
اس کے چھٹنے کا ہر ایک پھول کو ہے سخت الم   رکھتا دل بند ہے ہر غنچہ کو اِس کا ہے غم
غنچہ آغوشِ وفا کھولتا ہے ڈر ڈر کر   لُوٹے جوبن نہ صبا بُو کا کہیں بڑھ بڑھ کر

اچھے بہزاد! مصوّر ہو تم خوشبو کا
جو نہ دو کھینچ مُرقع تم ہماری بُو کا

ہنسا بہزاد بہت، بولا، کہ اے شوخ بیاں   تیز کر رکھی تھی کے روز سے تو نے یہ زباں
میں نہ سمجھا تھا کہ معشوقِ چمن نکہت ہے   میں تو سمجھا تھا کہ دل پھولوں کا اور رنگت ہے
راز بُو تم سے ہے افسوس مگر پوشیدہ   حُسنِ معشوق تمھارا ہے مگر نادیدہ

---

[1] یعنی اس کا مرقع تیار ہونا

آنکھ ہوا ور کبھی بُو کو نہ دیکھا تو نے ‏ ‏ ‏ کان ہو اس لے نکہت کو نہ سونگھا تو نے
شبنم آشام ہے گو ساغرِ گل میں نکہت ‏ ‏ ‏ دوشِ صرصر پہ پڑی پھرتی ہے ہر دم ساعت
پھول کی گود میں رہنا اُسے منظور نہیں ‏ ‏ ‏ پرِ پرواز کے ہوتے ہوئے مجبور نہیں
تھم کے دو چار دمیں یہ دشت میں آوارہ پھری ‏ ‏ ‏ قید زندانِ محبّت میں جو ہو اُس پہ مری
اس کا ہرجائی پن اور جان تمہاری جائے ‏ ‏ ‏ پائے بو پھول کی تو توڑنے گلچیں آئے
اِس کی خاطر گرو گرداب میں گیسو کے کہیں ‏ ‏ ‏ چھدو سوئی سے تو ملیں تمہیں سیخوں پہ کہیں
آگ پر جوش دیں اور عطر نکالیں آخر ‏ ‏ ‏ اور تم سہتے ہو دکھ سارے یہ بُو کی خاطر

اب تو بُو سے نہ رہا جا سکا آخر بولی
دیکھئے دیکھئے حد چھیڑنے کی بس ہولی

یاد رکھئے کہ نہیں خوب ٹھٹھولیں ایسی ‏ ‏ ‏ فرق ڈالیں جو دلوں میں نہیں باتیں اچھی

مل کر خاک میں بھی پھُول تو بُو ساتھ رہے
تنِ مُردہ میں جے بھی تو لہو ساتھ رہے
رنگ اُڑجائے بھی تو بُو نہ الگ ہو اس سے
نکلے خوں تن سے جدا پھر بھی نہ رگ ہو اس سے

مجھ پہ آوارگیٔ وحشت کی تہمت نہ دھرو ‏ ‏ ‏ صبر سے میرے نہیں ڈرتے خدا سے تو ڈرو

تاب یہ سُن کے نہ بہزاد کو پھر باقی رہی
بولا "واللہ میں ہنستا تھا، یہ کیا تم نے کہی"

یہ تو سوسن سے مجھے چھیڑ تھی مقصود ذرا ‏ ‏ ‏ اُس نے شبّو کی قسم دے کے مجھے چھیڑا تھا

گُلِ ہستی کا اگر راز ہے تو نکہت ہے
خندۂ گُل کی گر آواز ہے تو نکہت ہے

گُل کے فانوس میں وہ شعلۂ عریاں ہے بُو ‏ ‏ ‏ روشنی جس کی ہے نزدیک و بعید ہر ایک سو

رہروِ سمع و بصر کھاتا ہے جس جا ٹھوکر — جادۂ حس پہ وہاں ہوتی ہے نکہت رہبر
ذاتِ نادیدہ کا دیتی ہے پتہ گر تو شمیم — صفتِ چیدہ کا لاتی ہے نشاں گر تو شمیم
چشمِ گُل کی یہ نظر ہے کہ ہے پُر جس سے چمن — پاس بھی دور بھی سورج سے ہے سورج کی کرن
یہ ہے آوازِ جرس دشتِ عدم کی رہبر — اس سے آ آ کے پتہ پوچھتے ہیں آپ خضر
انجمِ گل کی چمک ہے یہ فضائے گلشن — یعنی تاروں کی فلک پر ہے شعاعِ روشن
ہیں ہنڈولے میں پڑے پھول کے طفلِ شبنم — کہ نسیم اس کو جھلاتی ہے پئے خوابِ ارم
بڑھ کے کیا جانے نہ ہو جائے گا یہ طفلِ شمیم — لوٹ لے اِس کے مزے موقع ہے جب تک کہ نسیم

ہے ضیا پاشِ بوئے نافۂ آہوئے ازل
العطش! اے تنک آبیِ جوئے وہم و امل

کس کی ہستی ہے کہ بے عکسِ شمیمِ گُل کا — ہے مصوّر کوئی عالم میں خمارِ مُل کا؛
کوئی بہزاد نہ کھینچے کبھی نقشِ نکہت
لاکھ تدبیر کرے پائے نہ رازِ قدرت

سفرِ رہروِ اثبات کی منزل ہے شمیم — زورقِ ہستیِ صد رنگ کا ساحل ہے شمیم
یعنی ہر ذات صفت اور صفتِ ذات بنے — نورِ بے سایہ ہر اک سمت میں ظلمات بنے
غیب ہو جائے شہود اور عدم ہستی ہو — نہ بلندی ہو کہیں اور نہ کہیں پستی ہو
حسن وارستۂ نظارہ ہو یعنی یکسر — جو بھی محسوس ہو محسوس ہو آئے نہ نظر

(۴)

سُن کے بہزاد سے یہ کہنے لگی بادِ بہار — بس تو معلوم ہوا مجھ سے ہے گلشن کا سنگار
ہے قدم میرا سرِ کوہ و سرِ ساحل بھی — دشت میں بھی ہے گزر اور سرِ منزل بھی
وادی میں پھولوں کو گودی میں کھلاتی ہوں میں — سبزہ کی سیج پہ شبنم کو سُلاتی ہوں میں
ناچ لہروں کا مری تال مرے سم سے ہے — راگ موجوں کا سمندر میں مرے دم سے ہے

بادبان نغمہ کی کشتی کے پھُلاتی ہوں میں
پھر خموشی کے سمندر میں چلاتی ہوں میں

کارواں آہ کا چلتا ہے مرے رستہ پر
رہروِ نالہ بھی رہتا ہے اِسی جادہ پر

سرنگوں ذرّہ کو افلاک پہ لے جاتی ہوں
فرسِ حس رہِ ادراک پہ لے جاتی ہوں

بے مرے بُلبلِ پرواز بھی ہے مُرغِ قفس
اور نشیمن میں ہو عنقا کے کہیں مُرغِ نفس

دوش پر اپنے لئے پھرتی ہوں خمہائے سحاب
تشنۂ دہر کو بے میرے ہی ہستی ہی سراب

عقدۂ غنچہ کرے وا تو نسیمِ سحری
بُو کی پرواز اگر ہے تو مری عشوہ گری

نئی ہستی رہے خاموش اگر باد نہو
طربستانِ جہاں بے مرے آباد نہو

مایۂ حُسن مرا اُڑ دِ نظر سے ہے مصوں
کس نے دیکھا ہی مجھے گرچہ میں ہر جگہ میں ہوں

کہا بہزاد نے "اے بادہ فروشِ فطرت!
خود پرستی نے کے شرم و حیا بھی رخصت!

جن میں کچھ ہوتا ہی بڑھ بڑھ نہیں بولتے یوں
سیم و زر اپنا سرِ راہ نہیں تولتے یوں

بے صدا کوہ کے سینے میں زر و جوہر ہیں
بطنِ لب بند صدف ہی میں ہیں جو گوہر ہیں

چاہ کی تہ میں پئے تشنہ ہے ایک منبعِ آب
اور صحرا میں چمکتا ہوا ہوتا ہے سراب

اُبلے چشمہ تو سمندر میں سمٹ جاتا ہے
توشہ ہر زرہ سرِ راہ میں بٹ جاتا ہے

تو نے سمجھا ہی رُخِ گیتی کا اپنے کو نکھار!
ہنرِ شیشہ گری کو ہے تفِ باد سے عار

تو ہی آوارۂ ہستی نہ کہ آزادِ ازل
تیری آوارگی کا قصد ہی ایک طولِ امل

تیری ہر بات سے ایک شورِ ہوس ہی پیدا
شہدِ شیریں کی جگہ نیشِ مگس ہی پیدا

دوش پہ جس کو اُٹھاتی ہے بٹھا دیتی ہی
سرنگولہ کا اُٹھا دھڑ سے گرا دیتی ہے

بڑے سے ڈرتی ہی چھوٹے کو ڈراتی ہے تو
آگ دہکاتی ہی اور شمع بجھاتی ہے تو

سوتی لہریں جگا طوفان اُٹھا دیتی ہی
زورقِ زیست کو ورطہ میں بٹھا دیتی ہی

آندھی بنکے تو گراتی ہے پھل اور پھول تمام — ہے ترے ہاتھ میں ہر لحظہ خزاں کی صمصام
صحنِ بستاں خس و خاشاک سے بھر دیتی ہے — گھر پرندوں کے تہ و بالا تو کر دیتی ہے
سر میں قطرہ کے ہوس بنکے بناتی ہے حباب — چہرہ اپنا ہے چھپا لیتی مگر زیرِ نقاب"

اب تو بے چین ہوا ہو گئی اور یوں بولی
"یا وہ گو میں رہی' اور آپ نے خود حد کر دی

ٹھیر جاؤں تو زمانہ کا نفس کھنچنے لگے — ایک ہی سانس میں ہر ایک کا دم کھنچنے لگے
بگڑوں تو کوئی نظر آئے نہ اس دنیا میں — ایک طوفان مچا دوں فلکِ بالا میں
سب کو اک دم میں اڑا غرقِ سمندر کر دوں — شعلہ بھڑکاؤں وہ کہ خشک سمندر کر دوں
ایک جھکڑ ہی میں ٹکرا دوں تارے باہم — دہر میں ڈال دوں ایک لمحہ میں گھر گھر ماتم

گیسوئے زیست کو ایک پل میں پریشان کر دوں
تنِ جاوید کو ایک جھونکے میں عریاں کر دوں!"

ہنسا ہزار، لگا کہنے، کہ "اے خود پرواز — اتنی ہی چھیڑ میں چل نکلی بشکلِ آواز!
خود سرائی کا تری توڑ تھی تقریر مری — یعنی بنیاد سے عاری نہ تھی تعمیر مری
اپنی تعریف پہ جو آپ اتر آتے ہیں — زینۂ ضد پہ وہ اوروں کو چڑھا جاتے ہیں
سرکشی شعلہ کی کرتی ہے اسے خاک نشیں — پھوٹے بن بلبلہ کی دیکھی نہ چشم خود بیں
مثلِ اسپند کریں آپ جو اپنی تعریف — آگ کو آپ ہی وہ اپنا بنا لیں گے حریف

مثلِ گل رہتی ہے اوروں کی طرف جن کی نظر
بے زباں اپنا جو کٹوانے کو تیار ہیں سر
ان کی تعریف میں کیوں سوکھے نہ بلبل کی زباں
ان کی خوشبو سے معطر نہ ہوں کیوں اہلِ جہاں

اب سنو مجھ سی بھی خود آپ کچھ اپنی تعریف — میں بھی گنواؤں جو معلوم ہیں اوصافِ لطیف

سازِ آفاق اگر ہے، تو ہی مضراب، نسیم ‎ ‎ ‎ تارِ بے نغمہ ہے گر ہو گئی نایاب نسیم
زخمۂ باد سے ہی نغمہ نوا تارِ نفس ‎ ‎ ‎ مرغِ جاں جس میں ہی وہ تارِ ہوا ہی یہ نفس
دورِ آفاق ہی تسبیح تو ڈورا ہے ہوا ‎ ‎ ‎ دانے دانے میں پرو رکھی ہے یوں بادِ صبا
بتِ عالم ہے برہمن تو یہ زنّار اُس کا ‎ ‎ ‎ گرد ہر پیکرِ ہستی کے ہے ایک تارِ ہوا
عدم آباد سے گر لائی ہے ہستی نامہ ‎ ‎ ‎ مہرِ صورت سے مزیّن یہ لفافہ اُس کا
ہو کثافت تو ہوا اس کو لطافت کر دے ‎ ‎ ‎ ثقلِ اثمار کو یہ تخمِ نزاکت کر دے
روئیں روئیں میں ہی اور جسم سے آزاد ہی یہ ‎ ‎ ‎ ہو کے آزاد رہی قید وہ ایجاد ہی یہ

ایک آغوش ہی جس میں ہی ہر ایک چیز کی جا
نہ بھرا اِس سے ہو، ایسا نہیں دنیا میں خلا

گیسوئے یار کی بو جا کے صبا لاتی ہے ‎ ‎ ‎ اور تو اور کوئے یار میں یہ جاتی ہی
ہو ہوا بند تو ہر ایک کا دم گھٹ جائے ‎ ‎ ‎ سانس کا قافلہ دم مارتے میں لٹ جائے
طفلکِ بُو کو صبا صحنِ چمن میں ٹہلائے ‎ ‎ ‎ طفلِ شبنم کو اُٹھا گود میں اپنی بہلائے
پرِ شکستہ کو اُڑائے پرِ آواز بنے ‎ ‎ ‎ یعنی ہر پردۂ بے پر کی یہ پرواز بنے

شکلِ نغمہ چھپی بیٹھی ہے نیستاں میں کہیں
پردہ میں جیسے پری بیٹھے پرستاں میں کہیں
اُودی اُودی ہو گھٹا اور ہوا چلتی ہو
نغمہ ہو، یار ہو، ساغر میں وہ شے ڈھلتی ہو

....

اتنا کہنا تھا کہ بہزاد نے لی انگڑائی ‎ ‎ ‎ پو پھٹی، پھول کھلے، نور کی مستی چھائی

اب شو[illegible] خود آ

کلکتہ یونیورسٹی کمیشن

اور

دیسی زبانوں کی تعلیم

(از اڈیٹر)

(۲)

ہندوستان کی انگریزی حکومت میں سب سے پہلی تحریر جس میں اہلِ ہند کے لئے ذریعۂ تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے مسٹر چارلس گرانٹ نے ۱۷۹۲ء میں مرتب کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی کورٹ آف ڈائرکٹرز میں پیش کی۔ اس تحریر میں اس امر پر بحث کی ہے کہ اہلِ ہند میں روشن خیالی پھیلانے کے لئے یہ لازم ہے کہ انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے۔ لیکن یہ تحریر بہت کم لوگوں کی نظر سے گزری اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اس پر کچھ زیادہ توجہ نہ کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے حالات وضروریات کے لحاظ سے جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے عربی اور سنسکرت کے کالج قایم کئے۔ ابتدا میں انگریزی تعلیم کی تحریک غیر سرکاری تھی اور اس کے بانی بنگال کے مشہور مصلح اور محبِّ وطن راجہ موہن رائے اور ڈیوڈ ہیر تھے۔ پہلا کالج جس میں انگریزی کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی ہندو کالج تھا جو انھیں دو صاحبوں نے قایم کیا تھا اور جو ہندو صاحبوں کی فیاضی پر چلتا تھا۔ بعد میں یہ کالج سرکار کی تحویل میں آگیا۔ اس کے علاوہ دوسری کوشش انگریزی تعلیم کی اشاعت میں عیسائی مشنریوں کی طرف سے ہوئی۔

اس کے بعد جب سرکار نے اشاعت تعلیم کی طرف توجہ کی اور اسے باضابطہ بنانا چاہا تو ذریعۂ تعلیم کا جھگڑا

پیدا ہوا اور یہ مسئلہ مجلس تعلیم عامہ (پبلک انسٹرکشن کمیٹی) میں پیش ہوا۔ مسر چارلس ٹریویلین جو اس مجلس کے رُکن تھے، لکھتے ہیں کہ انگریزی زبان کا ذوق عام طور پر پیدا ہو گیا تھا اور ہر طرف سے مجلس پر زور دیا گیا کہ انگریزی تعلیم کی ترقی و اشاعت میں کوشش کی جائے۔ اب مجلس میں دو فریق ہو گئے۔ ایک فریق عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا حامی تھا اور دوسرا انگریزی زبان اور انگریزی علوم کا "مشرقیوں" کی یہ رائے تھی کہ منظور شدہ رقم مغربی تصانیف کے عربی یا سنسکرت میں ترجمہ کرنے اور اُن طلبہ کو وظیفہ دینے میں صرف کی جائے جو ان قدیم السنہ کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ "مغربی" یہ کہتے تھے کہ اس رقم کے صرف کرنے میں کفایت شعاری مدنظر رکھی جائے اور عربی اور سنسکرت کی وہی کتابیں خریدی یا طبع کی جائیں جو کالجوں میں تحقیقی طور پر کام آسکیں اور آمدنی سے انگریزی اور دیسی زبانوں کے ذریعہ سے تعلیم دینے کے لئے نئے مدرسے قایم کئے جائیں۔

اس بحث کا خاتمہ لارڈ میکالے کی مشہور اور پر زور یادداشت مورخہ ۲ فروری ۱۸۳۵ء نے ہمیشہ کے لئے کر دیا۔ یہ یادداشت لارڈ میکالے نے رُکن مجلس تعلیم عامہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ بحیثیت ممبر کونسل تحریر کی تھی اور جس نے دوسرے سال ساتویں مارچ کو گورنمنٹ رزولیوشن کی صورت اختیار کی۔ اس رزولیوشن میں صاف طور سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ "سرکار انگریزی کا اصل مقصد یہ ہے کہ اہل ہند میں مغربی ادب اور سائنس کی اشاعت کرے اور تمام رقوم جو تعلیم کے لئے مخصوص ہیں صرف انگریزی تعلیم میں صرف کی جائیں نیز جو روپیہ مشرقی تصانیف کی طبع میں صرف ہوتا ہے وہ آیندہ سے اس مد میں صرف نہ کیا جائے بلکہ اس رقم سے "ہندوستانیوں کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم دی جائے۔"

مسر چارلس ٹریویلین کا بیان ہے کہ مجلس تعلیم میں تمام فریق اس بات پر متفق تھے کہ دیسی زبانوں میں "ادب اور سائنس کی تعلیم کا کافی سامان نہیں ہے" لیکن اس سے اُن کا یہ مطلب نہ تھا کہ دیسی زبانیں مطلق قابل لحاظ نہیں۔ بلکہ بخلاف اس کے "یہ سب تسلیم کرتے تھے" کہ ہمارا انتہائی مقصد یہی ہونا چاہیے کہ عام لوگوں میں اُنھیں کی زبان کے ذریعہ سے علم کی اشاعت کی جائے۔ لیکن اس اثنا میں یہ ضرور ہو گا کہ اس کے لئے مدرس تیار کئے جائیں، ادب کا سامان پیدا کیا جائے اور درمیانی اور اعلیٰ طبقوں میں اتحاد قائم کیا جائے۔" مجلس تعلیم میں اختلاف اس امر میں تھا کہ ان اہم تعلیمی مقاصد کے حصول کے لئے ذریعۂ تعلیم کس زبان کو قرار دیا جائے

ایک طرف انگریزی تھی اور دوسری طرف عربی اور سنسکرت۔ لطف یہ ہے کہ دیسی زبان کا سرے سے ذکر ہی نہ تھا اور نہ وہ معرض بحث میں آئی۔ سرکاری رزولیوشن مؤرخہ ۷ مارچ ۱۸۳۵ء میں بھی اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ لہٰذا مجلس تعلیم نے اس خیال سے کہ غلط فہمی پیدا نہ ہو اپنی دوسری سال کی رپورٹ میں اس مسئلہ پر بحث کی جس میں ذیل کا اقتباس پڑھنے کے قابل ہے۔

"ہم دیسی زبانوں کی تعلیم و ترقی کی اہمیت کو دل سے تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے اور ہماری رائے میں ۷ مارچ کا حکم اس کا مانع نہیں ہے۔ اس حکم کے نفاذ سے قبل جو بحث مباحثے ہوئے ان میں دیسی زبانوں کے حقوق کو ہر فریق نے خاص طور سے تسلیم کیا۔ گورنمنٹ کی خدمت میں جو مسئلہ فیصلہ کے لئے پیش تھا وہ یہ تھا کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا زیادہ مفید ہوگا یا مشرق کی قدیم علمی زبانوں کو۔ لہٰذا ہمارا یہ خیال ہے کہ سرکاری احکام میں جو یہ جملے واقع ہوئے ہیں کہ "مغربی ادب اور سائنس" "صرف انگریزی تعلیم" "اہلِ ہند کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم دی جائے" اُن کا مطلب صرف یہ ہے کہ اُن اہلِ ہند کی تعلیم کے لئے جو ہمارے مدارس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے سنسکرت اور عربی پر ترجیح دی گئی ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے ان جملوں کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں کہ آگے چل کر عام لوگوں میں اشاعت تعلیم کا ذریعہ کون سی زبان ہوگی۔ اگر انگریزی زبان کا مسئلہ رہ جاتا تو بھی لوگ اپنی زبانوں کے ذریعہ سے اُسی طرح علم حاصل کرتے ...... ہمارا انتہائی مقصد یہ ہے کہ دیسی علم ادب کو بنائیں اور ترقی دیں اور ہماری تمام ہمت اور کوشش اسی پر صرف ہو۔"

بہرحال اُس وقت سرکار کا منشا یہی تھا کہ انگریزی زبان کو ترجیح دی جائے۔ گو اس کا مطلب یہ نہ ہو کہ وہ دیسی زبانوں کو پامال کرنا چاہتی ہے۔ اگرچہ لارڈ میکالے کی یادداشت میں مشرقی السنہ و علوم کی سخت مخالفت کی گئی اور اُن کی بُری طرح ہنسی اُڑائی گئی تاہم اُس یک طرفہ اور نا ملایم تحریر میں یہ الفاظ بھی درج ہیں۔

"ہمیں سرِدست صرف یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ایک گروہ ایسے تعلیم یافتہ ہندیوں کا تیار کر دیں جو ہمارے اور ہمارے کثیر التعداد رعایا کے درمیان ترجمان کا کام دے سکے ...... ملک کی دیسی زبانوں کی تعلیم و ترقی کا کام بھی اسی گروہ کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیئے کہ مغربی لغات سے علمی اصطلاحات لے کر اپنی دیسی زبانوں کو

مالا مال کریں اور بتدریج اس قابل بنا دیں کہ انھیں کے ذریعۂ عوام تک علوم پہنچائے جا سکیں"۔

اس کے بعد ڈائرکٹران ایسٹ انڈیا کی طرف سے تعلیم ہندوستان کے متعلق ۱۸۵۴ء میں ایک مبسوط یادداشت شائع ہوئی جس میں اُنھوں نے اپنی تعلیمی پالیسی کا اعلان نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے اس بات پر بہت مسرت ظاہر کی ہے کہ اہلِ ہند نے مغربی علوم اور انگریزی علم ادب میں اعلیٰ قابلیت اور کمال حاصل کیا ہے اور اسے بہت کچھ سراہا ہے اور اپنی یہ خواہش بیان کی ہے کہ وہ اس قسم کے مغربی علم کی اشاعت کے ذرائع اور وسیع کریں گے اور اس میں آسانیاں پیدا کریں گے جو اہلِ ہند کی زندگی کے مختلف شعبوں میں عملی طور سے مفید ثابت ہو۔ اس کے بعد انھوں نے ذریعۂ تعلیم کے مسئلہ پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ چونکہ دیسی زبانوں اور مشرقی کی علمی السنہ میں ترجموں کی کمی ہے لہٰذا مغربی علم کی کنجی صرف انگریزی زبان ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں اور خاص کر پریسیڈنسی شہروں کے قرب و جوار میں لوگ عموماً انگریزی کو ملازمت یا بسر اوقات کے خیال سے دوسری زبانوں پر ترجیح دیتے ہیں اور انگریزی کے اوسط درجہ کے علم کو بجائے اس کے کہ عام علم کی ترقی کا زینہ نیاں کریں۔ تعلیم کا مقصد اور انتہا سمجھنے لگتے ہیں۔ اب ہم اُس عبارت کا ترجمہ نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے اپنی تعلیمی پالیسی کو صراحت سے بیان کیا ہے۔

"ہماری نہ یہ کبھی خواہش تھی اور نہ یہ مقصد تھا کہ دیسی زبانوں کے بجائے انگریزی زبانوں کو رائج کیا جائے ہمیں اُن زبانوں کی اہمیت کا ہمیشہ خیال رہا ہے جنھیں لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے فارسی کے بجائے انگریزی کو نہیں بلکہ انھیں زبانوں کو عدالتوں میں تصفیہ معاملات اور رعایا اور سرکاری عہدہ داروں کے مابین آپس کے میل جول کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ عام نظام تعلیم میں ان زبانوں کی تعلیم خاص طور پر داخل کی جائے اور ترقی یافتہ مغربی علم کی روشنی عوام میں کسی نہ کسی دیسی زبان کے ذریعہ سے پہنچائی جائے کیوں کہ ہر شخص کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکتا اور نہ ہر شخص سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ غیر زبان کی مشکلات پر غالب آ سکے گا۔

البتہ عام نظام تعلیم میں یہ ضرور ہے کہ انگریزی زبان جہاں کہیں اس کی ضرورت ہو، پڑھائی جائے۔ لیکن

اس کی تعلیم خاص توجہ کے ساتھ مقامی دیسی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے اور ایسی عام تعلیم کے ساتھ ہو جو دیسی زبانوں کے ذریعہ سے دی جا سکے۔ اور اگرچہ اُن لوگوں کے لئے جنھوں نے انگریزی زبان کا اس قدر علم حاصل کر لیا ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے عام تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، انگریزی زبان ایک کامل ذریعۂ تعلیم ہو گی لیکن اُس کثیر تعداد کو جو انگریزی سے بہت کم واقف ہے، یا بالکل واقف نہیں دیسی زبانوں ہی کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے۔ یہ کام اُن معلموں اور پروفیسروں کے ذریعہ سے بخوبی انجام پا سکتا ہے جو خود انگریزی اچھی طرح جانتے ہیں اور علم کی موجودہ ترقیوں سے خوب واقف ہیں۔ یہ حضرات اُن معلومات کو جو انھوں نے حاصل کئے ہیں اپنے اہلِ وطن کو اپنی مادری زبان کے ذریعہ پہنچا سکتے ہیں اور جوں جوں دیسی زبانوں کی اہمیت زیادہ محسوس ہوتی جائے گی، دیسی زبانوں کے سرمایہ میں مغربی تصانیف کے ترجموں یا جدید تصانیف سے قابلِ قدر اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور اس کام کے انجام دینے والے وہی لوگ ہوں گے جن کے دل مغربی ترقی اور خیالات سے مالامال ہیں۔ اور اس طرح ملک میں مغربی علم کی عام طور پر اشاعت ہونے لگے گی۔ اس لئے ہم انگریزی زبان نیز ہندوستان کی دیسی زبانوں کو (یعنی دونوں کو) مغربی علم کی اشاعت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور یہ ہماری تمنا ہے کہ ہم ہندوستان کے تمام مدارس میں ان دونوں کو اعلیٰ پیمانہ پر ساتھ ساتھ ترقی کرتے ہوئے دیکھیں۔"

یہ بیان نہایت واضح اور صاف ہے۔ لیکن جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں یونیورسٹیاں قایم ہوئیں تو اس مسئلہ کی صورت ہی دگرگوں ہو گئی اور دیسی زبانوں کی ترقی کا خیال محض خواب ہو گیا۔ جن لوگوں نے ۱۸۵۴ء کا ڈسپیچ یعنی یادداشت تحریر کی تھی، انھیں کی سفارش پر یونیورسٹیاں بھی قایم کی گئیں۔ اُن کی یہ رائے تھی اور یہ رائے اُس وقت بلا تردید صحیح خیال کی گئی تھی کہ ہندوستان میں جدید طریقہ کی اعلیٰ تعلیم صرف انگریزی زبان کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ اُن کا یہ خیال بھی تھا کہ سرکاری عہدوں کے لئے اُن تعلیم یافتہ نوجوانوں کا انتخاب کیا جائے جنھوں نے یونیورسٹی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہے یا یونیورسٹی میں کسی قسم کا امتیاز حاصل کیا ہے۔ سرکاری ملازمت کے لالچ نے مجوزہ اور مروجہ طریقہ پر مُہر کر دی۔

کلکتہ یونیورسٹی کے بانیوں نے اوّل اوّل مذکورۂ بالا یادداشت کے منشا کے مطابق عمل کیا اور انٹرنس کے

امتحان کے قواعد میں یہ قرار دیا کہ اُمیدوار جغرافیہ، تاریخ اور ریاضی کے سوالات کے جوابات کسی زندہ دیسی زبان میں ادا کرسکتا ہے۔ چنانچہ تعلیمی کمیشن بابت ۱۸۸۲ء کے صوبہ بنگال کی مجلس نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا ہے کہ "اس سے یہ توقع تھی کہ اس قاعدے کے تحت میں اس قسم کے مدارس پیدا ہو جائیں گے جن میں انگریزی صرف زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے گی اور باقی تمام مضامین کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ سے دی جائے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ضرورت سے مجبور ہو کر درسی اور دوسرے علمی کتابیں تالیف کی جائیں گی جو عام لوگوں میں مغربی علم کی اشاعت کا موجب ہوں گی۔"

اِسں مجلس کا بیان ہے کہ یہ توقعات بہت کچھ پوری ہوئیں اگر دیسی زبان میں سوالات کے جوابات ادا کرنے کی اجازت بحال رہتی۔ لیکن کلکتہ یونیورسٹی نے یہ اجازت منسوخ کر دی اور ۶۲-۱۸۶۱ء میں یہ قاعدہ قرار دیا کہ ہر شعبہ میں (سوائے اُن سوالات کے جن کے متعلق خاص طور سے ہدایت کی گئی ہو) تمام جوابات انگریزی میں ادا کیے جائیں۔ گویا اس طرح یونیورسٹی نے دیسی زبانوں کے گلے پر چھری پھیر کر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیدیا۔ اور مذکورۂ بالا یادداشت کا مقصد فوت ہوگیا۔

۱۸۶۴ء میں اس یونیورسٹی نے (جو بجا طور سے ہندوستان کی مُکھیا یونیورسٹی خیال کی جاتی ہے) دیسی زبانوں کے ایک اور چرکہ دیا۔ یعنی ایف اے اور بی اے کے نصاب سے دیسی زبان کو بالکل خارج کر دیا۔ اس سے قبل اُمیدوار کو اجازت تھی کہ خواہ کوئی قدیم علمی زبان لے یا دیسی زبان۔ نئے قاعدہ کے رُو سے دیسی زبان کی ممانعت ہوگئی۔ ۱۸۸۰ء میں خیالات نے کچھ پلٹا کھا اور ایف۔ اے کے امتحان میں ترجمہ کا ایک پرچہ (انگریزی سے دیسی زبان میں) داخل نصاب ہوا۔ ۱۸۸۹ء میں جب لڑکیوں کے لیے قواعد بنائے گئے تو انھیں ایف اے کے امتحان میں یہ اجازت دی گئی کہ خواہ کوئی قدیم علمی زبان لیں یا دیسی زبان۔

کمیشن بابت ۱۸۸۲ء نے ایک اور دلچسپ بحث کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بحث یہ ہے کہ کس عمر میں انگریزی ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے۔ اس معاملہ میں عہدہ داران ممالک متوسط و بنگال کا بہت اختلاف تھا۔ ممالک متوسط میں طلبہ کو مڈل اسکول ہی میں انگریزی کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی تھی کیوں کہ اُن کے خیال میں اگر طالب علم نیچے سے تیار ہو کر جائے گا تو ہائی اسکول میں اچھا رہے گا۔ لیکن بنگال کے عہدہ داروں نے اپنے تجربہ کی بنا پر

یہ بیان کیا کہ وہ طالب علم جو دیسی زبان میں تعلیم پاکر آتے ہیں اُن طالب علموں کے مقابلہ میں جنھوں نے انگریزی میں تعلیم حاصل کی ہی ہمیشہ ممتاز رہتے ہیں۔ خود اہلِ کمیشن کی بھی یہی رائے تھی کہ نیچے کے درجوں میں انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینا عام تعلیم کو نقصان پہنچانا ہی۔ انھوں نے یہ سفارش کی کہ مڈل اسکولوں میں ذریعہ تعلیم دیسی زبان ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن اس سے آگے وہ نہیں بڑھے اور یہ نہیں بتایا کہ ہائی اسکولوں میں کیا عمل ہونا چاہیئے۔ اس معاملہ کو انھوں نے مقامی گورنمنٹوں پر چھوڑدیا کہ وہ مقامی حالات کے لحاظ سے اس کا فیصلہ کریں اور اسکولوں کے منتظموں کو اس معاملہ میں پوری آزادی دی جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ۱۸۸۲ء تک بنگال میں عام دستور یہ تھا کہ ہائی اسکول کا تمام نصاب انگریزی زبان ہی کے ذریعہ سے پڑھایا جاتا تھا۔ لیکن عہدہ داران تعلیمی نے دیسی زبان کا بھی تجربہ کیا تھا اور انھوں نے سفارش کی کہ سرکاری اور امدادی مدارس میں اُس جماعت سے جسے آج کل آٹھویں جماعت کہتے ہیں (دسویں جماعت سب سے اعلیٰ جماعت ہی) انگریزی ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے۔ مسٹر ناتھن ناظم تعلیمات صوبہ بنگال نے اپنی پنجسالہ رپورٹ بابت ۹۷-۱۸۹۶ء تا ۱۹۰۱-۱۹۰۰ء میں اس بحث و اختلاف کا ذکر کیا ہی۔ ایک فریق کی تو یہ رائے ہی کہ انگریزی کو شروع ہی سے ذریعۂ تعلیم بنا دیا جائے۔ دوسرا فریق یہ کہتا ہی کہ اگر طلبہ کو ابتدا میں دیسی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دی گئی تو وہ انگریزی زبان نیز دوسرے مضامین میں اچھے رہیں گے اور دماغی ترقی کے لحاظ سے یہ طلبہ بہتر رہیں گے۔ اس تمام بحث کے بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اس وقت بخلاف سابق عام رُجحان یہ ہی کہ انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم ذرا بڑی عمر میں دینی چاہیئے۔

کمیشن منعقدہ ۱۹۰۲ء نے انگریزی کو ابتدائی عمر میں ذریعہ تعلیم قرار دینے کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہی۔ اس رپورٹ کے بعض مقامات پڑھنے کے قابل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"ہندوستانی یونیورسٹیوں کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی زبان کے ذریعہ سے مغربی علوم کی اعلیٰ تعلیم شائع کی جائے۔ اس لیئے انگریزی زبان کی مناسب تعلیم ہائی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں نہایت

ضروری ہے۔ باوجود اِس خاص امتیاز کے جو انگریزی زبان کو یونیورسٹی کی تعلیم میں حاصل ہے، نتائج مایوس کُن ہیں۔ طلبہ جب میٹرکولیشن میں کامیاب ہوکر کالج میں داخل ہوتے ہیں تو اُن میں اتنی استعداد بھی نہیں ہوتی کہ انگریزی لکچر اچھی طرح سمجھ لیں۔ بعض حالتوں میں تو یہ مشکل کچھ عرصہ کے بعد رفع ہوجاتی ہے لیکن اکثر طلبہ کی یہ حالت ہے کہ یونیورسٹی کا پورا نصاب ختم کرلینے کے بعد بھی انگریزی پر کچھ قدرت نہیں ہوتی۔ ڈگری مل جاتی ہے لیکن اتنی بھی انگریزی نہیں آتی کہ صحیح اور فصیح زبان میں ایک چھٹی لکھ لیں۔ اِن میں سے جو انگریزی تحریر و تقریر پر قادر ہیں اُن میں ایک یہ عیب پایا جاتا ہے کہ اُن کا تلفظ بہت خراب اور مکروہ ہوتا ہے۔ یہ عیب ابتدائی تعلیم کا ہے۔ والدین کی بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح امتحان سے نکل جائے اور مدرسوں کے منتظمین پر طرح طرح سے زور ڈالتے ہیں کہ بچے کو ترقی مل جائے خواہ وہ جماعت کے قابل ہو یا نہو۔ لڑکے ایک تو انگریزی زبان پڑھتے ہیں اور اس کے ساتھ دوسرے مضامین بھی انگریزی ہی کے ذریعہ سے سیکھتے ہیں۔ حالاں کہ اُس وقت اُن میں اس کے سمجھنے کی بھی استعداد نہیں ہوتی۔ پھر پڑھانے والے مدرس بھی کم لیاقت اور کم تنخواہ کے ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں جو عیب پیدا ہوجاتے ہیں وہ مشکل سے نکلتے ہیں۔ ہائی اسکول میں پہنچنے کے بعد بھی ایسے معلّم نہیں ملتے جن کی مادری زبان انگریزی ہو اور اس لئے جیسی چاہیئے انگریزی زبان کی تعلیم نہیں ہوتی بہت سے ایسے طالب علم ہیں جو میٹرکولیشن تک تعلیم پاچکے ہیں مگر انھوں نے کبھی کسی انگریز کو بولتے نہیں سُنا اور جب کبھی وہ کسی انگریز کو بولتے سنتے ہیں تو مشکل سے اُس کی بات سمجھ سکتے ہیں...... لہذا ہماری یہ رائے ہے کہ اُس وقت تک انگریزی شروع نہ کرائی جائے جب تک لڑکا مضمون کو اُس زبان میں سمجھنے کے قابل نہو۔ اور جن مدرسوں کی مادری زبان انگریزی نہو جب تک وہ کسی ٹریننگ کالج میں تعلیم نہ حاصل کرلیں اور کوئی انگریز امتحان لے کر اُن کو زبان اور تلفظ کا صداقت نامہ ندے اس کام پر مقرّر نہ کئے جائیں۔"

دیسی زبان کے متعلق کمیشن کی رائے حسب ذیل ہے:-

"ہمیں افسوس ہے کہ عام طور پر دیسی زبان کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور بہت سے گریجوائٹ ایسے ہیں جنھیں اپنی مادری زبان میں بہت کم استعداد ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اگر ایم اے کے نصاب میں دیسی زبانیں داخل کردی گئیں تو اس سے ان زبانوں کے عالمانہ مطالعہ میں بہت بڑی مدد ملے گی اور چوں کہ ہماری رائے میں

اعلیٰ تعلیم کا نصاب یونیورسٹی کی نگرانی میں ہونا چاہیئے۔ لہٰذا یونیورسٹی کو اپنے سرمایہ سے دیسی زبانوں کے پروفیسروں کے تقرر کی گنجائش نکالنی چاہیئے۔ ہماری یہ رائے بھی ہے کہ گو بی اے میں دیسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام نہ ہو تاہم اس کے نصاب میں دیسی زبان کی انشا پردازی ہر طالب علم کے لئے لازم ہونی چاہیئے جہاں کہیں ترجمہ داخل نصاب ہے وہاں ایک طور سے دیسی زبان کی حیثیت قایم ہو چکی ہے۔ اس کے متعلق جو شہادتیں ہمارے سامنے پیش ہوئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ عموماً لفظی ہوتا ہے اس اصول کے ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ترجمہ اُسی وقت قابل اطمینان خیال کیا جائے گا جب کہ وہ محاورہ اور قواعد اصول سے ٹھیک ہو۔ اس کے علاوہ دیسی زبان کی ادبی اور علمی تالیفات کے لئے انعامات مقرر کر کے حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

جب تک اسکولوں میں دیسی زبانوں کی مناسب تعلیم نہ دی جائے گی یونیورسٹی کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس وقت اس کی طرف سے عموماً غفلت کی جاتی ہے اور یہ مضمون کم لیاقت اور کم تنخواہ یاب مدرسین کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ دیسی زبانوں اور انگریزی دونوں کے لئے اچھے اُستادوں کی شدید ضرورت ہے۔ ہر طالب علم کے لئے اسکول کے نصاب کی تکمیل کے بعد لازم قرار دیا جائے کہ وہ اپنی زبان کا بھی امتحان دے اور یہ امتحان خاصا کڑا ہونا چاہیئے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ آسانی اور خوبی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ادا کر سکتا ہے۔

یہ امر باعث مسرّت ہے کہ ان تجاویز کا اثر کلکتہ یونیورسٹی پر ہوا اور یونیورسٹی نے چار سال بعد یعنی ۱۹۰۶ء میں نہ صرف انٹرنس (میٹرکولیشن) کے امتحان میں دیسی زبان کا امتحان لازمی قرار دیا بلکہ اس امر کی بھی اجازت دی کہ جو طالب علم تاریخ کا مضمون لیں انھیں اختیار ہوگا کہ اس کے سوالات کے جوابات چاہے انگریزی میں دیں یا اپنی مادری زبان میں۔ علاوہ اس کے بی۔ اے کے امتحان میں دیسی زبان کی انشا پردازی بھی لازم قرار دی گئی ہے۔ گویا ایک زمانہ کے بعد یونیورسٹی نے پھر اس کی طرف عود کیا۔

۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے بذریعہ رزولیوشن پھر دیسی زبانوں کی طرف توجہ دلائی۔ گورنمنٹ نے منجملہ دیگر الزامات کے موجودہ نظام تعلیم کے خلاف یہ الزام بھی قایم کیا کہ "انگریزی تعلیم کے پیچھے دیسی زبانوں

کی طرف سے غفلت کی جاتی ہے اور ۱۸۵۴ء کی یادداشت میں جو یہ توقع کی گئی تھی کہ یہ زبانیں عوام میں مغربی علم کی اشاعت کا ذریعہ ثابت ہوں گی اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس رزولیوشن کے مفصلہ ذیل اقتباس سے گورنمنٹ کی رائے کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

گورنمنٹ کی کبھی یہ پالیسی نہیں رہی کہ وہ ملکی زبانوں کی بجائے انگریزی کو رائج کرے۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی کی قیمت تاجرانہ حیثیت رکھتی ہے دوسرے اس وجہ سے کہ ہائی اسکولوں کا آخری امتحان انگریزی میں ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی قبل از وقت شروع کرادی جاتی ہے اور یہی نہیں بلکہ ذریعۂ تعلیم بھی وہی ہوتی ہے۔ اور انھیں وجوہ سے ان مدارس میں دیسی زبانیں پس پشت ڈال دی جاتی ہیں۔ لیکن صحیح طریقۂ تعلیم کی اغراض کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے۔ عام طور پر جب تک کہ بچہ تعلیم کے ابتدائی مراحل طے نہ کرے اور اُسے اپنی مادری زبان میں اچھی استعداد پیدا نہ ہو جائے انگریزی شروع نہ کرائی جائے۔ ہندوستان کے مدارس میں جو عام طور سے یہ دستور پایا جاتا ہے کہ طالب علم اکثر بے سمجھے نصاب کی کتابوں یا معانی یا حواشی کی کتابوں سے جملے اور عبارتیں رٹ لیتے ہیں تو اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ قبل اس کے کہ طالب علم میں انگریزی کی اتنی استعداد پیدا ہو کہ وہ کسی مضمون کو سمجھ لے، نصاب کے مضامین انگریزی زبان کے ذریعہ سے پڑھانے شروع کر دیئے جاتے ہیں۔ دیسی زبان کب تک ذریعۂ تعلیم رہے اور انگریزی زبان کس وقت ذریعۂ تعلیم بنے اس کے متعلق ہمارا عام اندازہ تیرھواں سال ہے۔ اس کے بعد بھی ہائی اسکولوں میں دیسی زبان کی تعلیم ترک نہ کی جائے بلکہ نصاب مدرسہ کے آخر تک اسے جاری رکھا جائے۔ اگر تعلیم یافتہ اصحاب اپنی زبانوں کی طرف سے غفلت کریں گے تو اُن کی زبانیں محض بات چیت کی اور بازاری بولیاں رہ جائیں گی اور اُن میں کسی قسم کا علم ادب پیدا نہ ہونے پائے گا اور اُن میں کبھی اس قدر ترقی نہ ہو گی کہ ہم اُس اُصول کو عمل میں لاسکیں جو ۱۸۵۴ء کی یادداشت میں قرار پایا تھا۔ یعنی یہ کہ مغربی علم رفتہ رفتہ دیسی زبانوں کے ذریعہ سے ملک کے عام لوگوں تک پہنچایا جائے۔“

گورنمنٹ کے رزولیوشن بابت ۱۹۱۳ء میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”اس بات کی کافی شہادت موجود ہے کہ جن طلبہ نے مدارس میں دیسی نصاب کی تکمیل کی ہے وہ دماغی لحاظ سے زیادہ مستعد پائے گئے ہیں۔“

اسی رزولیوشن میں اس امر کا بھی ذکر کیا گیا ہی کہ بعض صوبوں میں اُن طلبہ کے لئے جنھوں نے مدرسہ کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ سے حاصل کی ہی۔ انگریزی زبان کی تحصیل کی غرض سے خاص جماعتیں (اسپشل کلاسیں) کھولی گئی ہیں۔ اور مقامی گورنمنٹوں سے یہ سفارش کی گئی ہے کہ جہاں کہیں یہ طریقہ رائج ہو وہاں اِس کا انتظام کیا جائے۔

۱۷ مارچ ۱۹۱۵ء کو مسٹر رام رایا ننگار نے شاہی مجلس وضع قوانین (امپریل لیجلیٹو کونسل) میں ذریعہ تعلیم کے متعلق مفصلۂ ذیل تجویز (یعنی رزولیوشن) پیش کیا۔

"یہ مجلس گورنر جنرل با جلاس کونسل سے سفارش کرتی ہی کہ صوبہ داری حکومتوں (گورنمنٹوں) سے مشورہ سے ایسی تدابیر عمل میں لائی جائیں کہ تمام مدارس ثانویہ میں ہندوستانی طالب علموں کے لئے تعلیم کا ذریعہ ہندوستانی زبانیں قرار پائیں اور انگریزی زبان بحیثیت دوسری زبان کے لازمی طور سے سکھائی جائے"۔

اِس تجویز کے پیش ہونے پر ہندوستانی ارکان مجلس میں بہت سخت اختلاف رائے ہوا۔ میں اُن قابل وطن پرستوں کے نام لینا نہیں چاہتا جنھوں نے اس تجویز کی مخالفت میں آوازیں بلند کیں۔ کونسل کی روئداد موجودہ اس میں اُن صاحبوں کی تقریریں منقول ہیں۔ لیکن یہ خیال ضرور ہوتا ہی کہ یا تو یہ کونسلیں ہماری نیابت نہیں کرتیں یا ہم نے ابھی کوئی رائے ہی قایم نہیں کی ہی۔ جب ارکان کونسل کی بحث ختم ہو چکی تو سر ہارکورٹ بٹلر نے (جو اُس وقت سرکاری رُکن تعلیم تھے) یہ فرمایا کہ سرکار کی یہ مُسلّمہ پالیسی ہی کہ یہ تیرہ سال کی عمر تک ذریعۂ تعلیم دیسی زبان ہی ہونی چاہیئے۔ اب فیصلہ طلب صرف اتنی بات رہ جاتی ہے کہ آیا باقی تین یا چار اعلیٰ جماعتوں میں ذریعۂ تعلیم دیسی زبان ہی رہے۔ اب جو تجویز پیش ہوئی ہی اُس کا مقصد یہ نہیں ہی کہ انگریزی زبان کی تعلیم کم کر دی جائے بلکہ انگریزی کی تعلیم فطرتی طریقہ سے دی جائے اور اسی کے ساتھ دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر طلبہ کا دماغی بار کم کر دیا جائے تو یہ مسئلہ "تعلیمی پالیسی" کا نہ ہوا بلکہ "تعلیمی کفایت" کا ہُوا سر ہارکورٹ نے یہ اعتراف کیا کہ میرا اور بہت سے قابل ماہرانِ تعلیم کا تجربہ یہ ہی کہ جس لڑکے کی تعلیم اسکول (اپر مڈل اسکول) کے آخری درجہ تک دیسی زبان کے ذریعہ سے ہوئی ہی وہ اُس لڑکے سے بہت زیادہ ذہین پایا گیا جس نے اپنی تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے حاصل کی تھی انھوں نے کہا کہ میری رائے میں یہ

معاملہ جنگ کے بعد بغیر کسی رائے کے مشورہ کے لئے مقامی گورنمنٹوں کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔ اس پر مسٹر راینگار نے اپنی تجویز واپس لے لی۔

جنوری ۱۹۱۷ء میں دہلی میں ایک کانفرنس تمام ناظمِ تعلیمات (ڈائرکٹران پبلک انسٹرکشن) کی منعقد ہوئی اور اسی سال اگست کے مہینے میں شملہ میں ایک اور مجلس کا انعقاد ہوا جس میں تمام لوکل گورنمنٹوں کے نائب شریک تھے۔ ان مجلسوں میں یہی مسئلہ پیش تھا کہ مدارس ثانویہ میں انگریزی اور دیسی زبانوں کی کیا صورت ہونی چاہیئے۔ وائسرائے (لارڈ چیمسفورڈ) نے ان دونوں مجلسوں میں تقریریں کیں اور اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اس دوسری مجلس میں وائسرائے نے اوّل تو گورنمنٹ کی گزشتہ پالیسی کا ذکر کیا۔ پھر یہ بتایا کہ دیسی زبانوں کی ترقی اور انگریزی تعلیم کی اصلاح بہت اہم ہے۔ اس کے بعد اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ "اس بات کا فیصلہ بہت ضروری ہے کہ ذریعۂ تعلیم کے لحاظ سے انگریزی اور دیسی زبانوں کی کیا حیثیت ہے۔ ان سب امور کے طے کرنے میں ہمارے مدنظر یہ ہونا چاہیئے کہ طالب علم کو اس کی تعلیم سے تا امکان زیادہ فائدہ پہنچے۔

سر سنکرن نائر اس کے میر مجلس تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس مجلس کے انعقاد کا منشا یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں کیا تغیر و تبدل یا ترمیم و اصلاح کی جائے (۱) طالب علم کو جو مضمون پڑھائے جاتے ہیں وہ انھیں پوری طرح سمجھ لے (۲) اور انگریزی زبان کا علم مدرسہ کے نصاب کے ختم پر زیادہ بہتر ہو۔

اوّل میر مجلس نے انگریزی زبان کی تعلیم کے متعلق چند امور بحث و مشورہ کے لئے پیش کئے۔ مثلاً انگریزی کس وقت شروع کرائی جائے۔ کیا ابتدا ہی سے انگریزی شروع کرا دی جائے تاکہ طالب علم کو آخر میں اس پر پوری قدرت حاصل ہو جائے؟ یا اس وقت شروع کرائی جائے جب کہ اسے اپنی زبان میں اچھی خاصی استعداد حاصل ہو چکی ہو؟

کیا انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنے سے لڑکوں کو زبان انگریزی خاطر خواہ آجاتی ہے یا یوں ہی غلط سلط یا شُد بُد آتی ہے؟

اُن طلبہ کے متعلق عام رائے یا تجربہ کیا ہے جنھوں نے ورنیکلر مڈل میں کامیابی حاصل کی ہے (یعنی جنھوں نے دیسی زبانوں کے ذریعۂ تعلیم حاصل کرکے مڈل کا امتحان پاس کیا ہے) اور اس کے بعد ہائی اسکول میں

داخل ہو کر انگریزی سیکھی ہی؟ اِن طالب علموں کی حالت اُن طلبہ کے مقابلہ میں کیسی رہتی ہی جنھوں نے ابتدا سے انگریزی کے ذریعۂ تعلیم حاصل کی ہی؟

انگریزی کے پڑھانے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں؟ کیا موجودہ طریقہ تعلیم میں انگریزی علم ادب کو زیادہ وقعت دی جاتی ہی اور صحیح انگریزی بولنے اور لکھنے پر زیادہ توجہ نہیں کی جاتی؟ ابتدائی زمانہ میں تعلیم بالکل زبانی ہونی چاہیئے یا نہیں؟

کیا اُن طلبہ کا علم جو دیسی زبان کے ذریعۂ تعلیم حاصل کرتے ہیں بہ نسبت اُن ہم عمر طلبہ کے جو انگریزی کے ذریعہ سے تمام مضامین پڑھتے ہیں زیادہ بہتر ہوتا ہی اور وہ اپنے نصاب کے مضامین میں زیادہ مستعد ہوتے ہیں؟

کثرت رائے سے یہ امور طے پائے۔

۱- جو طالب علم چند سال تک اپنی زبان سیکھنے کے بعد انگریزی مدارس میں آتے ہیں وہ عموماً سوائے انگریزی زبان کے دوسرے مضامین میں اُن طلبہ سے بہتر ہوتے ہیں جو ابتدا ہی سے انگریزی زبان سیکھتے ہیں

۲- جو طالب علم چند سال تک اپنی زبان سیکھنے کے بعد انگریزی مدارس میں داخل ہوتے ہیں وہ انگریزی زبان میں بہ نسبت اُن طلبہ کے جو ابتدا سے انگریزی پڑھتے ہیں کمزور رہتے ہیں۔

۳- انگریزی کافی استعداد حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہی کہ مدرسہ میں جہاں تک جلد ممکن ہو انگریزی زبان شروع کرادی جائے۔

۴- موجودہ حالات میں اپنی زبان میں تین سال تعلیم پانے کے بعد نو اور گیارہ برس کی عمر کے درمیان انگریزی میں تعلیم شروع کرائی جائے (اس میں بعض نے ترمیم پیش کی کہ بجائے تین کے دو سال ہونے چاہئیں بعض نے بجائے دو کے چار سال کی ترمیم کی)

اس کے بعد میر مجلس نے ہائی اسکولوں کے ذریعۂ تعلیم کا مسٔلہ پیش کیا اس کے متعلق مفصلۂ ذیل سوالات بحث کے لئے پیش ہوئے۔

(۱) غیر زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے سے کہاں تک

(۱) حصول علم میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ خیال کی جدت و آزادی زائل ہو جاتی ہے، اور درسی مضامین کی تحصیل کے لئے رٹنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے؟

(ب) دیسی زبان میں مقابلۃً مناسب درسی کتب کا نہ ہونا، دیسی زبانوں میں اصطلاحات علمی کی کمی اور دیسی زبانوں کا مختلف اور متعدد ہونا، کیا یہ ایسی رکاوٹیں ہیں جن کی وجہ سے دیسی زبانوں کا ذریعۂ تعلیم ہونا ممکن نہیں؟

(ج) کیا انگریزی کو بتدریج ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے یا نہیں؟ اگر یہ ہو تو کس عمر میں اور کس حد تک؟

(د) یہ کس حد تک مناسب ہوگا کہ اسکول کے نصاب کے اختتام پر بعض مضامین کا امتحان دیسی زبانوں کے ذریعہ سے لیا جائے۔

بعد بحث کے مفصلۂ ذیل رزولیوشن مجلس کے سامنے پیش کئے گئے۔

(۱) ہائی اسکول کی تمام جماعتوں میں دیسی زبان ذریعۂ تعلیم ہونی چاہیئے۔

فضل حسین، سیتا چرن دوبے اور نانک صاحبان نے اس تجویز کی تائید کی۔

سیش ایار، رچی، کنھیا لال گرو اور دیوادھر صاحبان نے تجویز اس شرط کے ساتھ منظور کی کہ اس میں ان الفاظ کا اضافہ کیا جائے "سوائے انگریزی کے جہاں تک ممکن ہو دوسرے مضامین میں"

۲- ہائی اسکول کی آخری دو جماعتوں میں اصل ذریعۂ تعلیم انگریزی ہونا چاہیئے۔

ڈی لاقوس، سیوا کمار شاستری ایار، مولوی احسان اللہ، ہارنل، چکرورتی، سید محمد عبدالرؤف، میسٹن، سٹون، دوار کا ناتھ، چیٹرجی، نتر بخن، دیوادھر، کورنٹن، اور سر سندر لال صاحبان نے اس تجویز کی تائید میں دووٹ دیئے۔ مسٹر سیش ایار نے اس شرط کے ساتھ اس تجویز کو منظور کیا کہ بجائے "آخری دو جماعتوں" کے صرف "اعلیٰ جماعت" رکھا جائے۔

سیوا کمار شاستری ایار، مولوی احسان اللہ، ہارنل، چکرورتی، میسٹن، سٹون، دوار کا ناتھ، چیٹرجی، نتر بخن، کورنٹن اور سر سندر لال صاحبان نے یہ ترمیم کی کہ بجائے "دو" کے "تین" جماعتیں ہونی چاہئیں۔

مولوی احسان اللہ، ہارنل، چکرورتی، دوار کا ناتھ، چیٹرجی، نتر بخن، کورنٹن صاحبان نے فرمایا کہ

بجائے "دو" کے "چار" جماعتیں رکھی جائیں۔

ارکانِ کانفرنس کا اِس امر میں عموماً اتفاق تھا کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بتدریج بنایا جائے۔

پھر یہ رزولیوشن پیش کیا گیا۔

۳۔ "ہائی اسکول کے اختتام نصاب پر امتحانات سوائے انگریزی کے باقی تمام مضامین دیسی زبان میں ہونے چاہئیں"

فضل حسین اور سیتاچرن دوبے صاحبان نے اس کی تائید کی اِس کے بعد یہ رزولیوشن پیش ہوا۔

۴۔ اُمیدواروں کو اختیار دیا جائے کہ وہ ہائی اسکول کے امتحان میں سوائے انگریزی کے باقی تمام مضامین کے سوالات کے جواب دیسی زبان میں دیں خواہ انگریزی میں"

ڈی لافوس، سیش ایار، رچی، فضل حسین، سیتاچرن دوبے، کھنیا لال گرو، چکرورتی، بخشی رام رتن، سیّد محمد عبدالرؤف، چٹرجی، دیوادھر، نائک اور کورنٹن نے اس تجویز کی تائید کی۔

کلکتہ یونیورسٹی کمیشن

دیسی زبان کی تعلیم کے متعلق اِس وقت تک کی تاریخ ہم کافی وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ اب ہم اس بارے میں کلکتہ یونیورسٹی کی تحقیق اور رائے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ کمیشن ہر لحاظ سے نہایت قابل وقعت ہے۔ کیوں کہ جو ارکان اس میں شریک تھے اُن کی اعلیٰ قابلیت اور فن تعلیم میں اُن کی بصیرت مسلّم تھی۔ نیز جن اصحاب سے انھوں نے سوالات پیش کر کے جوابات حاصل کئے ہیں وہ بھی ملک میں اپنی علمی قابلیت اور تجربہ کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ لہذا ایسے کمیشن کی رائے خاص طور پر عزت و امتیاز کی نگاہ سے دیکھنے کے قابل ہے۔

کمیشن کا سوال یہ تھا۔

"کیا آپ کی رائے میں میٹریکولیشن سے اوپر نصاب یونیورسٹی کے ہر درجے میں انگریزی زبان، تعلیم اور امتحان کا ذریعہ ہونی چاہیے"

اس سوال کا جواب کچھ اوپر تین سو اصحاب کی طرف سے وصول ہوا۔ جوابات کی تقسیم اختلاف رائے کی

بنا پر مفصلۂ ذیل ہو سکتی ہی -

(۱) ۱۲۰ - ایسے اصحاب تھے جنھوں نے قطعی طور سے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا - یعنی اُن کی رائے میں ذریعۂ تعلیم اور ذریعہ امتحان میٹرکولیشن سے اوپر یونیورسٹی کے ہر درجہ میں انگریزی زبان ہونی چاہیئے

(۲) ۲۶ - کا جواب اثبات میں تھا مگر کسی قدر شرط کے ساتھ - یعنی سوائے دیسی زبانوں اور سنسکرت کے باقی تمام مضامین کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہونی چاہیئے -

(۳) ۴۸ - کا جواب انگریزی اور دیسی زبان کے مشترکہ استعمال میں ہی یعنی یا تو ان کا استعمال ساتھ ساتھ ہو یا دو الگ الگ تعلیم گاہیں ہوں - ایک میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو دوسرے میں دیسی زبان (آخری تجویز کی تائید میں صرف چند اصحاب ہیں)

(۴) ۳۳ - کی رائے یہ ہی کہ بتدریج انگریزی کی بجائے دیسی زبان کر دی جائے -

(۵) ۳۷ - کا جواب قطعی نفی میں ہی -

(۶) ۹ - اصحاب ایسے ہیں کہ اُن کے جواب کسی تقسیم کے تحت میں نہیں آ سکتے -

اس تقسیم کی (جو کمیشن نے بڑے احتیاط سے کرائی ہی) اگر تنقید کی جائے تو مختلف اصحاب کسی قدر مختلف نتائج پر پہنچیں گے - پہلے ہم کمیشن کی رائے دیکھتے ہیں - کمیشن نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہی کہ جو اصحاب موجودہ نظام تعلیم کو (کسی قدر خفیف تغیر کے ساتھ) قایم رکھنا چاہتے ہیں اُن کی تعداد نصف سے کسی قدر زیادہ ہی - ایک چوتھائی ایسے ہیں جن کا منشا یہ ہی کہ انگریزی اور دیسی زبان کی تعلیم ساتھ ساتھ ہو - ایک آٹھواں ایسے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بتدریج انگریزی کی جگہ دیسی زبان کر دی جائے - بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے قطعی طور سے یہ کہا ہو کہ انگریزی کی بجائے بالکل بنگالی (یعنی دیسی زبان) کر دی جائے کمیشن نے ان لوگوں کو جنھوں نے جواب محض نفی میں دیا ہی کسی شمار میں نہیں رکھا کیوں کہ اُن کے جواب سے صحیح طور سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُن کا منشا کیا ہی - یعنی وہ چاہتے ہیں کہ بتدریج انگریزی کے بجائے دیسی زبان کر دی جائے یا نمبر۳ والوں کی طرح دونوں کے ساتھ ساتھ تعلیم چاہتے ہیں - اگر ہم نمبر۲ و ۴ و ۵ کو بھی ملا لیں تو بھی تعداد ایک تہائی سے کم ہوتی ہی - زیادہ تعداد اُنھیں کی ہی جو موجودہ طرز تعلیم کے حامی ہیں -

لارڈ میکالے کی یادداشت اور لارڈ ولیم بنٹنک کے رزولیوشن کو اس وقت پورے تاسی سال ہوتے ہیں۔ اُس وقت سے لیکر اب تک سرکار نے مختلف تحریروں، تقریروں، یادداشتوں، رزولیوشنوں، کانفرنسوں اور کمیشنوں میں اپنی پالیسی کا بار بار اعادہ کیا ہے کہ سرکار کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ دیسی زبان کے بجائے انگریزی کو رواج دے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف تو اہلِ ہند کو انگریزی زبان کے ذریعہ مغربی اعلیٰ تعلیم دے اور دوسری طرف دیسی زبانوں کی ترقی میں کوشش کرے تاکہ وہ تمام اغراض کے لئے کارآمد ہوسکیں۔ اور وہی لوگ جو اعلیٰ درجہ کی مغربی تعلیم کی تکمیل کرچکے ہیں اپنی زبان کے ذریعہ سے اپنے عام اہلِ وطن میں مغربی علوم اور خیالات کی اشاعت کریں گے۔ یہ بہت مبارک اور شریفانہ مقصد ہے۔ بشرطیکہ عمل میں آتا۔ تاسی سال کچھ کم نہیں ہوتے۔ اس عرصہ میں بیسوں انقلاب ہوگئے، سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، قوموں نے عروج و زوال کے سمے دیکھ لئے، خود ہمارے دیکھتے دیکھتے کیا کچھ نہیں ہوا۔ مگر عمل نہ ہو سکا تو اس رزولیوشن پر۔ یہ تحریریں مابعد کی تحریروں اور تقریروں کے حوالہ کے لئے بہت کارآمد ہوسکتی ہیں اور بس، سرکار کی نیت نیک ہے مگر عمل میں مجبوریاں ہیں۔

اِس ناکامی کے چند وجوہ ہیں۔ اوّل سرکار نے کبھی اسے عمل میں لانے کی باقاعدہ کوشش نہیں کی۔ یہ بڑا روپیہ کا صَرف ہے۔ یہ کام اُس وقت تک انجام پا نہیں سکتا جب تک دل کھول کے روپیہ صرف نہ کیا جائے۔ ہماری سرکار اس اسراف کو کیوں گوارا کرنے لگی۔ دوسرے سرکار کا انتظامی اور دفتری کام انگریزی خوانوں سے بخوبی نکلنے لگا، اس لئے اُسے اور بھی دیسی زبانوں کی اشاعت و ترقی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تیسرے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود اہلِ ملک نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی بلکہ انگریزی تعلیم کے لئے اصرار کرتے رہے اور انگریزی کے جوش میں کبھی یہ خیال نہ کیا کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ خیر وہ تو ابتدائی زمانہ تھا مگر اب بھی ہمارے ملک کے اہل الرّائے اس مسئلہ کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وائسرائے کی کانفرنس ۱۹۱۵ء اور امپیریل لیجسلیٹو کونسل اور حال میں ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی لیجسلیٹو کونسل کی روداد میں ہماری شامتِ اعمال پر شاہد ہیں۔

دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم و امتحان بنانے میں مفصلۂ ذیل اعتراضات کئے گئے ہیں۔

۱- دیسی زبانوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہی کہ اُن میں علمی اور اعلیٰ ادبی خیالات کا کافی طور پر اظہار ہو سکے۔

۲- دیسی زبانوں میں نصاب تعلیم کے لئے کافی تعداد میں کتابیں نہیں ہیں۔

۳- ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ذریعۂ اظہار خیالات اور عام اور مشترکہ زبان انگریزی ہی جس کی قایم مقامی کوئی دوسری زبان نہیں کر سکتی۔

۴- اس کے یہ معنی ہوں گے کہ غیر ممالک کے معلّم مدرّسی کے عملے سے خارج کر دیئے جائیں اور ہمارے کالج بعض اعلیٰ درجہ کے پروفیسروں کی تعلیم سے محروم رہ جائیں۔

۵- دوسرے ممالک کی مثال مغالطہ انگیز ہی- ہندوستان کی حالت جُداگانہ ہی- ہندوستان برٹش امپائر (سلطنت برطانیہ) کا جزو ہی اور باہمی اتحاد کا ذریعہ انگریزی زبان ہی-

۶- دیسی زبانوں میں علمی اصطلاحات نہیں ہیں۔

۷- ہندوستان میں بہت سی زبانیں ہیں اور بعض زبانوں کو ذریعہ تعلیم کے لئے مخصوص کرنا بعید مشکل ہوگا- اور اس میں بہت سی شکایتیں پیدا ہوں گی۔

۸- انگریزی ادب کے مطالعہ سے خود دیسی زبانوں کی ترقی مقصود ہی-

۹- اگر انگریزی دوسری زبان ہوگئی تو اس کا وہی حال ہوگا جو اب دوسری زبانوں مثلاً فارسی، عربی، سنسکرت وغیرہ کا ہی-

۱۰- انگریزی زیادہ ترقی یافتہ اور مُہذّب زبان ہی اور اس وقت ملک میں بہ نسبت کسی دوسری زبان کے زیادہ پڑھی جاتی ہی اور ہندوستان کے اتحاد کی اُمید بہ نسبت کسی دیسی زبان کے انگریزی زبان سے زیادہ وابستہ ہی-

۱۱- دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانا گویا آگے جانے کے بجائے پیچھے جانا ہی-

۱۲- دیسی زبان میں پڑھانے والے کہاں ہیں-

۱۳- انگریزی دفتری اور سرکاری زبان ہی-

۱۴- بقول مسٹر را مانند چٹرجی (اڈیٹر ماڈرن ریویو) انگریزی کا علم تہذیب ذوق کے لئے، ہندستانی صوبوں کے باہمی تعلقات کے لئے بین الاقوامی تجارت اور مراسلت کے لئے، انتظامی اغراض کے لئے، ہندوستان کے سیاسی اتحاد کے لئے، باہمی تبادلہ خیالات کے لئے، بیرونی دنیا سے تعلقات قایم رکھنے کے لئے، اور علم کی جدید ترین ترقیات کے لئے ناگزیر ہی۔

اس ضمن میں ہندوستان کے نامور اور بزرگ فاضل سر آر جی بھنڈارکر کی رائے کا نقل کرنا بھی ضرور معلوم ہوتا ہی۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو خیالات ہندوستانیوں کو یونیورسٹی کی تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں وہ مغربی اور انگریزی ہیں۔ دیسی زبانیں ان خیالات کے ادا کرنے کی قابلیت اور صلاحیت نہیں رکھتیں۔ ہماری زبانوں میں ایسا علم ادب پیدا نہیں ہوا جو مغربی علوم کے مناسب اور موزوں ہو۔ ایسی حالت میں تعلیم اور امتحان کا ذریعہ دیسی زبانوں کو بنانا کچھ موثر نہ ہوگا۔ اگر دیسی زبان مجبوراً ہمارے سر مڑھی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک نئی زبان پیدا ہو جائے گی جو آدھا تیتر آدھا بٹیر ہوگا۔

یہ وہی اعتراضات ہیں جو اس سے قبل بارہا کئے گئے ہیں اور ان کے جوابات بھی دیئے گئے ہیں۔ لیکن جب کبھی یہ مسئلہ پیش ہوتا ہی تو یہی اعتراض نئی نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس میں ایک بڑا مغالطہ یہ ہی کہ جب کبھی دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کے متعلق اصرار کیا جاتا ہی تو اس کے یہ معنی سمجھ لئے جاتے ہیں کہ انگریزی کی تعلیم کو نظرانداز کر دیا جائے گا۔ گویا دیسی زبان اور انگریزی دو ایسے رقیب ہیں جو ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ حالاں کہ اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہوتا کہ انگریزی خارج کر دی جائے یا ہماری تعلیم میں جو وقعت یا اہمیت اُسے حاصل ہو چکی ہی اُسے کم کر دیا جائے۔ ہماری موجودہ حالت ایسی ہی کہ کم سے کم کسی ایک ترقی یافتہ یورپی زبان کا نصاب تعلیم رکھنا ضروری ہی۔ کیوں کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ دوسری ضرورتوں کے علاوہ انگریزی زبان کا علم خود دیسی زبانوں کی ترقی کے لئے مفید ہی۔ ہم جب دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے زور دیتے ہیں تو اس سے ہمارا صرف اتنا ہی مطلب نہیں کہ طالب علم کے حافظہ اور دماغ پر سے بار کم ہو جائے صحت جسمانی قایم اور دماغی نقصان سے محفوظ رہی اور وہ جلد لکھ پڑھ لے۔ بلکہ ہمارا یہ یقین ہی کہ صحیح معنوں میں علم کی تحصیل خصوصاً بچپن اور لڑکپن میں بغیر اپنی زبان کے ناممکن ہی۔ یہ ہمارا عقیدہ ہی کہ ملک میں عام طور سے

علم کی اشاعت بغیر اپنی زبان کے کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکتی۔ مرد اور عورت، اعلیٰ، وسطانیہ اور ادنیٰ طبقوں میں جو ایک ناروا تفاوت پیدا ہو گیا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور اس کے مٹانے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تعلیم کا ذریعہ دیسی زبان ہو۔ خیالات و بیان میں جدّت پیدا کرنے کے لئے، علمی اور ادبی طرز ادا کے لئے اپنی زبان کو تحصیل علم کا ذریعہ قرار دینا ایسا ہی ضروری ہے جیسے مچھلی کے لئے پانی۔

لارڈ میکالے نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے اور اب تک وہ جملہ بار بار دُہرایا جاتا ہے کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم یافتہ مشرق و مغرب میں ترجمانی کا کام دیں گے اور ملک میں مغربی علم و خیالات کی اشاعت کریں گے۔ لیکن تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب تک غیر زبان ذریعۂ تعلیم رہے گی وہ اس فرض کی ادا کرنے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر اوقات بجائے ترجمانی کے نقالی کرنے لگتے ہیں جو زبان و ادب اور اخلاق کے لئے مضر ثابت ہوتی ہے۔ یہ ترجمانی اُسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی اس ترجمانی کا حق ادا کیا جائے۔ ہمارے طلبہ مغربی علم و خیالات کی اشاعت اُسی وقت کر سکتے ہیں جب کہ اُن میں اُن خیالات کے ادا کرنے کی قوت پیدا کی جائے۔ اگر تاسی برس قبل تعلیم کا ڈھنگ وہی اختیار کیا جاتا ہے جو دنیا جہان میں رائج ہے اور جس کی صحت میں کسی ذی فہم کو کلام نہیں ہو سکتا یعنی ہماری تعلیم ہماری ہی زبان کے ذریعہ سے ہوتی اور یورپ کے نامور شعرا و ادبا، علما و حکما کی تصانیف بجائے ناقص اور بے مزہ انگریزی میں پڑھانے اور رٹانے اور اُن کے کلام کی خوبیوں کو غارت کرنے کے ہماری زبان میں پڑھائی جاتیں تو دیسی زبانوں کا علم ادب کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ شیکسپیر اور ملٹن کا کلام، ارسطو و افلاطون کی حکمت، مل اسپنسر اور ڈیکارٹ کا فلسفہ، نیوٹن اور ڈارون کے مسائل پڑھاتے ہوئے کئی قرن گزر گئے مگر ہماری زبانیں ان خیالات و مسائل سے اب تک ناآشنا ہیں۔ اگر یہی چیزیں ہماری زبان میں پڑھائی جاتیں تو نہ صرف ان سب کی تصانیف ہماری زبان میں ہوتیں بلکہ ان پر متعدد تنقیدیں اور حواشی لکھے جاتے اور انھیں پڑھنے والوں میں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے جو ان نامور ادیبوں شاعروں اور فلسفیوں کے ہم پلّہ ہوتے۔

ایک عام اور بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ دیسی زبانوں میں علوم و فنون پر ایسی کتابیں کہاں ہیں جو نصاب

میں داخل کرنے کے قابل ہوں۔ بیشک نہیں ہیں۔ اور ہوں کیوں کر جب تمام تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ یہ طلب ورسد کا معاملہ ہے۔ جس روز ذریعۂ تعلیم بدل جائے گا کتابیں خود بخود آجائیں گی اور اگر نہیں ہیں تو لکھوانی چاہئیں، انتظام کرنا چاہیئے۔

اگر آج یہ قطعی طور سے طے کر لیا جائے کہ ہر قسم کی تعلیم دیسی زبان میں ہوگی تو پھر کتابوں کا تیار کرانا کچھ مشکل نہیں۔ پہلے کتابوں کو نہیں دیکھنا چاہیئے۔ مقدم اس مسئلہ کا فیصلہ ہے، کتابیں اس کے بعد ہیں۔ یہ اعتراض کچھ نیا نہیں ہے جب سے سرکار انگریزی نے اس ملک کی تعلیم اپنے ہاتھ میں لی ہے اور انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم قرار پائی ہے اُس وقت سے بار بار یہی آواز ہمارا منہ بند کرنے کے لئے یا ہم میں سے اکثر کی تسکین کے لئے سنائی دی ہے۔ اور لارڈ میکالے اور لارڈ ولیم بنٹنگ سے لے کر سر سنکرن نائر اور لارڈ چیمسفورڈ تک اُسی ایک کلمے کو دُہراتے چلے آتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم تو چاہتے ہیں کہ تعلیم دیسی ہی زبان کے ذریعہ سے ہو مگر یہ مجبوری ہے۔ اگر یہی لیل ونہار ہے تو یہ مجبوری تا قیامت یوں ہی قائم رہے گی۔

لیکن اس سے بھی قوی اعتراض یہ ہے کہ دیسی زبانوں میں اعلیٰ ادبی اور علمی خیالات کے ادا کرنے کی صلاحیت نہیں۔ ۔ یہ اعتراض اس امر کو بتاتا ہے کہ معترض اپنی زبان اور دوسری زبانوں سے نیز زبانوں کے اصول نشو و نما سے ناواقف ہیں۔ دنیا کی جدید زبانوں کو لیجئے۔ ان میں کون سی ایسی زبان ہے جس میں صلاحیت تھی۔ کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ انگریزی زبان جو آج کل سیلاب کی طرح پھیلتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح کم مایہ اور حقیر سمجھی جاتی تھی۔ انگلستان کے نامور مصنفین انگریزی میں تصنیف کرنا عار سمجھتے تھے۔ وہاں بھی لاطینی و یونانی اور فرانسیسی کا وہی زور تھا جیسے ہمارے ہاں سنسکرت، عربی فارسی کا وہاں بھی ہماری طرح غیر زبانوں کو ترجیح دی گئی اور اپنی زبان پامال رہی۔ کچھ عرصہ پہلے جرمن زبان کیا تھی اور اب کیا ہے۔ وہی زبان جو بے حقیقت اور وحشیوں کی زبان خیال کی جاتی تھی، آج دنیا بھر کے علوم و فنون سے مالا مال اور بھرپور ہے۔ ہم دُور کیوں جائیں جاپان کی مثال ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ ساٹھ سال پہلے اس میں ہماری زبان سے زیادہ صلاحیت نہ تھی اور اب اُن کی یونیورسٹیوں

میں تمام علوم و فنون جاپانی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اس میں یہ صلاحیت کہاں سے آگئی؟ اس جملے کے بار بار دہرانے سے کہ ہماری زبانوں میں صلاحیت نہیں ہمیں کچھ فائدہ ہو سکتا ہے نہ ہماری زبان کو۔ جہاں تک اس میں صلاحیت ہے اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے اور آگے کے لئے اس میں صلاحیت پیدا کرنی چاہیئے۔ وہ زبانیں مبارک ہیں جو اپنے ملک و قوم کے حالات کا ساتھ دیتی رہیں (اور ساتھ دینا ناگزیر تھا) اور قدرت اُن کے نشو و نما میں اپنے اصول پر خاموشی سے مدد دیتی رہی۔ وہاں کسی غیر معمولی جد و جہد کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن وہ بدنصیب زبانیں جو اپنے والی وارثوں کی طرح انقلابِ عالم میں مبتذل اور پامال رہ گئیں، نہ حالات نے مساعدت کی نہ قدرت نے اُن کے لئے موافق حالات کا انتظار کرنا یا قدرت کی فیاضی پر اعتماد کرکے بیٹھ رہنا ظلم نہیں خودکشی ہے۔ انسان ذی شعور اور ذی عقل ہے۔ وہ حالات کی ناموافقت، قدرت کے بخل، گزشتہ غفلت کی تلافی اپنی عقل و تدبیر سے کر سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں غیر معمولی جد و جہد کی ضرورت ہے اور متفقہ کوشش کبھی ناکام نہیں رہتی۔

یہی صورت علمی اصطلاحات کی ہے اس مسئلہ کی بحث میں یہ اعتراض بھی بار بار پیش کیا گیا ہے۔ اصطلاحات کا پہلے سے نہونا زبان کی کمی ہے لیکن اس امر کی دلیل نہیں کہ ہماری تعلیم ہماری زبان میں نہیں ہونی چاہیئے۔ اصطلاحات کا بنانا بے شبہ مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ دوسرے ممالک میں یہ ہوا کہ جوں جوں علم ترقی کرتا گیا اصطلاحات بھی بنتی گئیں۔ ہمارا ملک پیچھے رہ گیا تھا اور جدید علوم کی تعلیم شروع ہوئی تو غیر زبان میں اس سے اور بھی پیچھے ہو گیا۔ اب یہ بار اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کے خیال سے طبیعت پریشان اور ہمت پست ہو جاتی ہے۔ لیکن جو پس ماندہ افراد اور اقوام ترقی کرنا چاہتی ہیں انھیں خوش خوش اپنی گزشتہ غفلتوں کا خمیازہ بھگتنا چاہیئے اور اپنی کمی جوش اور مستعدی کے ساتھ پوری کرنی چاہیئے۔ ڈاکٹر دینش چندر سین صاحب نے اپنے مضمون "بنگالی زبان و ادب کا نشو و نما" میں یہ خوب بات لکھی ہے کہ جن صاحبوں نے بنگالی میں سائنس پر کتابیں لکھی ہیں، انھیں کبھی اصطلاحات کی شکایت کرتے نہیں سُنا۔ بنگالی میں جب یہ صلاحیت موجود ہے تو ہندوستان کی بعض دوسری زبانیں بھی اس میں ہیٹی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر برجندرا ناتھ سیل کی (جو ادبی ذوق علم و فضل اور غائر نظری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے) یہ رائے ہے کہ ملک کی ادبی انجمنوں کے مشورہ سے اصطلاحی

الفاظ کی مسلمہ فہرستیں تیار کی جائیں اور کالجوں اور اسکولوں میں اُن کی اشاعت کی جائے تاکہ دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم و امتحان بنانے میں سہولت ہو۔

خواہ کتنی کوشش کیوں نہ کی جائے انگریزی زبان ملک کی زبان نہیں ہوسکتی اور یہی وجہ ہی کہ وہ آیندہ ذریعہ تعلیم بھی نہیں رہ سکتی اور نہ اس وقت یہ عام اور مشترکہ زبان ہی۔ البتہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اظہار خیالات کا ذریعہ ہی اور اِس حد تک اُسے مشترکہ زبان کہہ سکتے ہیں۔ اور غالباً کچھ عرصہ تک اُسے یہ حیثیت حاصل رہی گی لیکن ہمیشہ اُسے یہ حیثیت حاصل رہی اور وہ مُلک کی عام اور مشترکہ زبان ہوجائے، ناممکن ہی۔ کوّا کب تک ہنس کی چال چل سکتا ہی اور مستعار پروں سے کہاں تک پرواز ہوسکتی ہی۔ اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اِس عالم اسباب میں ترقی و نمود کے خواہاں ہیں تو زبان کی غلامی سے نکلنا اور ذہنی و دماغی آزادی حاصل کرنا پہلی شرط ہی۔ کوئی قوم ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتی جس کی زبان میں ادب نہو، جو حکیمانہ اور شاعرانہ خیالات اور نازک و لطیف جذبات کے ادا کرنے سے قاصر ہو، جو معمولی قصّے کہانیوں اور مقبول عام گیتوں اور دوہوں سے نکل کر فلسفیانہ نکات، عالمانہ مباحث اور اعلیٰ درجہ کے اصنافِ سخن پر قادر نہو، یا اس میں علوم و فنون کی سمائی نہو۔ جو کوئی قوم ایسی ہی وہ بہت بڑی نعمت سے بے بہرہ ہی۔ گویا وہ گونگی بھی ہی اور ساتھ ہی بھکاری بھی ہی۔ اور ظاہر ہے کہ اقوام عالم میں ایک گونگی اور بھکاری قوم کی کیا وقعت ہوسکتی ہی۔

یہ خیال صحیح نہیں ہی کہ اگر انگریزی ذریعہ تعلیم نہ رہی اور صرف بحیثیت زبان کے پڑھائی گئی تو اس کی وہی درگت ہوجائے گی جو ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سنسکرت عربی اور فارسی کی ہی۔ اوّل تو انگریزی زبان کی حیثیت لازم مضمون کی ہوگی نہ کہ اختیاری مضمون کی۔ دوسرے جب طلبہ انگریزی کو بحیثیت زبان کے سیکھیں گے تو ان کا علم پہلے کی نسبت زبان بہتر ہوگا۔ تیسرے جب تمام مضامین اپنی زبان کے ذریعہ سے حاصل کرینگے تو انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کا زیادہ موقع ملیگا۔ چوتھے یہ خیال بھی صحیح نہیں ہی کہ انگریزی کے ذریعۂ تعلیم ہونے سے انگریزی زبان کا علم زیادہ ہوجاتا ہی۔ موجودہ طرز تعلیم کی وجہ سے اُن کا زیادہ تر وقت رٹنے میں صرف ہوتا ہی اور اُن کی تعلیم بے حد ناقص ہوتی ہی نہ تو انگریزی زبان ہی اچھّی طرح آتی ہی اور نہ دوسری زبان۔ سوچنے سمجھنے کے بجائے وہ حافظہ سے کام لیتے ہیں اور غور و فکر کی عادت نہیں رہتی۔ پانچویں ہمیں اپنے نصاب میں زبان

اور ادب میں فرق کرنا پڑے گا۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر طالب علم کو قدیم انگریزی زبان اور ادب کی تعلیم دی جائے جو زندگی میں کبھی اس کے کام نہ آئے گی۔ یہ حصہ صرف اُن طلبہ کے لئے مخصوص رکھا جائے کہ جو ادیب یا زبانوں کے محقق بننا چاہتے ہیں، باقی طالب علموں و جدید انگریزی زبان اس طرح سکھائی جائے کہ وہ لکھنا پڑھنا اپنے خیالات کا اظہار کرنا اچھی طرح سیکھ جائیں، انگریزی اخبارات، رسالوں اور کتابوں سے استفادہ کر سکیں اور دنیاوی کاروبار میں انھیں سہولت حاصل ہو۔ چھٹے زبان کے طریقۂ تعلیم میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہی۔ موجودہ طریقۂ تعلیم بہت ناقص ہی، اس میں بہت وقت صرف ہوتا ہی اور زبان جیسا کہ چاہیئے نہیں آتی۔ جدید طریقہ کے مطابق اگر زبانوں کی تعلیم پر اصلاح کر دی گئی تو بہت بڑا فرق پیدا ہو جائے گا اور جو اعتراض کہ اس وقت کیا جاتا ہی وہ خود بخود رفع ہو جائے گا۔ ایسے لوگ عام کاروبار اور سرکاری دفاتر کے لئے بہت موزوں ہوں گے۔

سب سے عجیب یہ دو اعتراض ہیں کہ (۱) دیسی زبانوں میں پڑھانے والے کہاں سے آئیں گے۔ (۲) ہماری کالج بعض اعلیٰ درجے کے انگریز پروفیسروں کی تعلیم سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ دونوں اندیشے بیجا ہیں۔ جب انگریزی زبان اور انگریزی ادب کی تعلیم الگ الگ ہو جائے گی تو ہم اعلیٰ درجہ کے انگریز پروفیسروں کی تعلیم سے ہر طرح مستفید ہو سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے جب طلبہ کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم کا انتظام بہتر اور زیادہ باقاعدہ کر دیا جائے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اعلیٰ درجہ کے انگریز پروفیسروں کی خدمات سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔ شروع شروع میں یہ اندیشہ ضرور ہوتا ہی کہ دیسی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم دینے والے کہاں سے آئیں گے کیوں کہ دیسی اور پردیسی دونوں انگریزی ہی میں پڑھاتے آئے ہیں۔ اسی طریقہ سے انھوں نے خود پڑھا اور اسی طرح وہ دوسروں کو پڑھاتے ہیں۔ سوائے اس کے سینکڑوں حواشی، تنقیدیں، نوٹ، معنی کی کتابیں انگریزی میں موجود ہیں اور ہر سال نئی نئی لکھی جاتی ہیں، اور اکثر اُستاد انھیں کی مدد سے طالب علموں کو کتابیں رٹوا دیتے ہیں۔ دیسی زبانوں میں یہ سہولت کہاں، دُگنی تگنی مشکل بڑھ جاتی ہی۔ مگر باوجود اس کے ہر صوبے میں ایسے لوگ نکل آئیں گے جو اس کام کو بخوشی اور بخوبی انجام دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ یہی پروفیسر جو آج کل ہمارے کالجوں اور یونیورسیٹوں میں کام کر رہے ہیں،

اگر دل پہ رکھ لیں اور محنت سے جی نہ چُرائیں تو اپنی زبان میں اچھی خاصی طرح تعلیم دے سکتے ہیں۔ اور جب ایک بار یہ کام شروع ہو گیا تو پھر آیندہ مطلق دقت باقی نہ رہے گی۔ قانون اور تعلیم کے دو ایسے پیشے ہیں جن میں ہندوستانی کسی طرح یورپینوں سے کم نہیں بلکہ بعض اوقات وہ اُن سے سبقت لے جاتے ہیں۔ لہٰذا اس بارے میں کسی قسم کے اندیشہ کی ضرورت نہیں۔

سب سے پُرلطف اعتراض یہ ہے کہ دوسرے ممالک کی مثال مغالطہ انگیز ہے۔ ہندوستان کی حالت جداگانہ ہے۔ ہندوستان سلطنت برطانیہ کا جُزو ہے اور باہمی اتحاد کا ذریعہ انگریزی زبان ہے۔ گویا معترض کے خیال میں ہندوستان کا تعلق سلطنت برطانیہ سے اُسی وقت تک قایم رہ سکتا ہے جب تک کہ انگریزی زبان ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم ہے۔ اور گویا انگریزی زبان اُسی وقت آسکتی ہے جب کہ وہ تمام مضامین وعلوم کی تحصیل کا ذریعہ ہو۔ زبان سیکھنے کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں۔ اس اعتراض کو ہماری بحث سے کوئی واسطہ نہیں۔ علاوہ اس کے یہ سب تعلقات عارضی ہیں۔ لیکن ہمارا تعلق ہماری زبان سے ایسا ہے جو نہ کبھی جدا ہو سکتا ہے نہ ٹوٹ سکتا ہے۔ یہ ہماری ہستی سے وابستہ ہے۔

ہم ڈاکٹر سر آر جی بھنڈارکر کو بوجہ اُن کے علم وفضل اور بزرگی کے نہایت قابل احترام سمجھتے ہیں لیکن ہمیں اُن کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ چوں کہ جو خیالات یونیورسٹی کی تعلیم سے ہندوستانیوں کو پہنچے ہیں وہ مغربی اور انگریزی ہیں اور دیسی زبانیں ان خیالات کے ادا کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اور نہ اُن میں ایسا لٹریچر پیدا ہوا ہے جو مغربی علوم کے مناسب ہو، لہٰذا انگریزی ہی ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان ہونی چاہیئے۔ کیا روس میں پیٹر اور کیتھرائن کے عہد میں نیز اس کے بعد مدّت دراز تک جو خیالات پہنچے تھے وہ مغربی نہ تھے؟ کیا جاپان میں جو خیالات اور علوم وفنون پہنچے وہ مغربی نہ تھے؟ کیا انھوں نے بھی ان خیالات وعلوم کی تحصیل کا ذریعہ انگریزی یا کسی غیر زبان کو قرار دیا تھا۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم بدنصیب مغربی خیالات وعلوم کو اپنی زبان میں تحصیل نہ کر سکیں۔ علم کسی کی میراث نہیں۔ دُنیا کے ہر باشندہ کو اس پر حق ہے۔ اور ہر زبان اُسے اپنے بندوں تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جاپان نے جب مغربی علوم وخیالات اپنی زبان میں منتقل کئے تو وہاں کوئی ایسی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی جو آدھا تیتر آدھا

بیٹر ہوتی۔ پھر ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ اگر دیسی زبان مجبوراً ہمارے سر مڑھ دی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک نئی زبان پیدا ہو جائے جو آدھا تیتر آدھا بیٹر ہوگی۔ قرین صحت نہیں معلوم ہوتا۔ اوّل تو کسی خاص فن یا علم کے بعض الفاظ مستعار لینے سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہو سکتی، کیوں کہ ہر زبان کے اصول صرف ونحو طرز بیان اور محاورہ الگ ہوتا ہے، دوسرے اگر بالفرض ایسا ہو بھی جائے تو کم سے کم اس میں نصف کے شریک تو ہوں گے اور یہ اس سے بہتر ہے کہ جہاں ہمارا کچھ بھی حصہ نہ تھا اور ہم سرتاسر ایک غیر زبان کے محتاج تھے۔ اہلِ زبان جو صاحب ذوق ہیں کبھی اپنی زبان کو اس طرح خراب اور مسخ ہونے دیں گے۔ وہ اتنا سمجھتے ہیں کہ دوسری زبان سے کون سے الفاظ ہمیں مستعار لینے چاہئیں اور کون سے ہمیں خود بنانے چاہئیں۔ ڈاکٹر بھنڈارکر صاحب کا یہ خوف و ہراس وہم سے خالی نہیں۔

ڈاکٹر بھنڈارکر ہمارے ملک کے اُن بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے انگریزی حکومت کا آخری ابتدائی زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور اُس کے قبل کے حالات چشم دید لوگوں سے سُنے ہیں۔ اُس وقت ہمارا ملک پریشان حالی، طوائف الملوکی، بدنظمی، بے بسی اور بے سروسامانی میں مبتلا تھا۔ ایسی حالت میں انگریزوں کے جدید انتظامات اور طریقے، اُن کی حیرت انگیز اختراعات و ایجادات اور اُن کے پُرمغز اور وسیع علم ادب اور تہذیب کو دیکھ کر ایسے مرعوب ہوئے کہ وہ آخر وقت تک اپنے دل و دماغ سے اس رُعب کو جدا نہ کر سکے اور جیسا کہ اس قسم کے علما کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص علمی ذوق میں اس قدر منہمک رہے کہ انھوں نے بعد کے حالات اور تغیرات کو کھلی آنکھوں اور بے لاگ دل سے نہیں دیکھا۔ نواب عماد الملک بہادر مدظلہ (مولوی سید حسین صاحب بلگرامی) کا شمار بھی انھیں بزرگوں میں ہے۔ لیکن وہ اس مسئلہ خاص میں اپنے تمام ہم عصروں سے منفرد ہیں۔ اس معاملہ میں انھیں اس قدر غلو ہے کہ وہ غیر زبان کے ذریعہ سے علم حاصل کرنے کو دماغی اور اخلاقی انحطاط کی علامت سمجھتے ہیں اور اُس جدید گروہ میں جو اپنی زبان کا حامی ہے نواب صاحب ممدوح باوجود کہن سال ہونے کے پیش پیش ہیں۔ اصطلاحات کا مسئلہ ایسا کٹھن ہے کہ جہاں پہنچ کر اکثر اصحاب (نئے ہوں یا پرانے) ٹھٹک جاتے ہیں، انھوں نے اپنے عالمانہ مضمون میں (جو اس رسالہ کے پہلے نمبر میں شائع ہو چکا ہے) قطعی رائے کا اظہار فرمایا ہے اور جو رائے انھوں نے پچاس برس قبل قایم کی تھی اُس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی بلکہ

ترقی کی ہے۔ اُن کی یہ قطعی رائے ہے کہ جب تک ہم علوم اپنی زبان کے ذریعہ سے حاصل نہ کریں گے ملک علم سے بے بہرہ رہے گا اور کبھی علم کی اشاعت عام طور پر ملک میں نہ ہو گی۔ میں اب ملک کے ایسے واجب الاحترام بزرگ کی رائے نقل کرتا ہوں جو عالی دماغ مصنف اور بلند خیال شاعر ہونے کے علاوہ تعلیمی معاملات میں بھی استنادِ و اجتہاد کا درجہ رکھتا ہے اور جس نے دنیا اور خصوصاً اپنے وطن کے حالات کو نظرِ غائر سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور اس کے بہت بڑے حامی ہیں کہ انگریزی کی تعلیم بطور زبانِ دوم کے نہایت سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ اور کامل طور پر دی جائے۔ لیکن ذریعۂ تعلیم مدارس (نیز کالجوں میں یونیورسٹی کی ڈگری تک) مادری زبان ہو۔ وہ اس کی تائید میں چار دلیلیں پیش کرتے ہیں:-

اوّل۔ مادری زبان ہی کے ذریعہ سے ہر شخص زندگی کے اصلی سبق حاصل کرتا ہے۔

دوم۔ اس لئے کہ بعض طالب علم جو اعلیٰ تعلیم کا پورا استحقاق رکھتے ہیں انگریزی زبان پر بخوبی قادر نہیں ہو سکتے۔

سوم۔ اس لئے کہ بہت سے طالب علم جو انگریزی زبان حاصل کرتے ہیں اس میں پوری مہارت حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور تاہم اس زبان کی تحصیل کی کوشش میں جو بنگالی[1] کے لئے بہت مشکل ہے وہ توانائی و ہمّت کا بہت بڑا حصّہ صرف کر دیتے ہیں، حالاں کہ قوت فکر و مشاہدہ کے آزادانہ نشو و نما کے لئے اس (توانائی و ہمّت) کی شدید ضرورت ہے۔

چہارم۔ اس لئے کہ مادری زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے میں لڑکیوں پر سے تعلیم کا بار ہلکا ہو جائیگا اور یہ اس لئے ضروری ہے کہ لڑکیوں کی صحیح اور اعلیٰ تربیت ہندوستان کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

اُن کی یہ رائے ہے کہ مغربی تہذیب کی خاص خاص اور اصل چیزیں تعلیم کی عام اشاعت کے ذریعے تمام بنگالیوں تک پہنچائی جائیں اور یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ دیسی زبان کے استعمال کو مدارس میں زیادہ تر رواج دیا جائے۔

---

[1] جہاں کہیں بنگالی اور بنگال کے لفظ آئیں وہاں ہم بلا تکلف ہندوستانی اور ہندوستان کا تصور کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ حالات تقریباً تمام ملک میں یکساں ہیں (اڈیٹر)

انصاف کی بات یہ ہی کہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے دیسی زبانوں کے مسئلہ پر ایسی واضح اور مدلل بحث کی ہی کہ اب تک کسی سرکاری تحریر یا رپورٹ میں نہیں پائی گئی تھی۔ اس کمیشن نے دیسی زبانوں کی بڑی حمایت کی ہی اور اس کی ترقی اور توسیع کی پُر زور الفاظ میں ترغیب دی ہی۔ ذیل کے پر زور اور فصیح الفاظ سے کمیشن کی رائے کا بخوبی اظہار ہوتا ہی:-

زبانوں کے ذریعہ سے جو مدرسہ میں حاصل کی جائیں یا بعد میں تعلیم یافتہ مرد یا عورت کے ہاتھ میں دنیا کی تہذیب و علم کی کنجیاں آجاتی ہیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک ایسا پروانۂ راہداری آجاتا ہی جو اُسے اُن الفاظ تک پہنچا دیتا ہی جو تحریروں میں ہیں یا تقریروں میں اور حکما اور ادبا کی مجلس میں لیجاتا ہے جو زندہ ہیں یا مُردہ، قریب ہیں یا بعید۔ یورپ کے زمانہ وسطیٰ میں طالب علم کے لئے لاطینی علم کی کنجی تھی۔ اٹھارھویں صدی میں (یورپ میں) کاروبار و معاملات کے لئے فرانسیسی بڑی کنجی تھی۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگریزی ناگزیر ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ ہندوستانی طالب علم کے لئے انگریزی محض ذریعہ معاش ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ ہی۔ یہ ایک ایسا رستہ ہی جو اُسے وسیع علمی زندگی تک پہنچاتا ہی۔

لیکن دوسری طرف مادری زبان سب سے مقدم ہی۔ مادری زبان ہی فطری ذہانت کا صحیح آلہ ہی۔ ایک غیر زبان جو ذریعہ تعلیم ہی نئے خیالات کی رَو تو لاسکتی ہی۔ لیکن مادری زبان اُس آب و ہوا میں ملی ہوئی ہی جس میں انسان پیدا ہوتا ہی۔ دیسی زبان ہی کے واسطہ سے (جو ذوق اور علم و فضل کے ذریعہ شایستہ ہوچکی ہی) انسانی دماغ کے جدید تخیلات تقریر میں شگوفے کی طرح کھلتے ہیں۔ یہ ایک عالمگیر صداقت ہی اگرچہ بعض شاذ و نادر مثالیں اس کے خلاف بھی ملتی ہیں، لیکن یہ مستثنیات عام قاعدہ کو اور واضح طور سے ثابت کرتی ہیں۔ انسان کی مادری زبان مثل اُس کے سایہ کے ہی جو اس کی ذات سے جدا نہیں ہوسکتی۔ ہم اپنی زبان میں بموجب ایک پُرانی مثل کے خاص اپنے چشمے سے پانی پیتے ہیں۔ کیوں کہ ہم میں سے ہر ایک ایک جماعت کا رُکن ہی۔ ہم اس کی قوت اور فطری شعور اور پُرانی اور دُور کی چیزوں کی یادمیں (خواہ وہ کتنی ہی مدھم ہوں) برابر کے شریک ہیں۔ یہ ہماری اپنی زبان یا عام بول چال ہی ہے

جس کے ذریعہ سے ہم اپنی فطرت کے مخصوص طرز ادا کو حاصل کر سکتے ہیں یا وہاں پہنچ سکتے ہیں جہاں تک کہ ہماری فطرت رسائی کی اجازت دیتی ہے۔ یہ مادری زبان ہی ہے جو بچے کے دماغ کو تقریر کی روشنی سے منور کرتی اور آسایش دیتی ہے جب کہ جسمانی تجربہ یا جذبات کی تحریک سے نئے خیالات اور رائیں احساس یا خیال کے نقط ناآشنا گوشوں میں سے ابھرتی ہیں اور وہ ان کے ادا کرنے کے لئے الفاظ کی امداد ڈھونڈھتا ہے۔ لہذا ہر نظام تعلیم میں مادری زبان کے آزادانہ اور صحیح استعمال کو سب سے پہلی جگہ دینی چاہیئے"۔

اس خیال کے اظہار کے بعد انھوں نے تمام رایوں اور شہادتوں پر غور کرنے کے بعد یہ رائے قایم کی ہے کہ میٹریکولیشن کی جماعتوں میں انگریزی کا استعمال بحیثیت ذریعہ تعلیم کی ضرورت سے زیادہ ہے اور یہ طلبہ کے حق میں مضرت رساں ہے۔ لہذا مدارس ثانویہ میں دیسی زبان باستثنا انگریزی اور ریاضی کے دوسرے تمام مضامین کے لئے ذریعہ تعلیم قرار دی جائے۔ اس کے علاوہ امتحان میں طلبہ کو اجازت ہو کہ سوالات کے جوابات خواہ وہ دیسی زبان میں دیں یا انگریزی میں (سوائے ریاضی اور انگریزی کے) مگر انٹرمیڈیٹ کالجوں اور یونیورسٹی کے درجوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہونا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ہی انٹرمیڈیٹ کے درجوں میں مادری زبان کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ اگرچہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہوگا لیکن سنسکرت پالی اور خود دیسی زبانوں کی تعلیم میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہونے کی ضرورت نہیں۔

اصطلاحات علمیہ کے متعلق کمیشن کی یہ رائے ہے کہ انگریزی اصطلاحات بجنسہ اختیار کر لی جائیں۔ یہ خیال صحت پر مبنی نہیں ہے کہ کسی لفظ کے سمجھنے کے لئے اس کی اصل و اشتقاق سے واقف ہونا ضروری ہے خود انگریزی اصطلاحات لاطینی اور یونانی سے بنائی گئی ہیں، لیکن انگریزی لڑکے ایسے ہیں جو ان میں سے کوئی زبان بھی نہیں جانتے۔ الفاظ اور اصطلاحات کے معنی عمل استعمال سے ذہن نشین ہوتے ہیں نہ کہ اصل زبان کے مطالعہ سے۔ مثلاً سیاح "ٹیلسکوپ" کا لفظ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں حالاں کہ وہ اس کے یونانی اشتقاق و ترکیب سے بالکل ناواقف ہیں۔ ارکان کمیشن کی رائے میں اسما و صفات اور افعال کی گردانوں میں اور ان سے جو لفظ مشتق و مرکب ہوں گے ان کے استعمال و رواج میں کوئی زیادہ دقت نہ ہوگی۔ کمیشن کی یہ بحث صرف طلبہ کی کتب نصاب تعلیم سے ہے کیوں کہ ان ہی طلبہ کو یونیورسٹی میں جاکر انگریزی اصطلاحات کا استعمال کرنا پڑے گا۔

اور ان کے لئے دو زبانوں میں اصطلاحات یاد کرنا بیجا بار ہوگا۔

کمیشن نے مذکورۂ بالا رائے موجودہ حالات کے رد میں قایم کی ہی اور درحقیقت ارکان کمیشن اس معاملہ میں ایک قدم آگے بڑھے ہیں۔ یہ امر اب مسلم ہی کہ مدارس ثانوی میں ذریعۂ تعلیم دیسی زبان ہونی چاہیئے لیکن امتحان کے معاملہ میں کمیشن نے کسی قدر کمزوری ظاہر کی ہی۔ ہماری رائے میں اس بات کو طلبہ کی مرضی پر چھوڑ دینا کہ خواہ وہ جوابات اپنی زبان میں دیں خواہ انگریزی میں درست نہیں۔ اس سے پھر دیسی زبان گھاٹے میں رہے گی۔ طلبہ باوجود اس اجازت کے حسب عادت انگریزی کا رواج قایم رکھیں گے اور فوراً اس اجازت سے فائدہ نہیں اُٹھائیں گے۔ اس راز کے سمجھنے میں انھیں ایک مدت لگے گی۔ اصولاً بھی یہ طریقہ صحیح نہیں ہی۔ شاید ارکان کمیشن نے یہ رائے اس لئے دی ہی کہ بنگال میں ایک کثیر تعداد ایسے اشخاص کی موجود ہی جن کی مادری زبان اُردو ہی۔ یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ بنگالی اور اُردو دونوں میں جوابات دینے کی اجازت دیدیتے۔ جب تک انگریزی کا ذرا بھی لگاؤ رہے گا طالب علم حافظہ کے زور سے مضامین رٹ لیں گے اور اپنی زبان سمجھکر تحصیل کرنے سے غفلت کرتے رہیں گے۔ البتہ یہ شرط اس وقت کارگر نہیں ہوسکتی جب تمام کتب نصاب دیسی زبان میں ہوں اور پڑھانے والے بھی دیسی زبان ہی کے ذریعہ سے پڑھائیں دوسرا نقص اس تجویز میں یہ ہی کہ انھوں نے انگریزی اور ریاضی کو مستثنیٰ کر دیا ہی۔ حالاں کہ انگریزی کو خاص طور پر دیسی زبان کے ذریعہ سے پڑھانے کی ضرورت ہی جیسا کہ میں اس سے قبل لکھ چکا ہوں کہ اگر ابتداً انگریزی زبان کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ سے ہوتی تو انگریزی شعرا اور ادبا کے اعلیٰ خیالات بہت آسانی سے ہماری زبانوں میں منتقل ہو جاتے اور ہمیں ہر قسم کے نازک اور لطیف خیالات اور جذبات کے ادا کرنے میں زیادہ قدرت ہوتی اور ہماری زبانوں کے ادب کو بہت بڑا فائدہ پہنچتا۔ خیر ابتدا میں تو یہ عذر ہوسکتا تھا کہ دیسی زبانوں میں پڑھانے والے نہیں ملتے مگر یہ اب عذر پیش نہیں جاسکتا۔ ریاضی کی تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے اس لئے جائز رکھی گئی ہی کہ اس مضمون کی اعلیٰ تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے ہوگی اور طالب علم کو شروع سے انگریزی اصطلاحات سے مانوس رہنا چاہیئے۔ دوسرے ان کا یہ خیال بھی ہی کہ دیسی زبان میں ریاضی کی اصطلاحات نہیں ہیں۔ حساب کی ابتدائی تعلیم ظاہر ہی کہ طالب علموں کو اپنی زبان میں دی جائیگی۔

اوپر کے درجوں میں الجبرے اور علم ہندسہ کا اور اضافہ ہوگا۔ ان فنون کے اصطلاحات دیسی زبانوں میں بھی موجود ہیں۔ اگر یہ خیال ہو کہ یونیورسٹی میں جاکر ریاضی انگریزی میں پڑھائی جائے گی تو یہ ہو سکتا ہے کہ مدارس ثانویہ میں طلبہ دیسی اور انگریزی دونوں اصطلاحات کو پیشِ نظر رکھیں۔ اور یہ کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اس کے علاوہ کمیشن کی یہ بھی رائے ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالجوں میں دیسی زبانوں کی تعلیم جاری رکھی جائے اور ان زبانوں کا عمدہ کلام طالب علموں کو پڑھایا جائے جس سے انھیں نہ صرف اپنی زبان پر قدرت حاصل ہوگی بلکہ صحیح طور سے غور کرنے اور اپنے خیالات کے بوجہ احسن ظاہر کرنے کی قوت پیدا ہوگی۔ اسی طرح یونیورسٹی درجوں میں بھی دیسی زبانوں کی ادبی تاریخی تنقیدی تعلیم کی رائے دی ہے تاکہ طلبہ اپنی زبانوں میں تحقیق و تنقید کا کام کر سکیں ۔ کلکتہ یونیورسٹی نے اس سے قبل ہی اس کام کو شروع کر دیا تھا جس کی مختصر کیفیت ڈاکٹر دنیش چندر سین نے اپنے مضمون میں بیان کی ہے جو اسی رسالہ میں شائع ہوا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں بھی دیسی زبانوں کی ترقی و توسیع کا خیال کریں گی۔

سب سے بڑا کام اس وقت یونیورسٹیوں کا یہ ہے کہ وہ اس قسم کی مجلسیں قایم کریں جو دیسی زبانوں کی ترقی کے متعلق غور کریں۔ مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھوائیں یا ترجمہ کرائیں تاکہ یہ اعتراض کہ دیسی زبانوں میں علمی کتابیں نہیں ہیں رفع ہو جائے اور جو لوگ محض اس وجہ سے دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے میں تامل کرتے ہیں، انھیں کوئی عذر نہ رہے۔

اگرچہ کمیشن نے آیندہ کے متعلق کسی رائے کے اظہار سے احتراز کیا ہے اور اس مسئلہ کو خود اہلِ ملک کے فیصلہ پر چھوڑ دیا ہے۔ تاہم اُن کا خیال یہ ہے کہ مثل بعض مقبوضات برطانیہ اور دیگر ممالک کے ہندوستان کو بھی دو زبانیں اختیار کرنی پڑیں گی۔ ایک اپنی زبان اُن عزیز چیزوں کے اظہار کے لئے جو بچپن سے اُن کی زندگی کا جُز ہوگئی ہیں اور جو اُن کی شاعری اور قومی جذبات کی رُوح رواں ہیں۔ دوسرے انگریزی جو ہندوستان کے اتحاد اور دوسرے ممالک سے تعلقات قایم رکھنے کے لئے باہمی تبادلۂ خیالات اور صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو ملک کی عام اور مشترک

زبان ہو سکے ؟ انگریزی باوجود اس ترقی کے جو اسے حاصل ہی اور باوجود اس شغف کے جو اہلِ ہند کو اس سے ہی ملک کی عام زبان نہیں ہوسکتی۔ یہ ہمیشہ تعلیم یافتہ حلقے میں محدود رہے گی۔ نامور مستشرق ولکن کا وہ قول جو انھوں نے سرکاری فیصلہ کے خلاف لکھا تھا اب بھی باوجود انگریزی کی اس قدر اشاعت کے صحیح معلوم ہوتا ہی وہ لکھتے ہیں: "اس کلیہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہی کہ قومی ادب (لٹریچر) صرف قومی زبان کے ساتھ ساتھ چل سکتا ہی۔ اور جب تک علم غیر زبان تک محدود رہے گا وہ صرف چندے اشخاص کی ملک ہوسکتا ہی جنھیں اس کی تحصیل کا موقع اور فرصت ہی۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک ایسی زبان جو ہندوستانی زبان سے بالکل مختلف ہی کبھی عام طور پر ذریعۂ تعلیم نہیں ہوسکتی۔ اور اگر اس کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر بھی انتظام کیا جائے تو بھی وہ صرف ایک فرقہ کا حصّہ ہوگی سارے ملک کی زبان نہیں ہوسکتی۔"

یہ حیثیت ہندوستان کی صرف دو زبانوں کو حاصل ہوسکتی ہی۔ ایک ہندی دوسرے ہندوستانی یا اُردو کو۔ اگرچہ بدنصیبی سے باہمی اختلافات نے ان دو زبانوں کو بالکل ایک دوسرے سے جُدا کر دیا ہی لیکن حقیقت میں ہیں وہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ فریقین نے اپنی اپنی زبان کی حمایت میں جو اختلاف بیان کیا ہی اصل میں اس قدر اختلاف نہیں ہی۔ بڑا فرق رسم الخط کا ہی۔ اس کے متعلق بھی ہر فریق نے دلائل و براہین پیش کرکے اپنے اپنے خط کی خوبیاں اور دوسرے کی بُرائیاں دکھانے میں بڑا زور لگایا ہے۔ ہم یہاں ان کا اعادہ کرکے اس اختلاف کو تازہ نہیں کرنا چاہتے اور صرف ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو پروفیسر کی رائے بیان کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ چوں کہ فاضل پروفیسر کسی فریق سے تعلق نہیں رکھتے اور جنوبی ہند کے رہنے والے ہیں اور ملک کے تعلیمی مسائل پر اُن کی غائر نظر ہی، لہٰذا اُن کی رائے زیادہ قابلِ لحاظ اور لایقِ التفات ہے۔

"اگر اس ناممکن مفروضہ سے قطع نظر کر لیا جائے کہ انگریزی کسی زمانہ میں ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ہوسکتی ہی تو اب صرف یہ امر باقی رہ جاتا ہی کہ یا تو ہم غیر مروّجہ (مردہ) زبانوں میں سے جیسے سنسکرت پراکرت یا قدیم فارسی یا ہندوستان کی خاص خاص دیسی زبانوں میں سے مثلاً ہندی، بنگالی اور تامل میں سے کوئی زبان انتخاب کریں جو ملک کی عام زبان ہو۔ اوّل قسم کی زبانیں زیادہ بحث کے قابل نہیں۔ یہ سچ ہی کہ سنسکرت تمام ہندوستان میں پڑھی جاتی ہی علاوہ اس کے اس میں یہ خوبی بھی ہی کہ وہ تمام ہندوستانی

زبانوں کی بنیاد ہی۔ لیکن کسی زمانہ میں بھی وہ ہندوستان میں عام طور پر مُروّج نہ تھی اور یہ مشکل معلوم ہوتا ہی کہ ایک ایسی کامل زبان جس میں افعال کی اس قدر مختلف صورتیں ہیں عام لوگ بولتے ہوں۔ فارسی کا استحقاق اس معاملہ میں بہت کم ہی اور پراکرت کا اس سے بھی کم۔

اب صرف یہ بات باقی رہ گئی کہ ہندوستان میں چار بڑی بڑی زبانوں میں سے کون ایک مشترک زبان ہوسکتی ہی یعنی اس مسئلہ کی صورت صاف الفاظ میں یہ ہی کہ ہندستان کی خاص زبانوں میں سے ہم اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ معاشرت کے لئے کس زبان کو انتخاب کریں؟ بظاہر یہ جھگڑا ہندوستانی، بنگالی اور تامل میں ہی۔ تامل اور بنگالی، اگرچہ ان کا ادب وسیع ہی صرف ایک صوبہ اور خاص لوگوں میں محدود ہی۔ ہندوستانی کی حالت اس سے مختلف ہی۔ ہندوستانی بولنے والے کسی خاص محدود رقبے میں آباد نہیں۔ یہ زبان تمام شمالی ہند میں سمجھی جاتی ہی۔ ہندوستان کے مسلمان کسی قدر اختلاف کے ساتھ اسے استعمال کرتے ہیں اور اس سے اس کا دعویٰ اور قوی ہو جاتا ہی۔ علاوہ اس کے اس کے لکھنے میں دو قسم کے حروف استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ امر اس کے لئے باعث ضعف نہیں بلکہ اس کے استحقاق میں اور قوت پیدا کرتا ہی۔ ناگری حروف کی وجہ سے یہ تمام ہندوؤں میں مقبول ہی اور فارسی حروف کی وجہ سے تمام مسلمانوں میں۔ اس طرح ہندوستانی کو عام اور مشترک زبان قبول کر لینے سے ہماری تہذیب و تمدن کا سلسلہ ہندو مسلمان دونوں کے لئے قایم رہے گا[1]۔"

یہ اندیشہ بے بنیاد ہی کہ ہندوستانی کو عام اور مشترک زبان بنا لینے سے دوسری زبانوں کو نقصان پہنچے گا۔ ہر زبان اپنے اپنے صوبہ میں ترقی کرے گی اور اہل زبان کو ترقی پر وہی فخر ہوگا جو اس وقت ہی۔ ہندوستانی پہلے ہی سے ملک کے اکثر حصوں میں بولی یا سمجھی جاتی ہی اور ہر جگہ مقبول نظر آتی ہی اس سیکھنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی۔ یہ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہی کہ یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور اہل ملک کو دو یا تین زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں اگرچہ اس سے دماغ پر بار پڑتا ہی لیکن ساتھ ہی دوسرے فوائد بھی مدنظر ہیں۔

---

[1] نظم تعلیم ہندوستان (Essays on Educational Reconstruction in India.) مؤلفہ پروفیسر کے ایم پانیکر

بن کے بغیر چارہ نہیں۔ ہندوستان ہی ایک ایسا ملک نہیں بلکہ دنیا میں اور بھی ایسے ممالک ہیں جہاں حالات کے لحاظ سے یہی دقت پیش آتی ہے اور وہاں والوں کو دو دو زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ مثلاً ویلز کے طالب علم جب انگلینڈ کی کسی یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں انگریزی بولنی پڑتی ہے۔ بلجیم اور سوئٹزرلینڈ ایسے ملک ہیں جہاں کے باشندوں کو دو دو اور بعض اوقات تین تین زبانوں کا جاننا ضروری ہوتا ہے اس سے ان کی تعلیم یا ذہنی ترقی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسی طرح فنلینڈ میں سویڈش اور فنش یا گرین لینڈ میں ڈینش اور اسکیمو یا جاوا میں ڈچ یا ملائی زبانیں جاننی اور بولنی پڑتی ہیں۔ اہلِ ہند کے لئے موجودہ حالات میں اس کے بغیر چارہ نہیں کہ وہ اپنی مادری زبان کے علاوہ ہندوستانی جانیں اور بولیں اور علمی ترقی اور ذہنی نشو و نما کے لئے انگریزی یا کوئی اور یورپی زبان سیکھیں۔ قوموں کو دنیا میں ترقی کرنے کے لئے بہت سی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں ان میں سے ایک قربانی یہ بھی ہے جو ہمارے ملک کے حالات نے ہم پر فرض کر دی ہے۔

TO THE CUCKOO

By

W. Wordsworth

O blithe new-comer! I have heard,
I hear thee and rejoice;
O Cuckoo! shall I call thee bird,
Or but a wandering Voice?

While I am lying on the grass
Thy twofold shout I hear;
From hill to hill it seems to pass,
At once far off and near.

Though babbling only to the vale
Of sunshine and of flowers,
Thou bringest unto me a tale
Of visionary hours.

Thrice welcome, darling of the Spring:
Even yet thou art to me
No bird, but an invisible thing,
A voice, a mystery

کوئل٥

مترجمہ

(جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے)

خوشا ہست آواز والے پرندے (١)
تری کوک خوشیوں کا اک راز ہے
پرندہ کہوں یا تو بچپن کی میرے
بھٹکتی ہوئی سی اک آواز ہے

تری تانیں دلچی میں سنتا ہوں لیٹا (٢)
ہوا گھاس پر گو تو مستور ہے
تری کوک سے بن کا بن گونج اُٹھا
ابھی پاس ہے اور ابھی دور ہے

سناتی ہے بن کو سُریلی کہانی (٣)
تو پھل پھول کی دھوپ اور چھاؤں کی
یہ آواز تیری ہے مجھ میں جگاتی
لڑکپن کی گھڑیاں وہ اک خواب سی

خوشا اے تو فطرت کے موہن پرندے (۴)
تو میرے لڑکپن کی دمساز ہے
پرندہ نہیں تو تصور میں میرے
اک آواز ہے اب بھی اِک راز ہے

٥ اس نظم میں ناظرین ملاحظہ فرمائینگے کہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جہاں مصرعہ کا وزن ختم ہوا ہے وہاں جملہ بھی ختم ہو جائے۔ بلکہ جملہ خیال کے ساتھ ساتھ ہے اور قافیہ پر آپ دل
رچ بھکر دوسرے مصرعہ اور پھر بعد کے شعروں میں گھُل مِل گیا ہے۔ (اڈیٹر)

The same whom in my school-boy days	وہی ہے تو آواز اسکول جاتے	(٥)
I listen'd to ; that Cry	مرے کان میں پڑ گئی بس جہاں	
Which made me look a thousand ways	ہزاروں طرف آنکھ نے چھان مارے	
In bush, and tree, and sky.	درخت اور جھاڑی زمیں آسماں	
To seek thee did I often rove	لڑکپن میں تیرے لئے خاک چھانی	(٦)
Through woods aud on the green ;	گھنے بن کی میدان کی کھیت کی	
And thou wert still a hope, a love ;	پرندے دلربا اے تمنائے طفلی	
Still long'd for, never seen ·	بہت ڈھونڈھ دیکھا نہ پایا کبھی	
And I can listen to thee yet ;	تجھے سن کے اب بھی ہوں کھویا سا جاتا	(٧)
Can lie upon the plain	عجب ان سروں میں ہے جادو بھرا	
And listen, till I do beget	کہ آنکھوں میں لہرانے لگتا ہے سارا	
That golden time again.	زمانہ وہ انمول بچپن مرا	
O blessed bird ! the earth we pace	مبارک پرندے یہ دکھیاری دھرتی	(٨)
Again appears to be	نظر میں مری پھر ذرا کی ذرا	
An unsubstantial, fairy place,	پرستان ہے یا تخیّل کی نگری	
That is fit home for Thee ;	ترے آشیانہ کی موزوں جگہ	

اصطلاحات نباتات

از جناب مولوی سید وحیدالدین سلیم پروفیسر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ نمبر پنجم جلد ۲ بابت ماہ جنوری سنہ رواں)

Boronia	بورونیہ
Bostryx	کاکلیہ
Botanical	نباتی
Botanic garden	نباتی باغ (نباتستان)
Botanist	نبات داں
Botany	نباتیات - نباتات
Botrychium	خوشیہ
Botryoidal	خوشیلا
Botryose	خوشہ نما
Botryosporium	خوشہ دانہ
Boussingaultia	بوسنگولطیہ
Bouteloua	بوطیلویہ
Bouvardia	بووردیہ
Bowdichia	بودیشیہ
Brabeium	عطیہ
Bradburya	براڈبریہ
Butneria	بتنیریہ
Butomaceoe	بطوموسائیہ
Butomaceous	بطوموسائی
Butomus	بطوموس
Butea	بوتیہ
Buxbaumia	بکسومیہ — بکسبومیہ
Carpel	ثمیرہ - برچہ
Carpellary	ثمیری - برچکی
Carpellate	ثمیردار - برچہ دار
Caulescent	ساقدار - تنہ دار
Chloranthaceoe	سبزولائیہ
Chloranthacious	سبزولائی
Chloranthus	سبزولیہ
Chloranthy	سبزولہت
Decagynia	دہ زنہ
Decagynian	دہ زنی

Galactia	اشیریہ
Gasteromycetes	شکم کھمبي
Gastrolobium	شکم دمہ
Geoffroea	جاوریہ
Geoglossum	ارضدان
Germpore	جرسام
Germtube	جرمي نلي–جرم نلي
Gladiate	خنجراسا
Gladiole	خنجرہ
Glabularia	کریقہ
Globulariaceoe	دوالہ
Glochidiate	پیکاني
Glochidium	پیکان
Glossopteris	زبان سرخس
Glossopodium	زبان پایہ
Hobenaria	دسمیلا
Hadrocentric	مت بیچا
Hoemanthus	دم گلہ
Hoematoxylon	دم عودہ – بقم
Hoemodoraceoe	دم بنایلہ

Dermatogen	جلد آفرین
Diadelphia	دوبرادر
Diadelphous	دوبرادري
Epicalyx	زیرکاس
Epicarp	زبربار–زبرپھل
Faba	لوبیا
Fabaceoe	لوبایلہ
Febaceous	لوبایلي
Fagelia	فاجیلیہ
Falcata	ھنسیا
Fiber, Fibre	ریشہ–لیف
Fibered, Fibred	ریشہ دار–لیف دار
Fiber, or Fibre, plant	ریشہ داردرخت
Fibril	ریشک–لیفک
Fibrillar	ریشکي–لیفکي
	ریشکدار–لیفکدار
Fibrillary	ریشیکت–لیفیکیت
Fibration	لیفاد
Fibriform	لیف سان
Fibrilliform	لیفک سان

Hokea	هائیه
Halleria	هالریه
Halophilous	نونچه
Haloragidaceae	یمکنارانه
Haloragidaceous	یمکناري
Hylophyte	شوربا
Hamelia	هامیلیه
Hepatica	حکرانه
Hepaticae	جکریه
Hygrophyte	نم رو – نم نبات
Hygrophytic	نم روئی
Hymeniferous	جهل برت
Hymenium	جهلی
Hymenocallis	جهل روپ
Hymenophore	جهلي دار
Hymenophyllaceae	جهل پتیی
Hymenophyllum	جهل پتیا
Hyoscyamus	بنج (اجواین خراساني)
Hypanthium	زیر گل
Hypanthial	زیر گلي

Hypodermal	زیرجلد
Jaborandi	جابورندی
Jacaranda	جکاراندا
Jacitrra palm	جاسي تارا
Jacksonia	جکسونیه
Jacobinia	جقوبیه
Jagua palm	جکوا
Kittul	کی تول
Kneffia	نیفیه
Kniphofia	کنفوفیه
Kochia	کوکیه
Koeberlinia	کوبرلینیه
Koelreuteria	کلرویتریه
Kokoona	کوکونا
Kosteletzkya	کوستلرکیه
Krameria	کرامیریه
Labellum	لبک
Labiate	لبدار
Labouleeniaceae	لبول بنایله
Laboulbeniales	لابول بنایلي = لابول بنیلي

Mycelium	نطرومه
Mycelial	نطرومي
Mycetoid	نطراسا
Mycoplasma	نطري قالب
Mycology	نطريات
Mycologic	طارياتي
Mycologist	نطريات دان
Mycorrhiza	نطاري س
Mycorrhizal	نطاريني
Myoporaceoe	نقطايله
Myoporaceous	نقطالی
Myoporum	نقطابه
Myrcia	آس
Octogynia	هشتمانه
Octogynian	هشتمادي
Octolocular	هشتخانک
Octophyllous	هشتبرگوله
Odontoglossum	دنتاجيبيا
Oedogonium	درمبيج
Oenanthe	تاک

Laboulbeniaceous	لابول بنيله
Lachenalia	لاكي نبليه
Lactarius	دودهيا
Lactoric	شيرلا
Lactoridaceoe	شيرلايله
Lactoridaceous	شيرلايلي
Lactiflorous	شيرگله
Loelia	ليليه
Lagerstroemia	ليگرستيميه
Laminaria	صفيحيه
Laminariaceoe	صفيحايله
Laminariaceaus	صفيحايلي
Lanceolate	نرچيلا
Lancepod	نيز پايه
Langsdorffia	لنودرفيه
Lantana	كورلا
Lapageria	لاپا جيريه
Lapeyrousia	لاپا روزيه
Maranta	مرنتا
Mycelioid	نطرو ماسيا

Oenocarpus	ناكبر
Olea	زيتون
Oleaceoe	زيتونايله
Oleaceous	زيتونايلي
Oligocarpous	كمبر
Olive	زيتون
Oligospermous	كم تخمه
Oligotaxy	كم نظمي - كم ترتيبي
Ombrophile	باران جو
Ombrophobe	باران‌گريز
Periderm	حول جلد
Peridermal	حول جلدي
Perisperm	حول بزره
Perispermal / Perispermic	حول بزري
Porphyritic	ارغوانيه
Sabbatia	سباتيه
Sabia	سابيه
Sabiaceoe	سابايله
Sabiaceous	سابايلي
Sac	كيسه
Saccharomyces	شكر كهمدي
Saccharomycetaceoe	شكر كهمدايله
Saccharomycetaceous	شكر كهمدا يلي
Saffron	زعفران
Sageretia	سكريشيه
Sagina	سجينه
Sagittaria	سهميه
Saguerus	ساكوئيه
Salicaceoe	صفصاله - صفصافايله
Salicaceous	صفصايلي
Salicornia	نمكهار
Salix	صفصاف
Salomonia	سالمونيه
Salpiglossis	سرنازبان
Salvadora	سلوا دورا
Salvadoraceoe	سلوا دورايله
Salvadoraceous	سلوا دورايلي
Salvia	سلويه
Salvinia	سلوينيه
Salviniaceoe	سلوينايله

Salviniaceous	سلوينايلي
Samandura	سمندره
Sanguisorba	لهو چوش
Sanicle	شاوى
Sanicula	شاويه
Santalaceoe	صندلايله
Santalaceous	صندلايلي
Santalales	صندليله
Santalum	صندل

Sanvitalia	سنو طاليه
Sapindaceoe	صاپونايله
Sapindaceous	صاپونايلى
Sapindales	صاپونيله
Sapindus	صاپونغديه
Sapodilla	سپطيله
Saponaria	صاپونيه
Sapota	ساپوطه
Sapotaceoe	ساپوطايله
Sapotaceous	ساپوطايلي

تبصرے

سوانح عمری۔ نواب مولوی تفضل حسین خاں خان علامہ
حزن اختر
اسلام کا اثر یورپ پر
جواہر منظوم ۔ ترجمہ رباعیات سرمد
نقاش
نگار
دی ٹیچر
رئیس ہند

از اڈیٹر

سوانح عمری نواب مولوی تفضل حسین خاں خان علامہ

اگرچہ ایک سو پندرہ برس ہوتے ہیں کہ ایشیاٹک سوسائٹی نے خان علامہ کے حالات شائع کئے تھے مگر ہمارے ملک میں کتنے صاحب ہیں جو علامہ مرحوم کے نام اور اُن کے کارناموں سے واقف ہیں ۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اُن کے سعید اور قابل پوتے نواب سید محمد علی خاں صاحب نے مختلف تواریخ نیز

اپنے اور اپنے خاندان کی معلومات کی مدد سے خان علامہ کی ایک مختصر سوانح عمری اردو میں شائع کی ہے اس میں جناب مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی بھی قابل شکریہ ہیں کہ اُن کی تحریک سے وہ اس کے لکھنے اور شائع کرنے پر آمادہ ہوئے۔

خان علامہ ہندوستان کے اسلامی عہد کے آخری دور میں ایک بے نظیر فاضل اور عالم متبحر گذرے ہیں اُن کے بزرگ تاتار سے آکر کشمیر میں بس گئے تھے۔ اور پھر تجارت کے سلسلہ میں لاہور پہنچے جہاں اُنھوں نے صوبہ دار لاہور کی ملازمت اختیار کرلی۔ خان علامہ سیالکوٹ (اور بقول بعض لاہور) میں ۱۱۵۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ لیکن تیرہ سال ہی کی عمر میں دھلی چلے آئے جہاں اُن کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ انیس۱۹ سال کی عمر میں لکھنؤ آئے اور ملا حسن صاحب فرنگی محلی کی خدمت میں تکمیل علوم شروع کی۔ چونکہ خان مرحوم بلا کے ذہین تھے اور بعض اوقات ایسے نازک اعتراضات کر بیٹھتے تھے کہ ملا صاحب کو اُن کا جواب دینا مشکل ہوجاتا تھا۔ اسلئے ملا صاحب نے ایک بار ان کی غیر معمولی ذہانت اور طلاقت زبانی دیکھ کے جھنجھلا کر کتاب زمین پر دے ماری اور کہا اب تم کو پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد سے اُنھوں نے درسگاہ میں جانا ترک کردیا اور خود ہی کتب بینی اور مطالعہ میں مصروف رہے۔ اور ساتھ ہی درس تدریس کا سلسلہ بھی جاری کردیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کے علم و فضل کا اس قدر شہرہ ہوا کہ نواب شجاع الدولہ بہادر نے انھیں اپنے فرزند سعادت علی خاں کا اتالیق مقرر کردیا۔

نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ زیب دہ مسند وزارت ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بعض حالات کی وجہ سے دونوں بھائیوں میں ناچاقی ہوگئی اور کشیدگی یہانتک بڑھی کہ گورنر جنرل (ہیسٹنگز) کو دخل دینا پڑا۔ مصالحت کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ نواب سعادت علی خاں خان علامہ کو اپنی خدمت سے علٰحدہ کردیں۔ نواب سعادت علی خاں اس شرط کو منظور نہیں کرتے تھے مگر خان علامہ خود اصرار کرکے علٰحدہ ہوگئے۔ گورنر جنرل کو جب ان کی ایثار نفسی کا حال معلوم ہوا تو اُن پر اس کا بہت اثر پڑا اور خان علامہ کو پانسو روپیہ ماہوار پر میجر پامر کا مددگار مقرر کردیا۔ میجر موصوف اُس زمانہ میں راناگوہار سے ملکی معاملات کے متعلق

کارروائی کررہے تھے۔ ان معاملات میں خان علاّمہ نے اس قابلیت سے کام کیا کہ گورنر جنرل نے اُنھیں ایک دوسری اہم ذمہ داری کی خدمت پر مقرر کیا یعنی مسٹر ڈیوڈ انڈرسن سفیر کامل الاختیار کے ساتھ اُنھیں مادہوجی سندھیا سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا۔ وہاں انھوں نے ان ملکی معاملات میں ایسی ذہانت اور لیاقت دکھائی کہ ڈیوڈ انڈرسن ان کے قائل ہوگئے۔ ڈیوڈ انڈرسن اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میں ہندوستان میں بہت سے ہندوستانیوں سے ملا ہوں مگر میں نے کسی میں اس قدر صفات بدرجۂ کامل جمع نہیں دیکھیں کہ جو ایسا اعلیٰ درجہ کا معاملہ فہم۔ ایسا عالم متبحر، ایسا روشن خیال اور خوش اخلاق ہو۔

اُسی زمانہ میں جبکہ وہ مسٹر ڈیوڈ انڈرسن کے ساتھ کیمپ تھے۔ اُنھوں نے انگریزی زبان کی تحصیل شروع کردی جس میں مسٹر انڈرسن کے بھائی نے بہت مدد دی۔ بعد میں مطالعہ سے اُنھوں نے انگریزی کی بہت اچھی قابلیت حاصل کرلی۔

اُنھیں دنوں میں ایک دن تذکرہ تذکرہ میں پیشوا کی زبان سے بعض کلمات نواب آصف الدولہ بہادر کی شان کے خلاف نکل گئے۔ خان علاّمہ کو یہ ناگوار گذرا اور اُنھون نے بڑی خوبی سے اس کی وہیں تردید کردی۔ نواب کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے چنانچہ جب خان علاّمہ لکھنؤ آئے تو نواب نے انھیں عہدۂ سفارت پر مقرر کرکے کلکتہ بھیجدیا۔ اس عہدۂ سفارت پر رہ کر اُنھوں نے بہت قابل تحسین خدمات انجام دیں جس سے نواب کی نظروں میں اُن کی بڑی وقعت ہوگئی۔

ایک ایسی ہی قابل تعریف کارگذاری کے صلہ میں نواب امیرالدولہ بہادر انھیں اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے لیکن امیرالدولہ بہادر کے دفعتہً انتقال کرجانے سے وہ پھر واپس کلکتہ چلے آئے۔

نواب امیرالدولہ بہادر کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ راجہ ٹکیٹ رائے سے ناراض ہوگئے اور نائب الریاست بھی معتوب ہوئے۔ کام میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہونے لگیں۔ سرجان شور گورنر جنرل نے بہت سمجھایا کہ کوئی نائب مقرر ہونا چاہیئے ورنہ ریاست کا کاروبار ابتر ہوجائیگا۔ مگر جس کسی کا نام پیش کیا جاتا تھا وہ منظور نہیں کرتے تھے

آخر جب یہ کہا گیا کہ جسے آپ مناسب سمجھیں مقرر فرمائیں تو فرمایا کہ تفضل حسین خاں سے بہتر کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ گورنر جنرل نے کہا کہ خان علاّمہ ایک مسئلہ حکمیہ کے حل کرنے کو حکومت اقلیم ہند سے بہتر سمجھتے ہیں۔ نواب نے کہا کہ آپ خان علاّمہ کو میرے پاس بھیج دیجئے میں راضی کرلونگا۔ لکھا ہے کہ جب خان علاّمہ حاضر ہوئے تو نواب آصف الدولہ نے اُن کی گردن میں ہاتھ ڈالدئے کہ "میری آبرو اب تمھارے اس امر کے قبول کرنے پر ہے۔ اگر تمھیں میرے نمک کا پاس ہے تو اس سے انکار نہ کرو" ایسی حالت میں کیا انکار کرسکتے تھے۔ فوراً خلعت نیابت سے سرفراز ہوئے۔

ایسے دربار میں بھلا ایسے صاحب علم اور نیک نفس شخص کا کیا کام تھا۔ وہاں کے حالات اور صحبت سے بہت گھبرائے۔ نواب آصف الدولہ کی داد دہش مشہور ہے اُن کی بے دریغ بخششوں نے خزانہ خالی کردیا تھا۔ نااہلوں اور خودغرضوں کا مجمع تھا۔ ایسے حالات میں انتظام کرنا یا اصلاح کا خیال کرنا عبث ہے۔ کچھ دنوں بعد نواب آصف الدولہ کا انتقال ہوگیا تو وزیر علی خاں مسند نشین ہوئے اُن کی تلون مزاجی اور نالائقیوں نے دربار کا رنگ اور بگاڑ دیا نوبت یہانتک پہنچی کہ حکومت سے علٰحدہ کئے گئے۔ اور نواب سعادت علی خاں سریر آرائے حکومت ہوئے اور خان علامہ اپنی سابق خدمت سفارت پر واپس کلکتہ چلے گئے۔

سفارت کے زمانہ میں اُنہیں مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا خوب موقع ملا۔ تحفۃ العالم میں اُن کے روزانہ اوقات کی یوں کیفیت لکھی ہے کہ دن چڑھے سوکر اُٹھتے تھے۔ اُس وقت ریاضی کے طالب علم اُن سے استفادہ کرتے تھے قریب ظہر انگریزوں کی ملاقات اور کار منصبی کے ادا کرنے میں مشغول ہوجاتے۔ پھر لوگ ملنے کے لئے آجاتے کبھی کبھی خود بھی جاتے تھے۔ عصر کے وقت بعض طالب علم فقہ امامیہ پڑھتے۔ پھر نماز ظہرین ادا کرتے اور کھانا کھاتے۔ اس کے بعد کچھ طالب علم فقہ حنفیہ کا درس لینے حاضر ہوتے۔ شام ہونے کے بعد نماز عشائین ادا کرتے۔ پھر تنہا کتب مطالعہ اور مسائل علمیہ کے غور و خوض میں مصروف ہوجاتے۔ یہانتک کہ صبح کی نماز کا وقت آجاتا۔ بعد نماز سوجاتے"

خان علامہ عربی۔ فارسی اور علوم اسلامی کے زبردست عالم تھے انگریزی میں بھی اُنھوں نے بہت اچھی لیاقت حاصل کرلی تھی۔ اس کے بعد اُنھوں نے لاطینی کا مطالعہ شروع کیا اور اُس میں کافی استعداد پیدا کرلی۔ آخر زمانہ میں اُنھیں

یونانی سیکھنے کا شوق ہوا اور اُس میں بھی بقدرِ ضرورت واقفیت بہم پہنچالی۔ انھیں علاوہ دیگر علوم کے ریاضی اور ہیئت سے بہت شوق تھا اور اسی خیال سے انھوں نے انگریزی اور لاطینی پڑھی اور یورپین محققین کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ مسٹر روبن بروز نے لارڈ منتھ کو ایک خط میں خان علّامہ کی تصانیف کے متعلق لکھا ہے۔

" تفضل حسین خاں نیوٹن کی پرنسپیا (Principia) کا ترجمہ کر رہے ہیں اور ہم اُسے عربی میں شائع کرینگے۔ میرا ارادہ اس ترجمہ پر حواشی لکھنے کا ہے اس کے علاوہ انھوں نے امرسن کی میکانکس (Emerson's Mechanices) اور الجبرا کا بھی عربی میں ترجمہ کیا ہے آج کل وہ اپالونی اُس (Appollonius de Sectione Rationis) کے ترجمہ میں مصروف ہیں۔ اس کتاب کی قسمت بھی عجیب ہے۔ یہ کتاب اوّل اوّل یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئی۔ اصل یونانی نسخہ مفقود ہو گیا۔ بعد ازاں بوڈلین لائبریری کے عربی نسخے سے اس کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ اس کا عربی نسخہ ایشیا میں کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ میں نے لاطینی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اور اب تفضل حسین خاں اس کا عربی میں ترجمہ کر رہے ہیں" اس کے علاوہ انھوں نے مخروطات ثمن کے جبر و مقابلہ اور وارسن کے جرثقیل کا ترجمہ کیا۔ لوگارثم اور خط منحنی پر رسالے لکھے۔ نیز ابن ہیثم کے علم مناظر پر حاشیہ تحریر فرمایا۔

افسوس ہے کہ اس بے نظیر عالم کی کتابیں اب ہماری نظروں سے مفقود ہیں۔ بقول مؤلف سوانح عمری ممکن ہے کہ تلاش سے ایشیاٹک سوسائٹی میں اُن کے تراجم و تصانیف کا ذخیرہ دستیاب ہو جائے۔ درحقیقت خان علّامہ کی زندگی سبق آموز اور اُن کے کارنامے قابلِ فخر ہیں۔

یارب دنیا میں رہو۔ غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

دائرۂ ادبیہ کی جدید مطبوعات

۱- حزن اختر
۲- اسلام کا اثر یورپ پر

حزن اختر اودہ کے آخری تاجدار سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر کی ایک مثنوی ہی جس میں شاہ مرحوم نے زمانۂ قید کلکتہ کے حالات اور مصائب تحریر فرمائے ہیں۔ بقول مولانا عبدالحلیم صاحب شرر "یوں تو یہ مثنوی ایک شاعرانہ کلام ہی۔ مگر در اصل شاہ جنت آرامگاہ کی " آٹو بیاگرفی" یعنی خود اپنی سوانح عمری کا ایک دردناک ٹکڑا ہی" مولوی محبوب علی صاحب ناظم دائرہ ادبیہ قابل مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے اس شاہ بیتی کو جو مرحوم بادشاہ نے اپنے خون جگر سے لکھی تھی گمنامی سے نکال کر عام طور پر شائع کر دیا۔

یہ مثنوی چھوٹی سی تقطیع پر بہت اچھی چھپی ہی۔ شروع میں مولانا شرر صاحب کا بہت دلچسپ مقدمہ ہی۔ اور حقیقت یہ ہی کہ مولانا سے بہتر اس پر کوئی مقدمہ نہیں لکھ سکتا تھا۔ کیونکہ مولانا نے اس مظلوم بادشاہ کی آخری شان اور مٹیا برج کی صحبتوں کے رنگ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ گو بادشاہ قید فرنگ میں تھے مگر اُن کے قدموں کی برکت سے مٹیا برج خود ایک نیا لکھنؤ بن گیا تھا اور سچ یہ ہی کہ لکھنؤ کا جسم تو اودھ میں تھا مگر اس کی جان مٹیا برج میں تھی وہی صحبتیں وہی جلسے وہی شعر و شاعری اور عمارت کا شوق وہی دربار اور تکلفات جو بادشاہی میں تھے اس قید فرنگ میں بھی نظر آتے تھے۔ کس قدر افسوس اور حیرت کا مقام ہی کہ لارڈ ڈفرن جیسے ہوش مند مدبر نے مٹیا برج کے تمام

۱- حزن اختر- مجلد عصہ- غیر مجلد ۸ر
۲- اسلام کا اثر یورپ پر- مجلد ۱۲ر غیر مجلد ۴ر

} دائرہ ادبیہ لکھنؤ سے ملسکتی ہیں

عالیشان قصر و عمارات، وہاں کے دلفریب چمن، چڑیا گھر اور ڈیوڑھیاں گرا کر خاک میں ملا دیں ہم اسے کیا کہیں!
مگر خود اُنھیں کے ہم سر و ہم شعار فرمائیں کہ اِسے کیا کہتے ہیں؟

جب ۱۸۵۷ء کی مشہور فوجی شورش ہندوستان میں نمودار ہوئی تو انگریزوں کو اس اسیر بادشاہ پر بھی سازش کا شبہ ہوا۔ حالانکہ یہ اُن کے وظیفہ خوار تمام معاملات سے بے خبر وطن سے دور پڑے تھے مگر شبہ سے نہ بچ سکے۔ بادشاہ کچھ دنوں سے علیل تھے۔ علاج سے جب شفا پائی تو غسل صحت ہوا۔ مبارک بادی اور سلامتی کا غل ہونے لگا۔ شب کو بزم طرب جمی، ناچ گانا اور جلسہ رہا۔ چار گھڑی رات باقی تھی کہ جلسہ برخاست ہوا۔ سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے سے جا کر سو رہے۔ ابھی بادشاہ آرام فرما رہے تھے کہ داد فریاد اور دہائی کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یکایک بادشاہ خواب راحت سے بیدار ہوئے تو معلوم ہوا کہ کوٹھی کو گورا فوج نے گھیر رکھا ہے۔ آخر گورنر جنرل کے سکرٹری آئے اور کہا کہ سرکار کو کچھ شبہ سا ہو گیا ہے۔ اسلئے یہ حکم ہوا ہے کہ آپ کچھ دنوں قلعہ میں قیام فرمائے۔ بادشاہ نے ہر چند اپنی بے گناہی ثابت کی مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ صرف آٹھ مصاحبوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت دی گئی۔ نوکر چاکر سب ملا کر انتیس آدمی ہمراہ گئے۔ قلعہ (فورٹ ولیم) کا جو تلی دروازہ تھا وہاں ان سب کو پہنچا دیا۔ آٹھ روز تک وہاں رہے بعد ازاں قلعہ میں جو کوٹھی تھی وہاں قیام کا انتظام کیا گیا۔ یہ مثنوی اسی قید کا رونا ہے۔ وہاں جو جو بیتی یہ اُس کا کچا حال ہے۔ بادشاہ کو اپنی بیگمات کی جدائی کا بڑا قلق تھا۔ پھر اس پر بعض مصاحبوں اور بیگموں کی بیوفائی، ملازموں کی شوخ چشمی اور شورہ پشتی، پہرہ کے گوروں کی بدسلوکی اور طرح طرح کی تکلیفوں نے زندگی تلخ کر دی تھی۔ غرض اُس زمانہ کی پوری کیفیت اس میں درج ہے۔

نظم سیدھی سادی ہے اور اُن تکلفات سے بری ہے جو اُس وقت لکھنؤ کی شاعری میں عام طور سے پائے جاتے تھے اپنے دلی جذبات اور حالات کو بے تکلف بیان کر دیا ہے۔ یہ بات کچھ چھپی ہوئی نہیں کہ واجد علی شاہ کو ادب و شاعری کا ذوق تھا۔ لیکن بادشاہوں کا جیسا کچھ ذوق ہوتا ہے وہ بھی معلوم ہے۔ مولانا شرر نے اپنے مقدمہ میں اس معاملہ کو صاف کر دیا ہے۔ اور بہت خوبی سے یہ ثابت کیا ہے کہ "واجد علی شاہ کا کلام بُرا بھلا جو کچھ ہے خاص اُن کا ہے۔ اس میں ایک حرف بھی کسی اور کا نہیں ہے۔" اسی ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ "اصلی خرابی یہ تھی کہ بادشاہ کبھی کسی سے اصلاح یا مشورہ

نہ لیتے۔ تعلیم و اصلاح کا زمانہ لکھنؤ ہی میں ختم ہوگیا تھا۔ مٹیا برج میں وہ اُستاد بلکہ اُستاد الکل تھے۔ ذہن میں یہ جمی ہوئی تھی کہ کلام الملوک ملوک الکلام۔ جتنے شعرا و اساتذہ ملازم تھے۔ سب شاگرد سمجھے جاتے، وہ شرف شاگردی حاصل کرنے کی درخواست کرتے۔ بہ عنایت شاہی یہ عزت اُن کو دی جاتی اور ایک مہر عطا ہوتی جس میں نام و خطاب کے ساتھ الفاظ "تلمیذ السلطان" بھی کندہ ہوتے .... یہی اُستادی کلام میں لغزشوں کے رہ جانے کا باعث ہوتی۔ اور قیامت یہ تھی کہ دربار والے چاہے کتنے ہی صاحب کمال شاعر ہوں بجائے تنبیہ کرنے کے لغزشوں پر بجید داد دیتے، لیکن اور جس قسم کی لغزش چاہے ہو جائے یہ ممکن نہ تھا کہ کبھی کوئی مصرعہ غیر موزوں رہ جائے یا بحر سے الگ ہو اور یہ اُن کی کمال موزونی طبع کی دلیل ہے۔"

مولانا کی یہ رائے بالکل درست ہے جس کا ثبوت اس مثنوی کے مطالعہ سے بھی ملتا ہے۔ گو اس مثنوی کا درجہ بلحاظ شاعری کے اعلیٰ نہ ہو مگر ایسی یادگار ہے جو ہم اہل ہند کو نہایت عزیز ہے اور علاوہ شاعری کے تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے اور اُس زمانہ کو یاد دلاتی ہے جو ہمارے اخلاقی سیاسی زوال کا کمال تھا۔

اِسلام کا اثر یُورپ پر یہ رسالہ بھی اُسی تقطیع پر چھپا ہے جو حزن اختر کی ہے اس میں قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی نے یورپی مصنفین اور مورخین کے اقوال جمع کر دئے ہیں جن سے کامل طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے تمدن اور علوم و فنون کا یورپ پر کیسا کچھ اثر ہوا۔ اور کہاں تک وہ اس سے متمتع ہوئے۔ آخر میں ایک فہرست مسلمان مصنفین نیز اُن کی اُن تصنیفات کی دی ہے جن کا ترجمہ یورپ کی کسی زبان میں ہوا ہے۔ اگرچہ یہ مختصر سی کتاب ہے۔ لیکن اس میں کافی معلومات جمع کر دئے گئے ہیں۔ مؤلف نے اس کے ترجمہ و ترتیب میں محنت کی ہے جن اصحاب کو اس مضمون سے دلچسپی ہے وہ اسے بہت کارآمد پائینگے۔

جواہر منظوم

ترجمۂ اردو

رباعیات سرمد

رباعیات سرمد کا یہ منظوم ترجمہ منشی سید نواب علی صاحب صولت لکھنوی کا کیا ہوا ہی اور شاہجہانی پریس دہلی میں چھپا ہی۔ شروع میں سرمد کی سوانح عمری درج ہی جو مولانا ابوالکلام آزاد کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ مولانا کی یہ شکایت بجا معلوم ہوتی ہی کہ ہمعصر مورّخوں نے کہیں سرمد کا ذکر نہیں کیا حالانکہ دور از کار اور فضول قصّوں سے صفحے کے صفحے رنگ دئے ہیں۔ اُن کا خیال ہی کہ مورّخین نے پوری مستعدی کے ساتھ اس امر کی احتیاط کی ہی کہ سرمد کا ذکر نہ آنے پائے۔ اور یہ سیاسی عیاری اور چالبازی تھی تاکہ اُن کے آقائے ولی نعمت (عالمگیر) کے دامن پر اس خون ناحق کی چھینٹ نہ پڑے مولانا کی یہ رائے ہی کہ کفر کا فتویٰ محض شرعی حیلہ تھا" اصل بات یہ ہی کہ عالمگیر کی نظروں میں تو سب سی بڑا جرم داراشکوہ کی معیت تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہی اور ہزاروں خونریزیاں جو پولیٹکل اسباب سی ہوئی ہیں اُنھیں مذہب ہی کی چادر اُڑھا کر چھپایا گیا ہی۔ جب کوئی اور بہانہ نہ ملا تو عریانی و برہنگی کو کہ خلاف رسم شرع ہی بنیاد قرار دیا اور مذکورہ بالا رباعی سے نتیجہ نکالا کہ معراج جسمانی کا منکر ہی"

مولانا کے ماخذ میں تذکرۂ مراۃ الخیال مصنّفہ شیرخاں لودہی، تذکرہ ریاض الشعرا مؤلفہ علی قلی خاں داغستانی (یہ شخص عہد محمد شاہ کے امرا میں سے تھا) اور ایک بیاض قلمی جو عہد عالمگیر ثانی کی خوش مذاق شاعر (سراج الدین سراج) کی جمع کی ہوئی ہے۔

اس مختصر سوانح عمری کے بعد جس میں اصل حالات بہت کم ہیں، رباعیاں شروع ہوتی ہیں۔ پہلے جلی قلم میں

ملنے کا پتہ شاہجہانی پریس دہلی۔ قیمت مجلد عہ غیر مجلد ۱۲ ر تعداد صفحات ۹۷

اصل فارسی رباعی ہی اور اُس کے بعد خفی قلم میں اردو منظوم ترجمہ ہی۔ نظم کا نظم میں ترجمہ کرنا نہایت مشکل کام ہی۔ اور اس میں اشرنا کامیابی ہوئی ہے۔ کیونکہ ہر زبان کا طرزِ ادا، اسلوبِ بیاں اور محاورہ جدا ہوتا ہے۔ اسلئے اصل کی نزاکت اور قوت اور الفاظ کی ترتیب سے جو سُریلا پن پیدا ہوتا ہی وہ بیان میں نہیں آتا۔ جناب صولت صاحب نے ترجمہ میں بہت کوشش کی ہی اور جہاں تک ممکن ہوا ہے۔ خیالات کو صاف اور اچھی زبان میں موزونیت اور خوبی سی بیان کیا ہی لیکن باوجود اس کے وہ سرمد کا کلام نہیں ہوسکتا۔ صولت صاحب کا ہی اصل کی روح نقل میں نہیں ہی۔ تاہم صولت صاحب کی سعی قابلِ تعریف ہی۔ چند رباعیاں ترجمے کے ساتھ ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔ اِن سے اندازہ ہو جائیگا۔

(ترجمہ)	(اصل رباعی)
سرمد تو بیانِ کعبہ و دیر نہ کر	سرمد تو حدیثِ کعبہ و دیر مکن،
گمراہوں کی طرح شک کی تو سیر نہ کر	در وادیٔ شک چو گمرہاں سیر مکن،
شیطان سے سیکھ بندگی کا شیوہ	ہاں شیوۂ بندگی ز شیطاں آموز
اک قبلہ بنا - سجدہ پئے غیر نہ کر	یک قبلہ گزیں سجدہ برِ غیر مکن

کر فکر نہ تو خدمت شاہاں کی کہیں	اے فکر گزیں خدمت شاہاں بگزیں
رہتا ہے ہمیشہ کون برروئے زمیں	پیوستہ کسے نماند برروئے زمیں
پُرچین رہتی ہے بادشاہوں کی جبیں	پیشانیٔ شاہاں ہمہ پُرچیں دیدم
دنیا نہیں بقدر یک چینِ جبیں	دنیا نبود بقدر یک چینِ جبیں

ہو چکا بس شکوۂ لیل و نہار	سرمد گلہ اختصار می باید کرد
کام دو ہیں - کر کسی کو اختیار	یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن برضائے دوست می باید داد
یا جان برہش نثار می باید کرد

یا سراپا بن رضائے دلربا
جان کردے یا محبت میں نثار

در مسلخ عشق جز نکو را نہ کشند
لاغر صفتاں و زشت خو را نہ کشند
تو عاشق صادقی ز کشتن مگریز
مردار بود ہر آنکہ او را نہ کشند

مسلخ عشق میں اچھے ہی فنا ہوتے ہیں
قتل کب لاغر و بدکار بھلا ہوتے ہیں
تو بھی گر عاشق صادق ہے تو مرنے سے نہ ڈر
ذبح مردار کہاں، یہ تو بتا ہوتے ہیں؟

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند
سوز دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار
ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

کب اہل ہوس کو غم جانانہ ملا
مکھی کو نہ سوز دل پروانہ ملا
اک عمر ہے لازم پئے وصل دلدار
اس دولت سرمدی سے حبہ نہ ملا

در ہر گنہے فزود بخشایش جود
شرمندۂ ایں قسم نہ کرد ار نمود
خضر رہ من گناہ شد آخر کار
ایں فضل و کرم چہ بود ایں جرم چہ بود

بخشش تھی زیادہ۔ کم ہر ایک جرم و خطا
شرمندہ نہ مجھ کو میرے کاموں نے کیا
ہر ایک گنہ نے رہبری کی آخر
کیا خوب مرا جرم - کرم ہی تیرا

نقّاش

کس قدر خوشی کی بات ہی کہ اردو رسالوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہی۔ اور بلحاظ مضامین، تحریر، اور ظاہری شان کے بھی اُن کی حالت بہتر ہی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر علمی، ادبی ذوق ترقی پر ہے۔ نقّاش بھی اردو کے جدید ماہانہ رسالوں میں سے ہی۔ پہلے رسالے کے عنوان کے نیچے "مرقع اخلاق وادب" لکھا تھا۔ اور دوسرے میں "علم وادب" یہ رسالہ اسی سال جنوری سے نکلنا شروع ہوا ہی۔ اڈیٹر جناب یوسف عزیز صاحب بدایونی ہیں۔

رسالہ کے پہلے نمبر میں سب سے اوّل اڈیٹر کا مقالۂ افتتاحیہ ہے جس میں اُنہوں نے قوموں کے اور خاص کر مسلمانوں کے زوال وعروج سے بحث کی ہی اُن کی رائے ہے کہ "نہ تو محض وہ جہل (جہل تعلیم جدید) مسلمانوں کے تنزل کا سبب ہی نہ صرف ان کی سیاسی کس مپرسی بلکہ سبب اصلی اور علّۃ العلل ضعف ایمانی ہے یا ایمان مفصل کی خامی اور قوۃ عمل وجہد کا تعطّل" اس خیال کے ظاہر کرنیکے بعد وہ اپنے اس رسالہ کا مقصد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

اُس وقت ہم اپنا رسالہ نقّاس شائع کر رہے ہیں اور انھیں خیالات کے تحت میں یہ اشاعت عمل میں آرہی ہی کہ قوم کے قوائے عملی کو متحرک کرنیوالی علمی وادبی خدمت کی جائے پس ہمارا رسالہ انشا اللہ تعالیٰ ایسے اخلاقی و روحانی تعلیماتِ اِسلامی کے مباحث پر مشتمل ہوگا جو انسان کی زندگی میں من حیث الانسان جملہ کمالات وترقی کے ضامن ہیں"۔

لیکن رسالہ بھر میں اس مقصد کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا۔

دوسرے نمبر میں قابل اڈیٹر نے "ایک مسئلہ ضروری" کے عنوان سے رسالہ کے شروع میں ایک بہت اچھا مضمون اُردو کے رسالوں پر لکھا ہی جو اُن تمام اصحاب کے پڑھنے قابل ہی جن کا تعلق رسالوں کی اشاعت وترتیب سے ہے؛ خصوصاً بعض عنوانوں کی لفظی ترکیب پر پُرلطف نکتہ چینی کی ہی۔ اس تمام بحث کے آخر میں لکھتے ہیں کہ " اب صرف

علوم کا سوال رہجاتا ہی۔ اوران ہی مضامین کی سب سے زیادہ ضرورت بھی ہوتی ہی۔ لیکن علوم متداولہ کی کامل اورمسلسل تکرار نہ تو ممکن ہی نہ تقاضے کا یہ منشا اور نہ عامتہ الناس میں ایسی گہری دلچسپی البتہ علوم کی آسان آسان فروع اور دلچسپ وکارآمد منشعبات کو مخصوص اسالیب ایجاز کے ساتھ بحث قرار دیا جاسکتا ہی۔ اس میں بھی خاصکر وہ حصّہ جو ہمیشہ علمائے فنون کے زیر غور وتحقیق رہتا ہی رسائل کے لئے مناسب موضوع ہے "

نقّاش بھی اپنے لئے یہی موضوع قرار دیتا ہی ان دونوں مضمونوں کے پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ نقّاش نے اپنے لئے دو موضوع قرار دئے ہیں۔ ایک تو اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیم اور دوسرا علمی مسائل کی تحقیق پسندیدہ اسلوب سے۔ لیکن ان دونوں رسالوں میں اس قسم کے مضامین مفقود ہیں۔ خود اڈیٹر صاحب نے ذیل کے الفاظ میں اس کے متعلق معذرت کی ہی اسلئے کسی تنقید کی ضرورت نہیں۔

" نقّاش کے پیش نظر بھی ایسا ہی کچھ نصب العین ہی تاہم یہ اعتراف ہم ضرور کرینگے کہ موجودہ ابتدا میں مکمل معیار پیش کرنے کے لئے مقامی بے سروسامانیاں اور گردوپیش کی الجھنوں سے سابقہ ناگزیر ہے اور ایک مدّت تدریجی درکار ہی جو چندماہ کا معاملہ ہے۔ عزم کے رسوخ میں بفضلہ کوئی بے اطمینانی نہیں۔ انشاءاللہ مستقبل ملحق میں نقّاش شاہراہ ترقی پر ہوگا "

ہمیں اُمید ہے کہ اس ہونہار رسالہ کو اپنے مقاصد میں کامیابی ہوگی اور آیندہ ایسے سامان بہم پہنچ جائیں گے کہ وہ اپنے نصب العین کو پورا کرسکے۔ اب بھی اس میں نظم ونثر کے ایسے مضامین موجود ہیں جنھیں وہ اصحاب جن کو خاص علمی اور تحقیقی یا تنقیدی مضامین پڑھنے میں الجھن ہوتی ہی، شوق سے پڑھینگے۔ لہ

---x---

لہ ۔قیمت سالانہ للعہ بدایوں

نگار لہ

یہ جدید علمی و ادبی، ماہانہ رسالہ فروری سنہ رواں سے شائع ہونا شروع ہوا ہی، جو اردو رسالوں میں قابل قدر اضافہ ہی۔ "رئیس التحریر" جناب نیاز فتحپوری اور "معاون مدیر" جناب مخمور اکبرآبادی ہیں؛

جناب نیاز کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ اردو علم ادب میں بحیثیت نثار و ناظم کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور اس لئے یہ توقع ہے کہ اُن کی زیرِ ادارت یہ رسالہ فروغ پائیگا۔

بخلاف دوسرے رسالوں کے اس میں یہ نئی بات ہی کہ یہ ایک جماعت یا کمپنی کے مشترکہ سرمایہ سے جاری ہوا ہے۔ دوسرے اس کے شعبۂ ترتیب اور شعبۂ نشر و انتظام الگ الگ ہیں۔ شعبۂ ترتیب جناب "رئیس التحریر" کے تحت میں بھوپال میں ہی اور شعبۂ نشر و انتظام آگرہ میں۔

تمہیدی مضمون میں جو "عناصر نگار" کے نام سے پہلے رسالہ کے شروع درج ہی۔ نگار کے مقاصد پر بھی بحث کی ہی۔ تحریر فرماتے ہیں "عہد حاضر کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اگر کوئی ہو سکتی ہی تو صرف یہ کہ اس کا مذاق زیادہ ذہنی ہوتا جاتا ہی اور وہ تمام قوتیں جو اب سے قبل سطح پر تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں، اب عمق کی طرف مائل ہیں، جس کا حال ہمیں بھی اپنے تئیں غرق کر دینے ہی کے بعد معلوم ہوتا ہی"

اس لئے یہ رسالہ خالص ادبی رسالہ نہ ہوگا "کیونکہ ادب کی وہ مانگ جو چند سال پیشتر تھی، باقی نہیں رہی" اسلئے "رئیس التحریر" صاحب نے "اس کو مناسب نہیں سمجھا کہ جو تفریح تماشا کرنے والوں کی کثرت سے اس درجہ پامال اور عام ہو چکی ہی اُسے پھر پبلک کے سامنے پیش کروں" لہٰذا "ادبِ لطیف" اس رسالہ کے موضوع سے خارج ہوگا رہی سیاست تو "چونکہ موجودہ انقلاب پسندی کے جذباتِ سریع کے لحاظ سے ایک ماہوار رسالہ بقدر "لذتِ کام و دہن" بھی کوئی سامان فراہم نہیں کر سکتا، اس لئے اسے بالکل ترک کر دینا پڑا۔ کیونکہ میری رائے میں یہی وہ چیز ہی

لہ۔ تقطیع اردو کی۔ صفحات ۸۰ سالانہ چندہ پانچ روپیہ۔ حافظ امام الدین صاحب منٹولہ آگرہ سے ملسکتا ہی

جو رقابت سے سخت بیزار ہی- ہو تو سب کچھ یہی ورنہ بالکل نہ ہو"

"اب رہ گئیں دو قسمیں علم و تاریخ کی - سوان کا اختیار کرنا ضروری تھا۔ کسی قوم یا ملک کے مذاق میں خوشگوار تبدیلی اُسی وقت ہو سکتی ہی جب اُس کے معلومات وسیع ہوں- اور اس کا بہترین ذریعہ یہی ہی کہ نہایت حریصانہ طریقہ سے اردو میں علم تاریخ کا اتنا اور ایسا مواد فراہم کیا جائے کہ معمولی اردو داں طبقہ بھی اس سی محروم نہ رہی"

یہ درست ہی کہ ایک علمی و تاریخی رسالہ میں سوائے خشک مضامین کے اور کچھ نہیں۔ لیکن اول تو اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ یہ رسالہ اس حد تک نہ پہنچنے پائے اور اگر موضوع کے لحاظ سی کوئی مضمون ایسا نظر آجائے تو اُس کو دیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اصل مقصود آپ میں اسی ذوق کا پیدا کرنا ہی-

رسالہ کا ایک حصّہ بالالتزام ادبی مضامین کے لئے بھی وقف ہوگا۔ لیکن اُس میں وہ تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی شامل ہونگے جو افسانوں سے علٰحدہ ہیں لیکن ہیں ادب ہی سے وابستہ نظمیں بھی ہونگی مگر مخصوص معیار کی

معلومات کا ایک حصّہ جدا رہیگا جس کے ذریعہ سے کوشش کی جائیگی کہ بہترین اطلاعات (تاریخی و علمی) آپ کی نگاہوں سے گذرتی رہیں۔ فنون لطیفہ کے متعلق بہترین تصاویر بھی شائع ہوتی رہینگی"

ہم نے رسالہ کے مقاصد کے متعلق خود جناب رئیس التحریر صاحب کی عبارت نقل کردی ہی تاکہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہی یہ ظاہر ہے کہ یہ مقاصد نہایت پسندیدہ اور لایق تحسین ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اُن کو عمل میں لانے کی کوشش بھی کی گئی ہی تاہم رسالہ "ادب لطیف" سے خالی نہیں ہی اور اگر اس کے سعی ذرا وسیع کردئے جائیں تو رسالہ کا معتدبہ حصّہ اسی میں آجاتا ہی؛

رئیس التحریر حضرت نیاز فتحپوری کا طرز تحریر ایک خاص شان رکھتا ہی۔ ہم ناظرین کے اضافۂ علم اور اطلاع کے لئے عبارت کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں-

"اس میں شک نہیں کہ اِس وقت، جبکہ سیاسی امیال و عواطف نے، زندگی کے تمام لذیذ و دلچسپ مشاغل کو (شاید بجا طور پر) پس پشت ڈالدیا ہی، اور علی الخصوص اس وقت جب کہ طباعت اور کاغذ کی گرانی نقطۂ عروج کی

"گلہ فگن" حدتک پہنچ گئی ہے۔ کسی رسالہ کا اور رسالہ بھی وہ جو سیاسیات کے شجر ممنوع تک پہنچنے کی جرأت نہیں کرسکتا، جاری کرنا بیش بیں اور مصلحت اندیش نگاہوں کے نزدیک کچھ امید افزا بات نہیں ہوسکتی، لیکن اس کا کیا علاج کہ ہم اپنی جس آرزو کو مستقبل کے خوشگوار منظر و حالات سے وابستہ کرتے ہیں، وہ مستقبل کے اسی نقطہ پر پہنچ کر محسوس کرتی ہے کہ "ماضی" اس سے بہتر تھا۔ پھر جب یہ تجربہ تواتر کی حدتک پہنچ جائے اور زمانہ آئندہ کے تمام نقوش پے درپے اس طرح مبتلائے فریب رکھنے والے ثابت ہوتے رہیں، تو کب تک کوئی انتظار کرسکتا ہے۔ آخر کار مجبور ہوکر اسے کہدینا پڑتا ہے۔

"مرغابی شو کہ کار با طوفان ست"

ممکن ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اس کی داد دیں، لیکن "معمولی اردو داں طبقہ" اس سے مستفید نہیں ہوسکتا۔ پہلے رسالہ میں "اشتراکیت (Socialism) پر اور دوسرے رسالہ میں فوضویت (Anarchism) پر دو علمی مضمون "رئیس التحریر" حضرت نیاز کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دو ایسے مبحث ہیں کہ ان پر اردو زبان میں لکھنا اور اُن کے اصل مفہوم اور منشا اور اصول اور اُن کے پیدا ہونے کے اسباب پر بحث کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور ہمیں خوشی ہوئی کہ حضرت نیاز نے سب سے اوّل ان پر لکھنے کی زحمت گوارا کی۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں اس کا بھی افسوس ہے کہ یہ مضامین بہت مختصر، سرسری، اور غیر مکمل ہیں۔ یہ زیادہ تفصیل اور خوبی اور لطف کیساتھ لکھے جاسکتے تھے جس سے "معمولی اردو داں طبقہ" بھی لطف حاصل کرسکتا اور اُن کے اُصول کو بخوبی سمجھ سکتا۔ پہلا مضمون صرف ساڑھے تین صفحہ پر ہے اور دوسرا سات صفحہ پر۔

فوضویت بہت ہی ثقیل اور غیر مانوس لفظ ہے۔ انارکزم کا مفہوم نہایت آسانی اور خوبی سے لفظ نراج سے ادا ہوسکتا تھا۔ جو بہت ہی عام فہم اور سہل ہے۔

اردو کے مشہور علمی رسالہ معارف کے تتبع میں معلومات کے لئے بھی چند صفحات وقف ہیں۔ جو بہت کارآمد چیز ہے۔

رسالہ کے آخر میں "یاران نجد" کے عنوان کے تحت میں چند صفحہ ہیں۔ اُس کے رموز واشارات صرف "بزم نگار" کے ارکان ہی سمجھ سکتے ہیں غیران اسرار کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

نظم کا حصہ بھی معقول ہے پہلے رسالہ میں آٹھ نظمیں ہیں اور دوسرے میں پانچ۔ فسانے بھی چار سے کم نہیں۔

غرض یہ رسالہ خاص رنگ رکھتا ہے اور علمی و ادبی لحاظ سے قابل قدر ہے۔

دی ٹیچر

منشی کا لفظ ہماری زبان میں بہت معزز خیال کیا جاتا تھا اور قابل انشا پردازوں کے ناموں کے ساتھ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ، علّامہ ابوالفضل جیسے شخص کی تعریف میں بھی منشی کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ حال کے زمانہ میں شمس العلماء خان بہادر ذکاء اللہ مرحوم آخر وقت تک منشی ذکاء اللہ کہلائے اور اسی طرح غلام غوث خاں صاحب بیخبر مرحوم (میر منشی لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی) منشی کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ جب سے اس ملک میں انگریزی تسلط ہوا اور انگریز صاحبان کو ملک کی زبان سیکھنے کی ضرورت ہوئی تو منشی کی وقعت جاتی رہی اور یہ خاص فرقہ ہو گیا جس کا پیشہ "صاحب لوگوں" کو اردو فارسی پڑھانا ہے۔ عام طور پر منشیوں کی لیاقت (باستثنائے معدودے چند کے) معمولی ہوتی ہے اور اُس کے ساتھ وہ انگریزی بھی شدہ بدہ جانتے ہیں کیونکہ صاحب لوگوں کو پڑھانے کے لئے تھوڑی بہت انگریزی جاننی بھی ضروری ہے۔ پیشہ کی ضرورت اور صاحب لوگوں کی صحبت سے ان میں کسی قدر انگریزیت بھی آجاتی ہے۔ یہی خصوصیت ہم ان حضرات کے رسالہ "دی ٹیچر" میں دیکھتے ہیں جو اس کے نام اور ترتیب سے ظاہر ہے یہ رسالہ زیر ادارت منشی محمد اکبر خاں حیدری۔ ایم۔ آر۔ ایس دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں ایک اردو دوسرا انگریزی۔ اردو حصہ میں منشی صاحبان کے حالات، اُن کی مشکلات، طریقہ تعلیم، اور اردو زبان کے متعلق بعض مضامین ہیں۔ انگریزی حصہ میں امتحانات کے اردو پرچے، اردو صرف ونحو، اور زبان کے متعلق ہدایات، اصول تعلیم، اور منشیوں اور صاحبوں کے تعلقات پر تحریریں شائع کی گئی ہیں۔

درحقیقت منشیوں کا فرقہ بہت قابل رحم ہے۔ اس کا پیشہ جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے آسان نہیں ہے۔ بلکہ بہت کٹھن اور بے مزہ ہے اس کی معاش کا انحصار زیادہ تر فوجی انگریز عہدہ داروں کو پڑھانے پر ہے جہاں اُستادی شاگردی کا

تعلقات کا کوئی لحاظ نہیں ۔ عام طور پر صاحب اپنے منشی کو بھی ایک شاگرد پیشہ ہی سمجھتا ہی۔ تنخواہ میں تیس بہت ہوئی تو چالیس پچاس ۔ پڑہانے کا وقت دنیا سے نرالا۔ جب صاحب اپنے فرائض منصبی اور کھانے پینے سے فارغ ہوا تو کتاب لیکر بیٹھتا ہی۔ ایک تو منشی صاحب کا طریقہ تعلیم عجیب و غریب دوسرے صاحب کی سمجھ اوندھی طبیعت پہلے سے تھکی ہوئی اور اُس پر گرمی کی تپش اور غنودگی کا زور۔ بار بار جھنجھلاتا ہی اور کتاب ٹپک ٹپک دیتا ہی۔ جی دونوں کا نہیں لگتا۔ اسے پڑھنے کا شوق نہ اُسے پڑھانے کا۔ مجبوری سے پڑہتا ہی کیونکہ کامیابی پر ترقی کا دارومدار ہے۔ منشی صاحب بھی یہی چاہتے ہیں کہ کچھ بھی ہو امتحان میں کامیاب ہوجائے امتحان کی کامیابی پر نقد انعام ملتا ہی اور اس میں منشی صاحب کا بھی حصہ ہوتا ہی۔ بیچارہ منشی عمر بھر اسی کوچہ میں گشت لگاتا رہتا ہے اور حیران و پریشان رہتا ہے بعض اوقات اُسے منشی گری کی تلاش میں مارا مارا پھرنا پڑتا ہی۔ غرض کہ اُس کا ذوق، اُس کا میلان طبع اور اُس کی ساری زندگی عجیب قسم کی ہوجاتی ہے جسے دنیا کے دوسرے معاملات اور حالات بہت کم تعلق ہوتا ہی یہی وجہ ہے کہ ہم اُس کی زندگی کو قابل رحم خیال کرتے ہیں ۔ ہمیں اس سے دلی مسرت ہوئی کہ منشی صاحبان کو اپنے پیشہ کی وقعت کا خیال پیدا ہوا ہی اور اسی غرض سے اُنھوں نے یہ رسالہ جاری کیا ہی جس کا مقصد یہ ہے کہ باہم اتحاد پیدا کریں، اپنا وقار قائم کریں، لیاقت بڑھائیں، طریقہ تعلیم میں اصلاح کریں اور استاد شاگرد (منشی اور صاحب) کے تعلقات خوشگوار بنائیں اُن کے مدنظر صرف امتحان ہی نہ ہو بلکہ طرفین اپنا اپنا کام شوق اور دل سے کریں ۔ یہ بہت اچھے مقاصد ہیں اور ہمیں منشی صاحبوں سے کامل ہمدردی ہی لیکن اُن سے ہماری یہ عرض بھی ہی کہ وہ اپنی تمام عمر اسی تنگ کوچہ میں نہ بسر کردیں بلکہ اپنی نظر زیادہ وسیع اور بلند کرنے کی کوشش کریں ۔

رئیس ہند[1]

یہ ماہانہ رسالہ سب سے نرالا ہی ۔ یہ صرف ہندوستانی ریاستوں کے متعلق لکھتا ہے۔ دیسی ریاستوں کا اور اُن سے بڑھکر حکومت برطانیہ کا خیر خواہ ہی تمام خبریں اور مضامین ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق دیسی ریاستوں

---

[1] ملنے کا پتہ :- منیجر رسالہ رئیس ہند ۔ بھگونت آشرم پٹیالہ قیمت عام خریداروں سے آٹھ روپیہ سالانہ ۔ جائے اشاعت دہلی

سے ہے۔ مگر کوئی بات ایسی نہیں لکھتا کہ کوئی رئیس ناراض ہو۔ بلکہ جو لوگ اس قسم کی تحریر شائع کرتے ہیں اُن کی خوب خبر لیتا ہی یہانتک کہ بعض وقت گالیوں پر اُتر آتا ہے آج کل ملک میں جو سیاسی تحریکیں پائی جاتی ہیں اُن کا سخت مخالف ہی اور اُن کے بانیوں کو سخت سست اور بے نقط سناتا ہی۔ ہر رسالہ میں کسی نہ کسی راجہ مہاراجہ یا نواب کی سوانح عمری ہوتی ہی۔ ان رئیسوں میں سے کسی نہ کسی رئیس کی تصویر بھی ہوتی ہی۔ ایک پرچہ بالکل ہز رائل ہائی نس پرنس آف ویلز کی سیاحت ہند اور ان کی تقریروں کے لئے وقف کر دیا۔ اس رسالہ میں ایک عنوان "ہماری حاصل شدہ سوراج" کے نام سے رہتا ہی جس کے تحت ریاستوں کی مختلف خبریں درج رہتی ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو۔ جو لوگ دیسی ریاستوں کی اچھی خبریں سننے کے مشتاق ہیں اُن کے لئے یہ رسالہ مغتنمات میں سے ہے۔ ہمارے پاس پانچ رسالے پہنچے جن میں ایک تو جنوری کا ہی باقی دو دو ماہ کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا ہی۔

فہرست کتب

(سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو)

البیرونی کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ تعریف سے مستغنی ہے ہی کا فاضل ہے مگر بتحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہے ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفہ تاریخ اور مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی البیرونی اس کے حالاتِ زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے۔ قیمت عہ/

فلسفۂ اجتماع تالیف ہے اور اس کا موضوع نفس اجتماعی جماعت کے لیے اعمال و قوائے دماغی کے تحلیل و تشریح ہے موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور فائدے سے خالی نہوگا۔ اِس پر انگلستان و ہند کے علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔ عہ/

قاعدہ و کلیدِ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے۔ ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی نے اپنے صُوبہ کے گورنر سے تحریک کی ہے کہ اس قاعدہ کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ جن اُصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیے اُن کی تشریح کے لیے ایک کلید بھی تیار ہے۔ قاعدہ ۲/ کلید قاعدہ ۴/

دریاے لطافت ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے اُردو صرف و نحو اور محاورات و الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں۔ عہ/

طبقات الارض۔ اس فن کی پہلی کتاب ہے تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند ہیں انگریزی اور اُردو داں دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک کر دی گئی ہے۔ قیمت عہ/

مشاہیر یونان و رومہ۔ پلوٹارک لائوز کا ترجمہ ہے سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادبیان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اِس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔ وطن پرستی و بے نفسی، عزم

وجوا مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ لبریز ہے۔ ہماری قوم کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں اس کا ایک نسخہ ضرور ہونا چاہیے۔ دُنیا کی تمام مہذب زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ جلد اوّل غیر مجلد عہ ر

جلد دوم مجلد عہ ر

اسباقِ نحو دو حصے ملک کے ادیب کامل مولٰنا مولوی حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف سے ہیں۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے عربی خواں طلبار کے لیے نادر تحفے ہیں قیمت فی رسالہ سہر

علم المعیشت۔ اسرارِ تمدن کے سمجھنے کے لیے اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم اے نے ملک پر بڑا احسان کیا ہے حجم (۵۲۵) صفحے قیمت صرف للعہ ر

تاریخ اخلاقِ یورپ اصل مصنف لیکی کا نام علم و تبحر تحقیق و صداقت کا مرادف ہے یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن و معاشرت اُصول اخلاق مذہب و خیالات کا مرقع ہے۔ ترجمہ مولوی عبد الماجد صاحب بی اے۔ حصہ اوّل مجلد ہے ر دوم مجلد ہے ر

مبادیِ سائنس فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی گئی ہے اس کا بیان سلیس اور مقبول عام ہے اُردو ترجمہ صرف ایک حصہ کا ہے اور آخر کتاب میں فرہنگ مصطلحات بھی ہے

قیمت عہ ر

تاریخ یونانِ قدیم۔ یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ اِس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندی ہے۔ ایف اے کلاس کے طلبہ، جو یونانِ قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجے مفید پائینگے۔ مجلد قیمت عہ ر

انتخابِ کلامِ میر۔ میر تقی سرتاج شعرائے اُردو کے کلام کا انتخاب ہے مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۲۴۰ صفحے کا ایک مقدمہ بھی ہے قیمت عہ ر

رسالہ نباتات۔ اِس موضوع کا پہلا رسالہ ہے علمی اصطلاحات سے معرّا۔ سلاست روانی مملو اور دلچسپ و مفید ہے۔ طلبار نباتات جن مسئلہ کو انگریزی میں نہ

سمجھ سکیں وہ اسی رسالہ میں مطالعہ کریں۔ قیمت مجلد عہ

دیباچۂ صحت - اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہوا، پانی، غذا، لباس وغیرہ پر مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے زبان عام فہم اور پیرایہ مؤثر و دل پذیر ہے۔ ملک کی بہترین تصنیف ہے۔ اس کا مطالعہ طبیبوں کے کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔ حجم ۵۰۰ صفحے مجلد قیمت للعہ

قواعد اُردو ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اُردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھی گئی بسیط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے اس کو ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بمبئی نے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہے قیمت عاً

القول الاظہر ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف الفوز الاصغر کا اُردو ترجمہ ہے۔ ابن مسکویہ آسمان علم و فضل کا آفتاب تھا یہ کتاب فلسفہ انہیں کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے اس کو بمبئی یونیورسٹی نے سرکاری کتب خانوں کے لیے تجویز کیا ہے۔

قیمت عہ

اُمرائے ہنود - پانسو سے زیادہ ہندو امرا کے حالات قلم بند ہیں۔ یہ اُمرا سلاطین مغلیہ کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے کتاب گویا ان متعصب اور ناواقف مورخوں کا جواب ہے جو اسلامی حکومت پر تعصب کا الزام لگاتے ہیں۔ قیمت حصہ اول عاً حصہ دوم عہ

القمر - قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت اور چاند کے متعلق جتنی جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے۔ قیمت ۸ر

تاریخ تمدن - سرٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے الف سے لے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے۔ ہر بحث کے لئے ایک دلچسپ مگر پُر زور اُصول اختیار کیا گیا ہے اور ہر اُصول کی تائید میں تاریخی واقعات سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ بمبئی میں سرکاری لائبریریوں کے لیے تجویز کی گئی ہے۔ قیمت حصہ اول غیر مجلد عہ حصہ دوم مجلد عاً

مقدماتِ الطبیعات - یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ہکسلی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے۔ اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے۔ متعلمان سائنس اور عام شائقین کے لیے بہت مفید ہے۔ قیمت عہ

فلسفۂ جذبات - کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ قیمت عہ

نکات الشعرا - یہ اُردو شعرا کا تذکرہ میر تقی میر کی تالیفات سے ہے اس میں میر صاحب کی رائے اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت ۸/

نپولین اعظم ایبٹ کی مستند کتاب کا اُردو ترجمہ ہے کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری جدوجہد کا آخری باب ہے، واقعات کی داد یا تو سکندر کی زبان ادا کر سکتی ہے یا تیمور کی زبان ترجمہ آسان اور عام فہم ہے مکمل پانچ جلد قیمت ۱۲ عہ

فلسفۂ تعلیم - ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہے۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ اور والدین و معلم کے لیے چراغ ہدایت ہے تربیت کے زبانی قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے قیمت ۱۲/

رہنمایانِ ہند - مشہور کتاب پروفٹس آف انڈیا کا ترجمہ ہے شروع میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں لکھا ہے اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج کی سوانح اور گوتم بدھ کے پر اثر حالات آتے ہیں۔ آخری حصہ میں شنکرا چارج رامانج اور رامانند کا ذکر ہے قیمت عہ

آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اُردو

۱۔ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہی جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہی۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہی جس میں زبان ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہی؟ حجم کم سے کم ۱۵۰، اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحہ ہوتا ہی۔

۳۔ قیمت نو روپیے بارہ آنے سالانہ معہ محصول ڈاک اور ارکان انجمن ترقی اردو سے آٹھ روپیے بارہ آنے۔

۴۔ تمام خط و کتابت:۔ آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اُردو اورنگ آباد دکن سے ہونی چاہیئے۔

(باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)